انتخاب

ڈاکٹر توصیف تبسم

محمد حمید شاہد

پچاس افسانے

کہانی لکھنا تو گویا

زِندگی کو از سرِ نو تخلیق کرنا ہوتا ہے

محمد حمید شاہد کے

انتخاب/ترتیب

ڈاکٹر توصیف تبسم

C 2009، پورب اکادمی

طبع اول: جنوری2009

ناشر پورب اکادمی، اسلام آباد

فون نمبر 051-5382967, 0301-5595861

ای میل: info@poorab.com.pk

poorab_academy@yahoo.com

ویب سائٹ: www.poorab.com.pk

سرورق: اسلم کمال

عمل: سلیم پاشا

Pachaas Afsanay

by Muhammad Hameed Shahid

Selection : Dr Tauseef Tabassum

Published by Poorab Academy , Islamabad Pakistan

ISBN: 969 8917 64 0

۸۹۱۔۴۰۹۳۰۱

ش اہ

شاہد، محمد حمید

پچاس افسانے/محمد حمید شاہد

اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء

۵۴۳ ص

۱۔ اردو افسانے۔ انتخاب

۲۔ اردو افسانے

اِنتساب

کہانی کی اس نئی روایت کے نام
جس میں لفظ نے آدمی کی جون بدل لی ہے

زخمِ مضراب سے رِستا ہے لہو پوروں کا
کتنا دُشوار ہے، آواز کو نغمہ کرنا

۱۹۸۳ء۔ ۲۰۰۷

افسانوں کے مجموعے

بند آنکھوں سے پرے، جنم جہنم، مرگ زار

اور

غیر مدون منتخب کہانیاں

پچاس افسانے

اثبات

محمد حمید شاہد اُردو افسانے کا معتبر نام ہے' یہ اعتبار مسلسل ریاضت اور غور و فکر کا حاصل ہے۔ اس سلسلے میں یہی گواہی کیا کم ہے کہ جب محمد حمید شاہد کا افسانہ ''مرگ زار'' بھارت کے ادبی جریدے ''نیاورق'' میں شائع ہوا تو اس کو پڑھ کر ممتاز نقاد وارث علوی بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے اِس کی تیکنیک کو سراہا اور بولے کہ افسانہ تو پاکستان میں لکھا جا رہا ہے۔ ادھر شمس الرحمن فاروقی نے بھی اطلاع دی کہ محمد حمید شاہد کے ایک اور افسانہ ''لوتھ'' کو وہاں شامل نصاب کرلیا گیا ہے۔

محمد حمید شاہد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز نثر کی دیگر اصناف اور شاعری سے کیا مگر بہت جلد وہ افسانہ کی طرف آ گئے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اُردو اَفسانے سے مجھے جو ربطِ خاص ہے اس کا سبب اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ میں اَپنے تخلیقی وجود کو اِس با کمال صنف سے ہم آہنگ پاتا ہوں۔ اِسی محبت کا فیضان ہے کہ میں اَفسانے کی تخلیقی فضا میں رہتے ہوئے مختلف اوقات میں اُردو اَفسانے کی تفہیم کے جتن کرتا رہتا ہوں۔ اردو افسانے کی جس تفہیم کا تذکرہ محمد حمید شاہد نے یہاں کیا ہے' اس کی عملی صورت ''اردو افسانہ: صورت و معنیٰ'' ہے' جو اردو فکشن پر لکھے گئے ان کے مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد حمید شاہد ایک

تخلیق کار ہی نہیں، ایک باشعور نقاد بھی ہیں۔ اسی کی دہائی میں جب انہوں نے افسانے لکھنے شروع کیے تو ان کی ان تحریروں کو وہ توجہ اور پزیرائی ملی جو شاید ہی ان کے کسی اور ہم عصر کے حصہ میں آئی ہوگی۔ اس تخلیقی سفر کے دوران، ان افسانوں کے موضوعات کی وسعت وتنوع اور اسلوب کی رنگارنگی نے جہاں صف اوّل کے افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی اور ممتاز مفتی کو متاثر کیا، وہیں ان کے معاصرین بھی ان کی تخلیقات سے صرف نظر نہ کر سکے۔ شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، ڈاکٹر اسلم فرخی، خالدہ حسین، محمد منشا یاد جیسے بالغ نظر ادیب اور نقاد ان کے فن پر بات کرنے والوں میں شامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا کہ محمد حمید شاہد کہانی کہنے کے فن پر حیرت انگیز طور پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور تیز ہے، وہ زندگی کو کسی شاہ راہ سے نہیں بل کہ اس کی پگڈنڈیوں سے گزر کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ اس طرح کہ زندگی کا بھرپور ابلاغ ان کی کہانیوں سے ہو جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں عہد موجود کی معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی کے نقوش بڑے واضح اور اتنے نمایاں ہیں کہ ان سے لمحۂ رواں کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ ممتاز مفتی کو ان کے یہاں بیان کی سادگی، لکھنے والے کا خلوص اور خیالات کی یک گونہ ندرت نے متوجہ کیا تو شمس الرحمن فاروقی نے محمد حمید شاہد کو ایک حساس اور ہوش مند قصہ گو قرار دیا۔ ایسا حساس تخلیق کار جس کے بیانیہ میں موضوع کی پیچیدگی اور قصہ کی دل چسپی یک جان ہو گئے ہیں۔ محمد منشا یاد نے کہا کہ محمد حمید شاہد کے ہاں روایت سے انحراف کی کہانیاں بھی ہیں جن میں کہانی کے اندر کہانی بیان کرنے کا لطف پیدا کیا گیا ہے اور وہ بھی کچھ اس تخلیقی سلیقے سے کہ وحدت تاثر قائم رہتی ہے۔ ان کے موضوعات اور ان کا اسلوب، دونوں جددرجہ متنوع اور رنگارنگ ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے کہا کہ محمد حمید شاہد کی کہانیاں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کے باطن اور باطن کی حقیقت تک رسائی کے تمنائی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی کہانیوں کی دو سطحیں ہیں۔ یہ کہانیاں شہر وجود کے خارجی احوال ومقامات کی سیر بھی کراتی ہیں اور حاضر وموجود کا طلسم توڑ کر غائب اور نارسا کی جستجو بھی کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی عصری زندگی کے مصائب پر بھی انہوں

نے قلم اٹھایا ہے۔ ان کی کہانی ''مرگ زار'' اس کی روشن مثال ہے جو نائن الیون کے پس منظر میں لکھی گئی۔ یہ اور اس طرح کی کہانیاں عہد موجود کا نوحہ ہیں۔

محمد حمید شاہد کی کہانیوں کے تین مجموعے سامنے آچکے ہیں۔ وہ مسلسل لکھ رہے ہیں اور ان کی کہانیاں ادبی جریدوں میں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں۔ ''بند آنکھوں سے پرے'' ان کے افسانوں کا اولین مجموعہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ دوسرے مجموعے ''جنم جہنم'' ۱۹۹۸ء اور ''مرگ زار'' ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آئے۔ محمد حمید شاہد کی پہلی کتاب ''بند آنکھوں سے پرے'' میں ہر دو روایات الگ الگ اپنا جادو جگا رہی تھیں۔ ''برف کا گھونسلا'' اور ''مراجعت کا عذاب'' میں جہاں وہ حقیقت نگاری کے اسلوب کو فنی مہارت کے ساتھ برتتے ہیں، وہاں ''آئینے میں جھانکتی لکیریں'' اور ''اپنا سکہ'' میں وہ ہمیں باطن کے شہر کی سیر کراتے اور غیر مرئی وجود کا تماشائی بناتے ہیں۔ اپنے پہلے ہی مجموعے میں جہاں افسانہ نگار نے متنوع موضوعات اور اسالیب کو برتنے کی کوشش کی تھی، وہاں بظاہر سادہ بیانیے کو توڑے بغیر متن کی ساخت کے اندر قدرے بڑے اور گہرے معنیاتی سلسلے کو رکھ دینے کا التزام بھی کیا تھا۔ اس کی عمدہ مثال ''برف کا گھونسلا'' ہے۔ ''کفن کہانی'' اور ''بند آنکھوں سے پرے'' اس مجموعے کی ایک اور مزاج کی بہترین کہانیاں ہیں۔ ان میں تیکنیک اور موضوع کی پیچیدگی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ کہانیاں ہمیں افسانہ نگار کے اگلے سفر کی نوید دیتی ہیں۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کو ''جنم جہنم'' کے افسانے خاص طور پر اچھے لگے۔ انہیں ان کہانیوں کے مکالمات کا طریق کار اور بیانیہ کا بہاؤ دونوں مختلف محسوس ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ محمد حمید شاہد کو استعاراتی تفاعل کا ہنر آتا ہے۔ وہ معنیاتی انسلاکات پر قدرت رکھتے ہیں اور علامتی مفاہیم کا فن بھی جانتے ہیں۔

محمد حمید شاہد کے ہاں افسانہ لکھنا ایک باطنی تجربہ ہے جو اندر سے باہر کی طرف سفر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے وہ تخلیقی عمل کے لیے پہلے سے کسی منصوبہ بندی اور ادبی تحریکات کے

فریم ورک کو زہر ہلاہل سمجھتے ہیں۔ان کی کہانی کسی شعر یا کسی نظم کی طرح ان کے اندر سے پھوٹتی ہے۔اسی میں ان کی انفرادیت کا راز پوشیدہ ہے۔ان کا تخلیقی سفر دراصل ایک ذہنی اور روحانی سفر ہے جو مختلف سمتوں میں پھیل کر خود اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں پورے افسانے کو اپنے اندر بننے دیتا ہوں' پھر اس کو اس کی جزئیات سمیت کاغذ پر منتقل کرتا ہوں۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ کہانی لکھتے ہوئے' عین مین وہی رہتی ہے جس کی چھب اس نے پہلے دکھا رکھی تھی۔کہانی جوں جوں آگے بڑھتی ہے' نئی معنیاتی وسعتیں اور نئے امکانات کے دریچے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔خود ان کے الفاظ میں حقیقت کلی ہو یا تخلیقیت کا بھید دونوں عقلِ محض کا علاقہ نہیں۔ان دونوں منطقوں میں وجدان اور روح کا سہارا لینا پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی کہانیوں میں شعری عناصر فکشن کے متن میں منقلب ہوتے رہے ہیں ۔ بعد کے افسانوں میں علامتی تہ داری کے باوجود بیانیہ فکشن کے آہنگ کو لے کر چلتا ہے۔ان کے افسانوں میں کہانی محض واقعہ کی سطح پر نہیں رہتی' علامت بن جاتی ہے۔افسانے کو علامت کا منصب عطا کرنے والے عناصر کا بیشتر حصہ محمد حمید شاہد کے ہاں لوک داستانوں' اساطیر' مذہبی حکایات' مجموعی انسانی تجربے' گہری بصیرت اور مظاہر فطرت سے کشید ہوتا ہے۔

محمد حمید شاہد کے نظریہ فن کا اثر اُن کے تصور اسلوب پر بھی پڑا ہے۔گبن اور فلابیر نے لکھنے والے کے لیے اسلوب کو اس کی شخصیت کا عکس قرار دیا مگر محمد حمید شاہد کہتے ہیں کہ بے شک تخلیقی عمل کا رشتہ براہ راست ذات کی دریافت کے ساتھ جڑا ہوا ہے مگر خیال رہے کہ دریافت شدہ ذات کا یہ رخ' زندگی کے ہنگاموں میں مصروف فرد کی مکمل شخصیت کو سامنے نہیں لاتا بل کہ وہ اسی قدر روشن ہو پاتا ہے جتنا کہ وہ شخص خلوص سے اس کو دریافت کرتا ہے۔

محمد حمید شاہد نے اپنے افسانوں میں زبان و بیان کے کئی تجربے کیے ہیں۔مگر یہ تجربے خارج سے مسلط نہیں کیے گئے بل کہ یہ سب کچھ کہانی کے بہاؤ سے برآمد ہوتا رہا ہے۔ان کے یہاں کہانی کا تصور اپنی زبان اور ٹریٹمنٹ کو ساتھ لے کر آتا ہے۔محمد حمید شاہد ایک ہی انداز اور

ایک ہی اسلوب میں ہر موضوع کو نہیں برتتے‘ بل کہ موضوع اور ماحول بدلنے سے نہ صرف زبان تبدیل ہو جاتی ہے بل کہ جملوں کی ساخت بھی بدل جاتی ہے۔ جن افسانوں میں انہوں نے مقامی طور ر بولی جانے والی زبان‘ اور اس کے مخصوص الفاظ‘ اصطلاحات اور محاوروں سے کام لیا ہے وہاں وہ ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کے بغیر یہ خاص کہانی حقیقی آب و رنگ سے محروم رہتی۔ ضیا جالندھری نے اسی لیے ان کے افسانوں میں زبان کے استعمال کو کہانی کی جزئیات سے یوں پیوست پایا ہے کہ قاری خود کو اس منظر نامے کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ افتخار عارف کے خیال میں محمد حمید شاہد کو یوں داد دینی پڑتی ہے کہ ان کی کہانیوں میں استعمال ہونے والی زبان نثری آہنگ رکھتے ہوئے بھی دل آویز اور موثر ہو جاتی ہے۔

محمد حمید شاہد کے یہ پچاس منتخب افسانے اس وقت پیش کیے جا رہے ہیں جب کہ وہ اپنی عمر کے پچاس مراحل زندگی طے کر چکے ہیں۔ ان افسانوں کے انتخاب اور ترتیب میں بھی میں نے سمر سٹ ماہم والا اصول سامنے رکھتے ہوئے‘ اپنے طور پر سوچا کہ اگر کوئی اور شخص انہیں منتخب کرتا تو کیسے کرتا؟ اوّل مسئلہ افسانوں کے انتخاب اور پھر ان کی ترتیب کا تھا۔ آپ اگر چاہیں تو اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ تاہم میں نے شعوری طور پر یہ کوشش ضرور کی ہے کہ یہ انتخاب جہاں تک ممکن ہو بہ حیثیت افسانہ نگار محمد حمید شاہد کا نمائندہ انتخاب ہو۔ انتخاب کو ممکنہ حد تک جامع بنانے کے لیے‘ جہاں ان کے افسانوں کے مجموعے ''بند آنکھوں سے پرے'' (۱۹۹۴ء) ''جنم جہنم'' (۱۹۹۸ء) اور ''مرگ زار'' (۲۰۰۴ء) سے افسانے منتخب کیے گئے ہیں‘ وہیں ان کی بعض وہ کہانیاں بھی شامل انتخاب کی گئی ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں کا حصہ نہیں ہیں تاہم یہ سب کہانیاں لائق توجہ ضرور ہیں۔

اب کچھ گفتگو ان افسانوں کے بارے میں تاکہ ایک طرف تو ان کے انتخاب میں شامل کرنے کا کسی حد تک جواز فراہم ہو سکے‘ تو دوسری طرف ان افسانوں کی تفہیم کی راہ بھی ہموار ہو سکے۔ افسانوں کے بارے میں میری رائے حتمی نہیں ہے۔ اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا

ہے جو ہر قاری کا حق ہے۔ یوں بھی ہر متن معنوی اعتبار سے خود کو مختلف سطحوں پر دہراتا رہتا ہے۔

''سورگ میں سور'' محمد حمید شاہد کا ایسا افسانہ ہے جس پر مصنف بجا طور فخر کر سکتا ہے۔ ہم اس افسانے کو منٹو، بیدی اور انتظار حسین کے ایسے ہی افسانوں کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے پس منظر میں لکھی جانے والی یہ کہانی سوٗروں کی آمد' کتوں کی بہتات' بکریوں کی اموات اور مونگ پھلی کی کاشت جیسی علامتوں سے محمد حمید شاہد نے عالمی استعمار کی اس مکروہ سازش سے پردہ اٹھایا ہے جس میں موت ہمارے تہذیبی تشخص کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کہانی کی کئی پرتیں ہیں۔ واقعاتی اور سامنے کی سطح پر بھی اس کی ایک بھرپور معنویت ہے۔ پھر کہانی جس طریقہ سے ایک علامتی موڑ کاٹتی ہے اور ہمیں سیاسی جبر کی ایک نئی معنویت سے ہمکنار کراتی ہے وہ افسانہ نگار کی فنی ہنرمندی کا کمال ہے۔ اس کہانی میں بڑی خوبصورتی سے جزیات نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ بنجر زمینوں کی ثقافت، وہاں کے معاملات، بکریوں کی اقسام اور ان کی بیماریوں کی تفصیلات سے' لکھنے والے کے وسیع تجربے، مشاہدہ اور معلومات کا پتا چلتا ہے۔ اس کہانی کا پورا منظر نامہ دیہی ہے۔ اس اعلان کے بعد کہ آج کی دنیا ایک گلوبل ویلیج میں تبدیل ہو چکی ہے' عالمی استعمار کو پیش کرنے کے لیے دیہی استعارے زیادہ بامعنی ہو گئے ہیں۔ ''سورگ میں سوٗر'' اپنے موضوع 'اپنی تیکنیک اور فنی ہنرمندی کے حوالے سے محمد حمید شاہد کا بہترین اور اُردو ادب کا اہم ترین افسانہ ہے۔ یہ افسانہ زندگی کا حسی ادراک کرنے اور ادراک کو کسی واحد مفہوم کی قطعیت سے آزاد رکھنے کی ایک قابلِ رشک مثال ہے۔ اسے تمثیلی پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ بالائی سطح پر یہ بارانی زمین پر آباد سورگ ایسے گاؤں اور اس کے محنت کش باسیوں کی جہد حیات کی داستان ہے' مگر زیریں سطح پر یہ ایک طرف وطن عزیز کی سیاسی اور پھر ثقافتی تاریخ کا بیانیہ ہے تو دوسری طرف نائن الیون کے بعد پیدا ہونے والی عالمی صورت حال کا قصہ بھی ہے۔ یہ افسانہ اپنے اندر محض ہنگامی واقعیت نہیں رکھتا' یہ ایک بڑی فوجی طاقت کی بے رحمانہ سرگرمیوں کو تمثیلی انداز میں ہی پیش نہیں

کرتا' بل کہ ایک ایسی علامتی جہت بھی رکھتا ہے' جسے مجموعی انسانی تاریخ کے کئی ادوار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر اس افسانے کو انسانی تاریخ کی نئی اسطورہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

''برف کا گھونسلا'' محمد حمید شاہد کے پہلے مجموعے ''بند آنکھوں سے پرے'' کی پہلی کہانی ہے۔ یہ کہانی ''ایکسٹرا'' کے نام سے ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر رشید امجد کے ۱۹۹۴ء میں مرتب کیے ہوئے انتخاب ''پاکستانی ادب'' میں چھپی تھی۔ تاہم اِس کی تخلیق کا لگ بھگ وہی زمانہ بنتا ہے جب افغانستان میں روس کی پسپائی ہوئی اور امریکہ نے اپنے اتحادی پاکستان کی طرف سے نہ صرف آنکھیں پھیر لی تھیں بل کہ اس کی امداد بھی بند کر دی تھی۔ ''برف کا گھونسلا'' پرندوں اور انسانوں پر مشتمل دو کنبوں کی کہانی ہے جو ایک ہی گھر میں رہتے ہیں لیکن ان کی تقدیریں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کہانی میں بظاہر محمد حمید شاہد نے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے متن کو تشکیل دیا ہے مگر کہانی ایک سے زیادہ سطحوں پر علامت بن جاتی ہے۔ یہ کہانی مراعات یافتہ اور مظلوم طبقوں کو ایک تمثیلی انداز میں بھی پیش کرتی ہے اور پورے ایک طبقے کو ایکسٹرا کی صورت استعمال کرنے اور وقت نکل جانے کے بعد بہلاوے کے اس سامان کو یک سر بھلا دینے والے مکروہ کھیل کو بھی نہایت سفاکی سے سامنے لاتی ہے۔ چڑیا اور اس کے بچوں پر جو گزرتی ہے وہ بہت سے انسانی خاندانوں پر بھی بیتتی رہتی ہے۔ کہانی کا دردناک انجام قاری کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ بظاہر چڑیا کی موت کوئی بڑا سانحہ نہیں مگر افسانہ نگار اس سے گہرا تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ کہانی بہ حیثیت فن کار ان کے باکمال ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

''برشور'' بلوچستان کی قحط زدہ سرزمین کے پس منظر میں لکھا گیا ایک مکمل شہ پارہ ہے جو غربت کے ہاتھوں انسان کی تذلیل' بے توقیری اور عورت کی بے بسی کی تصویر ہے۔ انسان حالات کی چکی میں پستے پستے کیسے بھر بھرے آٹے میں تبدیل ہو جاتا ہے' اس صورت حال کا عمدہ بیان اس افسانے میں موجود ہے۔ بلوچستان کے دیہی علاقوں کی غربت اور وہاں آباد لوگوں کی

تصویر کشی کر کے محمد حمید شاہد نے پاکستانی اردو افسانے میں ایک ایسے عنصر کا اضافہ کیا ہے جو بہت کمیاب رہا ہے۔ یہ ایک نیا اور دل دوز موضوع ہے۔ ایتھوپیا اور صومالیہ کی بھوک پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ہمارے اپنے خطہ بلوچستان میں خشک سالی کا عفریت کس کس طرح انسانی زندگیوں اور مسرتوں کا لہو پی رہا ہے اس بارے میں کوئی افسانہ کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔

محمد حمید شاہد کی اولین کہانی ''بند آنکھوں سے پرے'' سے ہی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی کہانیاں موت کی ہم راز ہو گئی ہیں۔ موت ان کے افسانوں میں اپنا چہرہ دکھاتی رہتی ہے۔ ''موت کا بوسہ'' جیسی کہانیوں میں موت مختلف عصری، سماجی اور معاشی سطحوں پر روپ بدل بدل کر باقاعدہ ایک کردار میں ڈھل جاتی ہے اور آدمی اس کے مقابل بے بس دکھائی دیتا ہے۔ ''موت کا بوسہ''، ''مرگ زار''، ''موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ'' اور ''دکھ کیسے مرتا ہے'' ایسی کہانیاں ہیں جو اپنے تیز ناخنوں سے اپنا ہی کلیجہ چھیل چھیل کر لکھی گئی ہیں۔ ''کفن کہانی'' محمد حمید شاہد کے اولین افسانوی مجموعے کی بہترین طویل کہانی ہے۔ خوب صورت بیانیہ اور جیتے جاگتے کرداروں والی اس کہانی میں بھی موت گھات لگائے بیٹھی ہے۔

''کیس ہسٹری سے باہر قتل'' ایک نئی کہانی ہے جو ابھی تک کسی مجموعہ کا حصہ نہیں بنی۔ یہ دو کنبوں کا قصہ ہے۔ ایک طرف جدید زندگی ہے جو حساس آدمی کو مار ڈالنے پر تلی بیٹھی ہے اور دوسری طرف محبت کی بے پناہ لذت اور شدید گرفت ہے جس میں سانس گھٹ جاتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر نوشین کی کہانی ہے جس کے پاس سب کچھ تھا۔ اس کا شوہر بھی اس کی طرح کامیاب اور مصروف آدمی تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ حد درجہ عیار بھی تھا ورنہ وہ اپنے ہنر اور اپنے فرض کو کمال چالاکی سے سرمایہ کاری بنانے میں کامیاب نہ ہوتا۔ پہلے دونوں کی مصروفیت کام کی لگن کی وجہ سے تھی، پھر اس میں بہت سارے خواب شامل ہو گئے۔ وہ دونوں ان خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے میں اس درجہ الجھے کہ ایک دوسرے کے لیے جینے کا تصور ان کی زندگی سے معدوم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ یہ بھی بھول گئے کہ ایک دوسرے کے لیے پریشان کیسے ہوا جاتا ہے، بے نتیجہ باتوں

سے لطف کیسے کشید کیا جاتا ہے اور بلا سبب کیسے ہنسا جاتا ہے۔ یہ کہانی محض اس جوڑے کی کہانی نہیں، ان کے پڑوس میں ایک اور جوڑا بھی موجود ہے۔ نفیسہ بیگم اور اس کا شوہر۔ محبت کی لذت میں پوری طرح شرابور۔ گھر کی جھاڑ پونچھ اور ہانڈی روٹی کی محدود دنیا کو اپنے شوہر کی محبت کے لیے کل کائنات بنا لینے والی۔ یہ کیس ہسٹری اسی عورت کی ہے مگر قتل وہ ہوتی ہے جو اس کیس ہسٹری سے باہر ہے۔ یہ کہانی محض ان دو عورتوں کی کہانی نہیں ہے، کیوں کہ اس میں مرد ذات کی بھی کئی نفسیاتی گتھیاں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

''نئی الیکٹرا'' سراسر معصیت ہے مگر اس نے معصومیت کی پرفریب قبا زیب تن کر رکھی ہے۔ وہ دانے گن گن کر اسم اعظم کا ورد کرتی ہے تو چالیس کے چالیس چور اُس کے لیے کھل جا سم سم کہتے ہیں۔ حکمراں کی ساحری کے فن میں طاق، چالیس چوروں کی یہ سردارنی ہمارے زمانے کی مخلوق ہے اور ہماری اپنی سرزمین پر خون اور پیپ کے پیالے لنڈھانے میں مصروف ہے۔ اس عصری تماشے کو خیر و شر کے ازلی و ابدی تناظر میں رکھ کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش میں محمد حمید شاہد نے رفت و گزشت زمانوں اور دور و دراز سرزمینوں میں ہوس کی اسیری میں مبتلا ہیروئینوں کی سرگزشت کو بھی نئے سرے سے جانچا اور پرکھا ہے۔ شیطان کی شاگرد حسیناؤں کے گرد بنے گئے عالمی ادب کے شاہکاروں سے برآمد ہونے والی آفاقی حقیقتوں کی روشنی میں محمد حمید شاہد نے ہمیں اپنی اجتماعی ہستی کو درپیش امراض سے روشناس کرایا ہے۔ یونانی دیومالا کے پس منظر میں لکھی گئی اس کہانی کے ذریعہ افسانہ نگار نے معاصر صورت حال کو نئے معنی دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک مشکل تیکنیک میں لکھا گیا افسانہ ہے مگر محمد حمید شاہد کے ہاں یہ پسندیدہ تیکنیک ہے کہ اس طرح وہ متن کے اندر معنویت کا ایک اور جہاں آباد کر لیتے ہیں۔

''لوتھ'' گیارہ ستمبر کے واقعات کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ ایک کردار جو اپنے اردگرد کی آگاہی رکھتا ہے، جو حالات کے مطابق ردعمل ظاہر کر سکتا تھا، کیسے ناتجربہ کار ڈاکٹروں کی

وجہ سے رفتہ رفتہ لوتھ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اس کہانی میں ان ڈاکٹروں کا المیہ بیان کیا گیا ہے جو رفتہ رفتہ اپنی اصل سے دور ہوتے جاتے ہیں اور ان اقدار اور اس طرز معاشرت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جو ان کے اپنے تھے۔ یہ سب کچھ کھو کر ان کے ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آتا۔ یہ کہانی احساس کی لہروں سے مرتب ہوئی ہے۔اس میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ بجائے خود کہانی کا مقصود نہیں ہیں' بل کہ آخری سطروں میں باپ کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے گھاؤ کی لکیر ہے جسے باپ اپنے ہی بیٹے سے چھپا لینے کی کوشش کر رہا ہے مگر افسانہ نگار تاسف کی اس لکیر کو دیکھ لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور پوری معنویت کے ساتھ اسے پیش کر دیتا ہے۔ یہ کہانی ہماری نصف صدی کی تاریخ میں دو نسلوں کے درمیان پھیلی ہوئی خلیج کا تنقیدی بصیرت کے ساتھ جائزہ لیتی ہے جس میں ہمارے خواب ڈوب چکے ہیں۔

''جنم جہنم''میں قاری کو فلسفہء لذتیت کے احوال و مقامات کی سیر کرائی گئی ہے۔یہ ایک کہانی نہیں بل کہ تین کہانیوں کا سلسلہ ہے۔ تینوں کہانیاں خشک بیانیہ اور بے جان مقالہ نہیں ہیں بل کہ دلکش حکیمانہ کہانیوں کا ایک سلسلہ ہیں۔ ''جنم جہنم'' کو افسانہ نگار نے تین سطحوں پر لکھا ہے۔ اس میں انسانی وجود اور اس پر گزرنے والی کیفیات کو بھی درجہ بہ درجہ بیان کیا گیا ہے ۔''جنم جہنم۔ا''میں ہمیں جدید وجودی فکر کے اثرات بہت واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔اس کا مرکزی نسائی کردار جب زندگی کی نئی شاہ راہ پر نکل کھڑا ہوتا ہے تو اس کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس کا بیان ''جنم جہنم ۔۲'' میں سامنے آتا ہے۔''جنم جہنم ۔۳'' میں کہانی کے کردار مل کر زندگی کی معنویت' انسان کے احساس تنہائی اور بے بسی میں تلاش کرتے ہیں۔جنم جہنم سلسلے کی اس آخری کہانی کا آخری جملہ زندگی کے حاصل کو سامنے لاتا ہے:''یہ جو لعنت کی کٹاری کی تیز دھار ہے نا' بالآخر یہی تو بندے کا مقدر ہے۔''

تین پارچوں پر مشتمل ''پارہ دوز'' ایک مکمل کہانی ہے جس میں زندگی کی سبک رفتاری کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔نئی نسل جو بے خوابی کے عارضے میں مبتلا ہو چکی ہے نہیں

جانتی کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ مُسکّن ادویات کے ذریعے اس عارضے پر قابو پانے کی کوشش ہوتی رہتی ہے مگر مرض کی تشخیص کو معطل رکھا جاتا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ڈاکٹر ہے جو زندگی کی لذت سے اتنی آگے نکل چکا تھا کہ اسے اپنی جون میں واپس آنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ آصف فرخی نے اسے ''دنیازاد'' میں شائع کیا تو اس کی تیکنیک کو قابل توجہ قرار دیا تھا۔

''دُکھ کیسے مرتا ہے'' اور ''مرگ زار'' بھی محمد حمید شاہد کی اہم کہانیاں ہیں' بل کہ زندگی اور موت کی انتہاؤں پر پھیلی ہوئی دو قوسیں ہیں۔ ''دکھ کیسے مرتا ہے'' میں ہم زندگی کے عظیم ترین جذبے 'محبت' کو نہایت معمولی سطح پر مرتے ہوئے دیکھتے ہیں جب کہ ''مرگ زار'' میں شہادت کی ابدی زندگی کے عظیم تصور کو دھوکے کی خوفناک موت مرتے دیکھا گیا ہے۔ اپنی تیکنیک اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے دونوں کہانیاں موت کے موضوع پر ہونے کے باوجود بالکل الگ ہو گئی ہیں۔ ''مرگ زار'' کا موضوع بہت مشکل تھا اور یہ کہانی نازک ٹریٹمنٹ کا تقاضا کرتی تھی۔ یہ کہانی لکھتے ہوئے افسانہ نگار کو بھی خاصی احتیاط اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مگر وہ اپنی بات اور موقف کو تجرید کی دھند سے نکالنے اور بیان کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس کہانی کا موضوع جہاد اور شہادت جیسا نازک مسئلہ ہے جس کی کچھ عرصہ پہلے تک کچھ اور صورت تھی مگر نائن الیون اور عالمی طاقتوں کی مداخلت سے اب کچھ اور صورت بن گئی ہے۔ یہ ایک دہلا دینے والی پراثر کہانی ہے۔ ''مرگ زار'' میں مری کا ماحول ایک بار پھر محمد حمید شاہد کے افسانوں میں نمودار ہوتا ہے۔ ''برف کا گھونسلا'' کی طرح ''مرگ زار'' افسانے میں بھی موت ڈیرے ڈالے ہوئے ہے مگر اس کہانی تک آتے آتے ایسا لگتا ہے کہ موت کے علاوہ سب سچائیاں اپنی اہمیت کھو چکی ہیں۔ ''دکھ کیسے مرتا ہے'' کو جدید تر زندگی کے تناظر میں رکھ کر نفسیاتی سطح پر بنا گیا ہے جبکہ ''مرگ زار'' کہانی ایک سیدھ میں نہیں چلتی اور کئی قسم کے سوالات اٹھاتے انجام کار انسانی ضمیر کو

جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یہ وہی کہانی ہے جسے بقول ساجد رشید وارث علوی نے پڑھا تو اس کی تیکنیک کو بہت سراہا جبکہ ''دکھ کیسے مرتا ہے'' کو انگریزی میں ترجمہ کیا گیا اور یاسمین حمید نے اسے اکادمی ادبیات کے انگریزی جریدے ''پاکستانی لٹریچر'' میں شامل اشاعت کیا تو اسے پڑھ کر معروف عالمی اسکالر ایکسل مونٹے نے اسے جدید تر زندگی کے حوالے سے شاہکار افسانہ قرار دیا تھا۔

افسانہ ''پارینہ لمحے کا نزول'' کرافٹ پر محمد حمید شاہد کی غیر معمولی دسترس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ اور مشکل سے مشکل موضوع کو کہانی میں ڈھال لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس کہانی میں وہ اسی ہنر کو بروئے کار لائے ہیں۔ کہانی وقت کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں کاٹنے سے شروع ہوتی ہے اور جلد ہی اپنے قاری کو اس خلا کے مقابل کر دیتی ہے جس میں اس کہانی کی مرکزی کردار کا بے آبرو وجود زندہ لاش کی صورت پڑا ہوا ہے۔ ''پارینہ لمحے کا نزول'' میں جہاں تیز رفتاری سے بدلتی ہوئی انسانی صورت حال کی تصویر دکھائی گئی ہے' وہیں انسانی رشتوں میں ہونے والی شکست و ریخت کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ کہانی زندگی کے ایک نئے رُخ' نئے پہلو' نئے واقعاتی و حسی ماجرائیت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا تہذیبی وجود اور ہمارے سماج میں خاندان اور رشتوں کی روایت جدید زندگی کے جبر کو برداشت کر سکے گی؟ یہ وہ سوال ہے جو افسانہ نگار محمد حمید شاہد نے ''تکلے کا گھاؤ'' میں اٹھایا ہے۔ کہانی دیہی اور شہری زندگی میں یوں بٹی ہوئی ہے کہ دونوں اطراف کے افراد کی حسیات میں وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے۔ اس خلیج کی وسعت کو دکھانے کے لیے افسانہ نگار نے اس کہانی میں قدیم زبان' جدید رواں زبان اور نئی نسل کے ہاں آ کر بگڑ جانے والی انگریزی ملی ہوئی زبان کو استعمال کیا ہے۔ باپ کاغذ پر جھکا قدیم زبان میں کہانی لکھ رہا ہوتا ہے۔ لمحہء رواں کی کہانی کو وہ مروجہ زبان میں بیان کرتا چلا جاتا ہے اور بیٹے کی زبان سے جو شدید جملے نکلتے ہیں

اس میں تہذیبی زمین سے اکھڑنے کی پوری کہانی سمٹی ہوئی ہے۔ یہ کہانی آصف فرخی نے الحمرا کی طرف سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہونے والے انتخاب ''بہترین افسانے'' میں شامل کی تھی۔

افسانہ ''اللہ خیر کرے'' میں بظاہر ایک دعائیہ جملے کو اس کہانی کا عنوان بنایا گیا ہے مگر اس کہانی کے ذریعے انسانی بطون میں چھپی ہوئی خباثت کو بھی سامنے انڈیل کر رکھ دیا گیا تھا۔ اس خباثت کی بنیاد وہ محبت بنی ہے جو بظاہر بھلا دی گئی تھی مگر اچانک سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ محمد حمید شاہد نے اس کہانی کو کرداروں اور واقعات کے بہاؤ سے یوں آگے بڑھایا ہے کہ کرداروں کی نفسیات کا مطالعہ بھی ہوتا چلا جاتا ہے۔ متن' مناظر' کہانی کا بہاؤ اور کردار الگ الگ نہیں رہتے بل کہ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر یک جان ہو جاتے ہیں۔ ''اللہ خیر کرے'' بظاہر محبت کی تکون کی کہانی ہے لیکن در اصل یہ اس انسانی کمینگی اور خباثت کی نفسیاتی کہانی ہے جو آدمی کے اندر چھپی ہوتی ہے اور جس کا وہ خود بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا۔

افسانہ ''آٹھوں گانٹھ کمیت'' میں ایک ایسے شوہر کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنی بیوی کی بے پناہ محبت کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ وہ آٹھوں جوڑوں سے مضبوط نسلی گھوڑے کی طرح صحت مند ہے اور اندر ہی اندر اس کا جی بے وفائی کرنے کو چاہتا ہے۔ یہ افسانہ مرد کے دل میں چھپی خباثت کی کہانی ہے مگر سارے ماحول پر عورت کی محبت چھائی ہوئی ہے۔ یہ مختلف ذائقے کی کہانی ہے جو انسانی رشتوں میں شکست و ریخت کو ایک نئے رخ' نئے پہلو' نئے واقعاتی و حسی ماجرائیت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس کہانی میں بچی کھچی' ٹوٹی پھوٹی' ادھ پچدّی زندگی کو تھامنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کے منظر ہیں۔ بیوی کے گرد گھومتی اس کہانی میں کشش اور گریز کی ساری قوتیں باہم دست و گریباں دکھائی دیتی ہیں۔ کھلی ہوئی آنکھیں جب سامنے کے روح فرسا مناظر سے تھک جائیں تو پل بھر کو پلکیں موند لینے سے راحت ملتی ہے اور دوبارہ دیکھنے کی اہلیت تازہ دم ہو جاتی ہے۔

افسانہ ''پارو'' میں محمد حمید شاہد نے پوٹھوار کی فضا میں ایک نسائی کردار کی بڑی مہارت سے

تصویر کشی کی ہے۔اس میں ہمارے سماج کے توہمات'لوگوں کے سوچنے کے انداز اور عورت کی بے بسی کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ گاؤں کے منظر نامے سے طلوع ہوتی ایک ایسے مرد کی کہانی ہے جو فی الاصل نامرد تھا مگر اکھاڑے مارنے والا یہ پہلوان اس حقیقت کو مان لینے پر قادر نہ تھا۔لہذا اس نے اپنے بیل کے خصیے کچلوا ڈالے تھے۔بیل کا قصور یہ تھا کہ اس کے قریب آنے والی گائیں گابھن ہو جاتی تھیں۔ پارو کا کردار محمد حمید شاہد نے بہت محبت اور سلیقے سے تراشا ہے۔محمد حمید شاہد نے دیہی پس منظر میں تواتر سے کہانیاں لکھی ہیں۔ ایسی کہانیوں کے سرائیکی تراجم کا ایک مجموعہ ''پارو'' کے نام سے ہی سرائیکی ادبی بورڈ نے ملتان سے چھاپ رکھا ہے۔

قدیم کتاب کے موت سے منسوب نیم تصویری باب کی بڑی ترازو سے شروع ہونے والی کہانی ''کتاب الاموات سے میزان عدل کا باب'' میں ہماری قومی زندگی کا سانحہ ایک نئی معنویت پاتا ہے۔اس نئی کہانی میں بتایا گیا ہے کہ آتشیں گڑھے سے پار قائم کی گئی قدیمی میزان عدل پر جسم نہیں روحیں تلتی تھیں۔سَت دِیوتا جس نے اَپنے بھائی 'اَسر' کو قتل کیا تھا۔اور اَسر' جو قتل ہونے کے بعد پھر زندہ ہو گیا تھا اس کہانی کے دو بنیادی کردار ہیں۔کہانی میں غائب ہونے والے لوگوں اور مظلوموں کی دل خراش چیخوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور ان لاشوں کا بھی جو امن تت کے علاقے میں گرائی جاتی تھیں۔میزان عدل کے اوپر کو نکلے بانس پر بیٹھے اور شور مچانے والا وہ بندر جو اس دِیوی میں بدل گیا تھا جس کے نیچے کا بدن ڈھکا ہوا ہوتا تو اس کی زبان سچ بولتی تھی اور دیوی لباس گرا دیتی تو سارے بدن سے شہوت ٹپکتی تھی' کی علامت بھی ایک معنیاتی نظام تشکیل دیتی ہے۔ محمد حمید شاہد کا کہانی بیان کرنے کا انداز جو اس کہانی میں برتا گیا ہے حد درجہ منفرد اور اچھوتا ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں کہانی کے عصری حوالے سیدھے سبھاؤ آگے چلنے سے انکار کر دیں تو وہاں اساطیر کے بوسیدہ اوراق سے استفادہ نئی معنویت اجاگر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

محمد حمید شاہد کے افسانوں میں' اپنی زبان اور تیکنیک کے لحاظ سے ''نرمل نیر'' حد درجہ قابل ذکر افسانہ ہے۔ افسانہ نگار نے ہندی اساطیر کے آہنگ میں رکھ کر اس افسانے کو لکھتے ہوئے 'انسانی مقدر کو گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ایک طرف جَل ہی جَل ہے پوِتر جھر جھر گرتا اور دوسری طرف مدمتا ہے جو اِسی جَل میں اشنان کرتی' چھینٹیں اُڑاتی' دوڑتی پھرتی ہے۔ کہانی اس کے جگر جگر کرتی رَنس سے بنی ہوئی بگھی کی سواری سے شروع ہوتی ہے جمالیاتی منظر بناتے ہوئے اس حقیقت کو کھولتی ہے کہ آدمی کا مقدر یہی ہے کہ آنسو بہائے اور قطرہ قطرہ دَامن بھگوتا رہے۔ یہ افسانہ اپنی زبان اور تیکنیک سے ایک جمال پارہ بن گیا ہے۔

افسانہ ''معزول نسل'' کو محمد حمید شاہد نے وسیع ادراک اور گہری دردمندی سے لکھا ہے اور تیزی سے بدل جانے والے زمانے میں اس منظر نامے کو دریافت کیا ہے جو پرانی روش پر ٹھہرا ہوا ہے۔ قصہ امن پور کی دو بہنوں کی پوری زندگیوں کا احاطہ کرتا ہے اور دیہی اور شہری زندگی کے تضاد کو ابھار کر اس انسانی المیے تک جا پہنچتا ہے جس سے آج کا انسان دو چار ہے۔ بیٹیوں سے بے پناہ محبت کرنے والا نمبردار فقیر محمد' سدا کی راضی بہ رضا اس کی بیوی رضیہ اور دونوں بیٹیاں صفو اور عاشی' یہ وہ کردار ہیں جو افسانے میں نہایت سلیقے' ٹھہراؤ اور محبت سے تراشے گئے ہیں۔ مگر محبت سے تراشے گئے یہ کردار جب اپنے اپنے مقدر کی زندگی کے مقابل ہوتے ہیں تو المیہ درد کی لے ہو جاتا ہے۔

افسانہ ''ککلی کلیر دی'' میں محمد حمید شاہد نے مکالمہ کی تیکنیک کو استعمال کرتے ہوئے ہماری زندگیوں سے رخصت ہونے والی خوشیوں اور پاکیزہ جذبوں کو کہانی کی صورت میں ڈھال لیا ہے۔ محمد حمید شاہد ان موضوعات کو بھی' جو بالعموم افسانے کا موضوع نہیں ہوتے' انہیں افسانے کا موضوع بنانے کے لیے مخصوص تکنیک وضع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے میں خشک اور تنقیدی موضوعات کو انسانی زندگیوں سے جوڑ کر دیکھتے ہوئے افسانے پر تیکنیک کا نیا در

کھول لیا گیا ہے۔

کہانی ''گانٹھ'' نائن الیون کے بعد پیدا ہونے والی عالمی صورتِ حال سے جنم لیتی ہے جس میں ایک ایسے پاکستانی ڈاکٹر کی افتاد دکھائی گئی جو کئی عشروں سے امریکہ میں آباد تھا۔ اس نے اپنے وجود ہی کو نہیں بل کہ جداگانہ شناخت' تصورات' خیالات اور احساس تک کو امریکی معاشرے میں مکمل طور پر ضم کر دیا ہے۔نو ستمبر کی ناگہانی افتاد نے اس کو بھی بہت سے ہم وطنوں کی طرح شک وشبہ کے خندق میں پھینک دیا اور بالآخر اسے بھی ڈی پورٹ کر دیا گیا۔رشتے ناطے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئے ۔اس کے بیوی بچوں کا اس سے بس ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ ڈی پورٹ ہونے سے پہلے اپنی تمام دولت سے دست برداری کے کاغذات پر دستخط کر دے تا کہ وہ اس کے بعد اطمینان سے زندگی گزار سکیں۔ بظاہر یہ بھی عالمی سیاست کے تناظر میں لکھی گئی ایک کہانی نظر آتی ہے مگر غور کریں تو اس میں انسانی رشتوں کی شکست وریخت اور تہذیبی وثقافتی قدروں کی پائمالی اور نامعتبری کا المیہ دکھائی دے گا جو دنیا کی ایک مہذب ترین قوم کی مفاد پرستی کے نتیجہ میں سامنے آیا ہے۔انسانی توقیر' عالمی امن کی داعی اور تہذیبی فروغ کی دعویدار قوم جو اپنے مفاد کے حصول کے لیے طاقت کے نشہ میں شرابور کسی اخلاقی ضابطہ کی پابند نہیں۔اس کہانی میں وہ ایسی قوت بن کر سامنے آتی ہے جو حصول مقاصد کے لیے انتہائی درجہ کی پست ذہنیت' تکبر' جارحیت اور لاقانونیت کی مبلغ دکھائی دیتی ہے۔اس کہانی کو بھی محمد حمید شاہد نے نہایت احتیاط اور التزام کے ساتھ لکھا ہے اور حالات وواقعات کی تیز وتند روانی کو قابو میں رکھنے کے لیے ایسے چھوٹے چھوٹے ٹچز (touches) کے ذریعہ معنویت کے اسرار پیدا کیے ہیں جو سیدھے سادے اسلوب میں مشکل ہوتے۔ ''گانٹھ'' میں محمد حمید شاہد نے گوگول کے افسانے کی تھیم اور چیدہ چیدہ مناظر کو کہانی کے موضوعاتی فریم میں اس فنی سلیقے کے ساتھ پینٹ کیا ہے کہ یہ واقعہ اپنی تمام تر عصری صداقتوں پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہوا خیر وشر کے دائمی دیار تک جا پہنچتا ہے۔یہ صورت واقعہ ان کی وسعت

مطالعہ اور اس مطالعہ کے حاصل کا ان کے تخلیقی وجود میں حلول کر جانے کا مظہر بھی ہے۔ علاوہ ازیں یہ اس بات کی تصدیق بھی ہے کہ ہر بڑی تخلیق کا ماقبل کی بڑی تخلیقات کے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور ہوتا ہے۔

''موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ'' ایک اور کہانی ہے جو عالمی تناظر میں لکھی گئی ہے۔ اس کہانی میں افغانستان اور عراق میں رونما ہونے والے شعلے اور وحشت و بربریت کے نظارے پس منظر کا کام دے رہے ہیں۔ یہ کہانی بھی عالمی استعمار کے خلاف بلند آہنگ احتجاج ہے جس نے اجتماعی اموات کے ذریعے فرد واحد کی موت کو بھی بے توقیر اور غیر اہم بنا دیا ہے۔ محمد حمید شاہد انسانی رشتوں کی عجیب سفاکی کو کہانی کا موضوع بناتا ہے۔ نائن الیون کے پس منظر میں لکھی گئی اس کہانی یا اس موضوع کی دوسری کہانیوں میں ہمیں مقامی طور پر لوگوں کو جبر کا شکار بنانے والے وہ بوزنے نظر آتے ہیں جو کہیں دور بیٹھے اصل کرداروں کی نقل کر رہے ہیں اور یہ نقل بھی کافی بھونڈی ہے۔

''ناہنجار'' ایسی کہانی ہے جسے محمد حمید شاہد نے دو بار لکھا۔ پہلے یہ کہانی پنجابی میں لکھی گئی اور رسالہ ''رہاب'' بورے والا میں ''کلموہنا'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کہانی کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے کہانی کا ہلکا پھلکا اور سیدھا سادا بیانیہ بحال رکھا گیا ہے۔ انسانی بطون میں جھانکنا اور اس کی تلچھٹ سے جذبوں، سوچوں اور نیتیوں کو نتھار لانا محمد حمید شاہد کی فکشن کا ایک وصف خاص ہے۔ یہ کہانی اسی رجحان کی نمائندہ ہے۔

ہمارے یہاں دفتری زندگی کے بارے میں بہت کم کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ اس موضوع پر قدرت اللہ شہاب، منیر احمد شیخ اور وقار بن الہٰی کے بعد محمد حمید شاہد کی کہانیاں قابل توجہ ہیں۔ ان کی کہانی ''ادارہ اور آدمی'' اس کی ایک عمدہ اور بھرپور مثال ہے۔ اس کہانی میں عالمی معاشی صورت حال کے سامنے انسان کی بے بسی کو پیش کیا گیا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے گنٹر گراس کے

اس بیان کو کہانی کی بنیاد بنایا ہے کہ ''جب کوئی ادارہ یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ دو سو نوکریاں چھانٹ رہا ہے تو اس کے حصص کی قیمت جست لگا کر بڑھ جاتی ہے۔ یہ دیوانگی ہے''۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا آج کا معاشرہ انسانیت کش اقدامات کر کے ذاتی فائدے کے لیے دوسرے انسانوں کی گردنیں مارنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس افسانے کی زبان دفتری قسم کی ہے مگر افسانہ نگار نے اسے تخلیقی زبان بنا دیا ہے۔

دفتری موضوع پر لکھی گئی محمد حمید شاہد کی ایک اور کہانی ''واپسی'' ہے جس میں انسانی رشتوں کی نزاکتوں کا بیان بھی در آیا ہے۔ اس کہانی میں فضل احمد اور مریاں جیسے کرداروں کی تشکیل میں جس گہرے مشاہدے اور ہنر سے کام لیا گیا ہے اس نے انہیں فکشن کے زندہ کردار بنا دیا ہے۔

''بھرکس کہانیوں کا اندوختہ آدمی'' افسانے کی اشاعت جب ''نقاط'' فیصل آباد میں ہوئی تو افسانہ نگار نے اسے ''نا کہانی'' قرار دیا۔ یہ کہانی فن اور فن کار کے درمیان رشتوں کے کھوج سے شروع ہوتی ہے اور اپنا موضوعاتی کینوس وسیع کرتے ہوئے مشرقی اور مغربی زندگی میں رشتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کو اپنے اندر سمیٹ کر ایک نئی معنویت کا در باز کر دیتی ہے۔ یہ کہانی ایسے آدمیوں کا المیہ بیان کرتی ہے جو دیارِ غیر میں اپنے اپنے خاندانوں کو سنوارنے کے لیے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ یہاں تک کہ وہاں کی تیز رفتار زندگی نے انہیں تنہا کر دیا۔ محمد حمید شاہد کی اس کہانی نے مغرب میں بس کر سب کچھ حاصل کر چکے آدمی کے اند بوسیدہ جذبوں سے زندگی کی امنگ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ یوں ایک 'نا کہانی' انسانی نفسیات کی سچی کہانی بن گئی ہے۔

''جنریشن گیپ'' جیسا اس کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ دو نسلوں کے ٹکراؤ اور کشمکش کی کہانی ہے۔ پہلی نسل اپنی مٹی، تہذیب اور روایات سے جڑی ہوئی ہے، وہ کھیتوں میں محبت اگاتے ہیں، وہ زمین کو اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں اور مویشیوں سے بھی اولاد کی طرح محبت کرتے ہیں۔ نئی نسل زمین سے تعلق توڑ کر بلندی میں پرواز کرنا چاہتی ہے اور بلندی میں یہ خرابی ہے کہ جوں جوں بڑھتی جاتی ہے زمین کی چیزیں اتنی ہی حقیر اور چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ موضوع اگرچہ نیا

نہیں لیکن دلکش اسلوب بیان اور لفظیات نے اسے نیا ذائقہ بخشا ہے اور زمین سے جڑی ہوئی معاشرت اپنی ساری محبتوں اور مہکاروں کے ساتھ اس کہانی میں اجاگر ہوئی ہے۔

''اپنا سکہ'' جدید حسیت کی حامل اور دلربا اسلوب کی حامل کہانی ہے۔ مختلف اساطیری روایتوں اور حوالوں نے اس کی معنویت اور تاثر کو گہرا کر دیا ہے۔ ''اپنا سکہ'' کے اعلیٰ حضرت کو چونکہ مال و دولت اور اولاد کے فتنے نے بوکھلا کر رکھ دیا ہے لہذا وہ ترک علائق کا راستہ اپنانے پر مجبور ہیں۔ ایک ہجوم ہے جو ان کے ملفوظات کو سمیٹنے کے لیے بے تاب ہے مگر ان کے بیٹے اپنے باپ کی محبت میں نہیں' بل کہ رائے عامہ کے خوف سے انہیں گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت ایسے معاشرے اور ایسے گھر جانے سے انکار کر دیتے ہیں جہاں ریاکاری' منافقت اور میکانکی کاروباریت سکہ رائج الوقت ہے۔ انہیں اپنا وہی سکہ عزیز ہے جو اساطیر الاولین سے برآمد ہونے والی ابدی صداقتوں میں ڈھالا گیا ہے۔ یہ کہانی دراصل عصریت اور ابدیت کے درمیان جاری مکالمہ کا درجہ رکھتی ہے۔

''آخری صفحہ کی تحریر'' آدمی کی سرشت کی کہانی ہے۔ ایک ایسے قتل کی کہانی جو آدمی کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ اس مقدر کا جبر ہے جو وہ اپنا وجود کاٹ دینے پر مجبور ہے۔ یہ ایک علامتی کہانی ہے' جو مزاحمت کے شدید جذبے سے پھوٹی ہے۔ یہ کہانی مزاحمتی ادب کے اس انتخاب میں شامل ہے جو اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا ہے۔

''کفن کہانی'' محمد حمید شاہد کی ان کہانیوں میں شامل ہے جن کی تکنیک اور موضوع کی وسعت قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ اس کہانی کا بیانیہ سپاٹ نہیں، بہت تہہ دار اور پیچیدہ ہے۔ پنجاب کی لوک روایات کے ساتھ ساتھ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی غربت' ناانصافی' سماجی پس ماندگی کا بیان' گویا اس کہانی کے ذریعہ افسانہ نگار نے انسانی باطن میں جھانکنے کی سعی کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔

افسانہ ''دوسرا آدمی'' میں بتایا گیا ہے کہ آدمی وہ نہیں ہوتا جو بظاہر دکھائی دیتا ہے یا وہ جیسا

نظر آنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اصل آدمی تو کہیں اندر چھپا ہوتا ہے اور ایک روز اچانک تہذیبی پوست پھاڑ کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کہانی کے مرکزی کردار کے ساتھ سفر کرنے والا حلیم آدمی جب سفر مکمل ہونے پر جھولتا ہوا ایک طرف چل پڑتا ہے تو اس کے اندر کا کمینہ آدمی قاری کے اندر گھس جاتا ہے۔

''ماخوذ تاثر کی کہانی'' ایک ایسے معاشرے کی جھلک پیش کرتی ہے جہاں لمبی تھوتھنیوں والے اپنی جون بدل کر انسانی بستی میں جا پہنچے ہیں۔ روز کسی پر شب خون مارتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہاں صرف وہ رہ جاتے ہیں جو اپنی جون میں نہیں ہیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ کتوں 'چوہوں اور سانپوں کی اس بستی میں ایک مجذوب آنکلتا ہے اور افسانے کے مرکزی کردار سے مکالمہ کرتے ہوئے اسے ایک روحانی تجربے سے گزارتا ہے۔ بے شک ہوس کی راہوں پر سرپٹ دوڑتے ہوئے افراد کی تمام بیماریوں کا علاج بے ریا محبت سے ہی ممکن ہے۔ محبت کا آب حیات ہی اس معاشرے کی مخلوق کو آدمی کی جون میں واپس لاسکتا ہے۔ محمد حمید شاہد نے اس افسانے میں ایک تخلیق کار کے کرب اور سماج' خاندان کے خلاف اس کی جدوجہد اور بے بسی کو پیش کیا ہے ۔ حالات کی جبریت کو توڑنے کا سب سے بہتر ذریعہ ''تخلیق'' ہے۔ ہر نئی تخلیق اس بات کا اعلامیہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے اردگرد موجود حالات کی جکڑ بندی کو توڑ سکتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار کی ساری زندگی اپنے خاندان کی ضروریات پورا کرنے کے عمل کی نذر ہو جاتی ہے یوں تخلیق کار دہرے کرب سے گزرتا ہے۔ یہ وجودی کرب تخلیق کار کو بری طرح پیس کر رکھ دیتا ہے۔

ہم نے محمد حمید شاہد کے افسانوں کے بارے میں جستہ جستہ اظہار خیال کیا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ دوسرے مقتدر اہل قلم ان کے افسانوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

ڈاکٹر شفیق انجم' جو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں استاد ہیں' اپنی تصنیف ''اُردو افسانہ'' میں لکھتے ہیں: ''حمید شاہد کے افسانوں میں تفکر' تجسس اور تاثر مل کر یک رنگ ہو جاتے ہیں...... ''جنم جہنم'' اور ''مرگ زار'' کے افسانوں میں علامتی تہہ داری موجود ہونے کے باوجود

بیانیہ کو اولیت حاصل ہے۔ ان کی علامتیں زیادہ تر لوک داستانوں، اساطیر، مذہبی قصوں اور مظاہر فطرت سے متعلق ہیں۔ ان کے افسانوں کی انفرادی جہت وہ ذہنی و روحانی سفر ہے جو مختلف ابعاد میں پھیل پھیل کر اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عمل میں حمید شاہد کہانی کا تانا بانا تیار کرتے ہیں، جو لفظیات استعمال کرتے ہیں اور جملوں کی دروبست میں جو التزام رکھتے ہیں وہ ان کے جمالیاتی و وجدانی جڑاؤ کو کہانی کی متنی سطح تک لے آتے ہیں۔ حمید شاہد زندگی کی تلخ حقیقتوں کے اظہار میں اور تجسس و حیرانی کی نئی دنیاؤں کے انکشاف میں جذباتی نہیں ہوتے بل کہ ایک باوقار سنجیدگی اور متانت ہمہ دم رکھتے ہیں اور میرے خیال میں یہی پہلو اس فن کار کی جدید افسانہ نگاروں میں انفرادیت کا بڑا حوالہ ہے۔''

معروف نقاد پروفیسر فتح محمد ملک، صدر نشین مقتدرہ قومی زبان نے محمد حمید شاہد کے افسانوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شہروں میں بسر کرنے کے باوجود محمد حمید شاہد کے اندر وہ دہقان بچہ زندہ ہے جس کی سادہ و معصوم دنیا میں چرند پرند اور آدم زاد ایک ہی کنبے کے افراد ہیں۔ مظاہر کی کثرت میں وجود کی وحدت کا روحانی احساس جس تحیر اور تجسس کو جنم دیتا ہے اس نے شاہد کو ہندوستانی اور یونانی اساطیر کی تیرہ و تار دنیا کی خاک چھاننے اور پھر ظلمات سے نکل کر صحف سماوی کی نور علیٰ نور فضا میں پہنچ کر معصیت اور معصومیت کے اسرار سمجھنے پر اکسایا ہے۔''

ڈاکٹر انوار احمد، جو فکشن کے ایک مقتدر نقاد ہیں، اپنی تصنیف ''اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ'' میں محمد حمید شاہد کے اسلوب کی انفرادیت کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ایک طرف سرئیلسٹک انداز بیان...... اور دوسری طرف وہ بیانیہ اسلوب...... جس میں علامتی و تمثیلی اجزایوں شامل ہیں کہ روایتی اسلوب سے جڑاؤ کے ساتھ، افسانہ نگار کی الگ شناخت بھی متعین کرتے ہیں''۔

بھارت کے معروف افسانہ نگار اور ناول نگار مشرف عالم ذوقی نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ''آئندہ'' کراچی میں کہا ہے کہ ''سورگ میں سور'' جیسی کہانیوں کے خالق محمد حمید شاہد آج پاکستان

کی نئی کہانی کا ایک ایسا ناقابل فراموش چہرہ بن چکا ہے، جس کی کہانیوں میں 'آج' کے 'گملے' میں اُگے ہوئے نوکیلے کانٹے صاف نظر آجاتے ہیں۔ اپنے گھر، اڑوس پڑوس، ارندھتی رائے کی شہرۂ آفاق تصنیف 'دی گاڈ آف اسمول تھینگس' کی طرح حمید شاہد ان کانٹوں کی تلاش میں باہر نہیں جاتے، وہ عالمی پیمانے پر بُنی جارہی دہشت پسندی کو اپنے آس پاس ہی تلاش کر لیتے ہیں۔ 'مرگ زار' اور دوسری کہانیاں اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

معروف محقق اور نقاد سید مظہر جمیل نے اپنے مضمون ''مطبوعہ آفاق'' راولپنڈی میں لکھا ہے کہ 'محمد حمید شاہد واردات و ماجرائیت کا کہانی کار نہیں ہیں۔ کسی واقعے اور حادثے کی رپورٹنگ ان کا منصب نہیں ہے۔ وہ تو واقعات وحوادث اور افتاد و گداز سے پیدا ہونے والی حسی لہروں کو اپنے تجربے کے انٹینا کی مدد سے اپنے احساس میں جذب کر لیتے ہیں اور پھر انہیں تخلیقی طور پر تصویروں کی صورت میں نشر کر دیتے ہیں۔ کہیں یہ تصویریں اپنے منظر، پس منظر کے ساتھ رواں دواں دکھائی دیتی ہیں اور کہیں وہ ان کے التباس اور پرچھائیوں سے فضا سازی کا کام انجام دیتے ہیں کہ حقیقت اور علامت نگاری بھی حمید شاہد کی فنی دسترس سے باہر نہیں رہے ہیں۔

محمد سلیم الرحمن فکشن، نظم اور اپنے تراجم کے سبب ادبی حلقوں میں احترام سے دیکھے جاتے ہیں انہوں نے اپنے ایک انگریزی کالم مطبوعہ ''فرائیڈے ٹائمز'' لاہور میں ''مرگ زار'' کے حوالے سے لکھا: گو کہ یہ حمید شاہد کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ شاہد کا بنیادی وظیفہ یہ رہا ہے کہ اپنے اردگرد پھوٹ پڑنے والے فساد اور انہدام کو فکشن کا حصہ بنانے کے لیے مناسب ادبی جمالیات کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

بھارت کے معروف ادیب اور ''انتخاب'' گیا کے مدیر نے اپنے مضمون ''بیان اپنا'' میں محمد حمید شاہد کو پاکستان کے جدید معتبر افسانہ نگاروں میں یوں اہم گردانا ہے کہ بقول ان کے ''اسلوب' مواد و موضوع' فکر و دانش' اور معاشرتی زندگی کو نئے انداز نظر سے دیکھنے کے حوالے سے حمید شاہد کی طرف لوگوں نے توجہ دی ہے۔ اردو افسانے کی نئی تاریخ میں اپنے دستخط رقم کرنے والے فن

کار محمد حمید شاہد کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ صرف ایک فن کار کا نہیں ہے بل کہ اس کے ذریعہ نئے اردو افسانے کی سمت و رفتار کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے کئی افسانے نئے حالات میں نئے Ethics کی تشکیل پر اصرار کرتے ہیں۔ حمید شاہد تکنیک کے کئی تجربات کر کے اردو افسانے کے بیانیہ میں تخلیقی ابعاد پیدا کر رہے ہیں۔ ہشت پہلو معنویت کے ساتھ وہ اپنے تہذیبی ورثے کے فکری اور اخلاقی ذخیروں تک پہنچنا چاہتے ہیں اس لیے کہ ان کے یہاں فن کار فن پارے سے ذرا دور دور رہتا ہے۔ ایک نئے انداز کی Objectivity ہی جو حمید شاہد کے یہاں ابھر رہی ہے اور جو فن اور فن پارے کے نئے باہمی رشتے کی اشارہ نما ہے''۔

''شب خون'' جیسے ادبی تاریخ رکھنے والے جریدے کے مدیر' معروف نقاد اور فکشن نگار شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مضمون ''دکھ کا دیباچہ' مطبوعہ ''سبق اردو'' بھدوہی بھارت' میں لکھا ہے کہ'' محمد حمید شاہد نہایت ذی ہوش اور حساس قصہ گو معلوم ہوتے ہیں۔ بظاہر پیچیدگی کے باوجود ان کے بیانیہ کا وصف یہ ہے کہ ہم قصہ گو سے دور نہیں ہوتے' حالانکہ جدید افسانے میں افسانہ نگار بالکل تنہا اپنی بات کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ محمد حمید شاہد کی دوسری بڑی صفت ان کے موضوعات کا تنوع ہے۔ اسے محمد حمید شاہد کی کی بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہیے کہ وہ ایسے موضوع کو بھی بیانیہ میں بے تکلف لے آتے ہیں جس کے بارے میں زیادہ تر افسانہ نگار گومگو میں مبتلا ہوں گے کہ فکشن کی سطح پر اس سے کیا معاملہ کیا جائے۔''

اپنی اس گفتگو کا اختتام میں معروف افسانہ نگار محمد منشا یاد کے اس اس اقتباس پر کرنا چاہوں گا جو دراصل اس گفتگو کا حصہ ہے جو ''تخلیقی عمل: ایک مکالمہ'' کے تحت کی گئی اور جو محمد حمید شاہد کی تصنیف ''اردو افسانہ: صورت و معنیٰ'' میں شامل ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''محمد حمید شاہد کے فنِ افسانہ نگاری کی اہم خوبی ہے کہ وہ کسی ایک خاص ڈکشن کے اسیر نہیں ہوئے اور صاحبِ اسلوب بننے کی کوشش میں خود کو محدود نہیں کیا۔ صاحبِ اسلوب اور صاحبِ طرز کہلانے کی خواہش نے اچھے اچھوں کو ضائع کر دیا۔ کوئی موضوع یا مواد خواہ کتنا ہی قیمتی ہوتا اگر ان کے پہلے سے بنائے گئے فنی

سانچے میں فٹ نہ ہوتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے مگر اپنے اسلوب میں لچک برداشت نہ کرتے۔ انہیں کہانی سے زیادہ اسلوب عزیز ہوتا۔ مگر حمید شاہد کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ خیال، مواد اور موضوع کے ساتھ تکنیک اور اسلوب میں ضرورت کے مطابق تبدیلی پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ ہر رنگ کی کہانی لکھنے پر قادر ہیں۔ ان کی کہانیاں زمین سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں، اپنی تہذیب، ثقافت اور اقدار کی خوشبو لیے ہوئے اور افسانے کی روایت سے گہرا رشتہ رکھتے ہوئے لیکن تازگی اور ندرت کی حامل اور ایسی پر اثر کہ پڑھ لیں تو پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اندر حلول کر جاتی ہیں۔ خون میں شامل ہو جاتی ہیں۔''

''بند آنکھوں سے پرے'' سے ''جنم جہنم'' اور ''مرگ زار'' سے اب تک کے دیگر افسانوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ محمد حمید شاہد خود ایک مکمل Galaxy ہیں- وہ اپنے آپ کو کہیں دہراتے نہیں۔ ان کے ہر افسانے کی اپنی ایک الگ نوعیت اور شناخت ہے۔ محمد حمید شاہد کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے' دنیا سے متعلق ہمارے سابق یا بھولے بسرے علم کا احیا ہی نہیں ہوتا' بل کہ ہمیں باہر کی دنیا کا نیا ادراک حاصل ہوتا ہے' یعنی ہم محض باز یافت ہی نہیں کرتے بل کہ نئی یافت سے ہم کنار بھی ہوتے ہیں۔ بقول مبین مرزا فکشن محمد حمید شاہد کا مشغلہ نہیں بل کہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ فن سے سچی اور کھری وابستگی نے افسانہ نگار کو ایک ایسی راہ پر گامزن کر دیا ہے جہاں خارجی حقیقت نگاری اور باطنی صداقت پسندی مل کر ایک ہوگئی ہیں۔ انسانی زندگی کا المیہ ہو یا سیاسی وسماجی حالات کا دھارا' محبت کے کومل جذبے ہوں یا رشتوں کی مہک' ریاستی گروہی جبر ہو یا عالمی دہشت گردی یا پھر تہذیبی حوالوں کو نگلتی بازاری ثقافت' محمد حمید شاہد کا قلم یکساں روانی اور تخلیقی وقار کے ساتھ سب کو سمیٹتا چلا جاتا ہے۔

فن کار کا ایک منصب یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تخلیق کو انسانی فطرت سے ہم آہنگ کرے۔ محمد حمید شاہد نے اپنے بیانیے کو ایک سے زائد سطحوں پر یوں متحرک کر لیا ہے کہ وہ مطلق طور پر انسانی آہنگ میں ڈھل گیا ہے۔ اسی لیے تو احمد ندیم قاسمی کو کہنا پڑا کہ ''محمد حمید شاہد کے افسانوں کا

ایک ایک کردار، ایک ایک لاکھ انسانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔'' خود شعوریت سے جہاں افسانہ نگار نے متن در متن یعنی Frame Narrative کی صورت گری کی ہے وہاں انہوں نے اپنے افسانوں کو ایک نئی قسم کی حقیقت نگاری کی راہ بھی سجھادی ہے۔ محمد حمید شاہد کے ہاں نوحقیقت پسندی کے حوالے سے عمدہ مثال بن جانے والے افسانوں میں ''برف کا گھونسلا'' ''برشور'' ''لوتھ'' تکلے کا گھاؤ'' ''ملبا سانس لیتا ہے'' ''موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ'' ''جنم جہنم'' ''چٹا کا شاخ اشتہا کا'' ''آدمی کا بکھراؤ'' ''پارہ دوز'' اور ''مرگ زار'' جیسے افسانے شامل ہیں۔ واضح رہے کہ بقول ناصر عباس نیر، محمد حمید شاہد کی نوحقیقت پسندی دراصل زندگی پر غیر مشروط مگر کلی نظر ڈالنے سے عبارت ہے اور یہ اس توازن کو بحال کرتی ہے جسے جدیدیت پسندوں کی نافہمی اور ترقی پسندوں کی انتہا پسندانہ روشوں نے پامال کر دیا تھا۔ محمد حمید شاہد کے افسانے ''سورگ میں سور'' ''گانٹھ'' اور مرگ زار'' نہ صرف پاکستان اور اردو ادب کے شاہکار تسلیم کیے جائیں گے بل کہ آنے والے عہد کا نقاد انہیں گوگول کے ''Dead Souls'' اور Boccaccio (بوکیچو) کی ''Decameron'' اور ہیگل کی ''Logic'' کی طرح ادب عالیہ میں شمار کرے گا۔

ڈاکٹر توصیف تبسم

اسلام آباد: جون ۲۰۰۸

سورگ میں سور

جب سے تھوتھنیوں والے آئے ہیں، دکھ موت کی اَذِیّت سے بھی شدید اور سفاک ہو گئے ہیں۔

تاہم ایک زمانہ تھا...... اور وہ زمانہ بھی کیا خوب تھا کہ ہم دُکھ کے شدید تجربے سے زِندگی کی لذّت کشید کیا کرتے۔ اس لذّت کا لپکا اور چسکا ایسا تھا کہ خالی بکھیوں کے بھاڑ میں بھوک کے بھڑ بھونجے چھولے تڑتڑاتے بھنتے رہتے مگر ہم حیات افروز لطف سے سرشار ہوتے تھے۔ بجا کہ ہم بے بسی کے مقابل رہتے تھے لیکن ہمیں اَپنی بے بسی کا اس شدت سے احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہمت بندھی رہتی اور ہم موت کا مقابلہ بھرپور زِندگی کے دلنواز حوصلے سے کرتے تھے۔

وہ پھڑکی والا سال بھلا کوئی کیسے بھول پائے گا کہ جس میں بیتلیں، کجلیاں، کموریاں اور ناچیاں ایک ایک کر کے موت کی اوڑھ لے رہی تھیں، بہ ظاہر قدرے سخت جان نظر آنے والی بربری نسل کی ٹیڈی ٹھگنیاں بھی اسی موت کی وادی میں کودنے کے بہانے تلاش کرنے لگی

تھیں......تب جس طرح ہم نے اپنے ڈوبتے دلوں پر قابو پایا تھا وہ کچھ ہم ہی جانتے تھے۔اسی برس چھوٹی پتلی دُم اور بڑے حوانے والی وہ سرخ بیتل' کہ جسے ہم سب رَتی کہتے تھے'پھڑ کی سے پھَڑک گئی تھی اور کچھ ہی گھنٹوں کے اندر اندر موٹے سینگوں والی چتری' لٹکے ہوئے کانوں والی بھوری اور تکون جیسے تھنوں والی لنگڑی پل کی پل میں بے سُدھ ہوگئی تھیں۔ تب ہم پے درپے صدمات کے کلگتے تیل میں تلتے تھے مگر ہماری روحوں پر حیاتی اپنے من موہنے پھولوں کی کلیاں بناتی تھی۔ ایسے میں آوازوں کا میلہ سا لگ جاتا......اوئے فضلو! دیکھ اس نمانی کا پنڈا گرم ہے اسے اُدھر لے جا......اوئے شریفے وہاں چتری ماں کو کیوں ٹوہے جاتا ہے ادھر آ اور اس بگّی کے کُھروں کو دیکھ'ان کے اندر ورم آ گئے ہیں۔ میرو'نظاماں' خیرا' شوقی' ناماں' چھوٹی......ہم سب بھاگ بھاگ کر ایک ایک کے پاس پہنچتے تھے' ہر ایک کا منھ کھول کھول کر دیکھتے' بدن ٹٹولتے' حوانے ٹوہ کر اندازے لگاتے' ٹانگیں دہری کر کے کھروں کو کریدتے' دُمیں اُٹھاتے اور اُنگلیاں گھسیڑ گھسیڑ کر موت کی اُن علامتوں کو بھی تلاش کرلیا کرتے تھے جو بہ ظاہر نظر نہ آتی تھیں......

پھڑکی کی نشانیاں ہمیں کبھی نہ ملتیں...... اِس موذی مرض کی علامتیں ہیں بھی کیا' ہم کبھی نہجان پائے ......جب تک اندازے اس طرف جاتے پھڑکی اپنا وار چل چکی ہوتی اور ہم پھڑ کنے والی کو چھوڑ دوسریوں کو بچانے میں لگ جاتے تھے۔جس کا تھوڑا سا جثہ گرم ہوتا' جس کے اُٹھے کان ڈھلکنے لگتے یا پھر جو دانتوں کو باہم پیس رہی ہوتی' ہم اُسے الگ کر دیا کرتے تھے۔اُس برس ہمیں پھڑکی کی موتوں نے لتاڑ کر رکھ دیا تھا......مگر ہم اُس برس بھی اتنے بے بس نہیں ہوئے تھے جتنا کہ بعد میں تھوتھنیوں والوں کے سبب ہو گئے تھے۔

پہلے بے بسی ضرور تھی لیکن ہمت ہی ٹوٹ جائے ایسی لاچاری اور بے کسی نہ تھی۔ نہ پھڑکی والے سال نہ ہی آنے والے برسوں میں......ہم کوئی نہ کوئی سبیل کر ہی لیا کرتے تھے۔ جب بکریوں میں سے کسی کی چال بگڑ جاتی اور اگلے دن پہلے سے بھی زیادہ لنگڑانے لگتی' کوئی اپنے کُھر

زمین پر جُھٹک جھٹک کر مارتی یا کسی کا بدن ڈھلکنے لگتا' کسی کے منھ میں سفید سفید چھالے نکل آتے یا تھنوں کے سفید دانے پھٹ کر سرخ ہو جاتے' کسی کے منھ سے جھاگ اور رالیں بہنے لگتیں یا کسی کے حوانے کے غدود سوج جاتے' دودھ کم نکلتا یا پھر دودھ کی پھٹکیاں بن جاتیں' منھ اور آنکھوں کی جھلیاں زرد ہونے لگتیں یا پھر ناک منھ اور پیچھے سے لیس دار مادہ نکلنے لگتا' کسی کا پھل گر جاتا یا اُن میں سے کسی کا پہلا میمنا اگلی ٹانگوں کے بہ جائے پہلے پیچھا نکالنے لگتا' کوئی سوئے کی پیڑوں سے چیخے جاتی یا جھلی پھٹ جاتی اور ہم ترکیبیں کر کر کے پھل چھوڑنے میں مدد دے رہے ہوتے یا ترو ہنے والی کی زِندگی بڑہانے کے کیکھن کر رہے ہوتے تو ہمیں دُکھ' موت اور زِندگی دونوں کے مقابل کرتا تھا۔ مرنے والیاں مرجاتیں ...... جنہیں زندہ رہنا ہوتا تھا اُنہیں ہم بچا لیتے تھے۔ اکثر بہت زیادہ نقصان ہو جاتا...... اتنا زیادہ کہ ہماری کمریں ٹوٹ جاتیں مگر یہی تو ہماری زِندگی تھی...... ہمیں یاد رہتا تھا کہ کس سال پھڑکی کا حملہ ہوا تھا' کب منھ کُھر آیا' گل گھوٹو اور ماتا نے کب پھیرا ڈالا تھا' چاندنی سے چشمک کب ہوئی تھی' سنگ رھنی کے سبب کس کس نے چرنا چگنا چھوڑ دیا تھا' کسے خارش ہوئی تھی' کون نمونئے سے مری تھی' کِس کے پھیپھڑوں میں کِرم پڑ گئے تھے اور ناک مکّھی نے کسے اوندھایا تھا۔

سردیوں کی یخ بستہ راتیں ہوتیں یا گرمیوں کی کھڑی دو پہریں' ہم ایک ایک لمحے کو...... ایک ایک واقعے کو...... اور ہر ایک متاثر ہونے والی یا مر جانے والی کو یاد کرتے تھے...... اور اسی موت کے کھیل میں سے زِندگی کا چھچھا بر آمد ہو جایا کرتا تھا۔

یہ ٹھیک سے بتانا تو بہت مشکل ہے کہ بکریوں کے یہ اَجڑ اور ہم کب سے ساتھ ساتھ تھے تاہم چٹے دودھ جیسی اجلی داڑھی اور نورانی چہرے والے بابا جی' جنہیں ہمیشہ بکریوں کے اجڑ کے درمیاں لرزتے ہاتھوں میں اپنی کمر جیسا خم لیتی لاٹھی کے ساتھ ہی دیکھا گیا تھا' نے بتایا تھا کہ ہمارے گاؤں سورگ کی زمین اور ہمارے بدنوں کی مٹی کے اجزاء کا مطالبہ ہی یہی تھا کہ ہم اس

پاک فریضے میں مشغول رہتے۔ باباجی کا وجود اور ان کی باتیں ہمیں ایمان جیسی لگا کرتی تھیں لیکن جب انہوں نے یہ بتایا تھا تو اس وقت تک ہم خاصے ہوشمند ہو چکے تھے لہذا ہمیں پاک فریضے کے لفظوں نے چونکا دیا تھا اور ہم میں سے کئی ایک نے دہرایا تھا:

''باباجی پاک فریضہ؟......''

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا:

''اُچیاں شاناں والے کے صدقے یہ دھندا پاک فریضہ ہی تو ہے''

پھر اُن کی آنکھیں محبت کے پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں نہاں عقیدت کی کپکپاہٹ اور لرزتی اُنگلیوں کی ساری پوروں کو باہم ملا کر خیال ہی خیال میں بوسہ لیتے ہونٹوں پر تھراتی سسکاری کو چھولیا اور ہم سے یوں بے نیاز ہو گئے کہ اُن کی چھاتی کے اندر گونجتی آواز ہم تک پہنچنے لگی تھی۔

باباجی کے چل بسنے کے بعد ہم مونگ پھلی کی کاشت کی طرف راغب ہو گئے۔

یہ لگ بھگ وہی برس بنتا ہے جب اُدھر کی ایک بڑی بادشاہی میں ایک مونگ پھلی والے کو حکمرانی مل گئی تھی۔ یہ بات ہمیں شہر سے آنے والے بیوپاریوں نے بتائی تھی۔ اُنہوں نے ہمیں اُدھار بیج دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ مونگ پھلی تو سونے کی ڈلی ہوتی ہے۔ اُس سال ہم نے بے دلی سے تھوڑا سا بیج زمین میں دبا دیا تھا اور باقی بھون کر مزے لے لے کر گڑ کے ساتھ کھا گئے تھے ......تاہم جب فصل تیار ہوئی اور کھڑی فصل کا سودا کرنے بیوپاری پہنچ گئے تو ہمیں مونگ پھلی واقعی سونے کی ڈلی جیسی لگنے لگی تھی۔

سورگ کی زمین کی دو روپ تھے ...... اوپر کے جنوب مشرقی حصے کی ساری زمین ریتلی تھی، ہم اُسے اُتاڑ کہتے۔ اُتاڑ کی زمین ایسی ریتلی بھی نہ تھی کہ مٹھی میں بھریں تو ذرّے پھسلنے لگیں......ریتلی میرا کہ لیں......مگر اُسے میرا یوں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بارش کا جھبڑا پڑتا تو پانی

سیدھا اُس کے اندر اُتر جاتا' اوپری تہوں میں ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ کئی دھوپیں جو لگاتار پڑ جاتیں تو وتر کا نشان تک نہ ملتا۔ نیچے شمال مغربی حصے کی زمین رکڑ تھی......رکڑ بھی نہیں' شاید پتھریلی کہنا مناسب ہوگا......پتھریلی اور کھردری۔ اس پر بھی پانی نہ ٹھہرتا' فوراً پھسل کر گاؤں کو دولخت کرتے نمیلی کَس میں جا پڑتا تھا۔ اس حصے کے ڈھلوانی علاقوں میں کہیں کہیں ایسے ٹکڑے تھے جن میں وَتر ٹھہر جاتا تھا اور زمیں بیج بھی قبول کر لیتی تھی۔ ایسے قطعات اتنا اناج اور چارا اُگا ہی لیتے تھے کہ گاؤں والوں کے معدوں میں بھڑکتی آگ کے شعلے بجھتے تو نہ تھے تاہم مدہم ضرور پڑ جاتے ...... اور لہاریاں بھی بھوکی نہ رہتی تھیں۔

سارے اُتاڑ میں بکریاں خوب چرتی تھیں۔ یہاں ہر نسل اور ہر مزاج کی بکریوں کی بھوک مٹانے اور اُن کے بدنوں کو فربہ بنانے کا سامان موجود تھا۔ اپنے کھروں کو درختوں کے تنوں پر جما کر اوپر کی شاخوں سے رزق نوچنے والیوں کے لیے لذت بھرے پتوں والے مختلف النوع درختوں کے جھنڈ تھے' تھوڑا سا گردن کو خم دے کر چرے جانے اور آگے ہی آگے بڑھے جانے والیوں کے لیے جھاڑیاں اور بیلیں تھیں۔ بچھی ہوئی اور پھیلتی ہوئی نرم و شیریں گھاس بھی ہر کہیں تھی کہ جسے بربریاں شوق سے کھاتیں اور اپنی نسل تیزی سے بڑھاتی تھیں .... مگر جس تیزی سے تھوتھنیوں والے پلیدوں نے نسل بڑھائی تھی اُس نے سورگ والوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔

اُتاڑ سے پرے اُدھر جہاں ہموار زمین پر سرکاری رَکھ تھی' تھوتھنیوں والے وہاں سے غول در غول آتے تھے اور ہماری زمینوں پر تباہی مچا کر واپس رَکھ میں جا چھپتے تھے۔ جب تک بکریاں ہمارے التفات کا محور رہیں' تباہی مچا کر چھپ جانے والوں کی تعداد بھی محدود رہی...... یا پھر ...... شاید اُن کا پھیرا ہی اِدھر کم کم لگتا ہوگا۔ تاہم ہم احتیاط بھی تو کیا کرتے تھے...... بیری' کنیر اور کیکر کے درختوں کی خاردار ٹہنیوں کے چھاپوں کی کھتیاں جوڑ کر ہم بکریوں کے باڑوں کو

چاروں طرف سے محفوظ بنا لیا کرتے تھے۔ جب کبھی تھوتھنیوں والے ادھر آ نکلتے اور اُپنی تھو تھنیوں کو ان چھاپوں پر مارتے تو کانٹوں کی چبھن اُنہیں اُلٹا بھاگنے پر مجبور کر دیتی تھی ...... لیکن جب ہمیں مونگ پھلی کی فصل نے لگ بھگ بکریوں سے غافل ہی کر دیا تو وہ اندر تک گھس آتے۔ اُن کی تعداد اِس قدر بڑھ چکی تھی کہ ناچار ہم سورگ والوں کو اُنہیں بھگانے کے لیے پالتو کتوں کی تعداد بڑھا دینا پڑی تھی۔

یوں نہیں تھا کہ پہلے سورگ والے کتے نہیں رکھتے تھے...... گاؤں کے مستقل مکینوں پر ہی کیا موقوف' وہاں مختصر عرصے کے لیے آنے والے خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں میں بھی کتے ہوتے تھے۔ خانہ بدوشوں کے پاس عموماً گدی نسل کے کتے ہوتے جبکہ سورگ والوں میں سے جنہیں خرگوش کا شکار مرغوب تھا وہ جہازی اور تازی رکھا کرتے تھے۔ ایک دو شوقین مزاجوں کے پاس السیشن تھے جبکہ گاؤں کے کھوجیوں کے پاس پوائنٹر تھا...... تاہم باقی سب گھروں میں وہ عام نسل کے کتے تھے جو اجنبیوں کو دیکھ کر اُچھل اُچھل کر بھونکتے تھے یا پھر بکریوں کو شام پڑنے پر دوڑ دوڑ کر اکٹھا کرتے تھے۔

سورگ والوں نے کتوں کی تعداد بڑھائی ضرور تھی مگر یہ تعداد کبھی کافی نہ ہو پاتی تھی کہ لائن لگانے والا یہ بے شرم جانور بڑھتا بھی بڑی سرعت سے تھا۔ ہر اڑھائی مہینے کے بعد ان کی حرام زادیوں کی بکھیاں بھر جاتیں اور سال بعد پتہ چلتا کہ پچھلے برس کے مقابلے اس بار تین گنا زائد آئے اور مونگ پھلی کے کھیتوں کو کھود کر پلٹ گئے۔

شروع شروع میں اپنے ایمانوں کو بچانے کے لیے ہم اِس پلید نسل کا نام بھی زبان پر نہ لاتے تھے۔ انہیں مارنے کو جی بھی نہ چاہتا کہ انہیں دیکھتے ہی کراہت ہونے لگتی تھی مگر جب یہ بہت زیادہ زیاں کرنے لگے تو ہم نے بندوقیں اُٹھالیں۔ خوب منصوبہ بندی کر کے ان کا شکار کرتے......اور پھر جب سرکار نے کسی سرکاری مصلحت کے تحت اسلحہ رکھنے پر پابندی لگا دی تو

ہمیں شکاری کتوں کی تعداد بڑھا دینا پڑی۔

ہم ان کتوں کو لے کر شکار پر نکلتے تو ہمارے ہاتھوں میں کلہاڑیاں، برچھیاں اور بلم بھی ہوتے۔ کتے انہیں دوڑ دوڑ کر گھیرتے اور ہماری جانب دھکیلتے جاتے ...... ہم اُن پر حملہ آور ہو جاتے اور اُن کی تکا بوٹی کر دیتے تھے۔ تاہم یہ ایسا موذی تھا کہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو ہر بار ضرور زخمی کر دیتا تھا۔

ہم ان کا شکار کھیلتے تھے مگر ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ جس تیزی سے وہ بڑھ رہے تھے اس کے مقابلے میں ہمارے ہاتھ لگنے والوں کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر تھا۔ لہذا تشویش ہمارے بدنوں کے خُون کا حصہ ہو گئی تھی۔

تھوتھنیوں والوں کی بڑھتی تعداد ہمیں مونگ پھلی کی کاشت سے نہ روک پائی کہ اس فصل کے طفیل بھوک ہماری بکھیوں سے نکل کر اُنہیں فربہ بنا گئی تھی۔ بیوپاری کھڑی فصل کا اتنا عمدہ بھاؤ لگاتے اور نقد رقم سے ہماری جھولیاں بھر دیتے کہ ہمارے دیدے حیرت سے باہر کو اُبلنے لگتے تھے۔ یہ حیرت تب بھی کم ہونے میں نہ آئی جب ہمیں یہ پتہ چلا تھا کہ بیوپاری تو ادھر شہر میں کارخانے والوں سے کہ جو اس کا تیل نکالتے تھے یا اسے مزے مزے کے کھانوں کا حصہ بناتے تھے، ہمیں دیئے جانے والے بھاؤ سے کئی گنا کماتے تھے...... کہ...... کوئی اور جنس ہمیں اتنا بھاؤ نہ دیتی تھی...... شاید اسی بھاؤ کی لشک نے ہمیں بکریوں سے بِدکا دیا تھا۔

دِھیرے دِھیرے سارے اُتاڑ پر مونگ پھلی ہی کاشت ہونے لگی۔ یہ علاقہ اس کی کاشت برداشت کے لیے خوب موزوں نکلا۔ اس فصل کو نسبتاً لمبا اور گرم موسم چاہیئے، تو وہ اس علاقے والوں کا ازلی مقدر تھا۔ کم از کم جتنی بارش اس فصل کی طلب تھی اتنی خشک سالی کے موسم میں بھی ہو ہی جایا کرتی تھی۔ زمین بھاری ہو تو بہت سا پھل وہی دبائے رکھتی ہے، سارا اُتاڑ ریتلا میرا تھا، اُدھر پودے پر ہاتھ رکھا جاتا اِدھر ہلکی پھلکی زمین پھلیوں کے گچھے اُگل دیتی۔ ہم سردیوں

کے خاتمے سے پہلے پہلے ہل چلا کر مونگ پھلی کی کاشت کے لیے وتر محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ انگریزی حساب سے تیسرے مہینے کے آدھے میں اس کی گریاں بوئی جاتیں۔ یہ بوائی کبھی کبھار چوتھے کے آدھے تک چلتی تھی۔ جب پھلیاں بننے پر آتیں تو ہم ان کے بچاؤ کے لیے جنگلی چوہوں کے بل ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان میں زہر کی گولیاں ڈالا کرتے۔ چوہے اور سیہہ پھلیوں کے خاص دُشمن تھے مگر ہمیں شہر والے بیوپاریوں نے سائنو گیس' کہ جسے ہم پہلے پہل سینو گیس کہتے تو شہر والے ہنسا کرتے تھے' اور زہر کی گولیاں لا دی تھیں یہ ان کے تدارک کے لیے خوب موثر تھیں اور ہم خُوش تھے کہ ہم نے تقریباً ان پر قابو پا ہی لیا تھا......مگر تھوتھنیوں والوں نے ہمارے سارے حوصلے چھین لیے تھے۔ایک ایک بکری کو بیماری سے......بگھیاڑوں سے......اور موت کے منہ سے بچانے والے ہم سب بے بس ہو چکے تھے۔کبھی ہم مستقل دکھوں سے مقابل ہونے میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے......اور اب بے بسی کی فرصت ساری مصروفیت پر غلبہ پا گئی تھی

۔

مونگ پھلی کی کاشت بہ جائے خود زیادہ مصروفیت کا مشغلہ نہ نکلا۔ پہلے برس جب اُتاڑ کو ہموار کرنا پڑا تھا' اپنے اپنے نام کھتوئے گئے خسروں کے حساب سے کھیتوں کے گرد حدیں بنائی تھیں۔کھیتوں کے اندر آ جانے والے کیکروں' بیریوں' جھڑ بیریوں اور کنیروں کو کاٹ کاٹ کر بالن بنانے کے لیے اُن کے ٹوٹے ٹوٹے کئے تھے۔ ہل چلا کر کھبل اور مروا کو جڑوں سے اکھیڑا گیا اور گھاڑا ایک جگہ اکٹھا کیا تھا ...... بس وہ پہلا برس ہی شدید مصروفیت والا نکلا۔یہی پہلا برس بکریوں کے پیٹ بھر کر چرنے کا آخری سال بن گیا تھا۔وہ درختوں سے اترنے والے سبز پتوں سے لدی چھانگوں پر منہ مارتے ہوئے یا اُکھڑی ہوئی نرم نرم جھاڑیوں کو جڑوں میں چباتے اور ڈھیروں کی صورت پڑے گھاڑے کو چرتے ہوئے ہمیں اس بات کا احساس تک نہ دلا پائی تھیں کہ آنے والے برسوں میں ان کی بکھیاں خالی بھبھان رہیں گی حتیٰ کہ وہ خود بھی نہ رہیں

گی۔تاہم ہمارے پیٹ چربیلے ہونے شروع ہو گئے اور عجب طرح کی فرصت نے ہمارے وجودوں میں کاہلی کا بےلذّت پانی بھر دیا تھا۔

مونگ پھلی کی کاشت کے بعد سے لے کر زمین رنگ پھلیاں بننے تک ہم فارغ رہنے لگے ۔ پھلیاں بنتیں تو ہم بلوں کو تلاش کر کے اُن میں زہریلی دوا ڈالتے۔ یہ بھی کوئی ایسی مصروفیت نہ نکلی تھی کہ ہمارے وجودوں میں زِندگی کی ہمک بھر دیتی لہذا بہت جلد اُوب جایا کرتے' کھاٹیں لمبی کرتے اور اب تک پکّے ہو چکے گھروں کے دبیز سایوں میں دراز ہو جاتے۔

ہمیں کسالت نے جکڑے رکھا...... اور تھوتھنیوں والے اس قدر بڑھ گئے کہ کتوں کی خاطر خواہ تعداد بڑھا دینا پڑی۔

اور اب یہ ہو چکا ہے کہ کتے بہت زیادہ ہو گئے ہیں...... بہت زیادہ اور بہت قوی...... اتنے زیادہ کہ ہمارے حصے کا رزق بھی کھا جاتے ہیں ...... اور اتنے قوی کہ اُن کی زنجیریں ہماری ہتھیلیوں کو چھیل کر ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں۔ یہ کتے ہمارے کھیت اجاڑنے والوں کے عادی ہو گئے ہیں...... عادی' خوفزدہ یا پھر ان ہی جیسے...... ممکن ہے ان پلیدوں کے بار بار بدن تان کر کھڑا ہو جانے کے سبب کوئی سہم ان کے دلوں میں سما گیا ہو۔ معاملہ کچھ بھی ہو' صورت احوال یہ ہے کہ تھوتھنیوں والوں کو غراہٹوں کی اوٹ میسر آ گئی ہے۔ کتے دور کھڑے فقط غرائے جاتے ہیں۔ ہم سے زخمی ہتھیلیوں میں بلم' برچھیاں اور کلہاڑیاں تھامی ہی نہیں جا رہیں لہذا ہم خوف اور اندیشوں سے کانپے جاتے ہیں...... اور کچھ یوں دِکھنے لگا ہے کہ جیسے اس بار تھوتھنیوں والے' انہی کتوں کی غراہٹوں کی محافظت میں ہمارے سارے کھیت کھود کر ہی پلٹیں گے۔

برف کا گھونسلا

وہ غُصے میں جلی بُھنی بیٹھی تھی۔

اِدھر اُس نے چٹخنی کھولی، میں نے گھر کے اندر قدم رکھا' اُدھر وہ مجھ پر برس پڑی۔

بچیاں جو مجھے دیکھ کر کِھل اُٹھی تھیں اور میری جانب لپکنا ہی چاہتی تھیں' اِس متوقع حملے میں عدم مداخلت کے خیال سے' جہاں تھیں وہیں ٹھہری رہیں۔

''اِس سے بہتر تھا ہم اُسی دور افتادہ مقام پر پڑے رہتے کم از کم آپ شام کو تو وقت پر گھر پلٹ آیا کرتے تھے۔''

بچیاں مسکراتی رہیں...... وہ پیچ و تاب کھاتی رہی...... اور میں اپنے حق میں وہ دلیل جو مسلسل کئی روز سے دہرا رہا تھا' ایک مرتبہ پھر دہرانے سے ہچکچا رہا تھا۔

جس وقت مجھے مری میں تعینات کیا گیا تھا وہ بہت خُوش تھی۔ اسے ہنی مون والے دن یاد آرہے تھے جن کے سحر سے وہ ابھی تک نہ نکلی تھی۔ وہی گہرے بادلوں کا زمین پر اُترنا' ٹھنڈی ہواؤں کا بدن چوم کر گزرنا' گیلی سڑک پر پھسل کر گرنا' چوٹ لگنا اور چوٹ سہلانے کے لیے ہیئر

ڈرائر کا اِستعمال کرنا۔ محض ایک گرم بالٹی پانی کا ملنا اور دونوں کا نہانے کو اکٹھے باتھ روم میں گھس جانا کہ کہیں ایک کو ٹھنڈے پانی سے نہ نہانا پڑے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر مال روڈ پر چہل قدمی کرنا۔ پہروں Lintotts میں یا پھر پوسٹ آفس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کا نظارہ بھی وہ نہ بھول پائی تھی۔

مگر اب اکتاہٹ اُس کے بدن کے خلیے خلیے میں اتر رہی تھی۔ میں جانتا تھا' ایسا کیوں تھا۔ مگر میں کیا کرتا؟ سیزن ختم ہونے کو تھا' لیکن لوگ تھے جو پھر بھی جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ دفتر سرکاری مہمانوں سے بھرا رہتا تو گھر دوستوں اور عزیز و اقارب سے...... جو بھی آتا اس خواہش کے ساتھ آتا کہ ایک تو اس کے قیام و طعام کا بندوبست کیا جائے گا اور دوسرا اسے گھمانے پھرانے لے جایا جائے گا۔ اور یوں نہ چاہتے ہوئے بھی' میں گھر وقت پر نہ پلٹ سکتا تھا۔ جب کہ وہ بے چاری صبح صبح مہمانوں کے بستر سنبھالتی' صفائیاں کرتی' پانی گرم کر کے باتھ روم میں رکھتی' ناشتہ تیار کرتی' دن بھر کبھی کھانا پکاتی' دستر خوان پر سجاتی' تو کبھی چائے اور سموسوں سے مہمانوں کی تواضع کرتی۔ اُن کے بچوں کے منھ صاف کرتی' اپنی بچیوں کو سمجھاتی بجھاتی' مہمانوں کے جوٹھے برتن دھوتی' پھر جب شام کے دراز سائے چھتنار درختوں سے اُتر کر رات کے روپ میں ڈھلنا شروع ہو جاتے تو وہ بستر بچھا دیتی اور مہمانوں کی واپسی کا بیٹھے بیٹھے انتظار کرتی کہ وہ سیر سے پلٹیں تو اُسے بھی کمر سیدھی کرنے کو موقع ملے...... ایسے میں اس کی اکتاہٹ اور چڑچڑاپن بجا تھا۔

اسے ہول آ رہے تھے کہ ہواؤں میں یخ بستگی بڑھ گئی تھی اور یہ سن سن کر' کہ یہاں کی برفانی سردیاں تو ناقابل برداشت حد تک سرد ہوتی ہیں' بہت زیادہ متفکر تھی۔

''دیکھے ہیں لحاف آپ نے' جگہ جگہ سے روشن دان بن گئے ہیں...... اوڑھونہ اوڑھو ایک برابر...... دسمبر ہے کہ بھاگا چلا آ رہا ہے...... اِن کا کچھ کر دیجئے' ان کا......''

اُن دنوں مری میں بنے بنائے لحاف نہیں ملتے تھے اور نہ ہی دھنیا یا ایسا فرد ملتا جو ان کو ادھیڑ

کر روئی نکالتا' اسے دھنکتا اور پھر لحاف بھر کر سی دیتا۔ پھر ہمارے پاس اتنے لحاف بھی نہ تھے جو اپنے اور مہمانوں کے لیے انہیں استعمال کرتے اور یہ میں اس مقصد کے لیے پنڈی دے آتا۔

''لکڑیوں کا بندوبست کر و جی...... خشک لکڑیاں نہ ہوں گی تو ان ننھی جانوں کو سردی سے کیسے بچاؤ گے؟...... دیکھو ساتھ والوں نے لوہے کی انگیٹھی بنوائی ہے' بارہ سو میں۔ اس کے اوپر پائپ لگوا کر روشن دان سے ایک سرا باہر نکال دیا ہے کہ دھواں کمرے میں نہ بھر جائے۔ میرے مانو تو ویسی ہی بنوالو کہ برفیلی راتوں میں لکڑیاں نہیں جلائیں گے تو کمرا گرم نہیں ہوگا......''

وہ ٹھیک کہتی تھی...... مگر بارہ سو روپے!...... مہمانوں نے بجٹ اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ انگیٹھی بنوانے کی تجویز کو میں نے سنا اَن سنا کر دیا۔ رات ایسی بے شمار تجاویز کے ساتھ شروع ہوتی۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ نہ میں اس کے بدن کے گداز پن کو محسوس کر سکتا' نہ وہ میرے بازو پر سر رکھتی' نہ ہی میرے سینے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ...... وہ بولتے بولتے تھک جاتی اور میں 'ہاں' 'ہوں' کرتا رہتا۔ وہ غصے سے پہلو بدل کر سو جاتی اور میں دیر تک اس کے بدن کی جاگتی مہک سونگھتا سونگھتا بدن توڑ بیٹھتا...... پھر نہ جانے کب مجھے نیند آتی تو صبح ہونے تک رات کی ساری تجاویز اور باتیں بھول چکا ہوتا۔

ابھی پو نہ پھٹی ہوتی کہ میری آنکھ چڑیوں کی چہکار سے کھلتی۔ میں نے ایسی چڑیا میدانی علاقے میں نہ دیکھی تھی۔ لمبوترا سا بدن' دل کش رنگت' سر پر سیاہ کلغی' گردن گانی سے مزین' لمبی دُم' مٹکتی آنکھیں...... میری آنکھ کھلتی تو وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ میرے بستر پر ہی پھدک رہی ہوتی۔

''یقیناً انہیں بھوک لگی ہوگی...... راتیں بھی تو لمبی ہو رہی ہیں''

میں سوچتا اور اٹھ کر کچن سے ان کے لیے چوگا تیار کر کے کمرے میں ہی ایک طرف رکھ چھوڑتا۔ کچن کا ایک دروازہ صحن میں کھلتا تھا اور دوسرا اسی سونے والے کمرے میں...... اور میری

بیگم اس پر گھر بنانے والے کو داد دیتی کہ یوں وہ کچن میں رہتے ہوئے بھی بچیوں اور گاہے گاہے مجھ پر نظر رکھ سکتی تھی۔ کچن کے دونوں دروازوں والی دیواریں جہاں چھت سے جا ملتیں' بالکل وہیں اس چڑیا نے ایک گھونسلا بنا رکھا تھا۔ ادھر میدانی علاقوں میں' میں نے ایسا گھونسلا بھی نہیں دیکھا۔ گندھی ہوئی مٹی' جو چڑیا اپنی چونچ میں بھر کر لاتی رہی تھی' اس کے چھوٹے چھوٹے دانوں کو ایک ترتیب سے باہم چپکا کر' اس نے ایک مضبوط سا گھر چھت اور دیواروں کے سنگم پر بنالیا تھا۔

ابھی صبح صادق کا وقت ہوتا اور ثوبیہ دونوں بچیوں کو بازوؤں میں سمیٹے خواب کے مزے لے رہی ہوتی کہ چڑیا اپنے ننھے منے بچوں کے ساتھ چوں چوں کرتے ہوئے میرے سرہانے آ بیٹھتی۔ میں مسکرا کر آنکھیں کھول دیتا۔ یوں یہ چڑیا میری محسن بھی تھی کہ جب سے میں اس گھر میں آیا تھا میری فجر کی ایک بھی نماز قضا نہ ہوئی تھی۔ ایک دن بھی میں نے سیر کا ناغہ نہ کیا تھا۔ فجر کی نماز اور صبح کی سیر اور وہ بھی مری جیسے پر فضا مقام پر' یہ وہ دو عوامل تھے کہ جن کے لیے میں اپنی حیات کے عناصر منتشر ہونے تک مری میں رہ سکتا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ پتوں نے رنگ بدلنے شروع کر دیئے۔ قرمزی' جامنی کلیجی' پیلے' سرخ...... غرض عجب عجب رنگ تھے جوان پر آ رہے تھے۔ جب یہی رنگ شاخوں سے ٹوٹ کر قدموں تلے چرمر کرنے اور یخ بستہ ہواؤں کے سنگ اِدھر اُدھر ڈولنے لگے تو مہمانوں کی آمد میں بھی وقفے پڑنے شروع ہو گئے۔

اگرچہ اب وہ میرے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے نکل سکتی تھی' مال پر شاپنگ کر سکتی تھی' میری مصروفیات بھی کم ہو گئی تھیں اور میں اس کے لیے وقت نکال سکتا تھا۔ لہٰذا مزاجوں سے چڑچڑاپن نکل رہا تھا اور زِندگی معمول پر آ رہی تھی۔ مگر برا یہ ہوا کہ دونوں بچیاں یکے بعد دیگرے بیمار پڑ گئیں......

اور یہ اُس وقت ہوا' جب پہلی برف پڑ چکی تھی۔ برف پڑنے کا عمل بچیوں کے لیے بالکل نیا تھا۔ خود میں بھی مسحور ہو رہا تھا۔ ثوبیہ کی خُوشی تو دیدنی تھی۔ وہ بچیوں کے ساتھ برف پر دوڑتی'

ہنستی، ان کے پھسل پھسل کر گرنے پر قہقہے لگاتی ہوئی خود پھسلتی اور چیخیں مارتی۔ وہ اس قدر خُوش تھی کہ خُوشی اس کے سارے بدن سے چھلک رہی تھی۔ ہنستے ہنستے آنکھوں سے آنسو امنڈ آتے، بدن ہلکورے کھانے لگتا اور سرخ ناک رگڑ رگڑ کر مزید سرخ کر لیتی۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا مری کا حسن ثوبیہ کے حسن کی آمیزش سے مکمل ہو گیا تھا...... مگر برا ہو یخ بستہ ہواؤں کا کہ دونوں بچیاں یکے بعد دیگرے بیمار پڑ گئیں۔

اس سے پہلے کہ ثوبیہ پر پھر چڑ چڑے پن کا دورہ پڑتا، میں لوہے کی انگیٹھی بنوا لایا۔ لکڑیوں کا بندوبست کیا، لحاف پنڈی سے بھروا لایا۔ مگر کمرا تھا کہ رات کے کسی پہر پھر بھی گرم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ بچیاں شروع ہی سے علیحدہ بستر پر سونے کی عادی تھیں مگر اب وہ بھی ہمارے بستر میں گھس آتی تھیں اور یوں ہم پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے لپٹ کر سو جاتے اور رات بھر پہلو بدلنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ پہلو بدلنے سے یوں لگتا، جیسے برف کے یخ بستر پر ننگا بدن دھر دیا ہو۔

یہ وہ دن تھے جب کئی کئی فٹ برف پڑ چکی تھی۔ شاخساروں سے پتے ٹوٹ کر کب کے برف تلے دب چکے تھے۔ حدِ نظر تک دودھ جیسی سفیدی تھی۔ مکانوں کی ڈھلوان چھتوں پر، آنگنوں میں، پتھروں اور گھاس پر، درختوں کی ننگی شاخوں پر...... اور سارا منظر یوں لگتا تھا، جیسے مرمر میں تراشا گیا ہو...... ایسے میں مجھے اس چڑیا اور اس کے بچوں پر رحم آ رہا تھا جو مجھے اپنے گیتوں سے ہر سحر اسی طرح جگاتی آ رہی تھی۔ حالاں کہ اس ٹھٹھرے ہوئے ماحول سے ان کے ساتھ بھرا مار کر اڑنے والے سبھی پرندے ہجرت کر گئے تھے۔

بچیاں سارا سارا دِن کمرے کے اندر گھسے رہنے پر مجبور ہو گئیں۔ ثوبیہ انگیٹھی میں لکڑیاں ٹکڑے کر کے گھسیڑتی رہتی، پھکنی سے آگ دہکاتی اور بچیوں کو کھینچ کھینچ کر آگ کے پاس بٹھاتی رہتی۔ اگرچہ دھواں پائپ کے ذریعے باہر پھینکنے کا بندوبست تھا مگر پھر بھی کمرے میں دھواں بھر جاتا اور اسے نکالنے کے لیے وہ دروازے کھول دیتی۔ ادھر کمرے سے دھواں نکلتا، ٹھنڈی

مرطوب ہوائیں اندر آگھستیں۔ پھر انگیٹھی دہکتی اور کمرا گرم کیا جاتا۔

پھر یوں ہوا کہ مصروفیات کے اسی سلسلے میں سے ایک کالی صبح طلوع ہوگئی......

وہی کہ جسے میں ابھی تک بھلا نہیں سکا۔

مجھے مری چھوڑ دینا پڑی۔ نہ چھوڑتا تو راتوں کو یوں ہی ہڑ بڑا کر اٹھتا رہتا' سانس گھٹتی رہتی۔ وہ خواب مسلسل دیکھتا رہتا کہ مری نے برف کا سفید کفن لپیٹ رکھا ہے اور اس کفن میں ثوبیہ بچیوں کو بازوؤں میں لپیٹے سو رہی ہے...... یہ تھا وہ خواب' جو اس کالی صبح کے بعد آنے والی کئی راتوں کو میں نے مسلسل دیکھا تھا' ہڑ بڑا کر اٹھا تھا اور سانسیں گھٹتی ہوئی محسوس کی تھیں......اور پھر......اس سے چھٹکارا پانے کے لیے مری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس کالی صبح کو میں حسب معمول بہت پہلے جاگ چکا تھا۔ چڑیا اپنے بچوں کے ساتھ چوگا چگ کر اپنے گھونسلے میں جا چکی تھی اور مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ ثوبیہ کیوں نہیں اٹھ رہی؟ جب بچیاں بھی اٹھ گئیں اور ننھی مُنّی ناکوں کو رگڑ رگڑ کر انہیں سرخ تر کرنے لگیں تو ثوبیہ نے پہلو بدلا۔ کہنے لگی:

''میرا بدن ٹوٹ رہا ہے......''

میں نے تشویش سے اسے چھوا' جسم بخار میں تپ رہا تھا......کہا:

''تمہیں تو بخار ہے......''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی' کپڑے دُرست کئے' دوپٹے سے ناک کو رگڑتے ہوئے شوں شڑاک کی آواز نکالی اور کہنے لگی:

''بس معمولی سا ہے' اللہ کرے بچیاں ٹھیک ہو جائیں''

جب میں ناشتہ کر چکا اور دفتر جانے کے لیے باہر نکل کھڑا ہوا تو وہ دوڑتے دوڑتے میرے پیچھے آئی' میں رکا' پلٹ کر پوچھا:

''خیریت تو ہے نا؟''

کہنے لگی:

’’وہ کچن کے صحن والا دروازہ ہے نا‘ اس کے اوپر والے روشندان کا ایک شیشہ‘ جب سے ہم آئے ہیں‘ ٹوٹا ہوا ہے۔ پہلے تو خیریت رہی مگر اب رات بھر ایسی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں کہ کمرا ٹھنڈا ٹھار ہو جاتا ہے۔ آج ہو سکے تو وہاں شیشہ لگوا دیں......‘‘

میں نے اس کی جانب دیکھا‘ بخار سے اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

’’کیوں نہیں‘ کیوں نہیں‘ شیشہ آج ہی لگ جائے گا......‘‘

میں نے اس کے چہرے کو انگلی کی پوروں سے چھوتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اگلی صبح مری کی وہ پہلی صبح تھی جب میں فجر کی نماز کے لیے نہ اٹھ سکا تھا۔ پھر جب میں ہڑبڑا کر اٹھا تو صبح کا اجالا کمرے کے اندر کونے کھدروں تک گھس آیا تھا۔ میں جلدی سے بستر سے نیچے اترا۔ ثوبیہ بچیوں کو بازوؤں میں لیے ویسے ہی سوئی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا چڑیا اور اس کے بچے نظر نہ آرہے تھے۔

’’خدا کرے سب ٹھیک ہو‘‘

میں بڑبڑاتا لپک کر کچن تک گیا۔ گھونسلے سے بھی کوئی آواز نہ آرہی تھی۔ دفعتاً نگاہ اس روشن دان پر پڑی جس میں کل ہی نیا شیشہ لگوایا گیا تھا۔ اس پر باہر کی جانب برف کے گالے جمے ہوئے تھے۔ دل زور زور سے دھڑک اٹھا کچن کا دروازہ کھول کر جھٹ باہر نکلا۔ مری سفید دوشالہ اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ نظریں پھسلتے پھسلتے کچن کی دہلیز کے پاس ابھری ہوئی سطح پر ٹھہر گئیں۔ میں وہیں دوزانوں بیٹھ گیا اور انگلیوں سے برف کی ڈھیری کھرچنے لگا...... اور جب میں برف کھرچ چکا تو مجھے لگا‘ مری نے دوشالہ نہیں سفید کفن لپیٹ رکھا تھا اسی کفن میں چڑیا کے پر کھلے ہوئے تھے اور دو ننھے منے بچے اس کے پروں تلے دبے کب کے اُپنی ماں کی طرح زندگی کی سانسیں ہار چکے تھے۔

میرا سر گھومنے لگا۔ وہی انگلی کہ جس سے اگلی صبح میں نے ثوبیہ کے تپتے چہرے کو چھوا تھا اور

جس سے ابھی ابھی برف تلے سے تین بے جان لاشوں کو برآمد کیا تھا' میرے چھاتی میں گھسی چلی جاتی تھی...... اندر بہت ہی اندر...... میں تیزی سی کمرے میں بھاگا۔ثوبیہ اسی طرح بچیوں کو بازوؤں میں لیے سو رہی تھی ......اور...... جب میں اسے دیوانہ وار زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا تو میری آنکھیں ابل پڑی تھیں اور حلق ہچکیوں سے بھر گیا تھا۔

بَرشَور

''اس نے اَپنی بیوی کے نام پر بیٹی کا نام رکھا۔۔۔۔

اور بیٹی کے نام پر مسجد بنا ڈالی۔۔۔

چھی چھی چھی''

جب عبدالباری کاکڑ کی چھی چھی میرے کانوں میں پڑی' میں فضل مراد روڈینی کی طرف متوجہ تھا اور یہ جان ہی نہ پایا' وہ افسوس کر رہا تھا' اس پر نفرین بھیج رہا تھا یا اُس کا تمسخر اڑاتی اَپنی ہنسی دبا رہا تھا۔

روڈینی چال ڈھال اور لہجے کا پکا بلوچ تھا۔ بات کرتے ہوئے آدھا جملہ منہ ہی میں گھما کر نگل لیا کرتا یا یوں ہونٹ سکیڑ لیتا کہ اَدھ کہی بات بھی گرفت میں نہ آتی تھی لہذا اس کی بات سمجھنے کے لیے صرف اس کی طرف متوجہ رہنا پڑتا تھا۔

روڈینی یہاں بلوچستان سے اس کمیٹی کا ممبر تھا جس نے وفاقی حکومت کی ہدایت پر لگ

بھگ سارے صوبے کے قحط کی سی کیفیت سے دوچار علاقوں کا دورہ کر کے متاثرین کی بحالی کے لیے موزوں حکمت عملی تجویز کرنا تھی۔ ہم اسلام آباد سے تین آئے تھے' نورنشان خان ہماری کمیٹی کا کنوینئر تھا۔ وہ تھا تو چارسدے کا پٹھان' مگر اسلام آباد میں مستقل قیام اور وفاقی دارالحکومت کے سب سے بڑے کلب کی ممبر شپ نے اسے بڑے رکھ رکھاؤ والا بنا دیا تھا۔ وہ ہر فرد کو پورا پورا پروٹوکول دینے کا قائل تھا اور دیتا بھی تھا۔ اس کا ایسا کرنا شروع شروع میں اچھا لگتا' مگر جب وہ بدلے میں ایسے ہی پروٹوکول کا متمنی نظر آنے لگتا تو بہت کوفت ہوتی۔ عمر اور مرتبے میں وہ ہم سب سے بڑا تھا' لہٰذا سب اس کی خواہش کا جیسے تیسے احترام کر لیا کرتے' تاہم ہوا یوں کہ جونہی ہماری فلائیٹ کوئٹہ پہنچی اسے ایسا کمال کا پروٹوکول ملا کہ وہ ہمارے بادل ناخواستہ والی عزت افزائی سے بے نیاز ہو گیا۔

اِسلام آباد سے کمیٹی کا تیسرا ممبر عابد وسیم تھا' بلا کا ہنسوڑ۔ وقفے وقفے سے اُسے کوئی نہ کوئی پُرلطف بات یاد آ جایا کرتی تھی' جسے وہ بڑے اِہتمام سے شروع کرتا مگر کنوینئر کے چہرے کی سنجیدگی کو دیکھتے ہی سب کچھ بھول جایا کرتا تھا۔ کوئٹہ آنے اور کنوینئر کے پروٹوکول سمیٹنے کی مصروفیت نے اُس کی زبان کی گرہ کھول دی تھی' اَب اُسے کوئی شگفتہ بات یاد آتی تو وہ مجھے کہنی مار کر ایک طرف لے جاتا' اَپنی کہتا اور اِتنا منھ کھول کر ہنستا کہ اُس کے منھ کے اندر تالو کے عقب میں لٹکتا کتا کھسوں کھسوں پر جھولنے لگتا تھا۔

کنوینئر ضرورت پڑنے پر بلوچستان سے کسی اور آفیسر کو کمیٹی کا غیر مستقل ممبر بنانے کا اختیار رکھتا تھا۔ کوئٹہ اِیئر پورٹ پر ہمیں ریسیو کرنے والوں میں عبدالباری کاکڑ' صحبت خان پانیزئی اور غوث بخش لشاری بھی موجود تھے' اور تینوں نے ہوٹل پہنچنے سے لے کر اگلی صبح پہلی میٹنگ تک وہ پرلطف پروٹوکول دیا تھا کہ کنوینئر نے پہلی ہی میٹنگ میں انہیں بطور کوآپٹڈ ممبر بٹھا لیا تھا۔ برشور کا لفظ میں نے کاکڑ کی زبان سے سنا تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا

کہ یہ پشین بازار سے آگے اُوپر پہاڑوں کے اندر اس گاؤں کا نام تھا جو خشک سالی سے شدید متاثر ہوا تھا۔ ہمارے پاس جو رپورٹس تھیں ان کے مطابق ڈیرہ مراد جمالی کی تین تحصیلوں' کہ جن کے رقبے نہری تھے' کو چھوڑ کر سارا ہی بلوچستان متاثرہ تھا لہذا کمیٹی کے دیگر ممبران اس کی باتوں پر بہت زیادہ توجہ نہ دے رہے تھے...... مگر برشور نام کا صوتی تاثر ایسا تھا کہ میرے اندر کہیں گہرائی تک اتر گیا۔

تاج محمد ترین کے بیوی کے نام پر بیٹی کا نام رکھنے اور بیٹی کے نام سے ایک وسیع اور عالیشان مسجد تعمیر کرنے کی بات اس نے غالباً چوتھے روز تب بتائی تھی جب کمیٹی مختلف علاقوں کے مشاہدے کے لیے نکلنا چاہتی تھی۔ اس نے اصرار کیا تھا کہ پہلے ہمیں برشور چلنا چاہیئے مگر رودینی نے اسے سختی سے ٹوک دیا کیوں کہ اس نے سارا شیڈول پہلے سے بنا کر مختلف علاقوں کے مقامی افسران کو تقسیم کر رکھا تھا۔ ویسے بھی رودینی کمیٹی کا مستقل ممبر تھا' بے شک اب کاکڑ کنوینئر کا چہیتا ہو گیا تھا' مگر دورے کے انتظامی معاملات کے حوالے سے رودینی کا استحقاق ایسا تھا کہ جس کا احترام بہ ہر حال ہمیں کرنا تھا اور کرنا بھی پڑا۔ کاکڑ کے برشور کے لیے اصرار نے رودینی کو کچھ ایسا بدمزہ کیا کہ وہ دورے کے آخر تک کاکڑ اور کنوینئر سے کھچا کھچا رہا تا ہم عابد وسیم ایک اور سامع میسر آنے پر خُوش تھا۔

تربت ہم فوکر سے گئے۔ نوشکی اور خاران جیسے علاقوں کا زمینی سفر تھکا دینے والا تھا۔ واپسی پر اس حصے کی اُجڑی ہوئی وسعت ہمارے دِلوں میں دُکھ اور بے بسی بن کر گُھس چکی تھی۔ نصیر آباد کے نہری علاقے حوصلہ دیتے رہے جبکہ باقی ضلعوں میں وہی سنسان تباہی سنسنا رہی تھی۔ سب علاقے یوں اُجڑے ہوئے تھے جیسے ہر جگہ کوئی بھوت پھر گیا تھا۔ زیارت قدرے سر سبز تھا مگر آسمان کی ناراضی یہاں بھی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ چمن بس نام کا چمن رہ گیا' اِدھر اُدھر دھول اُڑتی تھی۔ لورا لئی' کلی' مہول' پونگہ' قلعہ سیف اللہ اور مسلم باغ کی ساری کاریزیں سوکھ

چکی تھیں' خضدار' درہ مولا' لندھاوا' کچھی کے میدان' درہ بولان' ڈھاڈر اور سبی جیسے علاقوں سے ہم لگ بھگ گاڑیاں بھگاتے ہوئے گزر گئے مگر ان کے اُجاڑ پن نے پھر بھی ہمیں آ لیا تھا۔ اِس دوران ہم کئی بار کوئٹہ آئے اور ستا کر پھر نکل کھڑے ہوئے۔ ہر بار کاکڑ نے کہا :

''آپ برشور دیکھ لیتے تو جتنی تباہی آپ دیکھ آئے ہیں' وہ سب کم تر لگتی۔''

جو تباہی ہم دیکھ آئے تھے اس سے زیادہ کا تصور ہمارے لیے ممکن ہی نہ تھا مگر کاکڑ کا کہنا تھا:

''برشور کی بلندیوں سے دکھ شور مچاتا اترتا ہے اور سیدھا دلوں میں گھس جاتا ہے۔''

جب وہ اِس طرح بات کر رہا ہوتا تو رودینی اور لاشاری کے چہروں پر اُکتاہٹ سی آ جاتی۔ یوں جیسے کاکڑ ایسے معاملے کو اُٹھا رہا ہو جو کمیٹی کے ٹی او آر سے باہر کا ہو۔ کاکڑ اور پانیزئی دونوں کوئٹہ میں مقیم تھے اور اُن کی دل چسپی ایسے علاقوں میں زیادہ تھی جہاں سیب' بادام' انار' اخروٹ اور انگور کے باغات بہ کثرت تھے۔ کئی برس کی خشک سالی کے باعث اِن باغات سے بارہ سے بائیس لاکھ سالانہ کمانے والے بھی کنگال ہو کر یوں اجڑے تھے کہ یقین نہ آتا تھا۔ جب ہماری ٹیم پٹھان کوٹ کی کاریز کا خشک ہوتا منبع دیکھ کر نکلی تو ایک سفید پوش یک دم عین سڑک کے بیچ ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا; یوں کہ ڈرائیور بہ مشکل گاڑی روک پایا تھا۔ مجھے اس کے اس طرح سڑک پر آ جانے پر شدید غصہ آیا اور شاید زبان سے کوئی نازیبا جملہ بھی نکل گیا تھا۔ کاکڑ نے سنا تو بتایا کہ وہ کلی سگر کا عبداللہ جان تھا' چار ہزار درختوں والے کالاکلو سیبوں کے باغ کا مالک ۔ اس کا باغ سات برس پہلے پہلی بار سترہ لاکھ میں بکا تھا۔ جب سے آسمان سے رحمت برسنا بند ہوئی' اس نے باغ بچانے کے لیے ہر سال نیا بور لگایا مگر پانی اتنا نیچے چلا گیا کہ ہر سال آٹھ دس لاکھ اسی پر اُٹھ جاتے۔ پانی ہر بار نکلا ضرور مگر اتنا کہ دو چار مہینے پائپ کا منھ بھرا ہوا ہوتا پھر کم ہوتا چلا جاتا حتی کہ ڈوبتی نبض کی طرح جھٹکے کھاتے کھاتے ختم ہو جاتا۔ زمین کی گہرائی میں پانی تلاش

کرتے کرتے کنگال ہونے والا شخص پشتو میں ہمارے کنوینئر کو کچھ کہہ رہا تھا۔ جب وہ بات کر چکا تو کنوینئر نے جیب سے پرس نکالا' پانچ سو کا نوٹ الگ کیا اور اس کی کھلی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ سیبوں کے باغ کا مالک مٹھی بھینچ کر تیزی سے سڑک سے اترا' اور لورالائی کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ کاکڑ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بتایا کہ وہ ہمیں امدادی سامان تقسیم کرنے والی ٹیم سمجھ بیٹھا تھا۔ لورا' قلعہ سیف اللہ اور مسلم باغ میں باغوں کے ایسے ہی مالک آٹے کے لیے امداد مانگتے پائے گئے۔ کاکڑ کا اصرار تھا:

''برشور کے تاج محمد ترین' کہ جس نے بیٹی کے نام سے مسجد بنائی تھی' کا قصہ بھی اتنا ہی تکلیف دہ تھا......اور شاید اس سے بھی زیادہ۔''

جب ہم سفر کر کر کے اُکتا چکے تو رودینی نے بتایا کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ابھی ہمیں سراواں کے پہاڑی اور جھلاواں کے میدانی علاقے دیکھنے تھے۔ اِس پروگرام میں برشور نہ آتا تھا۔ رودینی کوشش کر کے اِس طرف نکلنے کی گنجائش نکال سکتا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے وہی نہ چاہتا تھا......اور اب یہ بات کاکڑ کو مشتعل کیے دیتی تھی؛ تاہم اس کا بس ہی نہ چل رہا تھا۔

اگلے روز جب ہم نیچائی اور مستونگ سے گزر کر نوشکی کی طرف جا رہے تھے تو وہ ہمیں اس صحرا نما علاقے کی طرف لے گیا جہاں جگہ جگہ جانوروں کے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔ رودینی نے ایک جگہ گاڑیاں رکوا لیں وہ نیچے اُترا' اُنگلیاں سیدھی کر کے زمین میں دبائیں اور مٹھی میں مٹی بھر کر اپنے قدموں پر گھوما' یوں کہ اُس کی مٹھی کھل کر چاروں طرف مٹی پھینکتی چلی گئی۔ پھر وہ تقریباً چیختے ہوئے کہنے لگا:

''کاکڑ تمہیں ان لوگوں کا دُکھ بڑا نظر آتا ہے جن کے باغ اجڑ گئے' جنہوں نے بہت کچھ دیکھا اور اَب بھوک دیکھ کر بوکھلائے پھرتے ہیں۔ دیکھو ذرا اِن لوگوں کا دُکھ دیکھو۔ اِنہوں نے بھوک کی گود میں جنم لیا ہے......اِنہوں نے بھوک کے سوا

کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔''

وہ بھاگتا ہوا تھوڑا سا دُور گیا' جھکا اور ایک ڈھانچے سے ہڈی کو جھٹکا دے کر الگ کر کے پلٹا' اُسے کاکڑ کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے کہا:

''یہ ہڈیاں اِنہی بھیڑ بکریوں کی ہیں جن کے تھنوں سے یہاں والے بھوک دوہتے رہے ہیں' اس خشک سالی کے ہلے میں تمہیں جتنی ہڈیاں زمین کے اوپر نظر آ رہی ہیں نا' اتنی ہی زمین میں دفنادی گئی ہیں۔ جانتے ہو کس لیے؟''

اُس نے ایک لمحے کے لیے بھی نگاہیں کاکڑ کے چہرے سے الگ نہ کی تھیں۔ کاکڑ اس اچانک سوال پر بوکھلا سا گیا تھا۔ اسے کچھ سوجھ نہ رہا تھا۔ رودینی نے اس کے چہرے سے نظریں الگ کیں اور انہیں اپنے قدموں والی زمین پر گاڑ کر کہا:

''تم جو باغوں کے اُجڑنے کا قصہ بار بار لے بیٹھتے ہو تم کیا جانو کہ زمین میں دبائی گئی ہڈیاں صرف بھیڑ بکریوں کی نہیں ہیں...... تیرے میرے جیسے انسانوں کی بھی ہیں...... ان انسانوں کی' جنہوں نے بھوک کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا...... اور...... جو بھوک ہی سے مر گئے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

ہم کوئٹہ سے کراچی کو نکلنے والی سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ مستونگ کے بعد قلات آیا قلات سے مسلسل تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد خضدار۔ پڑنگ آباد' سوراپ' کھڈ کوچہ' باغبانہ' زہری' وڈھ' توتک' مغلئ' ہر کہیں وہی دِل جکڑنے والی ویرانی تھی۔ ہمیں آگے جانا تھا مگر آگے جا نہ سکے۔ سب چپ تھے۔ ایک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے' مسلسل باہر پھیلی ویرانی کو اَپنی آنکھوں میں سمیٹ چکے تھے۔ اِسی دوران نہ جانے کب رودینی نے کہا تھا:

''واپس پلٹتے ہیں...... آ...... آگے بھی یہی کچھ ہے۔''

ایسا کہتے ہوے اس کا گلا رندھا گیا تھا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا مگر سب نے گویا رودینی کی تجویز مان لی تھی۔

کوئٹہ پہنچنے پر بھی سب چپ رہے۔ ہمارے پاس ایک پورا دن بچ گیا تھا۔ کاکڑ اب برشور کا نام تک نہ لے رہا تھا۔ ہم سب کے بیچ اتنی خاموشی حائل ہوگئی تھی کہ ایک دوسرے سے بات کرنا از حد دشوار ہو رہا تھا اور ہم محسوس کرنے لگے تھے کہ ایک لمحہ مزید اسی جگہ پر یوں گم صم بیٹھے رہنے سے ہمارے سینے پھٹ جائیں گے لہذا کاکڑ اور لاشاری کو اپنے اپنے گھر اور باقیوں کو ہوٹل میں اپنے اپنے کمروں کے لیے اٹھ جانا چاہئے۔

تقریباً سب اُٹھ چکے تھے' کنوینئر' کاکڑ' لشاری' پانیزئی اور عابد وسیم گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہونے کے عمل میں تھے میں پوری طرح کمر سیدھی کر چکا تھا بس ایک رودینی اَپنی نشست سے ہلا تک نہیں تھا۔ ہمیں یوں اُٹھتے دیکھا تو کہا:

''میری تجویز ہے کہ کل برشور چلتے ہیں۔''

ہم سب نے پہلے رودینی کو اور پھر کاکڑ کو دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ آن کی آن میں سارا سناٹا شور مچاتا ہمارے اندر سے بہتا دور ہوتا چلا گیا۔ ہم دِن بھر کے تھکے ہوے تھے اور ہمیں آرام کے لیے جدا ہونا تھا مگر ہم کہیں نہیں جا رہے تھے۔

کاکڑ نے ہمیں بتایا کہ تاج محمد ترین اس کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں کوئٹہ کے پبلک سکول میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے اور تب دونوں کی کئی خُوشگوار شامیں ہنہ جھیل پر یوں گزری تھیں کہ اسے ابھی تک یاد آتی تھیں۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ کیسے اسے کلی سرخانزئی کے میر شااللہ ترین کی بیٹی اچھی لگی اور کیسے اُس نے ایک شام اس کے گھر کے باہر کلاشنکوف سے مسلسل فائرنگ کر کے اَپنی محبت کا اعلان کیا۔ کن مشکلوں سے کلی سرخانزئی والے رشتہ دینے پر آمادہ ہوے۔ کیسے اُس کی بیوی ایک بیٹی جنم

دیتے ہوئے مرگئی اور کیسے اُس نے عین جنازہ گاہ میں اعلان کیا کہ اُس نے اپنی بیٹی کا نام اپنی بیوی کے نام پر نور جان رکھ دیا ہے۔

کاکڑ جو بغیر سانس لیے بولے جا رہا تھا یہاں پہنچ کر دم لینے کو رکا تو ہمارا تجسس اتنا بڑھا کہ ہم اُس کے بولنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے تاہم حوصلہ مجتمع کرنے کے لیے جتنا وقت اُسے چاہیئے تھا وہ اُس نے لے لیا اور پھر بتایا:

''اسی برس اس کا باغ گیارہ لاکھ میں کراچی کے ایک بیوپاری نے خریدا۔

ایک سال درختوں پر زیادہ پھل لگتے اور اس سے اگلے سال کم۔''

اس نے ہمیں یہ بات ایسے لہجے میں بتائی جیسے ہمیں پہلے سے معلوم ہو پھر اس پر اضافہ کیا:

''اس کی قسمت دیکھئے کہ ہر سال اس کا باغ پہلے سے بھی زیادہ قیمت دیتا بس فرق یہ تھا کہ کم پھل والے سال میں باغ پچھلے سال سے ہزاروں میں اوپر جاتا اور بھاری پھل والے سال لاکھوں کا اضافہ دیتا۔ انہی برسوں میں اس نے اپنے لیے اور اپنی بیٹی کے رہنے کے لیے قلعہ بنایا۔ آپ نے دیکھا ہی ہے کہ یہاں ہر تمن کا میر اور صاحب حیثیت فرد قلعہ بنا کر رہتا ہے۔ وہ جدی حیثیت والا تھا' بندوق' تلوار' خنجر کمان' گھوڑا اور قلعہ مدتوں اس خاندان کی دل چسپیوں کا سامان رہے تھے......

مگر اس نے قلعہ نئے سرے سے بنوایا' گھوڑے کی جگہ پجارو آ گئی۔ میں نے اس کے پاس بڑھیا سے بڑھیا کلاشنکوف دیکھی ...... وہ بڑا شوقین مزاج ہے اس سلسلے میں۔''

ایک مرتبہ وہ پھر چپ ہو گیا۔ شاید اسے اپنی کہی ہوئی بات کی تصحیح کی ضرورت پڑ گئی تھی' منہ ہی منہ میں بڑبڑایا:

''شوقین مزاج ہے کہاں؟' کبھی تھا۔''

گلا صاف کرنے کو تھوڑا سا کھانسا اور اُپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

''جس سال قلعہ مکمل ہوا اُسی برس اُس نے بیٹی کے نام سے مسجد بنوانی شروع کی۔ ہم نے کبھی نہ سنا تھا کہ کسی نے اُپنی ہی بیوی کا نام یوں سرعام لیا ہو...... اُس نے قبرستان میں سب کے سامنے لیا تھا۔ اس سارے علاقے میں آج تک گھر کی کسی خاتون کے نام پر کسی نے مسجد کا نام بھی نہیں رکھا تھا ...... مگر...... اس نے رکھا...... جب رکھ دیا تو لوگ تعجب کا اظہار کرتے تھے...... تاہم جب عالیشان مسجد مکمل ہو گئی تو سب اُس کی بیٹی نور کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔''

کاکڑ نے اِدھر اُدھر خالی نظروں سے دیکھا' لمبی سانس لی تو 'آہ' نکل گئی کہا:

''بدقسمت''

اور پھر بولتا چلا گیا:

'' جس برس مسجد نور مکمل ہوئی تھی نا' اس سے اگلے برس بارش کی ایک بوند نہ پڑی تھی اور اس سے اگلے سات سال بھی خالی چلے گئے۔ پہلے پہل اس کے ہاں پانی کی کمی نہ تھی اس کے باغ کی سیرابی کے لیے آٹھ ٹیوب ویل تھے پانچ نیچے' تین اوپر...... مگر جوں جوں زمین کے اندر پانی کی سطح گرتی چلی گئی توں توں وہ بوکھلا کر جو سمجھ آیا' یا جس نے جو صلاح دی کرتا چلا گیا۔ مسلسل خشک سالی نے اس کا سب کچھ نگل لیا۔ ایک ایک کرکے ٹیوب ویل خشک ہوتے رہے۔ وہ سوکھتے باغ کو بچانے کے لیے ہر برس دو تین نئے بور لگواتا رہا مگر زمین کا پیٹ بانجھ عورت کے رحم کی طرح خالی نکلتا۔ اس کے پاس جو جمع جتھا تھا اسی میں اٹھ گیا پھر وہ مقروض ہوتا چلا گیا ...... مگر وہ باغ نہ بچا پایا۔''

اگلے روز جب ہم خد خانزئی' میاں خانزئی' طور مرغہ' کڑی درگئی اور کلی سرخانزئی کے

علاقوں سے گزرے تو حد نظر تک درختوں کے کٹے تنے نظر آئے' صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہاں کبھی سیبوں کے باغ تھے' گھروں پر پڑے تالے مکینوں کی نقل مکانی کا نوحہ سناتے تھے۔ یوں لگتا تھا ایک عذاب الہی تھا جو پوری بستی کو روند کر نکل گیا تھا۔ بند خُوشدل خان خشک پڑا تھا' پانیزئی نے بتایا کہ ہمارے بزرگوں میں سے بھی کسی نے اس بند کو پہلے خشک ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ گاڑی ترائی سے اُوپر نکلی تو پانیزئی نے اِطلاع دی:

''ہم برشور کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔''

کاکڑ نے خشمناک آنکھوں سے پانیزئی کو دیکھا جیسے اس نے یہ اطلاع قبل از وقت دے دی تھی یا جیسے یہ اطلاع یوں نہیں دی جانی چاہئے تھی۔ تاہم وہ چپ رہا حتی کہ مسجد کے مینار نظر آنے لگے۔ اُس نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی رک گئی ہم سب اس کے پیچھے پیچھے سڑک پر اُتر آئے۔ اُس نے اوپر پہاڑیوں کی تنی چھاتیوں کی سمت اُنگلی اُٹھائی اور کہا:

''آسمان سے ایک بوند بھی ٹپکے......اُن دو چوٹیوں کے بیچ سے پھسلتی نیچے دامن میں آجاتی ہے۔''

اُس کی انگلی پہاڑی کی ناف تک چلی آئی تھی' وہاں تک' جہاں زمین ہموار کر کے اُوپر تلے کئی تختے بنا دیئے گئے تھے۔ انہی تختوں پر سیدھی قطاروں میں سیاہ لمبوترے نقطے سے نظر آتے تھے جو نیچے دامن تک چلے گئے تھے۔ کاکڑ نے بتایا تھا کہ وہ درختوں کے باقی رہ جانے والے ٹھنٹھ تھے۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب باغ آباد تھا تو پوری وادی میں زمین کے ایک چپے پر بھی نگاہ نہ پڑتی تھی مگر ہم نے جدھر دیکھا اُدھر جہنم کے شعلوں جیسی مٹی ہی نظر آتی تھی۔

اسی جہنم کے بغلی حصے میں گاؤں کی آبادی تھی۔ گھروں کا سلسلہ جہاں ختم ہوتا تھا وہیں وہ مسجد تھی جس کا ہم مسلسل ذکر سنتے آئے تھے۔ مسجد واقعی عالیشان تھی۔ میں نے اندازہ لگایا اس آبادی کے گھروں میں بسنے والے سارے مرد' عورتیں اور بچے بھی اس کے صحن میں جمع ہو جاتے

تب بھی اس کا تین چوتھائی حصہ دوسری بستیوں سے آنے والے نمازیوں کے لیے بچ رہتا اور دوسری آبادیوں والے آجاتے تو بھی شاید سارا صحن نہ بھر پاتا۔

''وہ نور مسجد ہے نا۔''

مجھے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی مگر میں نے پوچھ لیا۔ اس بار پانیزئی بولا:

''یقیناً''......

''اتنی بڑی''

میرا اگلا سوال تھا۔

کاکڑ بولا:

''تب وہ کہتا تھا، مجھے جنت میں اتنا ہی بڑا گھر چاہیئے۔''

ہم چلتے چلتے نیچے تک آ گئے تھے، اتنے میں ڈرائیور اوپر سے گاڑی گھما کر لے آیا۔ اب ہم اُس راستے پر تھے جو باغ کی چاردیواری کے ساتھ ساتھ آبادی تک چلتا تھا۔ کاکڑ نے بتایا:

''اب یہ باغ ترین کا نہیں ہے۔''......

''کیا مطلب''

کنوینئر نے پوچھا:

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ یہ باغ تاج محمد ترین کا ہے؟۔''

''یہ باغ ترین ہی کا تھا مگر اِسے تباہی سے بچانے کے لیے اس نے زرگل سے جو قرض اٹھایا تھا اس میں یہ باغ، وہ قلعہ اور اس کا سارا اسباب بک چکا ہے......اور تکلیف وہ بات یہ ہے کہ ابھی اسے آدھے سے زیادہ قرض دینا ہے۔''

زرگل کے بارے میں ہمیں پہلے ہی بتایا جا چکا تھا کہ وہ سرحد کے اِدھر اُدھر آتا جاتا رہتا اور خوب کماتا تھا۔ سارے علاقے میں پےمنٹ کے نام کے حیلے سے سود پر قرض دیتا تھا۔

زرگل کا نام آیا تو کاکڑ نے بتایا کہ کل جب وہ ہوٹل سے اپنے گھر گیا تھا تو ترین وہاں اس کا پہلے سے منتظر تھا اور اس نے بتایا تھا کہ قرض کی واپسی کے لیے زرگل بہت دباو ڈال رہا تھا۔ زرگل کے لمبے ہاتھ تھے۔ اخروٹ آباد کے چند تلنگے ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اس کا دباوٴ کوئی بھی برداشت نہ کر پاتا تھا لہذا ترین کا یوں پریشان ہونا بجا تھا۔ کاکڑ نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے اضافہ کیا تھا:

''میں اس کی کتنی مدد کرسکتا تھا...... چالیس پچاس ہزار حد سے حد ایک لاکھ...... جتنا اس نے اٹھایا تھا' اسے ہم جیسے سفید پوشوں کی مدد سے نہیں اتارا جا سکتا تھا۔''

گاڑی عین مسجد کے سامنے رک گئی تھی کہ پچیس تیس آدمی مسجد سے نکل رہے تھے۔ کاکڑ یک دم گاڑی سے اترا' لمبے لمبے قدم اٹھاتا لوگوں کے وسط میں سر نیوڑھائے کھڑے اس شخص کے پاس پہنچا' جس کے بارے میں پانیزئی نے بتایا کہ وہ ترین تھا۔

ابھی ہم گاڑیوں سے اتر ہی رہے تھے کہ ہمیں دھاڑیں مار مار کر رونے کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو ترین کاکڑ کی چھاتی سے لگا ''ہائے نور' ہائے نور'' کہتا پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ اس سے دگنی عمر والے تسبیح اُٹھائے دودھ جیسی سفید ریش والے معزز نظر آنے والے شخص نے اس کے کندھے پر اَپنی تسبیح والا ہاتھ رکھا اور کہا:

''ترین کیوں تماشا بناتے ہو تم نے پچھلے سات سالوں میں جتنی پے منٹ مانگی میں نے دی...... میں نے دی نا؟...... دیکھو میں نے تمہاری بیٹی سے اتنے شریف لوگوں کے سامنے نکاح کیا ہے...... اب باقی قرض میں خدا رسولؐ کے نام پر تمہیں معاف کرتا ہوں۔''

ترین چپ ہونے کے بہ جائے اور شدت سے چیخا:

''خدا رسولؐ کے نام پر......؟''

پھر وہ ''ہائے نور'' کہتا مسجد کی سمت بڑھا اور ایک ستون کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر یوں جھنجھوڑنے لگا جیسے پوری مسجد کو کھسکا کر کہیں لے جانا چاہتا ہو' حتی کہ وہ نڈھال ہو گیا۔ بے بسی سے سر ستون کے ساتھ ٹکرایا اور کہا:

''کاش میں تمہیں بیچ کر نور' اپنی نور کو بکنے سے بچا لیتا۔''

''کیا کفر بکتے ہو''

زرگل چیخا۔ اس کا ہاتھ فضا میں یوں ناچا کہ موٹے دانوں والی لمبی تسبیح دائرہ بناتی دائیں بائیں جھولنے لگی۔ اس کے ساتھ کھڑے ہٹے کٹے دو آدمیوں نے اشارہ پا کر اسے مسجد کے ستون سے زبردستی الگ کیا اور کھینچتے ہوئے قلعے میں لے چلے مگر وہ مسلسل کہہ رہا تھا:

''کاش میں تمہیں بیچ سکتا نور'' ......

آواز دور ہوتی جا رہی تھی' ہم گاڑی میں بیٹھے تو ایک دفعہ پھر ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ ہم جلد ہی برشور کی حدود سے نکل آئے مگر برشور ہمارا پیچھا کرتا رہا۔

کیس ہسٹری سے باہر قتل

سب ڈاکٹر ایک دوسرے سے کسی نہ کسی بحث میں جتے ہوے تھے سوائے ڈاکٹر نوشین کے ٗ جس کے پورے بدن میں دوڑنے والی بے کلی اتنی شدت سے گونج رہی تھی کہ وہ بلانے والوں کو ٗ ہیلو ہائے ٗ سے آگے کچھ نہ کہہ پاتی تھی۔ اس نے قصداً اپنی اس کیفیت پر قابو پایا اور ایک نظر بیضوی میز کو گھیرے اپنے کولیگز پر ڈالی جو سرکتی ٗ پھسلتی سامنے کینوس کی دیوار پر پہنچی اور وہیں ٹھہر گئی ۔اسے یوں لگا جیسے وہاں اس کے اپنی کیس ہسٹری کی سلائیڈز چل رہی تھیں۔

وہ مصروف عورت تھی ٗ صبح پنڈی والی شاخ میں اور شام یہاں۔ اس کا شوہر بھی مصروف آدمی تھا جس نے اپنے ہنر اور فرض کو کمال نفاست اور عجب ہوشیاری سے سرمایہ کاری بنا ڈالا تھا۔ شروع شروع میں دونوں کی یہ بے پناہ مصروفیت کام کی لگن کی وجہ سے تھی پھر اس میں بہت سارے خواب شامل ہو گئے۔ دونوں ان خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے میں یوں الجھے کہ ایک

دوسرے کے لیے جینے کا تصور ان کے ہاں سے معدوم ہوتا چلا گیا۔ حتی کہ انہیں بھول ہی گیا کہ ایک دوسرے کے لیے پریشان کیسے ہوا جاتا ہے، بے نتیجہ باتوں سے لطف کیسے کشید کیا جاتا ہے اور بلاسبب کیسے ہنسا جاتا ہے۔

ان کا ایک ہی بیٹا تھا نبیل۔ اس کی ایجوکیشن کا مرحلہ آیا تو اس وقت تک کوالٹی ایجوکیشن کی ڈھنڈیا پڑ چکی تھی۔ اس نئی وبا کی اَپنی ضروریات اور تقاضے تھے' جو دونوں کو پورے کرنا تھے اور جس نے انہیں اس قدر الجھایا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے فکری سے بات کرنے کو بھی ترس گئے؛ حتی کہ یہ مصروفیت ان کے وجود میں اتر گئی۔ گھر بن گیا' خوب صورت اور بڑا' ویسا ہی جیسا وہ چاہتے تھے۔ کلینک بنا جو بعدازاں کئی بستروں کے ہسپتال میں کنورٹ ہو گیا' اس کی ایک شاخ پنڈی میں بھی کھل گئی اور بیٹا پڑھنے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔

شروع شروع میں نبیل سے فون پر بات ہو جاتی تھی' بعد میں وقفے پڑنے لگے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ رابطہ معطل ہو کر رہ گیا۔ جب اسے وہیں اَپنی مرضی کی جاب اور لڑکی دونوں مل گئیں تو یہ سلسلہ بہت جلد موقوف ہو گیا۔ اِدھر سے فون چلا جاتا تو کرنے کو کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ اگر اِدھر سے کوئی کرید کی جاتی' یا اس کی آواز سننے کو یوں ہی بات بڑھائی جاتی تو نبیل یہ کہ کر بات ختم کر دیتا تھا کہ اس بارے میں وہ اِی میل کر دے گا۔

اس کا میل باکس ہر روز رنگ رنگ کی میلز سے بھر جاتا تھا جن میں چند ہی اس کے اپنے پروفیشن سے متعلق ہوتیں۔ بیشتر کو اَن وانٹڈ (unwanted) کے زمرہ میں ڈالا جا سکتا تھا۔ اس نے شروع میں اپنے بیٹے کی اِی میلز لینے کے لیے ہاٹ میل پر جا کر یہ اکاؤنٹ بنایا تھا' اور روز ہی اسے کھول کر دیکھتی تھی۔ اس پر اس نے بیٹے کی کچھ اِی میلز وصول بھی کیں مگر جب یہ باکس زیادہ تر خالی کنستر کی طرح بجنے لگا تو اس نے اس پر اپنے شعبے سے متعلق الیکٹرانک جریدے منگوانے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی آلائشیں بھی آنے لگیں جنہیں وہ پہلے تجسس سے دیکھا کرتی مگر بعد میں دیکھے بغیر ہی ڈیلیٹ کر دیتی کہ اِن میں دکھایا جانے والا ہر

جسم اسے اپنے شوہر کے جسم کی طرح بے ہودہ اور پھسپھسا لگتا؛ جب کہ ہر عورت کا وجود بالآخر اس کے اپنے وجود کی طرح باسی ہو جاتا تھا۔

''جی ڈاکٹر نوشین''

ایک آواز نے براہ راست اسے مخاطب کر کے چونکا دیا تھا۔

یہ ڈاکٹر نعمان تھا' جس کے آتے ہی سب اپنی باتوں سے نکل آئے تھے اور اب تعظیم کے لیے اٹھنا چاہتے تھے' مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تو رکوع ہی سے لوٹ گئے تھے۔

ڈاکٹر نوشین کو اپنے دھیان سے نکلنے اور سنبھلنے میں کچھ وقت لگا تاہم اس اثنا میں وہ اپنی سیٹ سے کھڑی ہو چکی تھی اور اندازہ لگا چکی تھی کہ اسے کیس کی پریذنٹیشن کا کاشن دیا جا چکا تھا۔

یہ کیس ڈاکٹر نوشین نے بورڈ کو ریفر کیا تھا لہذا اس کا نام لے کر ڈاکٹر نعمان کا ''جی'' کہنا اس کے لیے اتنا غیر متوقع نہ ہونا چاہیے تھا۔ شاید ڈاکٹر نعمان پوری طرح بیٹھ چکنے کے بعد' حسب عادت مسکرا کر اور سب کی طرف دیکھنے کے بعد ایسا کہتا تو تب تک وہ سنبھل چکی ہوتی اور یوں نہ بوکھلاتی ۔اس نے بہت جلد بھانپ لیا کہ اس کا ''جی'' کہہ کر فوراً ہی میٹنگ شروع کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ بہت جلدی میں تھا۔

یہ جلدی دونوں کے وجود میں اتری ہوئی تھی مگر اس کیس کے بارے میں ڈاکٹر نوشین کا خیال تھا کہ یہ جلدی کا نہ تھا' پوری توجہ چاہتا تھا۔

اِس امید پر کہ شاید آنے والے لمحات میں ڈاکٹر نعمان' طبیعت سے چھلک پڑنے والی عجلت کو جھٹک کر اِس کیس کو انہماک دینے کے قابل ہو جائے' اِپنی الجھن کو جھٹک دیا۔سب جانتے تھے کہ معمولی اور غیر معمولی باتوں کی تفصیلات' جو مریض یا پھر کنسلٹ کرنے والا کوئی ڈاکٹر کسی کیس کے بارے میں دینا چاہتا تھا' ڈاکٹر نعمان اسے سننے کو پوری توجہ سے تیار ملا کرتا تھا کہ بقول اس کے اِسی میں بہت سی پیچیدگیوں کی کنجی ہوتی تھی۔وہ اپنے جونیئرز کو بھی کیس ہسٹری توجہ سے لینے اور اس پر بھرپور توجہ دینے کی تلقین کیا کرتا تھا جن میں سے اکثر عام سی' بے رس یا پھر غیر متعلق

باتوں سے جلد ہی اُوب جایا کرتے تھے۔

''عین آغاز میں صرف سننا ہی ایک مفید کیس ہسٹری کی بنیاد بن سکتا ہے''

یہ ڈاکٹر نعمان کا نقطہ نظر تھا۔ سوالات کی اہمیت سے اسے انکار نہیں تھا مگر اس کا خیال تھا کہ عموماً عصبی مریض اَپنی خالص ذہنی پراگندگی کو تشخیص سے پہلے ہی اِنہی سوالات کے نتیجے میں کوئی اور جہت دِے کر الجھا سکتے تھے۔ اس کا اپنا تجزیہ تھا کہ سائیکو انیل سز (Psychoanalysis) کے دورانیے میں بہت سے پے شنٹ اپنے معالج کے بے جا سوالات سے کانشی ایس ہو کر نفسی لذتیت میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے یا پھر نفسیاتی ایذا پرستی کو وتیرہ کر کے سائیکوڈرامے پر اتر آتے تھے۔

ڈاکٹر نعمان نے اس کیس کی ساری ہسٹری پڑھ ڈالی تھی اور اسے بورڈ کے سامنے رکھنے سے ہچکچا رہا تھا کہ اس کیس میں کوئی کمپلی کیشن تھی نہ سویئرٹی۔ مریض کو صرف پراپر کونسلنگ اور میڈیسن تھراپی چاہیے تھی۔ اس نے ڈاکٹر نوشین کو بلا کر اس حوالے سے کچھ مشورے بھی دینا چاہے مگر وہ اس روز لگ بھگ اتنی ہی اکتائی ہوئی تھی جتنا کہ ڈاکٹر نعمان میٹنگ والے روز نظر آ رہا تھا۔ وہ ٹیم ورک کا حامی تھا' لہذا اس کی ساری ٹیم اسے باس کی بہ جائے ایک محترم دوست کی طرح سمجھتی تھی اور یہ طرز عمل اس ہسپتال کے حق میں خوب جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نوشین کا اکھڑا ہوا مزاج دیکھ کر اس کی تجویز کو تب تو مان لیا گیا مگر وہ اندر سے اچٹا ہوا تھا اور اِس کا سبب یہ تھا کہ یہ مریض اِتنی توجہ اور ڈاکٹرز کے قیمتی ٹائم کو افورڈ اسی صورت میں کر سکتی تھی کہ کہ اسے ڈاکٹر نوشین کے علاوہ کوئی اور فالو کرتا۔ ڈاکٹر نوشین اِس کیس میں اموشنلی انوالو ہو گئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر نعمان کو بتایا تھا کہ یہ یونیورسٹی کے زمانے میں اس کی کلاس فیلو رہی تھی۔

سامنے والی اس نشست تک جاتے جاتے کہ جہاں سے اسے پریذنٹشن دینا تھی' وہ بے طرح چمٹ جانے والی اس بے اطمینانی کو دل سے کھرچنے کے جتن کرتی رہی جو ڈاکٹر نعمان کے اکتائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہی اس کے اندر اتر گئی تھی۔ اِس کے لیے اس نے یہ حیلہ کیا کہ اس

نے ڈاکٹر نعمان کے چہرے کی طرف دیکھنا ہی موقوف کر دیا۔ اس کے سامنے ٹیبل پر وہ لیپ ٹاپ پڑا تھا جس کے سی پی یو سے ملٹی میڈیا کو کنکٹنگ لیڈ کے ذریعے جوڑ دیا گیا تھا۔اس نے گھوم کر دیوار سے لگے اپنے اسسٹنٹ کو دیکھا تو اس نے ہال کی باقی روشنیاں مدہم کر دیں۔اب ڈاکٹر نوشین میں حوصلے اور خود اعتمادی کا تحرک پیدا ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نعمان کے چہرے سے جو عجلت اس نے بہتی دیکھی تھی اب وہ کہیں نہیں تھی۔ ہال کی مدہم روشنی نے' ملٹی میڈیا سے نکل کر کینوس کی دیوار پر پڑتی دودھیا تصویر نے' یا پھر اس کے اپنے تصور نے جواب پوری طرح مربوط ہو گیا تھا سب کے چہروں پر دھندلاہٹ مل دی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ایسی لمبی تصویر دیکھ رہی تھی جس میں ابھرے ہوئے سارے نقوش اس نے میلی روشنی کے ریزرے سے رگڑ رگڑ کر خود ہی مٹا ڈالے تھے۔

سامنے کینوس پر پڑنے والی روشنی کے اندر سے انگریزی کے حروف زوم اِن ہوئے۔ پاور پوائنٹ میں بنی ہوئی پریذنٹیشن کی پہلی سلائیڈ کے متحرک الفاظ جونہی پوری طرح ساکت ہوئے ڈاکٹر نوشین نے ذرا سا کھانس کر سب کی توجہ چاہی اور امید ظاہر کی کہ ان کی دِل چسپی اور توجہ سے وہ اِس کیس کو پوری طرح ایکس پلین کر پائے گی۔

سب کی نظریں اب سامنے اجلے کینوس کی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔پہلی سلائیڈ صرف اس عنوان کی تھی:

''معالجین کے بورڈ کے لیے کیس ہسٹری کی تلخیص''

دوسری سلائیڈ میں ابتدائی نوعیت کی معلومات کے باوصف' خلاف معمول قدرے کم طاقت کے ڈجیٹل کیمرے سے کھینچی گئی ایک عورت کی رنگین تصویر بھی تھی۔ معصوم سا چہرہ' نیچے دی گئی عبارت کی طرف متوجہ ہونے سے روک رہا تھا۔

ڈاکٹر نوشین کی آواز سارے میں ایک لذت بھری سسکاری کی طرح گونج رہی تھی:

''یہ ہے وہ عورت جس کی کیس ہسٹری آج ہماری پریذنٹیشن کا موضوع ہے۔''

اس نے اضافہ کیا:

''یہ تصویر میں نے اپنے سیل کیمرے سے لی ہے''

ایسا کہتے ہوے اس کی آواز میں ایک عجب طرح کی اپنائیت بھر گئی تھی۔ تصویر کے نیچے کی معلومات کو ڈاکٹر نوشین نے ویسے ہی پڑھ دیا جیسے کہ وہ سلائیڈ پر دی گئی تھیں:

نام: نفیسہ بیگم

عمر: سینتالیس سال

جسمانی ساخت: قد پانچ فٹ پانچ انچ' وزن ایک سوسینتالیس پونڈ'

رنگ سنہری مائل گورا' جلد صاف اور چمکدار

جسمانی صحت: بہ ظاہر کسی بیماری کے آثار نہیں؛ بل کہ قابل رشک حد تک صحت مند بدن

ازدواجی حیثیت: بیوہ

کیس کی نوعیت: دل کے دورے سے مرجانے والے اپنے شوہر کے بارے میں

مریضہ کو یقین کی حد تک وہم ہو گیا ہے کہ اسے اس نے قتل کیا ہے۔

عین آخری سطر کو پڑھتے ہوے اس نے ایک سرگوشی سنی:

''موروزم (moronism) کا کیس لگتا ہے''

اسے جان لینے میں قطعاً دیر نہ لگی تھی کہ یہ آواز ڈاکٹر انیس کی تھی۔

ڈاکٹر انیس کے مزاج میں پارہ بھرا ہوا تھا۔ فیصلہ دینے اور اندازے قائم کرنے میں ہمیشہ پھرتی دکھاتا اور اپنا فیصلہ بدلنے میں بھی اسے کوئی تردُّد نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نوشین بالعموم اُس کی اِس طرح کی باتوں کو اِگنور کر دیا کرتی تھی مگر اُس روز اسے نظر انداز نہ کر سکی اور لفظ چبا چبا کر کہا:

''نو' ڈاکٹر انیس' ناٹ ایٹ آل یہ کیس طفل دماغی کا نہیں ہے۔ اور خدارا بچوں کی سی جلد بازی سے گریز کیجیے۔''

ڈاکٹر انیس نے اسے خود پر براہ راست حملہ جانا تاہم وہ اِس حملے سے پوری طرح سنبھل نہ پایا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اُسے لگا جیسے سب اُس کی طرف دیکھ رہے تھے کھسیانا ہو کر فوری طور پر اُپنی پوزیشن واضح کرنا چاہی۔

''ڈاکٹر نوشین' میں فزیانومی (physiognomy) کو بھی قابل اِعتماد علم مانتا ہوں اور آپ کی کھینچی ہوئی تصویر میں اِس عورت کا چہرہ بچے کی طرح معصوم لگتا ہے' ایسے بچے کی طرح جس نے بلوغت نہ دیکھی ہو۔ یہ تصویر اِس عورت کی ذہنی کیفیت بھی واضح..................''

''نو کمنٹس ڈاکٹر انیس''

ڈاکٹر نعمان نے اُسے بات پوری نہ کرنے دِی اور کیس کو مکمل طور پر سن لینے کی تلقین کی۔ ڈاکٹر نوشین نے سر جھٹکا اور اگلی سلائیڈ پر آ گئی۔ بعد میں آنے والی ہر سلائیڈ پر بلٹ فارم میں اِنفرادی جملوں کی صورت اُہم اشارے دے دِیئے گئے تھے تاہم اِن نامکمل جملوں سے ڈاکٹر نوشین نے ایک کہانی مکمل کر دی۔

ڈاکٹر نعمان کے لیے یہ کہانی وہ کیس ہسٹری نہیں تھی جو ڈاکٹر نوشین کی آواز سنا رہی تھی۔ وہ تو اس آواز میں اُترا ہوا تھا جو اِیک اور عورت کے وجود میں پوری طرح اُتری ہوئی تھی۔ اور جب ڈاکٹر نوشین نے عین آغاز میں یہ کہا تھا کہ یہ آج کے عہد کی ایک متروک مگر ناگزیر عورت کا کیس ہے تو وہ بہت دیر تک اِن جملوں کو معنی دینے میں الجھا رہا۔

گھر کی جھاڑ پونچھ سے جونہی وہ فارغ ہوتی اُسے ہانڈی روٹی کا اہتمام کرنا ہوتا تھا کہ اُس کا شوہر انور عین دو بجے گھر کھانے پر پہنچ جایا کرتا تھا۔

یہ شروع ہی سے اُس کا معمول تھا اور اِس معمول کے ساتھ اُس نے خود کو یوں ڈھال لیا تھا جیسے گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کرتی ہر بار ایک خاص وقت پر اپنے لیے مخصوص مقام پر پہنچتی تھی۔

دو بجے کھانا' پانچ بجے چائے اور ٹھیک آٹھ بجے پھر کھانا اور کھانے کے بعد باہر سڑک پر کچھ دور تک چلنا' جی بھر کر باتیں کرنا' کسی بھی موضوع پر یا پھر بے سبب ہنسنا اور قہقہے لگانا' واپسی پر انور کے پہلو میں ڈھے جانا حتّٰی کہ وہ اسے یوں ہی لیٹے رہنے پر مجبور کر دے یا پھر خود ہی آنکھیں بند کر کے حلقوم سے خرخراہٹیں اگلنے لگے۔ دوسری صورت میں وہ بغیر آہٹ کیے پھر کچن میں گھس جاتی گندے برتن صاف کر کے سلیقے سے رَکھتی اور اس کے ساتھ نیند میں اُس کی شریک ہو جاتی۔ جب کہ پہلی صورت میں اگلی صبح اُسے اس کے جاگنے سے بہت پہلے اٹھنا پڑتا تھا۔ غسل' نماز اور اس کے بعد انور کے لیے لمبی دعائیں...... پھر وہی کچن...... حتی کہ رات اِدھر اُدھر ہو جانے والی ساری ترتیب صحیح صحیح اپنے مقام پر بیٹھ جاتی تھی۔

یہ سب اس کے لیے عبادت کا سا ہو گیا تھا تب ہی تو اس گھر کی ایک ایک چیز سے انور کو اس کی محبت خُوشبو اور نور کی طرح پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے سارے معمولات اس کے اندر سیکنڈ ظاہر کرنے والے نشانات کی طرح سما گئے تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک ہی محور پر گھومتی رات دن کی مسافت کو تین پہروں میں بانٹ رکھا تھا جو ایک خاص رفتار اور ڈھنگ سے گزرتے۔ اِن پہروں کے دورانئے میں یکسوئی سے اپنے معمولات کا حصہ ہو جاتی اور سانس لینا بھی بھول جاتی تھی۔ تاہم ایک پہر کٹتا اور پلٹ کر دیکھتی تو سرشاری کی مہک اس کے بدن کو اجال دیتی تھی۔ ہر پہر کے آخر میں انور کو ایک ٹک بے ریا محبت سے دیکھتے رہنا' سانسوں کو پوری طرح سینے میں ہموار کر لینے کے لیے کافی تھا۔ اس طرح وہ ایک اور نئے پہر کو اَپنے کامل اِنہماک سے کاٹ ڈالنے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔

وہ انور کے بارے یقین کی جس دولت سے مالا مال تھی اسی یقین کو ایمان بنائے رکھنا چاہتی تھی۔

جب اس کے آنے کا وقت ہو جاتا تھا تو وہ اپنے اِس ایمان کو تازہ رکھنے یا پھر اپنے خوابیدہ ماحول کو اِستقبال کے لیے کچو کے لگا کر تیار کرنے کو ڈِھیرے سے کہہ دیا کرتی تھی۔

''دھوپ' بارش' آندھی' طوفان ناس مارے کس میں ہمت ہے کہ انہیں روک لے''

مگر اس روز جب وہ اَپنے آپ یہ بڑبڑائی تھی اس کی آواز میں ایک نامانوس سی تلخی بھی شامل ہوگئی تھی جس نے اُس کی آواز کو قدرے بلند کر دیا تھا۔ اَپنی ہی اَجنبی سی آواز اُس کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک کر کھسیانی ہوئی۔ اُس نے بے اختیار باہر کی سمت نگاہ کی۔ ابھی انور نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا اور اپنے کام میں پہلے کی طرح مگن ہوگئی۔

اُسے اب کچھ زیادہ وقت نہیں چاہیے تھا۔

جب سے وہ اِس گھر میں آئے تھے' وہ اِسے سیدھا کرنے میں جتی ہوئی تھی۔ چیزیں یہاں وہاں ڈھنگ سے رَکھتے رَکھتے وہ بے سُدھ سی ہو جاتی تھی تاہم ہمت کر کے اُسے اُٹھ کھڑا ہونا پڑتا کہ اَپنے مزاج کے مطابق اَشیاء کو نہ دیکھ کر وہ چین سے لیٹ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ چیزیں گھسیٹ گھسیٹ کر اُن کی ترتیب بدلتی رہی؛ حتی کہ اس کی اَپنی کمر دُھری ہونے لگی۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بستر پر گر گئی۔ اگرچہ اُسے اُونگھ آ گئی تھی مگر خواب میں بھی وہ ایک ہی اِیڑھی پر گھومتی رہی اور اُسے اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ کتنا وقت گزر چکا تھا۔

باہر کسی کی گاڑی نے ہارن دیا تو وہ ہڑ بڑا کر اُٹھی' چونک کر گھڑی کو دیکھا' اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس کے شوہر کے آنے میں محض بیس منٹ رہ گئے تھے۔

وہ خوفزدہ نہیں تھی یہ تو سدھائی ہوئی محبت کا شاخسانہ تھا کہ معمول کے ٹھیک نہ بیٹھنے سے اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

ایک چولہے پر ککر دَھرا تھا۔ دوسرے کا برنر ٹھیک طرح سے کام نہ کرتا تھا۔ ذرا سی گیس

کم کھولوتو شعلہ بھبھک مار کر بجھ جاتا۔ شعلہ بڑھائے رکھو تو توے کا وسطی حصہ، جو کثرت اِستعمال سے پتلا ہو گیا، بہت تپ جاتا تھا، اِتنا کہ اِدھر چپاتی ڈالو اُدھر رنگ سنہرا ہوا اور چپاتی درمیانی حصے سے پھولنا شروع ہو جاتی۔ کنارے اِتنا جلدی پکتے نہ تھے لہذا اُسے ایک ہاتھ بار بار توے کے تپتے ہوئے کڑے پر رکھنے کے لیے ٹا کی اُٹھانا پڑتی؛ جو ہر بار چولہے کے نیچے کھسک جاتی۔ اُسے اِس کا اندازہ ہو جاتا تھا لہذا وہ اُنگلیاں لڑھکا کر اُسے تلاش کر لیا کرتی تھی۔ کڑے سے توا کھینچ کر روٹی کے کچے رہ جانے والے حصوں کو سینکتے ہوئے اُسے اَپنے دونوں ہاتھوں کے یوں مصروف رہنے اور ٹا کی کے بار بار اِدھر اُدھر ہو جانے پر طیش آ رہا تھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اَب ککر کے سیفٹی والو کو اوپر کھول کر گھومتے ہوئے ویٹ کو ہٹا دینا ہے؛ کہ اُسے بوٹیاں کھڑی کھڑی رکھنا ہی اچھا لگتا تھا۔ اُس نے اَپنے تجربے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر یہ کچھ اور وقت گلتی رہیں تو آخر میں خود ہی ہڈی چھوڑ کر مزا کِرا کِرا کر دیں گی۔

ایسے ہی ایک لمحے میں اُس کی نظر اَپنے ہاتھوں پر پڑی تھی اور اُسے لگا تھا جیسے اُس کی ہڈیوں نے گوشت چھوڑ دیا تھا۔

کھانا پکاتے پکاتے یوں اپنے وجود کے بارے میں سوچنا' اُسے دِھیان ٹوٹنے جیسا لگا تھا ایسی مکروہ حرکت' جس سے اُس کی ریاضت میں رَخنے پڑ گئے تھے۔ اُس نے پھر سے دِھیان جوڑنا چاہا۔ اُس کی نظر بار بار ککر کے جھوم جھوم کر گھومتے اور چھوں چھاں کر کے بھاپ چھوڑتے ویٹ پر پڑتی تھی مگر جب وہ ٹا کی کی تلاش میں اُنگلیاں چولہے کے نیچے گھسیٹر رہی تھی تو یہ فیصلہ ہی نہ کر پاتی تھی کہ پہلے وہ ککر کے سیفٹی والو کو کھولے گی' اُس کا اَپنے ہی محور پر گھومتا اور جھومتا ویٹ اُتارے گی یا توے کے کڑے کو پکڑ کر اُسے اِیک جانب کرتے ہوئے چپاتی کے کچے کنارے سینکے گی کہ اُس کی نظروں کو ہاتھ کی ہڈیوں سے اُچھلتے ہوئے گوشت نے جکڑ لیا تھا۔

وہ شروع سے ایسی نہ تھی۔ اسے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تو اپنا دھیان باندھ لیتی تھی۔ یوں سب مخمصے دھواں ہو جاتے تھے۔ چوں کہ وہ اَندر سے اَڑیل اور خود سر نہ تھی لہذا بہت جلد اُسے' سب ہو

چکنے فیصلے اُپنے کیے ہوئے لگنے لگتے۔ اِس روّیے نے اُسے اِس قدر سہل اور اِتنا میٹھا بنا دیا تھا کہ اُس کا شوہر انور اس کے وجود سے بندھ سا گیا تھا؛ اُس پالتو جانور کی طرح جو ایک کھونٹے پر باندھ باندھ کر اِس قدر سدھا لیا جاتا ہے کہ بعد ازاں گردن میں پڑی ہوئی رسی کھلی بھی رہے تو وہ خود کو اِسی سے بندھا ہوا جان کر ہمیشہ وہیں آ کر کھڑا ہو جایا کرتا ہے۔

جب انور نے کار عین گیٹ کے سامنے روکی ہوگی تو معمول کے مطابق اُسے نیوٹرل کرنے' اور ہینڈ بریک کھینچنے کے بعد ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھایا ہوگا کہ اُس روز بھی یہ آواز ہر روز کی طرح اُس تک پہنچ گئی تھی۔ یہ آواز اِدھر اُدھر خطا ہو گئی کہ اُس کی نظر کو ہڈیاں چھوڑنے والے گوشت نے جکڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں جانتی تھی کہ انور نے کتنی بار ایکسی لیٹر پر پاؤں کا بوجھ بڑھایا تھا؛ تاہم وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ انور نے ہارن نہ دیا ہوگا۔ عین گیٹ پر کار کھڑی کر کے ہارن دینا اُسے بہت معیوب لگتا تھا اور ویسے بھی اُس نے اسے کبھی اِتنا اِنتظار کرنے ہی نہ دیا تھا کہ وہ اُکتا کر ہارن بجانے لگے۔ انور نے ہارن نہیں بجایا ہوگا مگر اس کا دِل وَسوسوں سے بھر کر زور زور سے ضرور بجنے لگا ہوگا۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کار کے اِنجن کی آواز پر نہیں چونکی تھی بل کہ ڈھلکے ہوئے گوشت نے خود ہی اُس کی نظروں کو چھوڑ دیا تھا۔ اُس نے جلدی سے اَدھ پکّی روٹی کو گھسیٹ کر توے سے ہٹا لیا اور مُڑتے مُڑتے کُکر کے ویٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پہلے تو اُس کے اردگرد سے نکلتی بھاپ نے اُس کا ہاتھ جلایا اور پھر ویٹ کے لمس نے۔ اُس نے ارادہ بدل دیا اور چولہے کا شعلہ مدہم کرنے کو ناب گھما کر باہر نکل گئی۔

باہر اُس کا شوہر اُپنی کار میں یوں مرا پڑا تھا کہ اُس کی طرف والا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا؛ ایک پاؤں نیچے جھول رہا تھا اور دوسرا ابھی تک ایکسی لیٹر پر جما تھا۔

ڈاکٹر اتنی محویت سے ایک ایک تفصیل بتا رہی تھی کہ اُس کا سارا وجود ہال کی یخ بستگی کے باوصف پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ محبت اور موت کے اِس تذکرے نے ماحول کے پیالے میں ایک نامانوس سا لطف اور عجب سی بے کلی اُنڈیل دِی تھی۔ سب اَپنی اَپنی نشستوں پر ساکت ہو گئے تھے سوائے ڈاکٹر نعمان کے جو مسلسل پہلو بدل رہا تھا۔

مدہم روشنیاں جیسے خود ہی معمول پر آ گئی تھیں۔

''بورڈ کے معزز ممبران''

ڈاکٹر نوشین نے اَپنی منّی سی ناک کے نیچے جمع ہو جانے' اور شفاف پیشانی سے پھسل پھسل کر آنے والے پسینے کو ٹشو میں جذب کرتے ہوئے کہا:

''ایک عورت اَپنے وجود میں ہی زندہ رہتی ہے۔ اس کا کام کرنا بھی دراصل اس کے اسی وجود کی ایکسٹنشن ہوتا ہے اور ایک مرد......''

اُس نے جان بوجھ کر لمبا سانس لیا تھا' کسی بوجھ کو دِل سے اُتارنے کے لیے۔

''جی مرد تو اَپنے اِختیار اور اَپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی دنیا سے نکلتا ہی نہیں ہے۔

عورت کا وجود بھی اس کے اختیار کی دنیا کا علاقہ ہے۔

مگر نفیسہ اور اس کا شوہر انور ان معمولی مردوں اور اُتھلی عورتوں میں سے نہیں تھے۔

یہی سبب ہے کہ مرد اَپنی عورت کی محبت میں مر گیا......

اور عورت اسے ایسا قتل گردان رہی ہے جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا......

اپنے آپ کو اَذِیّت دینے کے لیے وہ بار بار اَپنے ہاتھوں کا گوشت دانتوں سے کاٹ کاٹ کر زخمی کر ڈالتی ہے''

ڈاکٹر نوشین کی سانسوں کی بے ترتیبی اُسے مزید کچھ کہنے سے روک رہی تھی۔

''فوری شاک کے بعد کا مَنٹل ڈس آرڈر' ڈپریشن یا پھر زیادہ سے زیادہ بیک

ہسٹری کی بنیاد پر (Schezo) شیزو کیس بنتا ہے"

ڈاکٹر انیس نے ایک بار پھر عجلت میں تخمینے لگائے۔ ڈاکٹر نوشین نے اپنی سانسوں کی پروا نہ کی اور اس بار بھی برسنے میں ایک لمحے کا توقف نہیں کیا:

"نہیں ڈاکٹر انیس یہ ڈپریشن، مینٹل ڈس آرڈر یا Schezoohrenia کا معمولی کیس ہے نہ idiocy کا، بل کہ یہ تو۔۔۔۔۔۔۔"

"ایک منٹ ڈاکٹر نوشین پلیز، ابھی آپ کو اپنی رائے نہیں دینا چاہیے۔"

ڈاکٹر نعمان نے نوشین کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور خیال ظاہر کیا:

"ابھی اِس کیس ہسٹری میں کچھ خلا باقی ہیں۔"

ڈاکٹر نوشین نے ایک بھرپور نظر ڈاکٹر نعمان پر ڈالی جو ریوالونگ چیئر میں دھنس کر کچھ اور چھوٹا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نعمان نے نوشین کی نظروں کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا:

"پہلے سوالات کا سیشن ہو جانا چاہیے"

"جی ضرور، موسٹ ویل کم"

وہ بول پڑی، جیسے پہلے ہی سے اس کے لیے تیار ہو۔ ممبران کے چہرے چغلی کھا رہے تھے کہ وہ اسے غیر معمولی کیس ماننے کو تیار نہ تھے۔ اُن کے سوالات سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ایک عمومی کیس پر اَپنے وقت کے ضیاع پر بھی ناخُوش تھے تاہم اُنہوں نے اَب تک کی گئی کونسلنگ اور میڈیسن تھراپی کے حوالے سے کئی سوالات کیے۔ ڈاکٹر نوشین نے سب سوالوں کے جوابات نہایت تحمل سے دِیے۔ تاہم پریذنٹیشن کے خاتمے تک اُس کا وجود ٹوٹنے لگا اور اُسے اندازہ ہو گیا کہ بہت جلد بخار اُسے آ لینے والا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر نعمان کے آفس چل کر کافی پینے کی دعوت کو نظر انداز کیا، گاڑی نکالی اور سیدھا گھر چلی آئی۔

اَگلے ایک گھنٹے تک اُس کا بدن بخار میں پھنکتا رہا۔ اُسے سینے کے اَندر اُوپر کی طرف ایک چبھن سی محسوس ہوئی جو بہت گہرائی میں اُترتی تو تھی پوری طرح معدوم نہ ہوتی تھی۔ بخار اور بھی تیز ہوا تو وہ اَپنے بدن کی تپش اور سینے کی دُکھن سے بے نیاز ہوگئی۔ اِسی کیفیت کے کسی لمحے میں وہ اُٹھی' چاروں طرف دیکھا تھا؛ سارے کمرے میں ایک خلا سا گونج رہا تھا۔ اس نے بغیر کسی پیش بندی کے اپنے آپ کو اِس خلا میں جھونک دیا۔حتّٰی کہ باہر اُسے کسی کار کے رُکنے کا اِحساس ہوا۔ آنے والے نے کار کا اِنجن بند کیا' نہ ہارن بجایا تھا۔ اُسے اِشتیاق ہوا تاہم اُس نے حیرت سے اس تصویر کو دیکھا جس میں وہ اپنے بیٹے اور شوہر کے ساتھ مل کر اتنی بے ریا ہنسی ہنس رہی تھی کہ پوری تصویر روشن ہوگئی تھی۔ تصویر میں بیٹے کے چہرے کا رُخ ماں کی طرف تھا اور وہ خود اپنے شوہر کو گوشہ چشم سے دِیکھتے ہوے پورا منھ کھول کر ہنس رہی تھی۔ اُس کے شوہر کے بھیگے ہوے ہونٹوں میں سے دَب دَب کر مسکراہٹ یوں نکل رہی تھی جیسے گیلے ہاتھوں سے تڑپتی ہوئی مچھلی پھسلتی ہے؛ زور لگا کر اور اَپنے وجود کی چمک اُچھال کر۔ عین اُس لمحے اسے کافی پیئے بغیر گھر چلے آنا ایک فاش چُوک لگا تھا۔

جب آنے والے نے ایکسی لیٹر پر پاؤں رَکھ کر اِنجن کی آواز پیدا کی تو اُس کا ہاتھ تصویر کو تھام چکا تھا۔ اَب تو وہ باقاعدہ خود کو کوس رہی تھی کہ اِتنی عجلت میں کیوں نکل آئی تھی۔ دوسری بار کار کے اِنجن کی آواز نے اُسے اِس قدر حیرت اور بوکھلاہٹ سے دوچار کیا کہ اُسے خود کو کوسنا موقوف کرنا پڑا مگر اِس اَثنا میں تصویر پھسل کر نیچے گر گئی تھی۔ وہ تصویر اُٹھانے کو جھکی اور اُسے تھاما ہی تھا کہ ایک بار پھر ویسی ہی آواز آئی۔ اِس بار اُس کا دِل اُس کے حلقوم تک یوں اُچھلا کہ واپس اَپنے ٹھکانے پر بیٹھ نہ سکا۔ وہ باہر کی سمت لپکی مگر وسطی میز سے اُلجھ کر وہیں ڈھیر ہوگئی۔ پہلے تصویر کے فریم پر جمی اُنگلیاں ڈھیلی پڑیں اور جب فریم دبیز قالین پر بغیر آواز پیدا کیے گر گیا تو اس کا ہاتھ میز سے ڈھلک کر عین تصویر کے اوپر یوں جا پڑا' کہ اس کے نیچے ڈاکٹر نعمان کی دَبی دَبی ہنسی پوری

طرح دفن ہو گئی تھی۔

نئی الیکٹرا

وہ کہتی ہے، وہ یوری پیڈیرز کی الیکٹرا جیسی ہے۔

فرق ہے تو اِتنا سا کہ پرانے والی الیکٹرا کو اُس کی بے وفا ماں اور اُس کے بد طینت عاشق کی وجہ سے سب کچھ چھوڑنا پڑا، جب کہ اُسے یعنی نئی الیکٹرا کو، جن لوگوں کی وجہ سے گھر بدری پر مجبور ہونا پڑا اُن میں ایسے لوگوں کے نام آتے ہیں جن کا وہ بتانا نہیں چاہتی۔

لوگ کہتے ہیں۔

وہ الیکٹرا نہیں خود کلائٹمنسٹرا ہے۔

شاطرہ، بے وفا، بد کردار......

گھر بدری محض ایک ڈرامہ تھا......اور جب وہ یہ کہتی ہے کہ وہ لوگوں کے نام بتانا نہیں چاہتی تو دراصل اُس کے ذِہن میں اِیک نام بھی نہیں ہوتا......وہ تو محض ڈرامے کا جملہ بولتی ہے۔

لوگ یہ بھی کہتے ہیں۔

پرانے والی کلائٹمنسٹرا نے اپنے شوہر ایگمنان کو اَپنے عاشق سے مل کر قتل کرایا تھا جب کہ اِس شاطرہ نے اَپنے بدطینت شوہر سے مل کر اُن سب کو تلوار کی دَھار پر رَکھا ہوا ہے جو اُس کی طرف نظر اُٹھانے کا جرم کرتے ہیں۔

وہ بتاتی ہے۔

جب نئے والے ایگمنان کو قتل ہوے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا تو اُس نے چال چلی تھی ویسی ہی چال جیسی پرانی والی الیکٹرا نے چلی تھی۔

بس فرق اِتنا تھا......

پرانی والی الیکٹرا نے یہ پیغام بھیجا تھا کہ اُس کے ہاں بچہ ہو چکا ہے جب کہ اُس نے' یعنی نئی الیکٹرا نے' ڈھونگ رچایا تھا کہ اُس کے پیٹ میں بچہ ہے اور بچہ اس قدر نیچے کھسک آیا ہے کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے۔

لوگ کہتے ہیں:

وہ الیکٹرا نہیں' کلائٹمنسٹرا ہے۔

دغاباز' فریبی' مکار......

یوں بھی حمل کسی قسم کا ڈھونگ رَچانے سے بھلا کب باز رکھ سکتا ہے۔ عمر ریوا بیلا کے ناول ''ری کوئیم فار اے وومین 'ز سول'' میں ریاستی جبر کا شکار ہونے والی سوزانا کی بے ربط یادداشتوں میں جس اَیلیشیا کا ذکر ملتا ہے وہ بھی حاملہ تھی۔

وہ پاگل نہیں تھی' مگر خود کو پاگل ظاہر کرتی تھی۔ اِس لیے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے نتیجے میں اُسے پاگل ہو جانا چاہیے تھا۔

جب وہ عجیب وغریب حرکتیں کرتی تھی تو اُس پر تشدد کرنے والے یقین کر لیتے تھے کہ وہ دیوانگی میں ایسا کر رہی ہے۔ جب کہ سوزانا اَپنی بے ربط یادداشتوں میں لکھتی ہے کہ وہ اِس

طرح کوئی اہم پیغام اُن تک منتقل کیا کرتی تھی۔

اُس نے بچے کا ڈھونگ نہیں رچایا تھا بچہ اس کے پیٹ میں تھا۔

پھر یوں ہوا' کہ وہ آ گئی۔

جب وہ آئی تو اس کے ہونٹوں پر گئے دنوں کے عذاب لمحوں کے تذکرے تھے۔

وہ کہتی......

اُس نے ایک ایک لمحہ رَو رَو کر گزارا ہے کیوں کہ اُسے اَپنے باپ یعنی نئے والے ایگمنان کے قتل کا دُکھ سہنا پڑا تھا اور اُسے ساری آسائشیں چھوڑنا پڑی تھیں جو اُس کے بدن میں حرارت' جلد میں چمک اور گالوں پر سرخی لا سکتی تھیں۔

جب وہ یہ کہتی تو لوگ اُس کے حُسن کی تعریف کرتے اور کہتے...... نام نہاد سختیوں نے تو اُس کے بدن کو گداز' ہونٹوں اور گالوں کو سُرخ جب کہ جلد کو مزید شفاف بنا دیا ہے۔

وہ کہتی......

جہاں وہ گھر بدری کے دن کاٹتی رہی تھی وہاں کے لوگ بہت اچھے تھے۔

پرانے والی الیکٹرا کا قصہ بھی ملتا جلتا ہے۔

جس کے ساتھ اُس کی شادی ہوئی تھی اُس نے اُسے چھوا تک نہ تھا۔

اور جس نے نہیں چھوا تھا؛ وہ چاہتا تھا الیکٹرا آرام سے رہے مگر وہ پرانی آسائشوں کو نہ بھول پائی تھی......وہ روتی رہتی تھی۔

وہ جو خود کو نئی الیکٹرا کہتی ہے وہ گھر بدری کے دنوں کو یاد کر کے دُکھی ہو جاتی ہے......اور کہتی ہے کہ......

وہ بہت اَچھے لوگ تھے......مگر پھر بھی وہ روتی رہتی تھی۔

لوگ کہتے ہیں۔

وہ الیکٹرا نہیں' کلائٹمنسٹرا ہے......

دغاباز، فریبی، عیار، مکار......

کچھ اور لوگ بھی ہیں، جو ذرا پرے کھڑے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

یہ اِدھر ہیں نہ اُدھر۔

اِن میں سے ایک کہتا ہے۔

وہ کالی داس کی شکنتلا ہے۔

ایسی شکنتلا کہ جسے کوئی راجہ دشینت نہیں ملا۔

وہ، جو خود کو راجہ دشینت سمجھتا ہے، اُس کے ہاتھ میں کوئی انگوٹھی نہیں ہے۔

خود کو راجہ دشینت کہنے والا دعویٰ کرتا ہے۔

اُس کی انگوٹھی مچھلی کے پیٹ میں ہے۔

وہ لوگ جو نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر......اُن میں سے ایک اور کہتا ہے......

یہی دعویٰ اس کے راجہ دشینت نہ ہونے کا ثبوت ہے۔

وہ مزید کہتا ہے۔

نہ تو مدعی دشینت ہے نہ اُس کے بازوؤں میں بازو ڈالنے والی شکنتلا......وہ تو بس راسین کی فیدرا جیسی ہے۔

جوانی، حسن اور جذبات سے بھری ہوئی۔

جو جذبات سے آگ بھڑکاتی ہے اور سب کو راکھ بنا ڈالتی ہے۔

وہ لوگ جو اُدھر ہیں، نہ اِدھر، اُن میں سے تیسرا کہتا ہے۔

وہ سارے لوگ جو اِدھر بھی ہیں اور اُدھر بھی بالزاک کے اُس بوڑھے گوریو جیسے ہیں، جو کامیڈی ہیومن میں اپنی بیٹیوں کے لیے سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔

وہ کہتی ہے۔

وہ تو سب کی بیٹی ہے۔

لوگ کہتے ہیں۔

وہ چھنال ہے۔

وہ ہنستی ہے اور تکرار کرتی ہے کہ

وہ تو سب کی بیٹی ہے۔

تیسرا آدمی اپنی بات آگے بڑھاتا ہے۔

لوگ بوڑھے گوریو کی طرح ہیں اُسے اپنی بیٹی نہ سمجھتے ہوئے بھی اُس پر سب کچھ قربان کرتے چلے جارہے ہیں۔

وہ اُسے جھوٹا کہتے ہوئے بھی اُس سے محبت کرتے ہیں کیوں کہ وہ کہتی ہے کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔

لوگ چوں کہ بوڑھے گوریو جیسے ہیں لہٰذا چھنال کے عاشقوں کو بھی دعا دے رہے ہیں۔ وہ دعا کے لیے اٹھے ان ہاتھوں سے لمبی مہلت کے دانے اٹھا کر نفاست سے بٹے ہوئے دھاگے میں ڈال لیتی ہے۔

یہ دانے اس کی انگلیوں سے پھسلتے ہیں اور ہونٹوں پر عجب سی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔

لوگ اُس وقت سے دعا کرنے کے عادی ہو گئے ہیں جب سے اس نے مظلومیت کا سوانگ بھرا ہوا تھا۔

لوگ کہتے ہیں۔

اس کی گھر بدری محض ڈھونگ تھا' آنکھوں میں دھول تھی' ایک فریب تھا' ڈرامہ تھا وہ چاہتی تو واپس آسکتی تھی۔

لیکن لوگ پھر بھی دُعا کرتے آتے رہے؛ اس لیے کہ لوگ بوڑھے گوریو جیسے ہیں۔

وہ جو نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر' وہ کہتے ہیں۔

لوگوں کی یہی سادگی کبھی کبھی بے وقوفی کی حدوں کو بھی چھونے لگتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں۔

اُس نے الہ دین کا جادوئی چراغ رگڑا تھا اور اَپنی ساری آسائشیں وہاں منتقل کر دی تھیں جہاں وہ گھر بدری کے دِن گزر رہی تھی۔ وہیں وہ خُون اور پیپ کے پیالے لنڈھاتی تھی؛ یہ پیالے اُسے اُس کے چاہنے والے فراہم کرتے تھے۔

الہ دن کا چراغ الیکٹرا والے اصل قصے میں نہیں ہے ...... مگر حیرت ہے کہ وہ خود سارے قصوں میں ہے اور سارے ہی قصے اُس کے آگے بے بس ہیں کہ اس کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہ جاتے ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایگمنان قتل ہو گیا۔

وہ کہتی ہے۔

اَب قتل ہونے والا ایگمنان نہیں بل کہ ایجس تھیس تھا۔

غاصب، ظالم اور اصل ایگمنان کا قاتل۔

اَصل ایگمنان سے اُس کی مراد یوری پیڈیز والا نہیں بل کہ اُس کا اپنا باپ ہے۔

مگر کچھ لوگوں کا اصرار ہے۔

اِس بار قتل ہونے والا ایگمنان ہی تھا۔

وہ کہتی ہے۔

جو قتل ہوا ہے اُسے قتل ہو جانا چاہئے تھا؛ اگرچہ اس قتل میں اُس کے بھائی یعنی نئے والے لیسٹس کا کوئی ہاتھ نہیں، مگر جو ہوا اچھا ہوا اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔

لوگ کہتے ہیں۔

بہت ظلم ہوا اور اِس ظلم کے پیچھے اُس شاطرہ، اُس کے بھائی اور اُن چالیس چوروں کا بھی ہاتھ ہے جو مرجینا والے نئے قصے میں اَپنے دروازے مرجینا کے لیے کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔

الیکٹرا اور کلائٹمنسٹرا کے قصے میں چور نہیں ہیں۔

مگر اِس قصے میں چوروں کا تذکرہ تواتر سے آتا ہے۔

وہ کہتی ہے۔

اگر اُسے چوروں والے قصے کی مرجینا سمجھ لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔

وہی مرجینا جو بے حد حسین تھی اور عقل مند بھی۔

لوگ کہتے ہیں۔

وہ چوروں والے نئے قصے کی دغا باز اور فریبی مرجینا ہے؛ ایسی مکار ارحرافہ کہ اپنے ہی مالک کی آنکھوں میں دُھول جھونکتی ہے۔

جب ہنہناتے گھوڑے بندھ چکتے ہیں اور اُس کا مالک اِعتماد کے نشے میں لڑھک چکتا ہے تو چپکے سے اٹھتی ہے۔

اور باری باری اُن چوروں کے بستروں میں جا گھستی ہے جو اُس کے مالک کے جاگتے ہوئے اُسے دیکھنے کا حوصلہ بھی نہ کر پاتے تھے۔

مگر جوں ہی اُس کا مالک جاگتا ہے۔

وہ پاک دامن اور عفیفہ بن جاتی ہے۔

اُس کے ہاتھوں میں مضبوط بٹے ہوئے دھاگے میں پروئے ہوئے دانے ہوتے ہیں۔

یہ دانے اس نے دعا کے لیے اُٹھے ہاتھوں سے اُچکے تھے۔

دُعا کے لیے اٹھے ہاتھ اُن لوگوں کے تھے جو اَپنی نہیں بل کہ بوڑھے گوریو کی جون میں تھے۔

لوگ کہتے ہیں؛ وہ جھوٹی ہے۔

مگر وہ دانے گن گن کر اسمِ اعظم کا ورد کرتی ہے۔

اور جب وہ ورد کرتی ہے تو چالیس کے چالیس چور اس کے لیے کھل جا سم سم کہتے ہیں۔

وہ لوگوں کی طرف مسکرا کر دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔

وہ الیکٹرا ہے۔

نظروں کے سامنے جتنی بھی تصویریں متحرک ہیں سب ایک ہی جاپ جپ رہی ہیں۔

وہ الیکٹرا ہے۔

گلیوں کا خُون پکارتا ہے۔

وہ کلائٹمنسٹرا ہے۔

دغاباز' فریبی' مکار......

مگر لوگ اسے دیکھنے اور سننے پر مجبور ہیں۔

اِس لیے کہ اس کے پاس مرجینا والی چمکتی جلد' فیدرا جیسے بھڑکتے جذبات' الیکٹرا جیسی بلند ہمتی کلائٹمنسٹرا جیسی عیاری' ایلیشیا جیسا ڈھونگ' شکنتلا جیسا حسن اور چالیس چوروں کی طاقت ہے۔

رُکی ہوئی زِندگی

وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا اُندیدہ ہو کر۔

عاطف اُسے دِیکھ رہا تھا' ہک دَک۔ کراہت کا گولا پیٹ کے وسط سے اُچھل اُچھل کر اُس کے حلقوم میں گھونسے مار رہا تھا' یوں کہ اُسے ہر نئے وار سے خود کو بچانے کے لیے دِھیان اِدھر اُدھر بہکانا اور بہلانا پڑتا۔

وہ بھوکا تھا۔

شاید بہت ہی بھوکا' کہ سالن کی رکابی اور روٹیوں کی چنگیر پر پوری طرح اوندھا ہو گیا تھا۔ جتنی دیر وہ چپڑ چپک چپڑ چپاک کر کے کھاتا رہا' عاطف اُس کے پراگندہ بالوں کے نیچے

اور پیچھے چھپ جانے والے چہرے کو ڈھنگ سے دیکھنے کے جتن کرتا رہا اور اُن معصوم لکیروں کو تلاش کرتا رہا جو کبھی تھیں' اَب کہیں نہیں تھیں۔ وقت کی سفا کی نے سب کچھ مِٹا کر ایک نئی تحریر لکھ دی تھی۔

ایسی تحریر جو پورے بدن میں اِضمحلال بھر رہی تھی۔

وہ پوری طرح جھکا ہوا تھا۔

اور اُس کے جبڑوں اور ہونٹوں کے باہم ٹکرانے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔

وہ بہاول پور سے عاطف کے ہاں پہنچا تھا۔ کیوں؟ یہ اُس نے نہیں بتایا تھا۔

شاید اس کا ابھی موقع بھی نہیں آیا تھا کہ وہ تو دفتر سے گھر واپسی پر اُسے گیٹ پر ہی مل گیا تھا۔

عاطف جس دفتر میں کام کرتا تھا وہاں کوئی اور اُصول ضابطہ ہو نہ ہو' چھٹی وقت پر مِل جایا کرتی۔ وہ سیدھا گھر پہنچتا کہ شائستہ اُس کی منتظر رہتی تھی۔

شروع شروع میں عاطف کو یقین تھا کہ یہ سچ مچ کا اِنتظار تھا' اَندر سے اُٹھتی تاہنگ والا' تبھی تو اُسے سیدھا گھر آنے کی عادت ہو گئی تھی مگر بعد اَزاں یہ ہوا کہ سب کچھ اُس کے معمولات کا حصہ ہو گیا۔

شائستہ کو بھی پہلے پہل اِنتظار میں لطف آتا تھا۔ کھٹا میٹھا لطف۔

اگرچہ اوجھ جیسے وجود نے پہلے ہی دِن اُس کے اَندر کراہت کی ایسی گولی سی رکھ دی تھی جو اُسے دیکھتے ہی خود بخود دُھواں چھوڑنے لگتی مگر کہیں نہ کہیں سے لذت کی مہک بھی اُٹھتی رہتی۔

دوسرے بدن کو چھو لینے کی لذت یا پھر اُسے دِیکھنے اور دِیکھے چلے جانے کی لذّت۔

وہ جیسا بھی تھا؛ اُس پر نظر ڈالتا تھا۔ ایک تارنہ سہی؛ جھجک جھجک کر سہی اور لُکنت زدہ لفظوں سے اتنی پھسلن بنا ہی لیتا کہ وہ اُس پر کوشش کر کے ہی سہی' پہروں پھسل سکتی تھی اور دُور تک'

بہت دُور تک جا سکتی تھی۔

مگر رَفتہ رَفتہ عجب اُفتاد آن پڑی کہ پہر سکڑنے لگے۔

اور یُوں لگتا تھا کہ وہ دونوں لذت کے زور سے جتنی دُور جا سکتے تھے' جا چکے' کہ اَب تو بدن میں کساوٹ اُترنے لگتی اور شائستہ کو کوفت ہوتی تھی۔

جب اُس نے آ ہی جانا ہوتا تو اِنتظار کیوں؟ اور اضطراب کیسا؟؟

غیر مانے' عادت نہ مانے۔ عادت نہ کہیں بدن کہ لیں۔

عادت کی ڈوری میں بندھا بدن دُکھتا تھا۔ دُکھتا تھا اور ٹوٹتا تھا۔

اس ٹوٹتے بدن کو پھر بھی اِنتظار کی گرہ دِی جاتی رہی حتّٰی کہ عادت معمول ہو گئی۔

دونوں میں ہمت نہ تھی کہ وہ معمول کے اِس دائرے کو توڑ ڈالیں۔

یوں نہیں تھا کہ عاطف گھر آتا تو پھر باہر نکلتا ہی نہیں تھا۔ لاہور ایسا شہر تھا جو کئی کئی گھنٹوں کے لیے مصروف رَکھ سکتا تھا۔ بے تکلف دوستوں سے ملتا۔ اِحباب کی مہذب مجالس میں بیٹھتا یا پھر اُس سے ملتا جو سارے فاصلے ختم کر ڈالنے کے ہنر جانتی تھی۔

وہ فاصلے یوں ختم کرتی تھی' جیسے کہ وہ ہوتے ہی نہیں تھے۔

پہلے وہ اُن موضوعات کو چھیڑتی جو عاطف کی کم زوری تھے یا پھر عاطف جن پر سہولت اور رغبت سے کچھ کہ سکتا تھا۔ وہ اَپنی بات کہ رہا ہوتا تو وہ چپکے سے اُپنے جذبوں کے دھاگے کا سرا' اُس کی چلتی بات کے ساتھ باندھ دِیتی اور پھر گرہ پر گرہ دِیے چلی جاتی۔

یہ جذبے اُس فتنے کی خیزش سے بندھے ہوتے جو عاطف کو گھر پلٹنے تک برف کا تودہ بنا دیا کرتے تھے۔

اکثر یوں ہوتا کہ عاطف گھر لوٹتا تو شائستہ کا بدن خفگی کے تناؤ کی لہریں چھوڑ رہا ہوتا۔

بدن کی کوسوں کے اُوپر ہی اُوپر تیرتی یہ لہریں ایسے لمس کی تھپکی مانگتی تھیں جو عاطف کے

اُندر رُوپی نے باتوں کے کھانچے میں کہیں یخ بستہ کر دِی تھی۔

جب کہ شائستہ غصے سے کھولتی تھی۔ کھولتی تھی اور کچھ نہ بولتی تھی۔

کہ وہ پہل کر کے بولے چلے جانے کی عادِی نہیں ہوئی تھی۔

عاطف کبھی کبھی چاہتا کہ وہ اُس پر برس پڑے' لڑے جھگڑے اور جو کچھ اُس کے بدن کی سطح مرتفع پر لہریں سی چھوڑ رہا تھا اُسے چیختے چنگھاڑتے لفظوں میں ڈال دِے۔ یوں کہ عاطف کے لیے اپنی بات کہنے کی گنجائش پیدا ہو۔

وہ بات جس سے خیزش کی تانت بندھی ہوتی ہے۔

مگر اس کا بدن سمندر کی بھوکی بپھری لہروں کی طرح اُوپر نیچے ہوتا رہتا اور ایسا شور چھوڑتا' جو ماحول کا حصہ ہو کر سکوت میں ڈھل جاتا ہے یا پھر ایسا شور جو اپنی دہشت سے پرے دھکیل دِیتا ہے اور سماعتوں کو بند کر دیتا ہے۔

وہ سننا چاہتا مگر کچھ بھی سُن نہ پاتا تھا کہ ایک سکوت تنا ہوا تھا۔ گاڑھا' گھمبیر اور گھمس والا سکوت۔ یا پھر شاید ایک دہشت کا تناؤ تھا' دِل کھینچ لینے والی دِہشت کا طالح تناؤ۔

معمول کبھی کبھار ٹوٹ بھی جاتا تھا۔ ایسے کہ جیسے کوئی بے دِھیانی میں ایک ہاتھ دُوسرے ہاتھ کی طرف لے جاتا ہے۔ دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں بائیں کی اُنگلیوں میں بٹھاتا ہے' ہتھیلیوں کو سامنے کر کے دونوں کہنیوں کو تان لیتا ہے اور پھر عین انگلیوں اور ہتھیلیوں کے جوڑ سے چٹخارے نکال دِیتا ہے۔

احباب کے دَائرے میں وہ ایک مثالی جوڑا جانے جاتے تھے۔ جب کبھی تقاریب میں اُنہیں اکٹھے شریک ہونا پڑتا' تو وہ ایک دوسرے کے آس پاس ہی رہتے۔

شاید اُس فاصلے کو پرے دھکیلنے کے لیے' جو دونوں کے بیچ تھا۔

وہ ایک دوسرے کو احتیاطاً دِیکھ لیا کرتے' کھسیانے ہوتے' ہنس دِیتے اور لوگ اُن کا یوں

مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنا حسرت اور لطف سے دیکھا کرتے تھے۔

مگر کچھ تو تھا' جو دُونوں کے بیچ تھا اور کچھ ایسا بھی تھا' جو دونوں کے بیچ نہیں تھا۔

مرد اَپنی عورت سے چھپ چھپا کر باہر جو کچھ کرتا ہے' عورت اُسے جان لیا کرتی ہے۔

شاید اس لیے کہ باہر کی ساری کارگزاری وہ بے خبری میں اَپنے تن پر لکھ لایا کرتا ہے' یوں کہ وہ خود تو اُس تحریر سے بے خبر ہوتا ہے مگر عورت اُسے پڑھ لیتی ہے۔ ایک ایک لفظ کو۔ ایک ایک شوشے اور نقطے کو اور اُن وقفوں کو بھی جو اِن لفظوں اور سطروں کے بیچ پڑتے ہیں۔

شائستہ نے عاطف کے بدن کے اوراق پر لکھے متن کو جب پڑھا تھا تو وہ رُوبی کی خُوشبو تک سے آگاہ ہو گئی تھی۔

اس کی جگہ کوئی بھی اور ہوتی تو وہ بپھر جاتی مگر وہ ایسی عورتوں میں سے تھی ہی نہیں' جو کسی بھی بات کو خود ہی آغاز دِے لیا کرتی ہیں۔

اُسے تو خود آغاز چاہیے تھا۔ بھیگا ہوا آغاز۔

ایسا کہ جس کا اَنجام بھی بھیگا ہوا ہو۔

عاطف کے پاس اَیسے الفاظ کہاں تھے جو پہل قدمی کا ہنر جانتے ہوں کہ ایسے اَلفاظ تو ہر بار اُس کے بدن کی جھولی میں رُوبی ڈالا کرتی تھی۔

اور وہ اسی کا عادی تھا۔

اِس عادت نے شائستہ کے بدن میں کسمساہٹ' بے قراری اور اِضطراب کی موجیں رَکھ دِی تھیں۔ وہ سارے گھر میں اِدھر اُدھر بکھرے تعطل کو باہر دھکیلتی رہتی' شاور لیتی تو پانی کی پھوار تلے سے نکلنا جیسے بھول ہی جاتی' حتیٰ کہ اُسے یوں لگنے لگتا جیسے جسم کے اُوپر ایک جھلی سی نمودار ہو گئی ہو۔ وہ لرزتے ہاتھوں کی لمبی پوروں سے اُس جھلی کو چھوتی تو لمس بدن کے اُوپر ہی اُوپر تیرتا رہتا۔ اِدھر سے اُوب کر باہر نکلتی تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر آئینے میں خود کو دِیکھے جاتی۔

پورا کمرا، اِمپورٹیڈ باڈی لوشنز اور پرفیومز سے مہکنے لگتا۔ اِسی مہک میں کپڑوں کی سرسراہٹیں جاگتیں، ویکسنگ اور پفنگ کے بعد بلش آن اور کاسمیٹکس کے اِنتخاب میں ایک مدت گزر جاتی۔ جب وہ اَپنے اطمینان کی آخری حد تک سنور چکی ہوتی، تو وہ آئینے میں خود کو پہلو بدل بدل کر دیکھتی دیکھتی اور دیکھے چلے جاتی، حتیٰ کہ آئینہ وہ منظر دکھانے لگتا تھا جس میں وہ نہیں ہوتی تھی۔

اِسی اَثنا میں کام کاج میں ہاتھ بٹانے والی آجاتی تو اُسے کئی کام سوجھ جاتے۔ جلدی جلدی ٹشو پیپرز سے چہرے پر جمی میک اَپ کی تہیں اُتار دِیتی۔ جب ٹشو پیپرز کا ڈھیر لگ جاتا تو اُس کی مصروفیت کا ڈھنگ بدل جاتا۔ گھر کو خوب چمکایا لشکایا جاتا۔ صاف ستھری چادروں کو پھر سے بدلا جاتا۔ اِدھر اُدھر دیواروں پر چھینٹے ڈھونڈ ڈھونڈ کر صاف کیے جاتے۔

یہاں تک کہ وہ نڈھال ہو جاتی۔

ایک اِنتظار کے لیے موزوں حد تک نڈھال۔

پھر وہ آجاتا تو اُس کے بدن پر لہریں سی اُٹھتیں۔

لہریں اُٹھتی رہتیں اور اُس کا بدن ٹوٹ جاتا؛ اُن لفظوں کی چاہ میں جو آگے بڑھ کر اُس کی ساری تھکن چُوس سکتے تھے۔

مگر عاطف تو خود پہل قدمی والے الفاظ کہیں سے مُستعار لینے کا عادی تھا۔

رُوبی سے اور رُوبی سے پہلے ایک اور لڑکی تھی فرحانہ، اُس سے۔

وہ بھی تو رُوبی جیسی ہی تھی۔

شائستہ بہت بعد میں اُس کی زِندگی میں آئی۔ تب جب دونوں نے اُس کا بدن اوجھ جیسا بنا دیا تھا۔

کچوکوں سے بیدار ہونے والا۔

یوں جیسے اس کا بدن نہ ہو مٹی میں مٹی ہو کر اور مکر مار کر پڑ رہنے والا وہ لسلسا کیڑا ہو جسے پھل

سنگھی اُپنی لمبی چونچ کے ٹھونگوں سے جگاتی ہے۔

جب بہاولپور سے آنے والا میلا کچیلا شخص اُسے دروازے پر ملا' تب تک شائستہ کا ساتھ ہوتے ہوئے بھی کچوکوں سے بیدار ہونے کی عادت کو ساتواں برس لگ چکا تھا۔

اِس سارے عرصے میں وہ دو سے تین ہو چکے تھے۔ ڈیڑھ برس پہلے ہی اُن کے ہاں ننھے فرخ نے جنم لیا تھا جو اَب پوری طرح شائستہ کو اَپنی جانب متوجہ کیے رَکھتا۔

بہ ظاہر گھر مکمل تھا۔ مکمل اور پر سکون دِکھنے والا۔

سب کچھ ایک ڈھنگ سے ہوتا نظر آتا تھا۔

مگر وقت کی ڈِھینگلی کے سرے سے بندھا معمولات کا بوکا جو پانی باہر پھینکتا تھا' وہ دونوں کی زبانوں پر پڑتے ہی کھولتا رَصاص ہو جاتا تھا' آبلے بنا دینے والا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

یہ سوال دونوں کے سامنے آتا رہا مگر وہ اِس کا صحیح صحیح ادراک کر سکنے اور اِس پر قابو پا لینے کی صلاحیت نہ رَکھتے تھے۔ وہ تو شاید اِس ساری صورتحال کے مقابل ہونے کو تیار ہی نہ تھے۔ تب ہی تو عاطف کے ہوتے ہوئے بھی شائستہ ننھے فرخ ہی سے مصروف رہے چلے جانے کو ترجیح دِیا کرتی۔

وہ جانتا تھا کہ وہ کیوں فرخ کو گھٹنوں پر اوندھا کیے مالش کیے جاتی ہے؟ کس لیے اُس کے پاؤں کے تلووں پر گال رَگڑ رہی ہے؟ اُس کے پیٹ پر منہ رکھ کر پھوکڑے مارتی ہے تو کیوں؟ اُس سے باتوں میں مگن رہنا' لاڈ سے ہونٹوں میں لوچ ڈال لینا اور وہ کہے جانا جس میں کوئی ربط نہ ہو' عاطف کی سماعت سے ٹکرا کر مربوط ہو جاتا مگر عاطف تو صرف اپنے اوجھ بدن پر کچوے چاہتا تھا لہٰذا ننھے وجود کی نازک جلد پر نرم نرم چکنے ہاتھوں کا یوں پھسلنا' اُسے گیلے ہونٹوں کی لرزش دَبا کر بوسے دینا' ہونٹ جما کر اور پٹاخ کی آواز پیدا کرتے ہوئے' ماتھے پر' ہونٹوں' گردن' ناف اور

رانوں پر، حتیٰ کہ دائیں یا بائیں پاؤں کے انگوٹھے کے گرد ہونٹوں کو رکھ کر گھما لینا' سب کچھ رائیگاں چلا جا رہا تھا۔

تاہم فرخ اِس پیار کی بوچھاڑ سے کھل کھل ہنستا' غوں غوں کرتا اور زور زور سے اَپنے پاؤں مارنے لگتا تھا۔

جس روز بہاولپور سے اُن کے ہاں مہمان آیا' اس روز شائستہ پروگرام بنائے بیٹھی تھی کہ عاطف کے آتے ہی وہ ننھے فرخ کو نیم گرم پانی سے نہلائے گی کہ وہ اُسے قدرے مَیلا مَیلا لگ رہا تھا مگر جب وہ مہمان ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا نظر آیا جو اَز حد مَیلا تھا تو وہ اَپنا پروگرام بھول چکی تھی۔

اُس کے وجود میں لسلسلے وجود کی پہلے سے موجود کراہت کے ساتھ عجب طرح کی باسی گھن بھی گُھس بیٹھی تھی۔

عاطف اَپنے مہمان کو بٹھا کر ذرا فاصلے پر کھڑی شائستہ کے پاس آیا' بوکھلایا ہوا۔

جب اُسے کچھ کہنا ہوتا اور شائستہ کسی دوسری کیفیت کو چہرے پر سجائے ہوتی تو وہ یوں ہی بوکھلا جایا کرتا تھا۔

شائستہ کچھ سننے کے مُوڈ میں نہ تھی۔ اُس نے مہمان کے سلام کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا تھا کہ اِس نئے وجود سے اُمنڈتی گِھن کو اَپنے بدن میں موجود کراہت کے پہلو میں بٹھا چکی تھی' حتیٰ کہ سب کچھ نفرت میں ڈھل کر اُس کے چہرے سے چھلکنے لگا۔ شائستہ کے لیے اَپنے اِن شدید جذبوں کے ساتھ وہاں رُکنا ممکن نہ رہا تو وہ اَپنے قدموں پر گھومی اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ اِسی اثنا میں عاطف کچن میں خود کو معمول پر لاتا رہا۔ اگرچہ وہ مہمان کے لیے پانی لینے آیا تھا مگر ریفریجریٹر سے بوتل نکالنے کے بہانے اُسے پوری طرح کھول رکھا تھا۔ یوں کہ اُس کا سینہ اور چہرہ' دونوں یخ جھونکوں کے سامنے رہیں۔

اُسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب شائستہ اُس کے عقب میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ تو تب بدحواس ہو کر ایک طرف ہو گیا' جب اُس نے اَپنے دائیں ہاتھ سے اُس کے بائیں کندھے کو قصداً زور سے دبا کر اُسے ایک جانب دھکیلا تھا۔

وہ وہیں کھڑا دیکھتا رہا جہاں بوکھلا کر پہنچا تھا۔ شائستہ نے پانی کی بوتل نکالتے ہی قدرے جُھٹکے سے ریفریجریٹر کا دروازہ بند کیا تھا۔

پھر اُس نے سینک کے کونے میں پڑا وہ گلاس نکالا جو دونوں کے اِستعمال میں نہیں آتا تھا اوراس چنگیر کی جانب لپکی جس میں پہلے سے روٹیاں لپٹی ہوئی پڑی تھیں۔ شائستہ بچ جانے والی روٹیوں کو اِسی چنگیر میں رَکھتی تھی کہ صفائی والی ماسی آتی تو لے جایا کرتی۔

رکابی میں سالن بھی پہلے سے موجود تھا' شوربا' جس کی سطح پر ایک جھلی سی بن گئی تھی۔ شوربے کے بیچ میں پڑا ہوا اکلوتا آلو اَپنی رنگت بدل کر گہرا بھورا ہو گیا تھا۔ یقیناً ماسی آج نہیں آئی تھی۔ اُس نے اَپنے یقین کے استحکام کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی اور نشانی تلاش کر لیتا' شائستہ نے اُسے پھر چونکا دیا۔ وہ ایک ٹرے میں پانی کی بوتل' گلاس' چنگیر اور رکابی رکھ کر اُس کی سمت بڑھانے کے بعد لفظوں کو چبا چبا کر کہہ رہی تھی۔

''جب وہ کھانا کھا چکیں تو اصرار کر کے انہیں روک نہ لیجئے گا۔''

اُس نے اُسے نہیں روکا تھا مگر وہ خود ہی رُک گیا تھا۔

شائستہ سارا وقت اَپنے بیڈ روم میں اُوندھی پڑی رہی اور بہت دیر بعد جب عاطف کمرے میں آ کر آنے والے مہمان کی بابت اُسے بتا رہا تھا تو اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ اُسے کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔ ''ضرورت مند''۔ ''پرانا کلاس فیلو'' اور ''مدد'' جیسے الفاظ اُس کے کانوں میں پڑے تھے۔ ایک میلے کچیلے شخص کی اوقات کے لیے یہ کافی تھے لہذا اُس نے اَپنی سماعتوں کو بند کر لیا' پہلو بدل کر لیٹ گئی اور سارے بدن کو موج دَر موج اُچھل جانے دیا۔

اُگلے روز ناشتے تک وہ نہیں اُٹھا تھا۔ دفتر کے لیے تیار ہونے کے بعد اور ناشتے کے لیے بیٹھنے سے پہلے' عاطف نے ڈرائنگ روم میں جھانکا۔ وہ وہیں صوفے پر' عین اُسی رُخ لیٹا ہوا تھا؛ رات اصرار کر کے جس رخ لیٹ گیا تھا۔ مہمانوں کے لیے بیڈ روم اوپر تھا مگر وہ وہیں صوفے پر لیٹنا چاہتا تھا۔ لیٹ گیا اور اَب اُٹھنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ عاطف نے دِل ہی دِل میں اسے وہی گالی دِی جو اُسے بچپن میں دِیا کرتا تھا اور ناشتے میں مگن ہو گیا۔

جب وہ دفتر کے لیے نکلنے لگا تو عاطف میں ہمت نہ تھی کہ وہ شائستہ کو مہمان کے حوالے سے کوئی ہدایت دِیتا یا فرمائش کرتا۔ کوٹ کی جیبوں کو ٹٹول کر اپنا چرمی پرس نکالا' اُس میں سے اَپنا وزیٹنگ کارڈ الگ کیا اور اُس میز پر رَکھ دِیا جس کے قریب پڑے صوفے پر وہ یوں بے خبر سو رہا تھا کہ سارا ڈرائنگ رُوم اُس کے خراٹوں سے گونجتا تھا۔

بے اِختیار وہی گالی عاطف کے ہونٹوں پر پھر سے گدگدی کرنے لگی۔

اُس کے ہونٹ بے اختیار پھیلتے چلے گئے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور باہر نکل گیا۔

دفتر میں وقفے وقفے سے اُسے مہمان کا خیال آتا رہا۔

رات اُس نے جو دل چسپ باتیں کی تھیں' اُنہیں یاد کرتا تو مسکرانے لگتا۔ شائستہ کے روّیے کے باعث اُسے جو خفت اُٹھانی پڑی تھی وہ اُسے ملول کرتی تھی لہذا اُس نے اپنے تیئیں طے بھی کر لیا تھا کہ وہ اُس کی کیا مدد کرے گا۔

جب بھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی' اُسے گماں گزرتا کہ گھر سے کال ہو گی حتیٰ کہ اُسے تشویش ہونے لگی۔ پھر وہ چاہنے لگا کہ خود فون کر کے مہمان کی بابت پتا کرے۔ اُس نے دو بار نمبر گھمایا بھی' مگر اِس خیال سے کہ فون شائستہ اُٹھائے گی' اُس نے اِرادہ ملتوی کر دیا۔ تیسری بار وہ گھر کا نمبر ملاتے ملاتے نہ جانے کیوں رُوبی کو ڈائل کر بیٹھا۔

وہ تو جیسے اُسی کے فون کی منتظر تھی۔

پہلے تو باتوں میں اُلجھالیا' پھر جذبوں کی ڈوری سے اُسے یوں باندھا کہ وہ دفتر سے غائب ہو کر سیدھا اُس کے پاس پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ چھٹی کا وقت ہو گیا۔

جب وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا تو نہ جانے کیوں اُسے یقین سا ہو چلا تھا کہ مہمان جا چکا ہو گا مگر وہ تو وہیں تھا۔

اُس نے مدھم مدھم آواز کو سنا تو اُسے یقین نہ آتا تھا۔

شوخ سی آواز' مسلسل بولنے کی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے دے کر۔ اور الفاظ یوں شباہت بناتے تھے کہ جیسے انہیں اَدا کرنے والے ہونٹ لوچ دَار ہو گئے ہوں۔ باتوں کے وقفوں میں قہقہے اُمنڈتے تھے۔ شائستہ کے شیریں حلقوم سے۔ اس جھلی کو توڑتے ہوئے جو ایسے قہقہوں سے الگ رہنے کے سبب اُس کی آواز کے اوپر بن گئی تھی۔

یہی قہقہے سننے کی اُسے حسرت رہی تھی۔ اُسے اَچنبھا ہوا کہ شائستہ ایسے رسیلے قہقہے اُچھال سکتی تھی اور اُچھال رہی تھی۔

وہ تقریباً بھاگتا ہوا ڈرائنگ روم کے دَروازے تک پہنچا اور اُسے لگا کہ جیسے سارا ڈرائنگ روم مہمان کی دھیمی' مسلسل باتوں سے اور شائستہ کے بے اختیار قہقہوں سے کناروں تک بھر چکا تھا اور اَب چھلکنے کو تھا۔

مہمان نے اَپنے گیلے کھچڑی بالوں کو سلیقے سے یوں پیچھے سنوارا ہوا تھا کہ کنپٹیوں کی سفیدی دَب گئی تھی اور اُس کی آنکھوں میں چمک تھی جو اُس کے سارے چہرے پر ظاہر ہو رہی تھی' یہاں تک کہ جبڑوں کی مسلسل نمایاں نظر آنے والی ہڈیاں بھی اِسی چمک میں کہیں معدوم ہو گئی تھیں۔

جو شخص بول رہا تھا اس کے بدن پر عاطف کا پسندیدہ لباس تھا جو اگرچہ اُس پر چست نہ بیٹھا تھا مگر اُسے بارعب بنا گیا تھا۔

دُھلا دُھلایا صاف ستھرا شخص' اُس شخص سے بالکل مختلف ہو گیا تھا جسے وہ صبح صوفے پر

خراٹے بھرتا چھوڑ گیا تھا۔

وہ مسلسل بول رہا تھا اور اُس کے ہونٹ ایک طرف دائرہ سا بنا رہے تھے۔

وہ عاطف کی نظر آنے تک بولتا رہا۔

شائستہ کے قہقہے اُچھلتے رہے۔

عاطف کے نظر آنے پر بھی وہ کسی رَخنے کے بغیر اُچھلتے رہے' حالاں کہ بولنے والا شخص خاموش ہو چکا تھا۔ عاطف کو لگا' شائستہ قہقہے نہیں اُچھال رہی تھی' ننھا فرخ اُس کے گھٹنوں پر اُوندھا پڑا کلکاریاں مار رہا تھا جب کہ نرم ملائم جلد پر مخروطی اُنگلیاں پھسل رہی تھیں اور پھسلے ہی جاتی تھیں۔

شاخِ اشتہا کی چٹک

اسے قریب نظری کا شاخسانہ کہیے یا کچھ اور کہ بعض کہانیاں لکھنے والے کے آس پاس کلبلا رہی ہوتی ہیں مگر وہ ان ہی جیسی کسی کہانی کو پالینے کے لیے ماضی کی دھول میں دفن ہو جانے والے قصوں کو کھوجنے میں جتا رہتا ہے۔

تو یوں ہے کہ جن دنوں مجھے پرانی کہانیوں کا ہوکا لگا ہوا تھا' مارکیز کا ننھا منا نیا ناول میرے ہاتھ لگ گیا۔

پہلی بار نہیں' دوسری بار۔

اگر میرے سامنے مارکیز کا یہ مختصر ناول دوسری بار نہ آتا تو شاید میں اپنے پاس مکر مار کر پڑی ہوئی اس جنس میں لتھڑی ہوئی کہانی کو یوں لکھنے نہ بیٹھ گیا ہوتا۔

مارکیز کے ناول کو دوسری بار پڑھنے سے میری مراد میمن کے اس اردو ترجمے سے ہے جو مجھے ترجمے کا معیار آنکنے کے لیے موصول ہوا تھا۔

یہ وہی ناول تھا جس کی خبر آنے کے بعد میں انگریزی کتابوں کی دکانوں کے کئی پھیرے لگا آیا تھا۔ پھر جوں ہی اس کتاب کا انگریزی نسخہ دستیاب ہوا تو میں نے اسے ایک ہی ہلے میں پڑھ ڈالا تھا۔ میں نے اپنے تیئں اس ناول کو پڑھ کر جو نتیجہ نکالا وہ مصنف کے حق میں جاتا تھا نہ اس کتاب کے حق میں۔

خدا لگتی کہوں گا میرا فیصلہ تھا ایک بڑے لکھنے والے نے بڑھاپے میں جنس کے سستے وسیلے سے اس ننھی منی کتاب میں جھک ماری تھی۔

ممکن ہے یہی سبب ہو کہ جب میمن کا ''اپنی بیسواؤں کی یادیں'' کے عنوان سے چھپا ہوا ترجمہ ملا تو میں خود کو اسے فوری طور پر پڑھنے کے لیے تیار نہ کر پایا اور پیپر بیک میں چھپا یہ مختصر سا ناول کہیں رکھ کر بھول گیا۔ گزشتہ دنوں کسی اور کتاب کی تلاش میں' جب کہ میں بہت زیادہ اکتا چکا تھا' یہ ناول اچانک سامنے آ گیا۔ میں نے اپنی مطلوبہ کتاب کی تلاش کو معطل کر کے اکتاہٹ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ اسی ناول کو تھامے تھامے اپنے بیڈ تک پہنچا' جسم کو پشت کے بل بستر پر دھپ سے گرنے دیا اور اسے یوں ہی یہاں وہاں سے دیکھنے لگا۔ جب میری نگاہ مارکیز کے ہاں بے باکی سے در آنے والے ان ننگے لفظوں پر پڑی جنہیں مترجم نے ایسے دلچسپ الفاظ میں ڈھال لیا تھا جو فوری طور پر فحش نہیں لگتے تھے' تو میں نے ناول کو ڈھنگ سے پڑھنا شروع کر دیا۔

ناول کو اس طرح پڑھنے کے دو غیر متوقع نتائج نکلے۔

ایک یہ کہ میں جسے مارکیز کے کھاتے میں جھک مارنا سمجھ بیٹھا تھا اس میں سے میرے لیے معنی کی ایک مختلف جہت نکل آئی اور دوسرا یہ کہ مجھے اپنا کنی کاٹ کر نکل جانے اور پھر بھول جانے والا ایک کردار شکیل رہ رہ کر یاد آنے لگا۔ ایک ناول جس کے مرکزی کردار نے اپنی نوے

ویں سالگرہ کی رات ایک باکرہ کے ساتھ گزارنے کا اہتمام کیا' میرے لیے اس میں سے زندگی کے کیا معنی برآمد ہوئے' میں ٹھیک بتانے سے قاصر ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ بارِ دگر پڑھنے پر نہ صرف اس ناول کا جنس کا رسیا مرکزی کردار میرے لیے ایک سطح پر قابل اعتنا ہوا' میں اپنے ایک متروک کردار شکیل کے بارے میں بھی ڈھنگ سے سوچنے پر مجبور ہوا تھا۔

اور یہ بات بہ جائے خود کوئی کم اہم بات نہیں تھی۔

شکیل اور مارکیز کے ناول کے مرکزی کردار میں کوئی خاص مشابہت نہیں ہے۔ بتا چکا ہوں کہ وہ نوے برس کا ہے جب کہ میرا شکیل بھرپور جوانی لیے ہوئے ہے۔ وہ مردِ مجرد اپنی مثالی بدصورتی کی وجہ سے خاکہ اڑانے والوں کا مرغوب' جب کہ جس شکیل کی میں بات کر رہا ہوں وہ محض نام کا شکیل نہیں ہے اور یہ شادی شدہ اور بال بچے دار ہے۔ تاہم ایک بات دونوں میں مشترک ہے کہ دونوں جنس زدہ ہیں اور شکیل تو اسی جنس زدگی کی وجہ سے دوستوں میں تضحیک کا سامان ہو گیا ہے۔ ایک مدت کے بعد شکیل جیسے کردار کی طرف لوٹنے کا سبب مارکیز کے ناول کے بوڑھے کی وہ جنسی خرمستیاں ہیں جنہیں ناول میں بہت سہولت سے لکھ لیا گیا ہے مگر ہمارے ہاں ایسی حرکتوں کو لکھنا چوں کہ فحاشی کے زمرہ میں آتا ہے لہذا مجھے شکیل کو لکھنے کے لیے بار بار مارکیز کی طرف دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ہاں تو میں مارکیز کے بوڑھے کی خرمستیوں کا ذکر کر رہا تھا اور بتانا چاہ رہا تھا کہ اس بوڑھے کی ہوس کاریوں کے باب میں جہاں اس کی اجڈ لارنڈی والی ملازمہ کا ذکر آتا ہے' وہی عقب سے جانے کا' وہیں مجھے اس وقت کے شکیل کا' اس کریانہ اسٹور کے مالک کا شکار بننا یاد آیا جس کے پاس اس شہر میں آکر وہ پہلے پہل ملازم ہوا تھا۔ جہاں ناول کے مرکزی کردار نے اپنے پچاس سال کی عمر کو پہنچنے پر ان پانچ سو چودہ عورتوں کا ذکر کیا ہے جن سے اس کا جنسی تعلق قائم ہوا' اور اس گنتی میں وہ بعد ازاں مسلسل اضافہ کیے جا رہا تھا' تو میرے دھیان میں شکیل کی زندگی میں آنے والی وہ چھپٹی لڑکیاں آگئیں جن کی وجہ سے وہ شہر بھر میں جنسی بلے کے طور پر مشہور ہوا۔

تاہم جس لڑکی کی وجہ سے شکیل کو نظروں سے گرا ہوا اور بعد میں اسے شہر چھوڑتے ہوئے دکھایا جانا ہے وہ بظاہر ان چٹپٹی لڑکیوں جیسی نہ تھی۔

اوہ ٹھہرے صاحب! مارکیز کے بوڑھے بدصورت کردار کی طرح قابل قبول ہو جانے والے جواں سال شکیل کی کہانی کو یوں شروع نہیں ہونا چاہیے' جیسا کہ میں اسے آغاز دے چکا ہوں۔ اس کردار کو عجلت میں یا یہاں وہاں سے ٹکڑوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ڈھنگ سے لکھنے سے پہلے مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو میں اپنی اس خفت سے آگاہ کرتا چلوں جو مجھے کسی جنس مارے آدمی سے مل کر اور اس کی لذت میں لتھڑی ہوئی باتیں سن کر لاحق ہو جایا کرتی ہے۔ اسی خفت کا شاخسانہ ہے کہ مجھے اپنا حوالہ جنس مارے کرداروں سے بھی کھلنے لگتا ہے۔ شکیل جیسا کردار میری دسترس میں رہا مگر اسی خفت نے ہمارے درمیان بہت سے رخنے رکھ دیئے تھے۔ حتی کہ میں نے یہ بھی بھلا دیا کہ شروع میں یہ کردار ایسا نہ تھا۔ یہ تو بہت بعد میں ہوا تھا کہ وہ نہ صرف لوگوں کی تضحیک کا سامان بنا' میری نظروں سے بھی گر گیا تھا۔

لیجئے اب مارکیز کے بوڑھے نے مجھے بہلا پھسلا کر اس مردود کہانی کے قریب کر ہی دیا ہے تو میں اسے شکیل سے اپنی پہلی ملاقات سے شروع کرنا چاہوں گا۔

شکیل سے میری پہلی ملاقات کسی تقریب میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں دوسرے شاعروں کی طرح اپنی غزل سنانے آیا تھا۔ صاف اور گورا رنگ جو ناک کی پھننگ' کانوں کی لوؤں اور چمک لیے نرم نرم گالوں سے قدرے شہابی ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا ٹھہر ٹھہر کر شعر پڑھنا اور پڑھتے ہوئے مصرعے کو ایک ادا سے دہرانا اچھا لگا تھا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ پہاڑیا ہے تو اور بھی اچھا لگا کہ وہ اس کے باوجود نہ صرف ہر مصرع میں ٹھیک ٹھیک لفظ باندھنے کا اہتمام کر لایا تھا ان کی ادائیگی میں بھی کوئی غلطی نہیں کر رہا تھا۔ جو غزل اس نے وہاں سنائی اس نے خوب سلیقے سے کہی تھی۔ اس کی فنی مہارت کا میں یوں قائل ہو گیا تھا کہ ساری غزل ایک روندی ہوئی بحر میں، مگر بہت عمدگی سے کہی گئی تھی۔ اس میں ایک دو غیر شاعرانہ اور کھدرے لفظوں کو اتنا ملائم بنا کر رواں

مصروں میں پیوست کر دیا گیا تھا کہ اب وہ غزل کے ہی الفاظ لگتے تھے۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ وہ لگ بھگ ہر شعر کے مصرع اولی میں اپنے خیال کی کچھ اس طرح تجسیم کر رہا تھا کہ ہر بار لہجہ کے نئے پن کا احساس ہوتا اور ایک ایسا مقدمہ بھی بنتا تھا جس کی طرف سننے والے کا متوجہ ہونا لازم ہو جاتا۔

جب وہ شعر مکمل کر کے سانس لیتا تو بات بھی مکمل ہو جاتی تھی۔

ذرا گماں باندھیے کہ ایک نوخیز شاعر ہے۔ آپ اس سے بالکل نئے لہجے کی غزل سن رہے ہیں۔ ایک ایسا لہجہ، جس میں عصر موجود کا تناظر اس کی اپنی لفظیات کے ساتھ سامنے آ رہا ہے۔ اس غزل میں اس کا اہتمام بھی ہے کہ کوئی لفظ فن پارے کے مجموعی مزاج میں اجنبی نہیں لگتا۔ سلیقہ ایسا کہ ہر لفظ کی ادائیگی کا مخرج ضرورت شعری کی وجہ سے کہیں بھی بدلا نہیں گیا۔ ہر لفظ ٹھیک اپنی نشست پر، اور وہ بھی یوں کہ ایک لفظ کی صوتیات اگلے لفظ کو ٹھوکا دینے کی بجائے اس میں اتر کر اس کی اپنی صوتیات میں منقلب ہو جاتیں۔ سچ پوچھیے تو ایسی باریکی سے غزل کہنے والے کا گمان ہی باندھا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ میرے سامنے تھا اور پورے قرینے سے غزل کہہ رہا تھا۔

لہذا میں اس کے قریب ہو گیا۔ اتنا قریب کہ ہم دونوں کے درمیان سے سارا حجاب اُٹھ گیا۔

جب وہ اسی شہر میں رہ کر خوب خوب داد، بے پناہ حسد اور بہت ساری نفرت اور تضحیک سمیٹ چکا تو بھی میں اس کے قریب رہا۔ پہلے پہل شکیل کے بارے میں شہر کے شاعروں نے یہ شوشا چھوڑا، ہو نہ ہو اسے کوئی لکھ کر دیتا ہے۔ جب لوگ تجسس سے پوچھنے لگے کہ وہ کون ہے جو اسے لکھ کر دیتا ہوگا؟ تو ایک ایسے بزرگ شاعر کا نام چلا دیا گیا جو کہنے کو شعر خوب سلیقے سے کہتے اور عادت ایسی پائی تھی کہ خوش شکل لونڈوں میں اٹھنے بیٹھنے کو اس گئے گزرے زمانے میں بھی چلن کیے ہوئے تھے۔ کسی کو ایسی باتوں پر یوں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ حضرت زبان کے روایتی

استعمال تک محدود رہتے تھے اور اچھا اور پکا مصرعہ کہنے کے باوجود خیال کو نیا بنا لینے پر قادر نہ تھے ۔ ایسا کیوں کر ہو سکتا تھا کہ کوئی خود تو فنی طور پر بے عیب مگر بوسیدگی کا احساس جگانے والا مصرعہ کہنے کو وتیرہ کیے ہو اور اپنے لونڈے کو حرف تازہ سے فیض یاب کرے۔ جب شکیل ایک سے بڑھ کر ایک تازہ غزل لانے لگا تو اس کے خلاف فضا باندھنے والوں کی جیبھیں خود بخود اپنے اپنے تالو سے بندھ گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اس نے اپنے جیسے شاعروں سے آگے نکل کر حاسدین کا گروہ پیدا کر لیا تھا۔ جو لوگ شعر میں اسے مات نہیں دے سکتے' اس کی شخصی کمزوریوں کو اچھال کر تسکین پاتے تھے۔

مجھے شکیل سے یہ شکایت تھی کہ آخر وہ اس باب میں انہیں خوب خوب مسالا کیوں فراہم کر رہا تھا۔ وہ میری بات سنتا اور ڈھٹائی سے ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔

وہ بارہ کہو سے پرے پہاڑوں کے ادھر جس گاؤں سے آیا تھا اس کا نام تنگ گلی تھا جو بول چال میں مختصر ہو کر تنگلی ہو گیا تھا۔ جب وہاں اس نے دس جماعتیں پڑھ لیں تو آگے کرنے کو کچھ نہ تھا۔ اس کے باپ کے پاس جو تھوڑی سی موروثی زمین تھی' اسے گزشتہ سال کی مسلسل بارشوں میں لینڈ سلائیڈ کھا گئی تھی۔ میٹرک کر لینے کے بعد اس کے لیے دو ہی راستے تھے۔ باپ کی طرح مری چلا جائے اور وہاں سیزن کھلنے پر ہوٹلوں میں بیرا گیری کرے یا ادھر شہر میں کسی دکان پر سیلز مین ہو جائے' جیسا کہ اس کے گاؤں کے کئی اور لڑکوں نے کیا تھا۔

اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

تنگلی کا ایک شخص دل محمد ادھر شہر میں ایک کریانے کے اسٹور پر ملازم تھا۔ وہ بقر عید پر گاؤں آیا تو شکیل کے باپ نے اس سے بات کی۔ اس نے فوری طور پر تو اسے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ وہاں شہر میں کام کرنے کے خواہش مند لڑکے ہر روز آتے رہتے تھے جو کم اجرت پر کام کرنے کو تیار ہو جاتے لہذا شکیل کو وہاں بھیجنا' لڑکے کو ایک لحاظ سے ضائع کرنا ہی ہوگا۔ اس کے باپ نے دل محمد کی نصیحت کو محض ٹالنے کا بہانہ سمجھا۔ وہ اپنے مالک کو بڑا خسیس اور گھٹیا کہہ رہا تھا

جو کم اجرت دیتا اور کام زیادہ لیتا تھا۔ یہ سب کچھ درست ہو سکتا تھا مگر دل محمد کے گھر والوں کی گزر بسر ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی لہذا اس نے خوب منت سماجت کر کے اسے مجبور کر لیا کہ وہ شکیل کو شہر لے جائے اور اپنے مالک سے ملا دے' آگے رہی اس کی قسمت۔ دل محمد نے جو کہا' وہ جھوٹ نہیں تھا۔ اس کا مالک نام کا گل زادہ تھا' نکلا پورا حرام زادہ۔ اسے دیکھتے ہی اس کی رالیں ٹپکنے لگی تھیں

۔

شکیل نے پہلے روز اس کی رالیں نہیں دیکھی تھیں کہ وہ تو اپنی ضرورت اور اپنی مجبوریوں کو دیکھ رہا تھا۔

گل زادہ نے شکیل کی رہائش کا بندوبست دل محمد کے ساتھ دکان کے پچھواڑے میں کرنے کی بجائے اوپر والے فلیٹ میں اپنے ساتھ کیا۔ اس نے اپنے ساتھ اپنے مالک کو یوں مہربان پایا تو اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ دوسری تنخواہ تک وہ اس پر خوب مہربان رہا اور جب اس بار بھی تنخواہ کی رقم کا منی آڈر گھر بھیج چکا تو ایک رات وہ اس کے بستر میں گھس گیا۔ سردیوں کے دن تھے' پہلے پہل اس کا یوں لحاف میں گھس آنا شکیل کو برا نہ لگا تھا تاہم رفتہ رفتہ شکیل پر اس حرام زادے کی نیت کھلی پھر وہ خود ہی کھلتا اور اسے کھولتا چلا گیا۔ بعد میں وہ یہ واقعہ اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے قہقہہ لگا کر سنایا کرتا۔

تاہم وہ یہ بھی کہتا کہ وہ جس مشکل میں پڑ گیا تھا اس سے ہمت کر کے نکل آیا تھا۔

جب میں نے شکیل سے اس کا یہ قصہ سنا، تو بات ایک قہقہے پر نہیں رکی تھی۔ قہقہے کی آواز ابھی معدوم نہیں ہوئی تھی کہ فوراً بعد اس کے حلقوم میں ہچکیوں کی باڑھ امنڈ پڑی تھی۔ اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کے لیے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دے کر کاٹ ہی ڈالا تھا۔ شکیل نے ذرا سنبھلنے کے بعد یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا مالک اس پر ایسے میں کھل رہا تھا جب وہ ان سہولتوں کا عادی ہوتا جا رہا تھا جو اس نے گاؤں میں دیکھی تک نہ تھیں۔ اس کے باپ کے پاس بھی ایک معقول رقم پہنچنے لگی۔ اس مختصر سے عرصے میں اس نے اپنے باپ کو اتنی رقم بھیج دی' جتنی

اس نے کبھی اپنے باپ کے پاس یکمشت دیکھی ہی نہ تھی۔ اپنے ہی باپ کا کفیل بننے میں اسے لطف آنے لگا۔ یہی لطف تھا کہ جس نے اسے فوری طور پر بے روزگار ہونے کے لیے تیار نہ ہونے دیا۔ بعد میں جب راتیں مسلسل لذت اور کراہت کے بیچ گزرنے لگیں تو اس کا دل شدت سے الٹنے لگا۔ وہ وہاں ٹھہرا رہا' یہاں تک کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اس شخص سے شدید نفرت محسوس کرنے لگا۔ یہ نفرت اتنی شدید تھی کہ ایک رات' جب کہ اس کا مالک اوندھا پڑا اس کا انتظار کر رہا تھا' وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔

جس روز وہ گل زادہ کی ملکیت اور اس کے فلیٹ سے نکلا تھا' اس روز اس نے صاف صاف ایک لذیذ سنسناہٹ کو اوندھے پڑے بھاری چربیلے بدن میں ریڑھ کی ہڈی سے دمچی کی طرف بہتے ہوئے پایا تھا۔

مارکیز کا ناول دوسری بار پڑھنے کے بعد اب اگر میں اس دن کی بابت سوچوں' جس روز شکیل نے مجھے اپنا یہ قصہ سناتے ہوئے قہقہہ لگایا اور فوراً بعد اپنے دم کو ہچکیوں کا پھندا لگا لیا تھا تو مجھے شکیل کی جگہ مارکیز کے ناول کی وہ باکرہ لڑکی یاد آجاتی ہے جسے نوے سالہ بوڑھے نے دیلگدینہ کا نام دیا تھا۔ دیلگدینہ' جو پانچ دسمبر کو محض پندرہ سال کی ہو رہی تھی مگر جسے اپنے گھر کے اخراجات چلانے کے لیے شہر سے باہر دن میں دو بار بٹن ٹانکنے جانا پڑتا تھا۔ اس لڑکی کو ایک دن میں، جب سوئی اور انگشتانے سے، سو سو بٹن ٹانکنا پڑتے تو وہ ادھ موئی ہو جاتی۔ دیلگدینہ اور شکیل کو میں ایک ساتھ یوں دیکھ رہا ہوں کہ دن بھر اپنے مالک گل زادہ کا کریانہ بیچتے اور گاہکوں کے نہ ٹوٹنے والے رش سے نبٹتے نبٹتے شکیل بھی بالکل اس لڑکی کی طرح ادھ موا ہو جاتا۔ تاہم ان دونوں کو کہانی کے اس مرحلہ پر ایک جیسی مشقت میں پڑا دکھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دونوں کہانی کے باقی مراحل بھی ایک جیسے ہوں گے۔ شکیل' جو اپنے مالک کی دمچی میں سنسناہٹ چھوڑ کر نکل آیا تھا' بعد میں بہت خوار ہوا۔ تاہم ایک روز آیا کہ ایک دوسرے شخص نے نہ صرف اسے اپنے ہاں ملازمت دی' اس کے نکاح میں اپنی بیٹی صفیہ بھی دے دی تھی۔

شکیل ملازمت کے لیے آیا اور گھر داماد ہو گیا تھا۔

وہ خوب رو تھا اور سلجھا ہوا بھی۔ ہمت کی بھی اس میں کمی نہ تھی۔ وہ ضرورت مند تھا اور ایک لحاظ سے دیکھیں تو شرف اللہ بھی ضرورت مند تھا اس کی بیٹی کنواری رہ گئی تھی۔ یہ ایسی ضرورت تھی جس کے لیے شکیل کی کسی بھی ضرورت کو پورا کیا جا سکتا تھا۔ لہذا اس نئے گھر میں اس کے بارے میں بھی ویسا ہی سوچا جانے لگا جیسا کہ ایک بیٹے کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ صفیہ، شرف اللہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے پاس جو کچھ تھا، اُسی کا تھا۔ دونوں کے بہتر مستقبل کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ شکیل کالج میں داخلہ لے لے۔ سال بھر کی ملازمت اور خواری کے بعد شکیل فوری طور پر مزید پڑھنے کی طرف راغب نہ ہو پایا۔ جب اسی کی بیوی نے ایک شفیق ماں کی طرح اس کا حوصلہ بڑھایا اور سسر نے یقین دلایا کہ تعلیم پر اُٹھنے والے سارے اخراجات وہ خود اٹھائیں گے تو اُس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔

یہیں وہ شاعری کی طرف راغب ہوا تھا۔

جن دنوں میں شکیل کی طرف متوجہ ہوا اس نے ایم اے کر لیا تھا اور ایک غیر سرکاری کالج سے وابستہ تھا۔ شام کو وہ اسی کالج میں چلنے والی اکیڈمی میں پڑھا کر خوب کما بھی رہا تھا تاہم اس بارے میں مطمئن نہ تھا اور کچھ نیا کرنے کی بابت مسلسل سوچا کرتا۔ ان دنوں اس شہر میں پراپرٹی کا کاروبار بہت عروج پر تھا۔ اس نے دو ایک ایسے سودے کمیشن کی بجائے ٹاپ یعنی پلاٹ نقد اٹھا کر بیچنے کی بنیاد پر کیے۔ ان سودوں نے اسے اتنا مارجن دیا کہ وہ یکسوئی سے اس کاروبار میں جت گیا۔ پھر تو ٹاپے پر ٹاپا اترنے لگا اور اس کے حالات بدلتے چلے گئے۔

اس کے حالات ہی نہیں بدلے وہ خود بھی بدلتا چلا گیا۔

شہر بھر کے ان شاعروں نے سکھ کا سانس لیا جو مشاعروں میں اس کی ساری توجہ سمیٹ لینے پر اس سے نالاں رہتے تھے کہ اب وہ ادھر آتا ہی نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہوا کہ اس نے تقاریب میں آنا یک دم موقوف کر دیا تھا۔ پہلے پہل اس میں تعطل کے وقفے پڑے۔ پھر جب کبھی وہ آتا

تو مجھے بھی ساتھ اچک کر باہر لے جاتا کہ اسے سننے سنانے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ گاڑیاں بدلنا اس کا معمول ہوتا جا رہا تھا کہ اس کاروبار میں بھی اس نے اچھی خاصی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔

یہ بدلا ہوا شکیل دیکھ کر میں اس شکیل کی بابت سوچنے لگتا تھا جسے پہاڑوں سے آتے ہی مجبور پا کر گل زادہ نے پچھاڑ لیا تھا۔

شروع شروع میں، میں سمجھتا رہا تھا کہ وہ سے شادی کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی میں جس طرح آسائشیں آ رہی تھی ان کے جھانسے میں وہ خود بھی ایک مدت تک یوں ہی سمجھتا رہا تھا۔ اس عورت کے بطن سے اس نے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا کیں۔ بقول اس کے اسے اپنے بچوں سے بہت محبت تھی۔ یہ بعد کی بات ہے کہ اس نے گاڑیاں اور لڑکیاں بدلنا مشغلہ بنا لیا تھا۔ ان دنوں اس نے نہ صرف صفیہ کا بلکہ ان تینوں بچوں کا ذکر بھی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے کہا نا کہ میں شکیل کے بہت قریب تھا۔ یہ بھی بتا دوں کہ اس کے بیوی بچے مجھ سے بہت مانوس تھے تاہم کہتا چلوں کہ جس تیزی سے وہ ان سے دور ہوا، میں بھی انہیں ملنے سے کترانے لگا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شکیل کے سب لچھن جان گئے ہوں گے۔ میں نے ان کے سامنے جاتا تو ممکن تھا کہ صفیہ اس حوالے سے بات چھیڑ کر میری مدد مانگ لیتی۔ میں جانتا تھا جس لذت کی دلدل میں وہ اتر چکا تھا کوئی بھی اسے نکال نہیں سکتا تھا۔ حتی کہ میں بھی۔ میں نے اپنے تئیں ایک آدھ بار بچوں اور صفیہ کا ذکر کر کے اسے اس دلدل سے نکالنا چاہا تھا۔ بچوں کے نام پر تو وہ چپ ہو گیا مگر صفیہ کا ذکر آتے ہی اس نے ویسا ہی قہقہہ لگایا جیسا کہ وہ گل زادہ کا نام آنے پر لگایا کرتا تھا۔

گل زادہ اور صفیہ میں اگر کوئی مشابہت ہو سکتی تھی تو وہ دونوں کا بھاری بھرکم وجود تھا جو تھل تھل کرتا تھا۔

ایک اور بات جو مجھے ہمیشہ الجھن میں ڈالتی رہی ہے وہ شکیل کا صفیہ کے ذکر پر عجب طرح کا قہقہہ لگانا تھا، ایسا قہقہہ کہ بات محض اس مشابہت تک محدود نہ رہتی تھی۔

صفیہ، شکیل سے عمر میں نو دس سال بڑی ہوگی۔ بچوں کی پیدائش کے بعد تو وہ اس کے مقابلے میں کہیں بوڑھی دکھائی دیتی تھی۔ تاہم وہ اس کے بچوں کی ماں تھی اور اس کا یوں اس کی توہین کرنا مجھے بہت کھلتا۔ جس روز وہ ایک قیمتی گاڑی پر آکر مجھے تقریب سے اٹھا کر ایک ہوٹل لے گیا تھا' اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کی عمر کے آدمی کے لیے ایک جوان عورت کے وجود کی کیا اہمیت تھی۔ اسی روز اس نے اپنے موبائل کے قدرے زیادہ پکسل والے کیمرے سے لے گئی پانچ مختلف لڑکیوں کی تصاویر دکھائی تھیں جن میں سے ایک تصویر تو ایسی تھی جس میں وہ خود بھی موجود تھا۔ موبائل کا ڈسپلے بڑا' اور تصویریں خوب شوخ' شفاف اور روشن تھیں ۔ جس تصویر میں وہ خود موجود تھا' اس کے آگے کو جھکے ہوئے دائیں کندھے سے، میں نے اندازہ لگایا کہ اسی سمت کے بازو کو آگے بڑھا کر یہ تصویر اس نے اپنے سیل کے کیمرے سے خود کھینچی تھی ۔ اس کے ساتھ ایک ایسی لڑکی تھی جس کی عمر ہو نہ ہو اس کی اپنی بڑی بیٹی سونیا جتنی تھی۔ لڑکی اور وہ خود بھی جہاں تک تصویر میں نظر آرہے تھے لباس کی تہمت سے پاک تھے۔ اگرچہ تصویر میں سے لذت ابلی پڑ رہی تھی مگر سونیا سے اس تصویر والی لڑکی کی مشابہت قائم کرتے ہوئے میں سارا مزا کرکرا کر بیٹھا تھا۔

مجھے سونیا سے اس لڑکی کا موازنہ نہیں کرنا چاہیے تھا، جس کے ساتھ، بقول شکیل کے ،اس نے نوٹوں میں تولنے کے بعد ایک رات کی رفاقت پائی تھی۔

ماننا پڑے گا کہ مارکیز کی کہانی کا بوڑھا عورتوں کی گنتی کے بارے میں کہیں آگے تھا۔ تاہم یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ان عورتوں پر خرچ کے معاملے میں) اگر فی کس عورت کے حساب سے خرچ کا تخمینہ لگایا جائے تو) شکیل کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ یہ بھی بجا کہ مارکیز کا بوڑھا صحافی' جسے چکلہ چلانے والی روسا کبرکس ''اے میرے اسکالر'' کہہ کر مخاطب کرتی تھی' جس عورت سے بھی) اس ناول کے ترجمہ کار کی اصطلاح میں جفتی کا) تعلق بنانا چاہتا' اسے معاوضہ ضرور ادا کیا کرتا تھا' لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ تھا پرلے درجے کا کنجوس۔ اگر آپ نے یہ ناول مکمل طور پر پڑھ رکھا ہے تو

آپ کی نظر میں اسی مرکزی کردار کا اعترافی بیان ضرور گزرا ہوگا جس کے مطابق وہ بخیل آدمی تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر تو ہونہ ہو آپ کی ہنسی ضرور خطا ہوگئی ہوگی جہاں اس جنس زدہ بوڑھے نے اپنی نوے ویں سالگرہ کی رات ایک باکرہ کے ساتھ گزارنے کے لیے خرچ کا حساب چودہ پیسو لگایا تھا۔ یعنی اخبار سے ملنے والے پورے ایک ماہ کی کالم نویسی کے معاوضے کے برابر۔ پھر جس طرح اس بوڑھے نے پلنگ کے نیچے کے مخفی خانوں سے عین حساب کے مطابق ریزگاری نکالی تھی' دو پیسو کمرے کا کرایہ' چار مالکہ کے لیے' تین لڑکی کے واسطے' پانچ رات کے کھانے اور اوپر کے خرچے کے لیے' سچ پوچھیں تو یہ پڑھ کر میری ناف سے ہنسی کا گولا اٹھا اور میرے جبڑوں کو اتنا دور اچھال گیا تھا کہ وہ بہت دیر بعد ہی واپس اپنی جگہ پر آپائے تھے۔ میری کہانی کا شکیل ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اس معاملے میں بھی گن گن کر خرچ کرتے ہیں۔ یہ جو اس نے لڑکی کو نوٹوں میں تولنے کی بات کی تھی تو اس سے قطعاً اس کی یہ مراد نہیں تھی کہ اسے اپنا بہت سارو پیہ خرچ ہوجانے کا احساس تھا۔

وہ تو اس لڑکی کے دام بالا بتا کر اس کی قدر و قیمت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

''اپنی سوگوار بیسواؤں کی یادیں'' نامی کتاب میں عین وہاں سے کہانی جنس کا چلن چھوڑ کر محبت کی ڈگر پر ہو لیتی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ قحبہ خانے کے ایک اہم گاہک کو پویلین کے پہلے کمرے میں کوئی چاقو مار کر قتل کرنے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ کہانی کے بوڑھے اسکالر نے جب خون سے لت پت بستر پر ابلے ہوئے مرغ کی طرح پیلے ہوجانے والے اس لحیم شحیم آدمی کی لاش کو پڑے دیکھا تھا تو اس کے جسم پر کپڑے کی ایک دھجی نہ تھی۔ کہانی کا یہ حصہ پڑھ کر پہلے تو میرے وجود میں سنسنی دوڑی مگر جب یہ بتایا گیا کہ اس ننگی لاش نے جوتے پہن رکھے تھے تو میری ایک بار پھر ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ مارکیز نے کہانی کے اس حصے میں جنس کا میٹھا اس مردے پر مل کر اسے لذیذ بناتے ہوئے بتایا ہے کہ مقتول کا جسم ابھی اکڑا نہیں تھا۔ اس کی گردن پر ہونٹ کی شکل کے دو زخم تھے اور یہ کہ موت کے باعث اس کے سکڑے ہوئے عضو پر ایک کونڈم

ہنوز چڑھا ہوا تھا۔ کہانی لکھنے والے نے یہ وضاحت کرنا بھی ضروری جانا ہے کہ کونڈم غیر استعمال شدہ دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں مجھے مترجم سے اپنی ایک شکایت ریکارڈ پر لانی ہے اور اسے داد بھی دینی ہے۔ شکایت کا یہ موقع وہاں وہاں نکلتا رہا ہے جہاں اس نے اردو جملوں کو بھی ترجمہ کیے جانے والے متن کے قریب رکھ کر انہیں پیچیدہ بنا دیا۔ ناول کے نام کے ساتھ بھی یہی رویہ روا رکھا گیا ہے جب کہ اسے تھوڑا سا بدل کر رواں کرنے کے لیے ''اپنی سوگوار بیسواؤں کی یاد میں'' کر دیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اور اب مجھے برملا اس جرات اور سلیقے کی داد دینی ہے جس کو روبہ عمل لا کر اس نے ان لفظوں کا ترجمہ کر لیا ہے جو بالعموم ہمارے ہاں شائستگی کے تقاضے کے پیش نظر زبان پر نہیں لائے جاتے ہیں۔ تاہم اسے کا کیا کیجئے کہ کونڈم کا ترجمہ کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا۔

شاید اس لفظ کا ترجمہ کرنا اس کے بس میں تھا ہی نہیں۔

یہاں شکیل سے متعلق دو واقعات کہانی میں گھسنے کو بے تاب ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پہلا واقعہ خود بخود آگے چل کر دوسرے واقعے سے جڑ جاتا ہے۔ پہلے واقعہ کا تعلق ان دنوں سے ہے جن دنوں اس کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے مڈل اسٹنڈرڈ امتحان کی تیاری کے لیے یونین کونسل مسیاڑی کے دفتر میں اضافی پڑھائی کا اہتمام کیا تھا۔ امتحانوں تک اسے اور اس کے ہم جماعتوں کو وہیں رہنا' پڑھنا اور رات گئے وہیں سونا تھا۔ یہ قصہ شکیل بہت مزے لے لے کر اور خوب کھینچ تان کر سنایا کرتا مگر مختصراً یوں ہے کہ جب ماسٹر صاحب چلے جاتے اور دن بھر پڑھ پڑھ کر اکتائے ہوئے لڑکوں کو کچھ نہ سوجھتا' تو وہ ملحقہ کمرے میں منصوبہ بندی والی دواؤں کے ساتھ پڑے ہوئے چمکیلے لفافوں میں بند سفید غبارے چوری کر کے خوب پھلایا کرتے تھے۔ یہ غبارے اگرچہ اس طرح رنگین نہ تھے جیسے تنگلی میں سودے کی ہٹی پر ملتے تھے مگر ان میں ایک ایسی خوبی تھی جو ان رنگین غباروں میں بھی نہ تھی کہ یہ ہوا بھرنے پر بہت پھولتے تھے۔ وہ سب اس پر خوش تھے کہ ان کے ہاتھ بہت سے چٹے خمور غبارے لگ گئے تھے اور رات گئے ان میں

اس پر مقابلہ لگا رہتا تھا کہ کون انہیں سب سے زیادہ پھلائے گا۔ شکیل کے مطابق ان دنوں ان غباروں پر سفید رنگ کا سفوف ملا ہوتا تھا جس سے ان کے ہونٹ اور گال یوں ہو جاتے تھے جیسے ان پر آٹا مل دیا گیا ہو۔ اسی سفیدی نے ان کی شرارتوں کا پول ہیڈ ماسٹر صاحب پر کھول دیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو پہلے تو غصہ آیا پھر کچھ سوچتے ہوئے ہنس پڑے اور کہا "نامعقولو! یہ ناپاک ہوتے ہیں کہ اس میں بیمار پیشاب کرتے ہیں۔"

اگلے روز ساتھ والے کمرے پر تالا نہ پڑ گیا ہوتا تو وہ ضرور تجربہ کرتے کہ ان غباروں کو بیمار کیسے استعمال کرتے تھے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات انہیں مزید الجھا گئی تھی۔

اسی شکیل نے' کہ جسے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک زمانے میں الجھا دیا تھا' اب اس الجھن سے پوری طرح نکل آیا تھا۔ اس نے مجھے لگ بھگ ویسے ہی کھلے منہ والے غبارے کی اپنے سیل فون کے قدرے زیادہ پکسل والے کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر تب دکھائی تھی جب میں اجلاس سے اٹھ کر اس کے ساتھ ہوٹل آ گیا تھا اور جب وہ اپنی دوست لڑکیوں کی پانچوں تصویریں دکھا چکا تھا۔ مجھے اس کا سنایا ہوا اوپر والا واقعہ عین اس موقعے پر یوں یاد آیا تھا کہ تصویر میں بھی لگ بھگ ویسا ہی غبارہ تھا۔ تصویر والا غبارہ بالکل سفید نہ تھا' ایسی جلد کی رنگت لیے ہوئے تھا جس میں چمک بھی آ گئی تھی۔ میں نے کراہت کو اپنے حلقوم تک آتے پا کر اس کا سیل فون اسے لوٹانا چاہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی پھسلتی ہوئی ایک نظر اس غبارے پر ڈال لی۔ مجھے صاف دِکھ رہا تھا کہ اس میں کسی بیمار نے پیشاب تو نہ کیا تھا تاہم کچھ تھا جس سے وہ ذرا سا پھول کر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ ساری لڑکیاں جن کی اس نے تصویریں بنا رکھی تھیں یا ان جیسی دوسری لڑکیاں جو کیمرے والا موبائل دیکھتے ہی بدک جاتی تھیں' ایک ایک کر کے اس کی زندگی سے نکل گئیں اور ان سب کی جگہ عاتکہ لے لی تھی۔

بتایا جا چکا ہے کہ مارکیز کے لذت مارے بوڑھے کی دیلگد ینہ پانچ دسمبر کو پندرہ برس کی ہوئی تھی اور کہانی میں جب سالگرہ والی رات آتی ہے تو بوڑھے اسکالر کی حرکتیں پڑھ کر گمان سا

ہونے لگتا ہے کہ جیسے اسے اس لڑکی سے محبت ہوگئی ہوگی مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ اسے پورا گانا سنا کر اور پورے بدن پر بوسے دے کرایک بے قابومہک جگانا چاہتا تھا۔

اس روز وہ اس بے قابومہک کو جگا کراور خوب تھک کر وہ سو گیا تھا۔

اس کی محبت تو تب جاگی تھی جب قتل والی رات کے بعد دیلگد ینہ اوراس کا ملنا ایک عرصے تک ممکن نہ رہا تھا۔ اس کے بعد کے صفحات بوڑھے اسکالر کی اس لڑکی کی محبت میں تڑپ کا احوال سمیٹے ہوئے ہیں۔ شکیل کی کہانی میں عاتکہ لگ بھگ اسی طرح کی تڑپا دینے والی محبت کے لیے موزوں ٹھہرتی ہے،جس طرح کی محبت مارکیز کے مرکزی کردار کواس پندرہ سالہ لڑکی سے تھی، تاہم اتنی ساری مشابہتوں کے باوجود شکیل کی کہانی بہت مختلف ہوجاتی ہے۔

عاتکہ کو لے کرشکیل نے یہ شہر چھوڑ دیا تو مجھے اس کی اس حرکت پر شدید صدمہ پہنچا۔

جس خاندان نے اس شخص کوشہر میں آسرا دیا' اس خاندان سے اس نے وفا نہ کی تھی۔ شکیل سے قربت کی وجہ سے میں جانتا ہوں کہ صفیہ نے اپنی ذات مٹا کر اس کی خدمت اور محافظت کی تھی۔ جس طرح مائیں اپنی اولاد کے عیب چھپا کراوران کی خطاؤں کو بھول کرانہیں اپنی محبت کی چادر سے باہرنہیں نکالتیں بالکل اسی طرح کی مسلسل اور بے ریا محبت اسے صفیہ سے ملی تھی۔ جب کئی روز بعد شکیل کے یوں شہر چھوڑنے کی خبر ملی تو میں بھابی کا دکھ بانٹنے اس کے گھر پہنچ گیا اس خدشے کے باوجود کہ مجھے وہ جا کراپنے دوست کے حوالے سے ناحق خجالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہاں پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ شکیل کی ساری حرکتوں کا اندازہ صفیہ کو تھا۔ دونوں بچیاں مجھے دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گئیں تاہم صفیہ یوں حوصلے میں تھی جیسے وہ شکیل سے جدائی اور بے وفائی کا وار سہہ گئی ہو۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ہونہ ہواس کا سبب کچھ اور تھا۔

شاید یہ دونوں کی عمر کا وہ تفاوت تھا جس نے عین آغاز ہی سے دونوں کے بیچ شدید اور تند جذبوں والا تعلق قائم نہ ہونے دیا تھا۔ تاہم وہ پریشان تھی' اتنا کہ جتنا کوئی اپنی بے انتہا قیمتی

شے کے کھو جانے پر پریشان ہو سکتا تھا۔ یہ ماں کے پیار والا سارا احساس مجھے تب محسوس ہوا تھا جب اس نے اپنے بیٹے شہباز کو دیکھا تھا۔ شہباز لگ بھگ اس عمر کو پہنچ گیا تھا جس عمر میں شکیل اس شہر آیا تھا۔ جب اس کی ماں نے یہ بتایا کہ شہباز نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا اور کسی دکان پر کام کر کے اس گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں تو میں نے دیکھا شکیل کے دل گرفتہ بیٹے کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا تھا اور اس نے اپنی مٹھیاں اور ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے۔

مارکیز نے آخری پیراگراف لکھتے ہوئے بوڑھے اسکالر کے گھر کے باورچی خانے میں ڈیلگدینہ کو اپنی پوری آواز سے گاتا دکھا کر اپنی کہانی کو رومانوی جہت دے دی تھی۔ مگر میری اس کہانی کا المیہ یہ ہے کہ اپنے خاتمے پر اس سے سارا رومان اور ساری لذت منہا ہو گئی ہے۔ شکیل اپنے ساتھ بھاگ جانے والی لڑکی سے بھی اوب چکا ہے۔ جس عمر میں اسے یہ سیکھنا تھا کہ شدید اور الہڑ جذبوں کو طول کیسے دیا جاتا ہے وہ سدھائے ہوئے جذبوں سے نبٹتا رہا تھا۔ وہ واپس آیا تو سیدھا گھر نہیں گیا میرے پاس آیا شاید وہ اپنے گھر کی دہلیز ایک ہی ہلے میں پار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ میں اسے رات بھر حوصلہ دیتا رہا اور سمجھاتا رہا کہ اس کے بیوی بچوں کو اس کی ضرورت تھی اور یہ کہ اس کے اپنے گھر میں اس کا انتظار ہو رہا تھا مگر اگلے روز جب میں اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تو اس کے بیٹے نے اس پر پستول تان لیا تھا۔ صفیہ نے واقعی اپنے شکیل کو معاف کر دیا تھا تب ہی تو اس نے یوں پستول تاننے پر اپنے بیٹے کی چھاتی پیٹ ڈالی تھی۔ شہباز نڈھال ہو کر دہلیز پر ہی بیٹھ گیا۔ صفیہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر اسے الانگھا اور اپنے شوہر کی طرف لپکی۔ دہلیز پر بیٹھے نوجوان کے ہاتھ میں جنبش ہوئی اور اگلے ہی لمحہ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ایک کربناک چیخ میرا وجود چیر گئی تھی۔

لوتھ

اُس کی ٹانگیں کولہوں سے بالشت بھر نیچے سے کاٹ دِی گئی تھیں۔

ایک مدّت سے اُس نے اپنے تلووں کے گھاؤ اپنے ہی بیٹے پر کُھلنے نہ دیئے تھے.... ضبط کرتا رہا اور اُونچی نیچی راہوں پر چلتا رہا تھا...... مگر کچھ عرصے سے یہ زخم رِسنے لگے تھے اور چڑھواں درد گھٹنوں کی جکڑن بن گیا تھا .... حتّٰی کہ دَردوں کی تپک اس کے حواس معطل کرنے لگی۔ اُسے سمتوں کا شعور نہ رہتا تھا۔ جدھر جانا ہوتا' اُدھر نہ جاتا بل کہ اُلٹ سمت کو نکل کھڑا

ہوتا۔

اُسے بار بار ڈھونڈ کر لایا جاتا۔

ہر بار اُس کے زخم رِس رہے ہوتے تھے۔

زخم تھے تو بہت پرانے مگر بیٹے پر اُن کے کُھلنے اور حواس پر شب خُون مارنے کا واقعہ ایک ساتھ ہوا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اس کا بیٹا ٹی وی کے سامنے بیٹھا بار بار دِکھائے جانے والے وقت کے عجوبہ سانحے کو حیرت سے دِیکھ رہا تھا۔ پہلے ایک طیارہ آیا' قوس بناتا ہوا ......اور ...... ایک فلک بوس عمارت سے ٹکرا گیا' شعلے بھڑک اُٹھے ......اور اَبھی آنکھیں پوری طرح چوپٹ ہو کر حیرت کی وسعت کو سمیٹ ہی رہی تھیں کہ منظر میں ایک اور طیارہ نمودار ہوا۔ پہلے طیارے کی طرح ......اور پہلی عمارت کے پہلو میں اُسی کی سی شان سے کھڑی دوسری عمارت کے بیچ گھس کر شعلے اُچھال گیا۔

وہ اپنے بیٹے کے عقب میں بیٹھا یہ سارا منظر انوکھے اطمینان سے دیکھتا رہا' جیسے یہی کچھ ہونا تھا ...... یا پھر جیسے یہی کچھ ہونا چاہیے تھے۔ اَگلے روز اطمینان کی جگہ بے کلی نے لے لی ...... حتّٰی کہ کچھ ہی دنوں میں وہ دہشت زدہ ہو چکا تھا۔

جب پہلی بار یہ منظر سکرین پر دِکھائی دِیا تھا' انوکھی طمانیت کی بھبک کے باعث اُس نے اَپنے ہی تلووں کے زخمی حصے کو سختی سے دَبا لیا تھا جس کے سبب اس کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی تھی۔

بیٹے نے پلٹ کر باپ کو دِیکھا اور فوری طور پر اس سسکاری کے کچھ اور معنی نکالے تھے......تاہم جب اُس کی نظر رِستے ہوئے تلووں پر پڑی تو بہت پریشان ہو گیا تھا۔

اُسے گلہ تھا کہ آخر اُس سے ان زخموں کو اوجھل کیوں رَکھا گیا تھا؟

وہ اَز حد فکر مندی ظاہر کرنے لگا تھا' ......اور شاید فکر میں مبتلا ہو بھی گیا تھا......لگ بھگ اِتنا

ہی فکر مند، جتنا کہ دونوں فلک بوس عمارتوں کے ساتھ طیاروں کے ٹکرانے کے بعد ہوا تھا۔

بعد کے دنوں میں دَرد اور تشویش میں اِضافہ ہوتا چلا گیا حتّٰی کہ دونوں کے حوصلے ٹوٹ گئے تھے۔

پھر یُوں ہوا کہ بیٹے نے مختلف ہسپتالوں کا دورہ کرنے والی ملٹی نیشنل اداروں کے ڈاکٹروں کی ٹیم سے رابطہ کیا۔ غیر ملکی ڈاکٹروں نے یہاں کے ڈاکٹروں کو مشورہ دِیا اور اُن صورتوں پر غور ہونے لگا جو اُس کے باپ کے علاج کے لیے ممکن تھیں۔

مگر اُس کا باپ اِن ڈاکٹروں کے نام ہی سے بِدکنے لگا تھا۔ اُسے نہ جانے کیوں اُن کی صورتیں اس کمپنی کے کارپردازان کی سی لگنے لگتی تھیں، جنھوں نے اپنے پراجیکٹ ایریا تک بہ سہولت رسائی کے لیے سامنے کی پھلواری بھی ایکوائر کروالی تھی۔ اُس کے باپ کا خیال تھا کہ تب جو زمین کو زخم لگے تھے اُس کے پاؤں کے تلووں نے سنبھال لیے تھے۔ اُس کا بیٹا کورآباد کو نکلتی سراب اُچھالتی شاہ راہ پر لمبی ڈرائیو کرتے ہوئے اُن باتوں کی بابت سوچتا اور قہقہے مار کر ہنستا تھا۔

وہ قہقہے مار مار کر ہنستا رہا حتّٰی کہ قہقہوں کے تسلسل سے اُس کی آنکھوں میں کسیلا پانی بھر گیا۔
جب اُس کا باپ رَفتہ رَفتہ اَپنے حواس کھوتا چلا جا رہا تھا، تب بھی اُس کی آنکھوں میں ایسا ہی کسیلا پانی تھا۔

پہلے پہل یوں ہوا تھا کہ ٹی وِی پر دونوں عمارتوں سے جہاز ٹکراتے دِیکھ کر وہ بھی قہقہہ بار ہوا، اور ہوتا چلا گیا...... حتّٰی کہ آنکھیں کڑوے پانیوں سے بھر گئیں۔ جب اُس کی آنکھیں، بار بار نشر کیا جانے والا منظر، دیکھنے کے قابل ہو گئیں تو وہ عجیب طرح سے سوچنے لگا تھا۔ منظر میں تو جہاز جڑواں فلک بوس ٹاورز کے بیچ گھستے تھے مگر اُسے یوں لگتا، جیسے وہ دونوں ٹاورز لوہے اور سیمنٹ کے نہ تھے، اُس کی اَپنی ہڈیوں اور ماس کے بنے ہوئے تھے۔

اُدھر سے جب بھی شعلے اُٹھتے تھے اِدھر اس کے درد کی چاہنگیں اُسے جکڑ لیتی تھیں۔

دَرد بڑھتا گیا' اِس قدر...... جس قدر کہ وہ بڑھ سکتا تھا۔

جِن ڈاکٹروں کے ساتھ بیٹے نے رابطہ کیا تھا' اُن سب کا کہنا تھا' بہت دِیر ہو چکی تھی۔ ٹانگوں کا کٹ جانا اُس کے باقی بدن کی بقا کے لیے ضروری ہو گیا تھا

اُس کے باقی بدن کو بچا لیا گیا۔

اس بدن کو' جس کے زِندہ یا مردہ ہونے کے بیچ کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

خود اُسے بھی اَندازہ نہ ہو پایا کہ اَپریشن کے بعد وہ کتنے عرصہ تک بے سُدھ پڑا رَہا... تاہم اس سارے دورانیے میں اُس درد کی شدت کا سلسلہ شاید ہی معطل ہوا ہوگا' جو اَندریوں گونجتا تھا کہ باہر کی سمت چھلک مارنے لگتا تھا۔

دَرد کی کسمَساہَٹ جب ہونٹوں تک پہنچی تو اُس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے جکڑ لیا .. دَرد چہرے کے خلیے خلیے کو تھرّانے لگا ...... حتّیٰ کہ پورے بدن پر لرزہ سا تیر گیا۔

اور یہ وہ آخری لَرزَہ تھا جو اُس نے اَپنے پورے بدن پر بکھر جانے دِیا تھا۔

بدن پر لوٹتی تھراہٹ کے سبب اُس کے چاروں طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ سب سے زِیادہ فکر بیٹے کو لاحق تھی۔ بدن سے باہر چھلکتے درد کے باوصف اَبھی تک وہ باہر کی دنیا سے بہت دور تھا ..... کہ وہ تو وہاں تھا' جہاں درد کے دَھارے کے ساتھ بسین نالے کا پانی تھا۔

اس پانی کے بہاوَ کی شوریدگی تھی

اور وہ ساری دہشت بھی تو وہیں تھی جسے پرے دھکیلنے کے وہ عمر بھر جتن کرتا رہا تھا۔

بسین نالہ' جہاں وہ رہتا تھا' وہاں سے سات میل ادھر پڑتا تھا۔ اَپنے اُن دِنوں کے دوستوں کے ساتھ وہ برسوں اس نالے پر جاتا رہا تھا۔ وہ عمر کے اس مرحلے میں تھا کہ جب بہتے

پانیوں کو دیکھ کر خواہ مخواہ نہانے کو جی کرتا ہے۔ وہ اپنی شلوار نیفے میں اُڑس لیا کرتا تھا' بڑے پلّوں والی بھاری شلوار کو اتنے بَل دیئے جاتے کہ اُس کا آسن کاٹنے لگتا تھا۔ وہ بسین میں گھس جاتا تو اُس وقت تک پانی سے باہر نہ نکلتا تھا جب تک کہ اُس کا آخری دوست بھی باہر نہ نکل آتا۔ بسین کا پانی اُچھالنا' اُس کی ریت پر ننگے پاؤں چلنا اور پانی کے بہاؤ کی آواز سننا' مَدّھم سی اور مَدُھری' اُسے اَچھا لگتا تھا۔

وہ اَپنے دوستوں سے اِس قدر وابستہ ہوتے ہوئے بھی اُن جیسا نہ ہوسکا تھا۔ اُس کے ساتھی عین اس وقت کہ جب وہاں سے ریل کو گزرنا ہوتا تھا' اُسے کھینچ کر اُدھر اوپر لے جاتے ...... وہاں جہاں تنگ سے پُل کے اُوپر سے ریل گزرتی تھی تو سارے میں ریل کے گزرنے کی گڑگڑاہٹ بھر جاتی تھی۔ ریل گزرنے کے لمحات میں وہ سب پُل کے نیچے سے اُوپر کا نظارہ کرتے اور قہقہے مارتے تھے .... مگر وہ دہشت زَدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلتا تھا۔ قہقہے مزید بلند ہوتے' وہ ساری قوت مجتمع کر کے قدم اُٹھاتا' اِتنی بھرپور قوت سے کہ جیسے اُس کا اگلا قدم وہاں پڑے گا جہاں نالہ دَم توڑ دِیتا تھا۔

بعد کے زمانے میں وہ اس چھوٹے سے نالے کی بابت سوچتا تھا تو اُس کا دَم ٹوٹتا تھا۔

وہ کوشش اور ہمت سے اس کی یادوں کو حافظے پرے سے پرے دھکیلتا رہا۔

جب تک وہ حواس میں رہا' اَپنی اِس کوشش میں کام یاب بھی رہا۔

مگر بسین کے اِس معصوم اور بے ضرر حوالے کو بعد ازاں وقوع پذیر ہونے والے سانحوں نے ثانوی بنا دیا تھا۔ اب تو اُس کی یادوں میں بسین کے اَندر بپھرے پانیوں کا شراٹا بہہ رہا تھا اور وہ ایک ایک منظر پوری جزئیات کے ساتھ دیکھتا تھا۔

پہلے پہل کا دِھیرے دِھیرے بہنے والا بسین نالہ' بپھر کر دریا بن چکا تھا۔

وہ پُل' جس کے نیچے کی چھاجوں برسنے والی دہشت' اُسے پَرے پھینک دِیتی تھی' پانیوں کی

تندی میں بہہ گیا تھا۔

اور وہ فاصلہ' جو وہ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ پیدل ہی طے کرلیا کرتا تھا' ٹرین پر طے ہوا تھا۔

ٹرین پر اُس کے لٹے پٹے مسافروں سے کہیں زِیادہ خوف لدا ہوا تھا

دہشت میں گندھا خوف' چیخیں اور سسکیاں اُچھالتا ہوا۔

پُل ٹوٹ جانے کے سبب پٹڑی اُکھڑ کر پانیوں کے سنگ بہہ رہی تھی ......اور رِیل گاڑی کوئ کوس بھر پہلے ہی روک لیا گیا تھا۔

رِیل کے رُکتے ہی دہشت کا منھ زور ریلا اُمنڈ پڑا' جو بسین کے کِنارے کِنارے دور تک پھیل گیا تھا۔ اُوپر کہیں شدید بارشیں ہوئی تھیں' یہاں بھی مینہ کم نہ برسا تھا اور ابھی تک پھوار سی پڑ رہی تھی مگر اُوپر کی بارشوں نے نالے کو دَریا بنا دیا تھا۔ حوصلے تو پہلے کے ٹوٹے ہوے تھے' آگے کا پُل ٹوٹ گیا تھا اور بلوائی کسی بھی وقت ان تک پہنچ سکتے تھے۔ بسین کا بپھرا ہوا پانی سامنے تھا' بلوائی نہیں پہنچے تھے مگر اُن کی دہشت پہنچ گئی تھی۔

شُوکتی ہوئی اور خوخیاتی ہوئی دَہشت......

خوف سینوں سے سسکاریاں کشید کرتا تھا......اتنی زیادہ اور اس تسلسل سے کہ یہ سسکاریاں بسین کے پانیوں کے شور شرابے پر حاوی ہو رہی تھیں۔

وہاں کچھ ہمت والے بھی تھے جو خوف کو پرے دَھکیلتے دَھکیلتے اُکتا گئے تھے۔ اب اُنہیں اُن کے حوصلے اُکساتے تھے لہذا' اُنہوں نے بپھرے پانیوں میں اَپنے قدم ڈال دیے۔

کئی پار چڑھ گئے تو اسے بھی یقین سا ہونے لگا کہ وہ بھی پار نکل جائے گا۔ اس نے اَپنی بیوی کا ہاتھ تھاما' ننھی بیٹی کو کندھے سے لگایا اور ہمت والوں کے ساتھ ہولیا۔ اُس نے بیوی کو نگاہ

سامنے کنارے پر جمائے رَکھنے کی تلقین کی اور خود بھی پار دِیکھ کر آگے بڑھنے لگا۔

اُس کی بیوی کو آٹھواں آدھے میں تھا۔ پانی دِیکھ کر اُسے چکر آنے لگتے تھے'ایک قدم آگے بڑھاتی تھی تو دو پیچھے کو پڑتے تھے۔ وہ سامنے کنارہ دیکھتی تھی مگر اُچھلتا چھل اُچھالتا منھ زور پانی اس کا دھیان جکڑ لیتا تھا...... حتی کہ وہ چکرا گئی' پاؤں اُچٹ گئے اور وہ پانیوں پر ڈولنے لگی۔

اُس نے بیوی کو چکرا کر پانی پر گرتے ہوئے دِیکھا تو اُسے سنبھالنے کو لپکا۔ ننھی بیٹی جو کندھے سے لگی تھی اس پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بیوی کو سنبھالتے سنبھالتے بیٹی پانیوں نے نگل لی۔ اُس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ عین بسین کے وسط سے دُکھ سمیٹ کر واپس پہلے کنارے پر پلٹ گئے۔ وہیں انہیں رات پڑ گئی اسی کنارے پر قافلے کی عورتوں نے رات کے کسی سمے اَپنی اَپنی اوڑھنیوں سے اوٹ بنائی اور سسکیوں کے بیچ ایک معصوم کی ننھی چیخوں کا استقبال کیا۔

یہ وہی معصوم تھا جو اَب اِتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اُس نے خود ہی باپ کی ٹانگیں کٹوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بیٹا ڈاکٹروں کے پینل سے پوری طرح متفق ہو گیا تھا کہ پاؤں کا گھاؤ پھیلتے پھیلتے اوپر تک پہنچ چکا تھا۔ وہ چلنے سے باز نہ آتا تھا..... یوں بقول اُن کے' زخم تازہ ہو جاتے تھے۔ ان زخموں سے اُٹھنے والا سلسلاہٹ جیسا مسلسل درد اُس کے نچلے دَھڑ میں اِتنا شدید ہو جاتا کہ اُس کی چیخیں نکلتی رہتیں۔ اِتنی بلند اور اِتنے تسلسل کے ساتھ کہ پڑوسی اُدھر ہی متوجہ رہتے تھے۔

ڈاکٹروں کے مطابق گھاؤ زہر بن گئے تھے لہذا اپریشن ضروری تھا۔ بیٹا بھی قائل ہو گیا تھا کہ اس ضمن میں باپ سے رائے لینا مناسب نہیں تھا اور وہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کا باپ کوئی معقول رائے دینے کے اہل نہیں رہا تھا۔

بیٹے کو یقین ہونے لگا تھا کہ وہ ساری صورتحال کو بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا لہذا اپنے طور پر ہی ڈاکٹروں سے متفق ہو گیا۔ اپریشن خاصا طویل تھا' اپریشن ہو گیا تو ڈاکٹروں نے حسب عادت

اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا' اس کا باپ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا......

مگر جب باپ کو ہوش آیا تو وہ اپنے ہی بیٹے سے ایک اور گھاؤ پوری طرح چھپا لینے کے جتن کر رہا تھا۔

یہ اس کے دِل کا گھاؤ تھا۔

ایسا گھاؤ' جس کے اندر سے دَرد کا عجب غراٹا اٹھتا تھا.....

وہ غراٹا' جو بدن کو تھرانے کے بہ جائے اسے لوتھ کا سا بنا دیتا تھا۔

جنم جہنم ۔ ١

''یہ جو نظر ہے نا! منظر چاہتی ہے۔

اور یہ جو منظر ہے نا! اَپنے وجود کے اِعتبار کے لیے ناظر چاہتا ہے۔

دِیکھنے اور دِیکھے جانے کی یہ جو اشتہا ہے نا! یہ فاصلوں کو پاٹتی ہے۔

اور فاصلوں کا وجود جب معدوم ہو جاتا ہے نا! تو جہنم وجود میں آتا ہے۔

اور اس جہنم میں اِیذا کوئی اور نہیں دیتا' دیکھنے اور دیکھے جانے کی اشتہا رکھنے والے ایک

دوسرے کو دیتے ہیں۔''

مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ اُسے نہیں دِیکھ پا رہا تھا' جو سراسر منظر بنی سامنے تھی۔

اُسے حیرت ہو رہی تھی۔

''یہ جو حیرت ہوتی ہے نا! یہ ہماری زِیست کی محافظ ہوتی ہے۔ اسے نکھارتی ہے' سنوارتی ہے۔ یہ نہ ہو اور بندہ سیدھے سبھاؤ حقیقتوں کا سامنا کر لے' تو حواس کھو بیٹھے۔ گویا حیرت بصارت اور بصیرت کے بیچ وہ خلا ہے' جہاں حقیقت کی تیز رفتاری اَپنی سُرعت رہن رَکھتی ہے اور چپکے سے شعور کی آغوش میں جا گرتی ہے۔ اور بندے کو یوں لگتا ہے' یہ تو وہی حقیقت ہے جس کا اسے پہلے سے ادراک تھا۔''

اور اُسے یوں لگتا تھا' منظر بن جانے والی عین مین وہی تھی جسے وہ نہ صرف جانتا تھا بل کہ پہلے سے اُس کا عادی بھی تھا۔

''یہ جو کسی کا عادی ہو جانا ہوتا ہے نا! یہ خود بخود دوسروں کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔ جہاں کئی دوسرے ناکارہ ہو جاتے ہیں' بہت سے اَفادی بھی ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جو عادی ہو جاتا ہے نا! وہ عین اسی ایک لمحے میں معذور بھی ہوتا ہے اور قادر بھی۔

قادران معنوں میں' کہ صرف ایک کے لیے دوسروں سے دست بردار ہونے کی صلاحیت رَکھتا ہے اور معذور یوں کہ جس کا وہ عادی ہو جائے وہ نہ رہے تو اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا''

اور جس کا وہ عادی تھا وہ وہاں نہیں تھی' مگر اُسے لگ رہا تھا وہ وہیں تھی اُس کے بدن کے اِرد گرد یا باطن میں یا اُس اور یا......

مگر منظر بن جانے والی جس کی کبھی عادی ہو گئی تھی وہ اَب نہیں تھا

اور جو سامنے تھا وہ زِندگی کی لذت سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

اُس نے اُسے دِیکھا تھا اور اَپنی نارسائیوں کی بابت سوچا تھا تو اُس کے اندر یہ خواہش ٹھاٹھیں مارنے لگی تھی کہ کاش لذت سے بھرا ہوا یہ پیالہ غٹا غٹ پی لے۔

اور وہ جواب اُس کے اور دِیکھ رہا تھا‘ اُس نے اُس کے پیاسے ہونٹوں کی تحریر کو پڑھ لیا تھا۔

’’یہ جو ہونٹ ہوتے ہیں نا! یہ آنکھیں اور یہ چہرہ بھی۔

یہ اکھروں کی بنا ہی اپنا مدعا کہہ دِینے کی قدرت رَکھتے ہیں۔‘‘

اُس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا‘ مگر وہ جو دِیکھ رہا تھا‘ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

’’ویسے بھی یہ جو زیست ہوتی ہے نا! قدم قدم پر ہدایات مانگتی ہے‘ مشورے طلب کرتی ہے۔ اور انہی مشوروں اور ہدایات کے گارِے پانی سے شعور کی عمارت وجود پاتی ہے؛ جس میں روزن ہوتے ہیں‘ کھڑکیاں اور دروازے ہوتے ہیں‘ جہاں سے ہوائیں گزرتی ہیں۔ نئے سورج کی روشنی اندر آتی ہے۔‘‘

اور وہ جو مادر زاد تھی‘ الف بالکل الف۔ اِنہی روزنوں‘ کھڑکیوں اور دروازوں کو چوپٹ کیے بیٹھی تھی۔

بس یوں سمجھو کہ وہ اس ننھی بچّی کی طرح تھی جس کا باپ تو بچّی کو بڑوں کا ادب سکھاتا ہے اور بڑوں کی بات مان لینے کی تعلیم دیتا ہے‘ پھر رَفتہ رَفتہ اُس پر خوفناک اِختیار حاصل کر لیتا ہے یوں کہ کوئی زور زبردستی اور تشدّد سے بھی اِس قدر اِختیار حاصل نہ کر پائے۔

اگر وہ بچّی کی طرح تھی جو اِختیار دِے چکی تھی تو دوسرا وہ تھا جو خوفناک اختیار حاصل کر چکا تھا۔

اور جسے خوفناک اِختیار حاصل تھا وہ دِیکھ رہا تھا۔

مگر جو منظر اس کے سامنے تھا وہ نظر میں نہیں سما رہا تھا۔

اس کے سامنے کیا تھا!

ایک وجود۔

جیتا جاگتا۔

سانسوں کی گرمی سے بھرا ہوا۔

چکنا، چمکتا، رنگ برساتا، خوشبو بکھیرتا۔

ایسا کہ اس نے پہلے نہیں دِیکھا تھا۔

تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مگر اب جو وہ دیکھ رہا تھا تو حواس گم ہو رہے تھے، طلب بے لگام ہو رہی تھی اور ہاتھ بے قابو ہوا چاہتے تھے۔

یہ کیسا اختیار تھا جو اسے بے اختیار کر رہا تھا۔

''اِختیار اور بے اِختیاری کے بیچ کتنا فاصلہ ہوتا ہے۔ ہے نا!''

اُس کے ہاتھ اُٹھے، بے صبری سے، مگر وہ رُکا خود بہ خود نہیں، اُس نے جبر کیا اور خود کو روکا، خیال کی رو کو تھوڑا سا بہکایا کہ اندر کا ندیدہ پن وہ نہ دِیکھ لے، جسے وہ دِیکھ رہا تھا۔

بس اِسی ایک ذرا سے جبر سے سارا پانسہ پلٹ گیا۔

اَب ناظر تھا مگر منظر بن جانے والی نہ تھی۔

جو نظر میں تھی۔

اُس میں تندی نہ تھی، ٹھہراؤ تھا۔ چھپا کے نہ تھے، دِھیما پن تھا۔ شیرہ ہی شیرہ نہ تھا، قطرہ قطرہ ٹپکتا رَس تھا۔

اُس نے نظر بھر کر منظر دِیکھا تھا اور نظر میں وہ بھر گئی جو دیکھنے اور دیکھے جانے کے قضیے میں ہی نہ پڑتی تھی۔

اور جب وہ نظر میں بھر گئی، جو وہاں تھی ہی نہیں، تو اُس نے دونوں بدنوں کے بیچ کئی سو پھیرے لگائے۔

اور جب وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا اور اَپنی ہی خواہش کے قدموں پر گر پڑا اور تیزی چلتی سانسوں کے بیچ خود کو مصلوب پایا تو اپنے آپ سے مکالمہ کیا۔

یہ پوست کیا ہوتا ہے۔

''بدن کا جغرافیہ۔''

اور یہ بدن کیا ہوتا ہے؟

''روح کا لبادہ۔''

اور یہ روح کیا ہوتی ہے؟

''خدا''

اور یہ خدا کون ہے؟

''وہ جو با اختیار ہے۔''

اور جو با اختیار نہیں ہے وہ کیا ہے؟

''وہ مخلوق ہے۔''

اور مخلوق کیا ہے؟

''نارسائی۔''

اس نے اَپنی مٹھیاں کھول کر دیکھیں' خالی تھیں اور آنکھوں کے بیچ یہاں وہاں کچھ بھی نہ تھا بس نارسائی کی دُھول اُڑتی تھی۔

اور وہ جو سامنے بیٹھی تھی۔

ایسے کہ جیسے وہ تھی۔

اب وہ حیران ہو رہی تھی۔

اَبھی لحہ بھی پہلے اُس نے اُسے دیکھا تھا' جس کے لیے وہ منظر بنی بیٹھی تھی تو اُسے طلب کا سیلاب اُمنڈتا نظر آیا تھا' اِس قدر کہ اس نے اپنے قدموں کو دھرتی سے جدا ہوتے محسوس کیا تھا اور اس سیلاب میں خود کو بہہ جانے پر مجبور پایا تھا۔

بس پلک جھپکنے کی دیر ہوئی اور سارا نظارہ بدل گیا۔

وہ، جو ناظر تھا، خود بھی بے بس تھا کہ وہ اُسے نظر نہ آ رہی تھی جو منظر بنی ہوئی تھی۔

ایسا اس کے ساتھ پہلے نہ ہوا تھا۔

اگر ہوا تھا بھی تو وہ اس شدّت سے نہ جان پایا تھا۔

"یہ جو جان لینا ہوتا ہے نا! اس جان لینے سے نہ جان پانے کی اَذِیّت قابلِ برداشت ہوتی ہے۔"

مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے مقابل ایک وجود تھا۔

سانس لیتا۔

شعلے برساتا۔

رنگ بکھیرتا۔

خُوشبو میں لپٹا۔

بغیر کسی لبادے کے۔

بغیر کسی آڑ کے۔

بغیر کسی فاصلے کے۔

وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔ مو بہ مو۔

وہ اسے چھو سکتا تھا۔ خلیہ بہ خلیہ۔

چاہتا تو مسلتا۔ روندتا۔ تھپتھپاتا۔

پہلے پہل ہیجان کی منزل آئی تھی۔ مگر ایک لمحے کے ضبط نے عجب مخمصے میں ڈال دیا

اور۔ بالآخر پانسہ پلٹ گیا۔

شعور پر خفتگی کا مہین پردہ پڑا۔

معروض معدوم ہوا۔

معدوم ادراک پر غالب ٹھہرا۔

اور جب ایسا ہو گیا تو۔

وہ حیرت کی تصویر بن گئی

حیرت کی تصویر بن جانے والی کو پہلے پہل جھجک ہوتی تھی' بعد میں اُس نے اَپنی تمام نا آسودگیوں کو یاد کیا تھا۔

وہ نا آسودِگیاں کہ جن کی چکی میں اُس کی زِیست کا دَانہ دَانہ پستا تھا۔

جب وہ اَپنی نا آسودگی کو یاد کر کے خوب رو چکی تھی تو اس نے ایک وجود دِیکھا تھا۔

وہ جو زِندگی سے کناروں تک بھرا ہوا تھا۔

جذبوں سے لبالب تھا۔

جس کے لمس میں گرماہٹ تھی۔

جس کی آنکھوں سے نکلتے شعلے اس کے وجود میں اُترتے چلے جاتے تھے۔

اور جو آخر کار اُس پر مکمل اِختیار پا چکا تھا۔

اِتنا اِختیار کہ وہ اُسے اِس حالت میں لے آیا جس حالت میں کبھی اُس شخص کے سامنے جانے پر مجبور تھی جو اُس کی زِندگی کا مالک بنا دیا گیا تھا۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس شخص کو اس پر اختیار ہو ۔ مگر اسے تھا۔

پہلے پہل وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی' وہ شخص اسے چھوئے کہ جسے بااختیار بنا دیا گیا تھا مگر رفتہ رفتہ اُس کے اعصاب تننے لگتے' بدن تڑخنے لگتا۔ اور وہ باؤلی ہو جاتی۔ چیختی' چلاتی' تن کے کپڑے پھاڑ ڈالتی۔ اور چاہتی کہ وہ اُسے مسلے' کچلے' روند ڈالے۔۔

مگر وہ پرے بیٹھا اُسے تکتا رہتا اور اَپنے ہی ہاتھ مسلتا رہتا تھا۔

اور ایک روز یوں ہوا کہ جب وہ اَپنے ہاتھ مسل رہا تھا۔ اور ایک ٹک اُسے دِیکھ رہا تھا۔ مر گیا۔

جب وہ مر گیا۔ تو وہ اس کے سامنے اس لباس میں تھی' جس میں وہ تخلیق کی گئی تھی۔

اُس کے مرنے سے کچھ دیر پہلے تک وہ بری طرح چیخ رہی تھی، برس رہی تھی، رو رہی تھی اور باؤلی ہو رہی تھی۔ مگر وہ پلک جھپکے بغیر اُسے دِیکھتا رہا۔ اور اپنے ہی ہاتھوں کو مسلتا رہا۔ اور۔
اور جب وہ کہ جو چیخ رہی تھی، اس نے دیکھا کہ دیکھنے والے کی پتیاں ٹھہر گئی تھیں اور ایک دوسرے کو مسلنے والے ہاتھ رک گئے تھے تو لفظ اس کے ہونٹوں میں ٹھہر گئے اور سارا شور شرابہ بدن میں ٹھٹھک گیا تھا۔

وہ آگے بڑھی اور اُسے چھوا۔

یہ وہ پہلی بار تھی کہ اُپنی خواہش اور اِختیار پر اُس نے اُسے چھوا تھا۔

یخ بستگی اُس کے اَندر اُتر گئی۔

اُسے یقین نہیں آ رہا تھا لہذا تسلی کرنے کے لیے آخری بار چھوا۔

اِس بار ٹھنڈا وجود اس کی روح میں اُتر گیا

اور جب اُس کی تسلی ہو گئی تو اُس کے اندر سے ایک طوفان اُٹھا اور اُمنڈ کر آنکھوں میں برسا۔

اور اس نے ''نہیں نہیں'' کے لفظ چیخ چیخ کر اَدا کیے۔

''نہیں نہیں'' کی صوت دیواروں سے ٹکراتی ہوئی جب اس کے وجود سے ٹکرائی تو اُسے یوں لگا جیسے اُس کا اپنا وجود معدوم ہو گیا تھا۔

پہلے کوئی تھا۔۔ جو اس کا نظارہ کرتا تھا

کھرا سچا۔

اس کی آنکھوں میں دوغلا پن نہ تھا۔ فریب نہ تھا۔ مکر نہ تھا۔ دھوکا نہ تھا۔

وہ دیکھتا تھا اور اُسے ہی دیکھتا تھا۔

اُس کی آنکھیں اُس کے وجود سے بھر جاتی تھی اور کنارے چھلکنے لگتے تھے۔

اور جب کنارے چھلکنے لگتے تھے......اور......اس کا وجود مزید شر شر اُس کی آنکھوں کے

راستے اس کے بدن میں اُترنا چاہتا تھا مگر اس کے وجود کی اُتھلی سطح تانبے کی طرح بج اُٹھتی تھی تو وہ اپنے ہی ہاتھوں کو مسلنے لگتا تھا۔

ایسے میں وہ اَپنی آنکھیں کھلی رَکھتا تھا۔

ان کھلی آنکھوں کے بیچ جو عذاب تھے وہ انہیں جانتی تھی مگر اہمیت نہ دیتی تھی کہ اسے وہ اَپنی نارسائی کے عذاب سے کم تر درجے کے عذاب لگتے تھے۔

ہاں مگر ایک بات بہت اَہم تھی کہ وہ ہاتھ مسلتا تو اسے اَپنی ہستی کا یقین ہو جاتا تھا۔

اور جسے اَپنی ہستی کا یقین ہو جایا کرتا تھا وہ ایک ہاتھ مسلتے وجود کے معدوم ہونے سے ہی متزلزل ہو گئی۔

پھر جب ہر طرف سے اس کے تکفیر ہونے لگی۔ تو اس نے' کہ جو اتنی صلاحیت رَکھتا تھا کہ وہ بغیر کسی جبر کے اُس پر اختیار حاصل کر لے' اسے ایک عجب مخمصے میں ڈال دیا۔

وہ یوں تھی...... جیسے کہ وہ تخلیق ہوئی تھی۔

اور وہ سامنے تھا بالکل یوں کہ وہ اُسے براہ راست دیکھ سکتا تھا۔ چاہتا تو چھو لیتا' اور۔

منظر بن جانے والی کو نہ جانے کیوں یقین تھا کہ ساری نارسائیاں' ناآسودگیاں اور تلخیاں جو اس کے وجود سے آکاس بیل کی طرح لپٹی ہوئی تھی' اس کے دَم سے جھڑ جائیں گی۔

اُس نے یقین کی نظر سے اُسے دِیکھا۔

اُمید کے پانیوں پر قدم رکھا۔

اور مخمصے میں جا گری۔

وہ مخمصے میں یوں گری کہ اُس نے عین اُس وقت اُس کی آنکھوں میں دِیکھ لیا تھا جب وہ وہاں نہ تھی

حالاں کہ وہ اس کے سامنے تھی۔ اور اس طرح تھی' جیسے کہ وہ چاہتا تھا۔

اس نے خود کو جھنجھوڑا اور آخری بار ناظر کی آنکھوں میں جھانکا۔

اسے اَپنی ہستی کا یقین چاہیے تھا‘ مگر۔

’’یہ جو ہستی اور نیستی ہوتی ہے نا! بس اِن کے بیچ بال برابر فاصلہ ہوتا ہے۔

یہ جو نظارہ کرنا ہوتا ہے نا! یہ محض دِیکھنا نہیں ہوتا‘ نظر کے گارے سے دیکھے جانے والے وجود کی عمارت اینٹ اینٹ تعمیر کرنا ہوتی ہے۔ مگر جب ناظر معروض کی بہ جائے معدوم کا اثبات کرنے لگے تو معروض کی ہستی نیستی میں بدل جاتی ہے اور معدوم کی نیستی ہستی میں۔‘‘

اور منظر نے خود کو ناظر کی نظر میں معدوم ہوتے دیکھ لیا تھا۔

گویا اب وہاں اس کی ہستی نیستی کے مترادف تھی۔

اور وہ کہ جس نے اُس کی ہستی کو نیستی میں بدل دیا تھا‘ اُس کی متخیلہ کو پَر لگ گئے تھے۔

جس نے اُڑان بھری۔ یہاں وہاں۔

اُس نے اِس ساری پرواز کو نظر بھر کر دِیکھا تو اسے خبر ہوئی‘ یہ پرواز باہر نہ تھی‘ بھیتر میں تھی۔

اُس نے وہاں جھانکا‘ اِدھر اُدھر یادوں کے جالے تھے‘ رِشتوں کا کاٹھ کباڑ تھا‘ نا آسودگیوں کی گرد تھی‘ آنسو تھے اور آہیں تھیں۔

اس نے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا‘ آہوں کو سسکیوں کو چولا پہنایا‘ پلکوں سے یادوں کی گرد صاف کی‘ محبت سے رشتوں کا کاٹھ کباڑ درست کیا۔ سلیقے سے رکھا۔ مُود رمُو خلیہ دَر خلیہ۔

جس کے وجود نے تخلیق کا کرب سہا تھا اور اس کے آنگن کو چہکار سے بھر دیا تھا۔

اور وہ مدت مدید سے منظر بننے کے آزار سے پاک تھی۔

اُدھر سامنے وہ تھی‘ جو منظر بنی بیٹھی تھی اور نظر کی طلب میں مری جاتی تھی‘ مگر جسے ناظر نے دیکھا وہ‘ وہ تھی جو دیکھے جانے کی طلب سے غنی تھی۔

عین اسی لمحے منظر بنی بیٹھی مخمصے میں پڑ گئی تھی۔ مخمصے سے نیستی میں جا گری اور پھر کراہ کر اپنے وجود پر نفرت بھیجی‘ اس شخص کو یاد کیا کہ جس کی آنکھیں اس کے وجود سے بھر جاتی تھیں تو جسم

تانبے کی طرح بجنے لگتا تھا۔اور پھر وہ اپنے ہاتھ مسلتا تھا۔

اور جب وہ اپنے ہاتھ مسلتا تھا تو اُپنی ہستی کا یقین ہونے لگتا تھا۔

شکستہ تخیل کی اس پرواز نے اس کے وجود میں تھوڑی سی ہستی ایک مرتبہ پھر بھر دی۔

اس نے اُٹھ کر خود کو سمیٹا' لپیٹا اور نفرت سے اُسے دِیکھا جو ناظر تو اُس کا تھا مگر اس کی آنکھ کوئی اور نظارہ سمیٹے ہوئے تھی۔ پھر آگے بڑھی منہ میں جمع ہونے والا سارا لعاب اس کے منہ پر تھوک دیا اور کہا۔

''جہنم اگر کوئی ہے تو وہ محض کسی کی نظر میں سما جانے کی خواہش ہے۔

میں نے تو ناحق اس جہنم کو اپنا مقدر بنائے رکھا۔''

اس نے قہر بھری ایک اور نظر حیرت دَر حیرت کے تلے سسکتے وجود پر ڈالی' بڑبڑائی۔

''عذاب کسی بھی دوسرے وجود کا نام ہے۔

یہ عذاب میرے لیے پہلے وہ تھا اور کچھ لمحے پہلے تک تم تھے۔''

بچا کھچا لعاب ایک مرتبہ پھر اُس نے اُپنے منہ میں جمع کیا اور اُس کے چہرے پر ایک اور تہہ چڑھا دی

''میں اِس جہنم پر لعنت بھیجتی ہوں۔''

پھر اس نے زِندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا اور زیست کی نئی شاہ راہ پر نکل کھڑی ہوئی۔

جنم جہنم۔ ۲

وہ جو زیست کی نئی شاہ راہ پر نکل کھڑی ہوئی تھی اُس کا دَامن گذر چکے لمحوں کے کانٹوں سے اُلجھا ہی رہا۔ اُس نے اَپنے تئیں دیکھے جانے کی خواہش کا کانٹا دِل سے نکال پھینکا تھا' مگر گزر چکے لمحے اُس کے دِل میں ترازو تھے۔

''یہ جو گزر چکے لمحے ہوتے ہیں نا! یہ دراصل جونکوں کی طرح ہوتے ہیں

لمحے۔ قطرہ قطرہ خُون پینے والے۔ اَندر ہی اَندر سے چاٹنے والے‘‘
اس کے سامنے زیست کی لمبی شاہ راہ تھی۔
اور اِرادہ تھا کہ وہ آگے بڑھتی رہے گی۔
مگر یادیں۔؟
اس نے انہیں پٹخ کر پرے پھینکا اور حتمی فیصلہ دے دیا کہ وہ انہیں قریب بھی نہ پھٹکنے دے گی۔

’’مگر یہ جو یادیں ہوتی ہیں نا! یہ پالتو بلی کی طرح ہوتی ہیں۔
دھتکارو، مارو، نکال دو، پھر پلٹ آتی ہیں۔
اور جب پلٹ آتی ہیں نا!۔ تو یوں سارے میں اتراتی پھرتی ہیں جیسے وہ سرے سے نکالی ہی نہ گئی ہوں۔

یہ جو نکلنا اور نکالنا ہوتا ہے نا! اِن کے بیچ انا کا فاصلہ ہوتا ہے۔
نکلو تو اَنا انگلی تھامے آگے آگے ہوتی ہے، نکالے جاؤ تو قدموں تلے کچلی جاتی ہے۔‘‘
پہلے پہل وہ اس فیصلے پر پہنچنے میں اُلجھی رہی کہ وہ نکلی تھی یا نکالی گئی تھی؟
اور جب وہ فیصلہ نہ کر پائی تو اس کا دھیان یادوں کی جونکوں کی طرف ہو گیا۔
’’یہ جو دھیان ہوتا ہے نا! گرگٹ کی طرح ہوتا ہے۔
رنگ بدلتا ہوا۔ پل میں ایسا پل میں ویسا
چکنا یوں کہ قابو میں نہیں آتا۔ پھسل پھِسل جاتا ہے۔‘‘
اب وہ کہ جس کا دِھیان قابو میں نہ تھا۔
اور جس کے اندر یادوں کی جونکیں مسلسل مگر قطرہ قطرہ خُون پیتی تھیں۔
اُس کے سامنے زیست کی لمبی شاہ راہ تھی۔
اس شاہ راہ پر اُسے آگے بڑھنا تھا۔

اس کے زادِ سفر میں پہلے پہل اُمید کی چمک تھی' جو راستہ دکھاتی تھی

حوصلہ تھا' جو بڑھاوا دیتا تھا

سپنوں کی خُوشبو تھی' جو اسے مدہوش رَکھتی تھی۔

مگر اب کچھ نہ تھا۔

نہ وہ تھا۔

نہ یہ تھا۔

بس تھی تو ایک لمبی شاہ راہ تھی جس کے ماتھے پر زیست کی تہمت دَھری تھی

بے شمار مگر ندیدی آنکھیں تھیں

لمبے لمبے مگر مکروہ ہاتھ تھے

بھاری' مضبوط اور سفاک قدم تھے

آنکھیں بدن چیرتی تھی' ہاتھ مسلتے تھے اور قدم کچل کچل دیتے۔

اور وہ کہ جسے بہت پہلے یہی کچھ پانے کی حسرت تھی پہلے پہل لذت کے پیالے آبِ حیات سمجھ کر پیتی رہی

پیتی رہی اور جیتی رہی۔

کس قدر سرور تھا' نشہ تھا' مٹھاس تھی۔

''یہ جو نشہ ہوتا ہے نا! ۔ اوّل اوّل یہی زِندگی کا حاصل ہوتا ہے۔

مگر آخر کار زِندگی نفی ہو جاتی ہے اور نشہ ہی نشہ رہ جاتا ہے۔''

جب زِندگی منہا ہو گئی

اور لذّت بھی یکسانیت نے نگل لی۔

تو بدن کھوکھلا ہو گیا۔

اور یوں بجنے لگا جیسے پھٹا ہوا ڈھول ہوتا ہے۔

تب اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا

اسے کچھ نظر نہ آیا۔

جو نظر آئے تو وہ خواب تھے' جو بے تعبیر تھے۔

''یہ خواب ہوتے ہیں نا!۔ یہ دراصل نا آسودہ خواہشوں کا عکس ہوتے ہیں۔''

اور یہ اُس کی کیسی نا آسودہ خواہشیں تھیں' جو وہ سیراب ہو کر بھی پیاسی کی پیاسی تھی

اور اس چشمے کو پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھیں جو سراب سے بھرا ہوا تھا

''یہ جو سراب ہوتا ہے نا!۔ یہ حقیقت ہوتی ہے۔

اور یہ جو حقیقت اور سراب کو الگ الگ شے سمجھنا ہوتا ہے نا! یہ محض ہمارے شعور کا التباس ہے۔''

اور جو پیچھے پلٹ پلٹ کر خشک چشمے کو دیکھتی تھی تو اُسے وہ لبالب بھرا ہوا لگتا تھا۔ اور اَپنی راہ میں آنے والے اُچھلتے کودتے پانی کو دیکھتی تھی تو وہ صحرا کی اُڑتی دُھول لگتی تھی

وہ سوچتی تھی۔ اَصل کیا ہے؟

اس نے سامنے دُور اُفق میں گم ہوتی شاہ راہ کی جانب دِیکھا اور سوچا۔ شاید اصل وہیں کہیں ہے۔

مگر جب وہ آگے بڑھی تو اُداسی اُس کے اَندر اُتر گئی۔

''یہ جو اُداسی ہوتی ہے نا!۔ یہ گرد کی طرح ہوتی ہے۔ نہ جھاڑو تو تہ در تہ جمتی چلی جاتی ہے۔ یا پھر اُن سوئیوں کی طرح' جن میں سارا بدن بیندھا ہوتا ہے' یوں کہ بھیگی شام کو سوئیاں چبھوئی گئی ہوں تو رات پڑ جاتی ہے سوئیاں نکال لی جائیں تو انگلیاں لہولہان ہو جاتی ہیں اور نہ نکالی جائیں تو سارا بدن سن ہو جاتا ہے۔''

اس نے پوروں سے اُداسی کی ایک ایک سوئی کو ٹٹولا محض ٹٹولنے ہی سے اُس کی پوریں زخمی ہو گئیں۔

اُس نے سوئیاں بندھے بدن کو سہلایا' خلیہ خلیہ سُن ہو رہا تھا

اُس نے ہمت کر کے ایک ایک سوئی نکال پھینکی۔

اور زخمی پوروں سے گرتے قطروں میں اپنے ہونٹوں کے عکس کو تلاش کیا۔

ابھی تک رَس بھرے تھے۔

قوسوں کو دیکھا۔ ندرت تھی

بدن ٹٹولا۔ مدھ بھرا تھا۔

بازؤوں کو جانچا۔ وارفتگی تھی۔

جب تک رس رہا ندرت رہی مدھ رہا وارفتگی رہی

وہ' جو بھی آتا سمٹاتی رہی اور آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔

آگے۔ آگے۔ مزید آگے

مگر اِس کا اَنت کیا ہے؟۔

اُس کے اندر ٹوٹے حوصلے کی صدا تھی

''کچھ بھی نہیں۔''

''گویا۔ یہ جو انت ہوتا ہے نا!۔ یہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہ تو فقط سراب ہے' دھوکا ہے''

مگر یہ جو چلنے والے ہوتے ہیں' رُکتے کیوں نہیں؟

''رُکیں کیسے۔ کہ ہر اَنت کا سرا آغاز سے جڑا ہوتا ہے۔

یوں اَنت تو آغاز ہی کا دوسرا نام ہوا' نا!۔''

اور وہ جو اَنت چاہتی تھی اسے پتہ ہی نہ چل رہا تھا کہ شروعات کہاں تھیں اور اَنت کہاں

اَنت اور آغاز گڈ مڈ ہو رہے تھے

اور وہ اپنے ہی محور پر گھومتی جا رہی تھی۔

''یہ جو اپنے ہی محور پر گھومنا ہوتا ہے نا!۔ اِس سے چلنے اور ساکن ہونے کا فرق مٹ جاتا ہے۔''

اور وہ جو اپنے ہی محور پر چل رہی تھی۔

یا گھوم رہی تھی۔

یا پھر جو ساکت تھی۔

اور اگر وہ ساکت تھی تو دوسرے چل رہے تھے

وہ بھی چل نہ رہے تھے' گھوم رہے تھے

اور جو گھوم رہے تھے' اُسے بھی گھما رہے تھے۔

اور جو گھما رہے تھے' اُس کا ہاتھ تھامتے تھے۔

جب ہاتھ تھام چکتے تھے تو قدم اُس کے اُوپر دَھرتے تھے۔

اور جب وہ ہمت کر کے ایک سے ہاتھ چھڑا لیتی تھی تو کوئی دوسرا تھام لیتا تھا

پھر تیسرا۔ وہ سب ایک ایک کر کے بدلتے رہے

ایک جیسے چہرے

ایک جیسی سرگوشیاں

ایک جیسی آوازیں

ایک جیسے بدن۔

ایک جیسی سختی۔

ایک جیسی نرماہٹ۔

اور پھر۔ یہاں وہاں۔ پانی ہی پانی۔

صاف' شفاف' موتیوں کی طرح چمکتا' پھسلتا

یا پھر بدبودار' گندا' تعفن پھیلاتا' اچھلتا' کودتا۔

اور ان پانیوں کے بیچ پچھتاوے۔
اور ان پچھتاوں کے بیچ چہروں کا طلوع وغروب
تو کیا زیست کی طویل شاہ راہ کا سفر ایسا ہی ہے؟
اور یہ زیست کیسی ہے جو چلتی ہی جا رہی ہے؟
اس نے پچل دینے والی زِیست کو دِیکھا۔
اور جانا؛
''زیست اور کچھ بھی نہیں، بس لعنت ہی لعنت ہے۔''

جنم جہنم۔ ۳

اور وہ کہ جس کے چہرے پر تھوک کی ایک اور تہہ جم گئی تھی۔
اُس کی سماعتوں سے تھوک کر چلی جانے والی کے قہقہوں کی گونج اُبھی تک ٹکرا رہی تھی
وہ اُٹھا۔ بڑبڑایا۔

''جہنم۔لعنت''

پھر اَپنے وجود پر نظر ڈالی اور لڑکھڑا کر گر گیا۔

اب نگاہ اوپر کی تو نظر میں کوئی بھی نہ تھا' جو سہارا ہو

وہ خالی پن سے گھبرا اُٹھا

مٹی مٹھیوں میں بھر لی اور ہوا کے رُخ پر اُچھال دِی......ساری مٹی ہوا نے واپس اُسی پر بکھیر دی۔

مٹی۔مٹی پر بکھر گئی۔وہ منمنایا۔

''اگر یہ مٹی ہے اور میں بھی ہوں تو حقیقت کیا ہے۔''

مٹی کا جواب تھا۔

''شونیتا''۔

شُونیتا اس نے دہرایا

''مٹی ہمیشہ سچ کہتی ہے۔ یہ جو شونیتا ہے نا!۔ یہ حقیقت کا اصل الاصول ہے۔منتہائے دانش' کلی حقیقت۔تتھتا اور آخر کار نِروان۔''

تو کیا یہ سب کچھ واہمہ ہے' دھوکہ ہیہ صوت' یہ نگاہ' یہ جذبوں سے لبالب بھر جانا' یہ قہقہے' یہ آنسوؤں کا امنڈ آنا اور اور

''یہ تو نِردبان ہے۔''

وہ مباحثے پر اُتر آیا' کہی باتوں کو سوال کی صورت لوٹانے لگا۔نِردبان؟

''دیکھو جس منزل کے تم متلاشی ہو اُس کا جاپ شونیہ ہے۔''

خاموش ہو جاؤ خود میں اُترو اور اِنسانی بقا کے گہرے رازوں کی کھوج میں نکل جاؤ ورنہ تم اَپوہ کے اسیر ہو جاؤ گے۔''

وہ رہ نہ سکا۔اَپوہ؟۔

''محدود ہوتا ہے۔ اتنا کہ جتنا دوسرے کو رد کرنے سے جگہ بنا پاتا ہے۔''

وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

''یہ جو میں ہوں نا!۔ یہ میں اس لیے ہوں کہ میں تُو نہیں۔

اور یہ جو تُو ہے نا۔ تُو اس لیے ہے کہ تُو میں نہیں۔

جب تجھ سے دوسرے سارے نفی ہو جائیں گے تو فقط تو ہو گا۔ تب آنند کی کھلی بانہیں تمہیں آغوش میں لے لیں گی۔''

آنند؟۔

''ہاں آنند۔ اور یہ جو آنند ہوتا ہے نا!۔ یہی رَس ہے۔ اور یہ جو رَس ہوتا ہے نا یہی آنند ہے''

تب اُس نے اس کی بابت سوچا جو رَس کی طلب میں زِیست کی نئی شاہ راہ پر نکل کھڑی ہوئی تھی اور خود کو سوچا کہ آنند پانے کو اُسے دیکھا تھا تو آنکھ میں وہ بھر گئی تھی جو منظر بننے کی خواہش سے وراء الوراء تھی۔

پھر ایک اور نگاہ اُپنے وجود پر ڈالی جو رَس بھوگ سے بھوگنا چاہتا تھا مگر آنکھوں میں مٹی کی رَڑک تھی۔

اُسے یاد آیا۔ کہ وہ جو خود بخود نظر میں بھر گئی تھی پہلے پہل آئی تھی تو مَدَن مد تھی۔ جگر جگر کرتی۔ لشکارے مارتی چکا چوند کرتی۔ مگر اب وہ شونیہ ہی شونیہ تھی۔

بیچ کی ساری منزلوں سے وہ بے خبر تھا۔

''بیچ کی منزلیں جان لو گے نا!۔ تو بھے کا شکار ہو جاؤ گے۔ ان منزلوں سے گزرنے والے تو ان جانے میں گزر جاتے ہیں''

اَن جانے میں؟

''ہاں اَن جانے میں

رتی کے سہارے،...... شوک سہتے ہوئے، ......بغیر کسی گرودھ کے،...... بغیر کسی بھے کے،......بغیر کسی جگپسا کے

کہ اس راہ میں وسمے ہی وَسمے ہے۔''

وسمے۔؟

''ہاں اِستعجاب کے فلک سے تحیّر کا برستا ہوا جل۔ اور آدمی اس سے بھیگ بھِیگ جاتا ہے تم بھی بھیگ گئے ہونا!''

پھر اس نے دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب تھیں۔

وہ، وہاں پہنچا جہاں وہ تھی جسے نہ دیکھنے کی خواہش تھی نہ دیکھے جانے کی اشتہا۔

تم اس منزل تک کیسی پہنچ گئیں؟

تمہارے طفیل۔ تم نے میری تکفیر کی اور میں خود کو بھول گئی۔ جب مجھے اپنی نیستی کا یقین ہو گیا تو میں ان لعنتوں سے چھٹکارا پا گئی جن میں اب تم لتھڑے ہوئے ہو۔

اب تم جہاں ہو وہاں کی بابت کچھ بتاؤ؟

دیکھو! میں جب ہوں ہی نہیں تو اپنی بابت کیا بتاؤں؟

اور یہ جو تم میرے مقابل ہو۔

یہ میں نہیں اس کا پرتو ہے ہاں جو ہے۔ مگر نہیں ہے۔

کیا کہتی ہو؟۔ جو ہے۔ مگر نہیں ہے۔ اور یہ جو تم ہو۔ اور یہ جو میں ہوں۔ اور یہ جو زیست کی لمبی شاہ راہ ہے۔ اور اس پر بھاگتی قہقہے لگاتی وہ ہے، جو نظر کی طلب میں منظر بن گئی تھی اور یہ جو نظارے ہیں اور یہ جو نظر ہے

وہ ہنسی کچھ بھی نہیں ہے بس لعنت ہی لعنت ہے۔

یہ جنم بھی۔ اور اس کے علائق بھی سب لعنت ہی لعنت ہے

وہ بڑبڑایا۔ لعنت؟

پھر بھاگتا ہوا آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا...... اور تاڑ تاڑ تھپڑ اپنے ہی منھ پر یوں رسید کرنے لگا جیسے جہنم کے بھڑکتے شعلے بجھا رہا ہو۔

پھر چیخا لعنت۔لعنت

تب اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے

اور ہونٹوں سے اس کے زخمی گالوں کو چوما۔

اور پوروں سے اس کے آنسوؤں کو صاف کیا۔

اور اسے دیکھا۔

اور جب اُسے دیکھا' تو وہ اس کی آنکھ میں گر گئی اور ساری کی ساری بھیگ گئی۔

بھیگ گئی اور بہہ گئی۔

بہہ گئی اور ڈوب گئی۔

تب اس کے اندر اسی کی ہستی اُتر آئی۔

وہ مچل اُٹھی اور چیخ کر کہا۔

''یہ جو لعنت کی کٹاری کی تیز دھار ہے نا!۔ بالآخر یہی تو بندے کا مقدّر ہے۔''

بند آنکھوں سے پَرے

راحیل کو زِندگی میں پہلی مرتبہ اَپنی بے بسی پر ترس آیا۔

کل شام تک وہ اَپنی قسمت پر نازاں تھا۔

کون سی نعمت تھی، جو اس کا مقدّر نہ ٹھہری تھی۔

یہ جو تتلی جیسی بچی نایاب اور پھولوں جیسے دو بچے نبیل اور فرخ پھلواڑی میں کھیل رہے ہیں،

راحیل ہی کے بچے ہیں۔

کل تک وہ انہیں دیکھتا تھا تو روح میں تازگی پاتا تھا' خُون کی حدت تیز ہو جاتی تھی اور آنکھوں میں محبت اور وارفتگی کی چمک اُتر آتی تھی۔

کہ کل کا ہر سمے یقین کا سمے تھا۔

مگر اب یقین کے سمے کی ڈوری اس کے ہاتھ سے سرک چکی تھی۔ اسے یوں لگنے لگا' جیسے اس کی روح تشکیک' تذبذب اور بے قراری کی سولی پر لٹکی ہوئی ہو۔

کیا وہ سب لمحے اِلتباس تھے جو اُنہوں نے ایک دوسرے میں گم ہو کر گزارے تھے؟

اُسے یقین نہیں آ رہا تھا......

یقین کے لیے وجہ کی ٹھوس زمین چاہئے جس پر بے دھڑک قدم رکھے جا سکیں۔ وہ تو اندیشوں کے آوارہ بادلوں میں یونہی ڈول رہا تھا...... ''ہاں'' اور ''نہ'' کی صلیب پر لٹکا' من کے سمندر میں تیر رہا تھا...... اور موج در موج اُٹھتی لہریں' جن کا رُخ کبھی باہر کی جانب تھا' بالکل ایسے ہی جیسے چودھویں رات ساری موجیں کناروں کو لپکتی ہیں' وہ آج اس کے باطن میں اندر بہت گہرائی میں گرتی چلی جاتی تھیں۔

وہ سن روم میں بیٹھا تھا۔ یوں جیسے اس کا وجود بالکل خالی ہو چکا ہو۔ ایسے میں اس کی نظریں اوپر اٹھیں اور ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد پھلواڑی کے بیچوں بیچ امریکن گراس سے سجے لان میں کھیلتے اَپنے بچوں پ' گئیں۔ فلک کی سمت اُٹھتے سرسبز پہاڑوں پر چھتنار پیڑوں سے بادلوں کے دَل کے دَل یوں اُٹھ رہے تھے جیسے وہاں جگہ جگہ آگ سلگ رہی ہو اور دُھواں ہی دُھواں اُوپر اُٹھ رہا ہو۔

ایسی ہی ٹھنڈی آگ اسے لگا اس کے اَندر بھی بھڑکنے لگی تھی۔

بادل رفتہ رفتہ پھیلتے پھیلتے کاٹیج کے گرداگرد لکڑی سے بنے ہوئے جنگلے تک آ پہنچے تھے۔ ہر طرف دُھند ہی دُھند تھی۔ چند لمحے پہلے جو پہاڑ گھنے پیڑوں اور اُمنڈتے بادلوں سے مزین نظر آ

رہے تھے‘ وہ اب اس دھند میں گم ہو گئے تھے۔

یہی وہ موسم تھا‘ جو ہر سال گرمیوں میں‘ جب بچوں کو اسکولوں سے چھٹیاں ہوتی تھیں‘ اُسے یہاں رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے اِسی مہینے اور اِسی تاریخ کو راحیل اور حسینہ اِسی کاٹیج کی پھلواڑی کے بیچوں بیچ‘ وہاں جہاں نایاب‘ نبیل اور فرخ کھیل رہے ہیں‘ ایک دوسرے میں گم تھے...... یا پھر شاید راحیل حسینہ میں گم تھا اور حسینہ......

تب بھی بادل یونہی پیڑوں کی پھنگیوں سے اُٹھے تھے اور کاٹیج کے جنگلے کو پھلانگنے لگے تھے ۔ ان دونوں کو بادلوں کی یہ اٹکھیلیاں اچھی لگ رہی تھیں۔ پھر انہیں یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ بادلوں کی گود میں تھے۔

حسینہ راحیل کے مقابل بیٹھی تھی۔

اور اس کے نیم گھونگھریالے بال اس کے اُبھرے ہوئے شانوں کو چھو رہے تھے۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور گال سیب کی مانند سرخ ہو رہے تھے۔ راحیل کھسک کر اُس کے داہنے ہاتھ ہو گیا اور اُس کا سر اَپنے زانو پر ٹکا لیا۔ حسینہ نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی اور خاموشی سے گیلی گھاس پر ٹانگیں پسار کر اپنے پورے چہرے کو راحیل کے سامنے کر دیا تھا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹ مسکراہٹ کی پھوار سے گیلے ہو کر پھیل رہے تھے۔ پلکوں کی جھالر تھرتھرا کر اُوپر اُٹھتی اور پھر نیچے گر جاتی......

گویا اُس کی آنکھیں بند تھیں......

اُس کی آنکھیں بند تھیں؟......

اِس خیال کے آتے ہی راحیل کو یوں لگا جیسے ایک کوندا سا لپک کر اُسے بھسم کر گیا ہو......

تب بھی اُس کی آنکھیں بند تھیں......؟

اُن سرشاری کے لمحوں میں‘ جب کہ شادی کو محض تین روز گزرے تھے......تب بھی......تب بھی......؟

اندر سینے میں درد بڑھتا ہی چلا گیا۔

اس نے بچوں کی جانب دیکھا۔ تینوں پہلے کی طرح کھیلنے میں مگن تھے......ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے...... دائرے میں گھومتے ہوے......ایک دوسرے پر گرتے ہوے......قہقہے لگاتے ہوے......اور چیختے ہوے:

Ring a ring of roses

A pocket full of posies

Tishoo! tishoo!

We all fall down

اور راحیل کا ذِہن Fall Down ......Fall Down کی تکرار سے گونج اُٹھا۔

بادل کا تیج کا جنگلا پھلانگ کر پھلواڑی کے بیچ پہنچ گئے۔ اسے یوں لگ رہا تھا' بچے کبھی گیلی دھند میں گم ہوتے تھے اور کبھی ان بادلوں کی گود سے کود کر سامنے آجاتے۔ راحیل سَن روم سے باہر آگیا۔ اس کے بدن کا بہت سا خالی پن وسوسوں سے بھر گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا بچوں تک پہنچا۔ باری باری اُپنی نگہ کی لمبی پوروں کے لمس سے اُن کے چہروں کے ایک ایک خط کو ٹٹولا۔ پھر نفی میں دائیں بائیں سر ہلاتا ہوا واپس سَن روم میں پہنچا اور خود کو کرسی پر گرا دیا۔

Fall Down...Fall Down

بچے پہلے کی طرح اپنے کھیل میں مگن رہے۔

حسینہ' اُس کی بیوی یعنی اُس کے بچوں کی ماں' کچن میں اُس کے لیے چائنیز بنانے میں مصروف تھی...... وہی حسینہ کہ جس نے راحیل کو کبھی بھی مایوس نہیں کیا تھا۔ اُسے یوں لگتا تھا کہ خلوص کا یہ مجسمہ ہر آن اُس کی دِل جوئی میں لگا رہتا تھا۔ بالکل ہمارے ہاں کی روایتی بیویوں کی طرح...... راحیل کو اُس پر ناز تھا اور بے اَنت پیار بھی......اور شاید جس لمحے اس نے اپنے آپ کو

پھلواڑی سے واپس آ کر خود کو کرسی پر گرا لیا تھا تب تک اسے پیار تھا...... مگر یہ واقعہ بھی اپنی جگہ تھا کہ کل شام سے اس لمحہ تک تشکیک، تذبذب، بے قراری اور بے یقینی کی آری نے اُس کے لیے اور صرف اُسی کے لیے مخصوص راحیل کے باطنی جذبات کو اندر ہی اندر سے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔

ہاں...... کل شام سے...... کہ جب جمال، راحیل کو ملا تھا۔

وہی جمال جو کبھی راحیل کا کلاس فیلو تھا۔

اِسم با مسمیٰ...... دراز قد، مضبوط بدن، کھلتی رنگت اور سب سے بڑھ کر اُس کا شیریں لہجہ...... شاید یہی وہ خصوصیات تھیں، جن کی وجہ سے وہ پوری یونیورسٹی میں ہر دِل عزیز تھا...... اور شاید یہی وجہ تھی کہ انگلش لٹریچر کی طالبہ حسینہ اُس پر مرمٹی تھی۔

حسینہ بھی اَپنے نام کی طرح حسین تھی۔

نکلتا قد، نیم گھونگھریالے بال، فربہی شانے، بڑی اور بھوری آنکھیں، چھوٹے چھوٹے ہونٹ، صاف شفاف جلد، دودھیا رنگ میں شفق کی سرخی گھلی ہوئی۔ وہ دونوں کب سے ایک دوسرے کی چاہ میں بندھے ہوئے تھے؟ اُن دنوں راحیل کو اِس کا علم نہ تھا...... اور شاید اُس کو علم ہوتا بھی نہ، اگر وہ اس روز حسینہ کی سسکیاں نہ سن لیتا۔ ڈیپارٹمنٹ آف پتھالوجی کے عقب میں خوبصورت سے لان کی پرلی طرف دونوں مقابل بیٹھے تھے۔ جمال بے قراری سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اپنے گالوں پر ٹھہرے ہوئے آنسو اَپنی مخروطی اُنگلیوں سے صاف کر رہی تھی۔ راحیل نے تجسس میں اَپنی چال مدہم کر لی۔

وہ کپکپائے لفظوں میں کہہ رہی تھی:

''عورت اَپنی زندگی میں صرف ایک ہی مرد کو چاہتی ہے، ہاں صرف ایک مرد کو...... میں نے تمہیں چاہا ہے...... تمہیں روح تک میں بسایا ہے...... تمہارے لیے خواب دیکھے ہیں...... تم سے اُمیدیں باندھی ہیں...... بس تم ہی میرے مَن کے اَندر اُترے ہو۔ تم اور صرف تم میرا پیار ہو...... یاد رکھنا...... میں تمہیں زِندگی بھر نہ بھلا سکوں گی۔''

جمال چُپ چاپ اُسے دِیکھے جا رہا تھا اور حسینہ بھی چند لمحوں کے لیے چُپ کے پانیوں میں اُتر گئی تھی......اور اِسی اثنا میں راحیل کچھ آگے نکل گیا۔

وہ پہلا دِن تھا کہ راحیل کو اُن دونوں کی محبت کا علم ہوا تھا۔

اور وہ آخری دن تھا کہ اُس نے جمال کو دِیکھا تھا۔

حسینہ بلا کی حسین سہی مگر اُس میں آج کل کی لڑکیوں جیسا چنچل پن نہ تھا۔ کسی نے بھی اس کے کھنکتے قہقہے نہ سنے تھے۔ وہ اکثر حیا کی چادر میں لپٹی لائبریری میں دیکھی جاتی یا پھر گنے چنے سنجیدہ سے دوستوں اور سہیلیوں کے ہمراہ کسی خشک سے موضوع پر محوِ گفتگو ہوتی ......اس کا پسندیدہ موضوع ادب و فلسفہ تھا۔ اِس پر وہ پہروں جمال کے ساتھ گفتگو کرتی۔ یہ ادبی و علمی محافل زیادہ تر ڈیپارٹمنٹ آف پتھالوجی کے عقب والے خوبصورت لان میں جما کرتی تھیں۔ ان میں راحیل بھی کبھی کبھار شریک ہوا کرتا تھا۔ لیکن اکثر اوقات بحث اِتنی خشک ہوتی کہ وہ جلد اُکتا کر اُٹھ جاتا۔

اُس روز تک، کہ جس روز اُس نے جمال کو آخری بار دیکھا تھا اور حسینہ اَپنے دہکتے گالوں سے ڈھلکتے آنسو صاف کرتے، اور عورت کے ایک پیار کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے، جمال کو اَپنی محبت کا یقین دِلا رہی تھی...... ہاں شاید اس روز تک، راحیل کو اس میں کبھی کوئی کشش محسوس نہ ہوئی تھی۔

ایک سنجیدہ سی فلسفی لڑکی، جو خشک موضوعات پر تو پہروں بولتی ہو، مگر دوستوں کو ایک کھنکتا قہقہہ تک نواز نہ سکے......اُس میں بھلا راحیل کو کشش محسوس ہوتی بھی تو کیوں کر؟

مگر اُس لمحے کہ جب اُس کے ہونٹ جمال کی محبت کی نمی سے تر تھے؛ راحیل کو یوں لگا، جیسے اس کے اندر کہیں نہ کہیں کچھ ہونے لگا تھا......

وہ جو محض کتابوں میں غرق رہتی......وہ جو خشک ادبی و فلسفیانہ موضوعات پر پہروں بحث کرتی......اور......وہ کہ جسے کسی نے کُھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا......جو بلا کی حسین سہی......

مگر جس کا کوئی سکینڈل یونیورسٹی کی فضا میں نہیں گونجا...... اُس کے ہونٹ محبت کی پھوار سے تر بھی ہو سکتے تھے!...... اُس کا دِل محبت میں بے قرار ہونا بھی جانتا تھا!...... یہ اُس کی شخصیت کا ایسا حسین گوشہ تھا جو راحیل پر پہلی مرتبہ کُھلا تھا...... اور کُھلا بھی یوں کہ اُسے اندر سے نہال کر گیا تھا۔

اس کے بعد تو اُس کی نظر میں کوئی بھی جچ نہیں رہا تھا۔ سب فیشن کی شائق' بات بات پر قہقہے لگانے والی' اٹھکیلیاں کرتی' آنکھیں مٹکاتی' جدید تہذیب میں ڈھلی ہوئی' دھلی دھلائی چمکتی لڑکیاں بہت پیچھے رہ گئیں۔

پھر وقت نے کچھ یوں انگڑائی لی کہ اُسے حاصل کرنا راحیل کے لیے کوئی مشکل نہ رہا۔

اُس روز کہ جب پہلی مرتبہ اُس نے جمال کے لیے حسینہ کے ہونٹوں سے محبت کے بھیگے لفظ طلوع ہوتے دیکھے تھے اور کل شام کے اُس سمے تک کہ جب جمال اُسے ایک طویل عرصے بعد ملا تھا؛ راحیل اور حسینہ کے بیچ جتنے موسم آئے' اُن میں سے ایک پر بھی جمال کا سایہ تک نہ تھا۔

اور اس روز کہ جب وہ راحیل کی دُلہن بن کر اُس کے آنگن میں اُتری تھی' اس روز سے کل شام تک کا ایک ایک لمحہ راحیل کی مٹھی سے پھسل کر گزرا تھا۔ کل کا سارا دِن راحیل نے بچوں کے ساتھ کھیلتے اور حسینہ سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے گزار دیا۔ شام ہونے کو آئی تو وہ بے دھیانی میں باہر نکل کھڑا ہوا۔ پیدل چلتا چلتا کارٹ روڈ سے ہوتا ہوا مال تک گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ پانی سے بوجھل بادل ہوا کے سنگ ڈول رہے تھے اور جی چاہتا تھا' چھوٹے چھوٹے قدموں سے وہ یونہی چلتا رہے...... چلتا رہے۔ دفعتاً اُس کی نگہ جمال پر پڑی...... ایک لمحے کو وہ اُس نے اس کی جانب لپکنا چاہا مگر دوسری آن اِک دھڑکے نے اُس کے قدم جکڑ لیے۔

وہ چاہتا تھا' پہلو بچا کر نکل جائے۔ مگر وہ ایسا چاہتے ہوئے بھی نہ کر سکا۔ کہ جمال بہت قریب آ چکا تھا اور اس نے اُسے دیکھ بھی لیا۔ اُس نے مصنوعی گرمجوشی سے اُسے بغل گیر کیا...... طویل عرصے تک گم رہنے کا گلہ کیا اور کوئی بہانہ بنا کر کھسک جانے کا ارادہ باندھا۔ مگر جب جمال نے نہایت اپنائیت سے کافی کے کپ پر جا چکے لمحوں کو یاد کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ مجبوراً

ساتھ ہولیا تھا۔

X

اُن کے سامنے کافی کے گرم گرم کپ پڑے تھے جن سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور شیشے کی دیوار کے اُس پار بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پانی سے بوجھل بادل اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے......اور راحیل اس کے مقابل بیٹھا اس کے سوالوں کے زدّ پر تھا...... وہ کہ جو بالکل نہ بدلا تھا......بس آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگ گیا اور کنپٹیوں پر چند بال سفید ہو گئے تھے...... پوچھ رہا تھا:

''شادی کی؟۔ بھابھی کیسی ہے؟...... بچے کتنے ہیں؟......''

راحیل پر یہ سوال بہت گراں گزر رہے تھے......وہ پہلو بچا بچا کر جواب دِیتا رہا اور کسی بھی لمحے اُس پر یہ نہ کھلنے دِیا کہ وہی حسینہ جو بہت عرصہ قبل ڈیپارٹمنٹ آف پتھالوجی کے عقب والے گراؤنڈ میں روتے ہوے اور عورت کے ایک پیار کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے' اسے اَپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی؛ وہی...... ہاں وہی...... حسینہ اب اس کی بیوی تھی......اس کے بچوں کی ماں...... اس کے لیے پل پل جینے والی...... ہر لمحہ اس کی خُوشنودی کے لیے مصروف......اسے حسینہ پر اعتماد تھا......مگر نہ جانے کیوں' وہ جمال پر یہ سب کچھ ظاہر نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ تب ہی تو اُس نے موضوع بدلنے کے لیے اَپنے سوالات کا رُخ جمال کی جانب کر دیا تھا۔

''تم......تم ایکا ایکی کیسے غائب ہو گئے تھے؟...... مجھے یاد ہے' میں نے تمہیں آخری بار ڈیپارٹمنٹ آف پتھالوجی کے عقب والے لان میں دیکھا تھا......''

''میں بزدل تھا''

راحیل چونک پڑا' نگاہیں اُس کے چہرے پر گاڑتے ہوے کہا:

''بزدل؟''

وہ راحیل کے کندھے سے پرے شیشے کی اُس جانب پانی سے بوجھل آوارہ بادلوں کو دیکھتے ہوے گویا ہوا:

''بزدل......ہاں بزدل......میں واقعی بہت بزدل تھا''

پھر اُس نے راحیل کو آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے دیکھا اور کہا:

''میرے دوست''

اس کی آواز، جو کہیں دور سے آ رہی تھی، پھر کہیں گم ہو گئی۔ ہونٹ تھر تھرائے اور لفظ ایک ایک کر کے اس کے ہونٹوں سے یوں پھسلنے لگے کہ بمشکل راحیل تک پہنچ پا رہے تھے:

''اس روز کہ جب تم نے مجھے آخری مرتبہ دیکھا تھا......اس نے پہلی مرتبہ محبت کے بھیگے لفظ سے اپنے ہونٹوں کو معطر کیا تھا۔

میں حیرت سے اُسے دِیکھ رہا تھا۔

خُوشی کا سماملا تھا تو یوں کہ میرے بدن کا ایک ایک خلیہ دُکھ کی بھٹی میں بُھن رہا تھا......

میں اُسے خدا حافظ کہہ دینے پر مجبور تھا......کہ میں بزدل تھا۔ مگر اُس نے سب کچھ سننے کے بعد بھی وہ لفظ کہے تھے، جن کو اُس کے سامنے کہہ دینے کا مجھے کبھی حوصلہ نہ ہوا......اور جن کو سننے کی چاہ میں، مَیں نے طویل اِنتظار کا دُکھ سہا تھا......''

راحیل پہلو بدل رہا تھا۔

مگر جمال رندھا جانے والی آواز میں اُسے بتا رہا تھا:

''جس روز میں نے اُسے آخری بار دیکھا تھا۔ اُس سے ایک رات قبل میرا باپ قتل ہو گیا تھا......اور ابھی میں باپ کی لاش کے حصول کے لیے جائے وقوعہ کی جانب بھاگ رہا تھا کہ میرے چچا نے، میری راہ روک کر، مجھے بتایا تھا، میرے باپ کے قاتل کو لہو میں نہلا دِیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا، دشمنوں کا شک مجھ پر ہے کہ یہ دوسرا قتل میں نے باپ کا بدلہ لینے کے لیے کیا ہے......''

پھر رات ابھی میں نے اپنے باپ کی نعش دفن بھی نہ کی تھی کہ مجھے بتایا گیا، میری جان خطرے میں ہے،......اور یہ بھی......کہ......میرے خلاف قتل کا مُقدّمہ درج کرانے کے لیے آدمی

تھانے کی جانب روانہ ہو چکے ہیں۔ تب جلدی جلدی آخری رسومات ادا کی گئی تھیں' جنازہ پڑھا گیا' قبر تیار ہوئی اور میرے مقتول باپ کو دفن کر دیا گیا...... پھر رات کے اندھیرے میں ہی مجھے گاؤں سے باہر لے جایا گیا...... تا کہ دشمنوں کی جانب سے ممکنہ کارروائی سے مجھے بچایا جا سکے......''

جمال نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا:

''میں بہت خوفزدہ تھا۔

مجھے باور کرادیا گیا تھا کہ اگر میں گرفتار ہو گیا تو سیدھا پھانسی کے تختے تک جا پہنچوں گا......

اور......اور......اگر دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا تو قتل کر دیا جاؤں گا......

خوف نے مجھے بزدل بنا دیا تھا۔

اور......میں نے اسے روتا چھوڑ کر امریکہ بھاگ جانے کا ارادہ باندھ لیا تھا......''

جمال بتا رہا تھا:

''اس روز......کہ جب میں آخری بار حسینہ سے ملا تھا؛ اُسی روز میرا چچا بھی گاؤں سے آ کر مجھے ملا تھا......اُسی نے میرے فرار کا سارا بندوبست کیا تھا۔ میرا چچا بہت بااثر شخص تھا اور ایسا اِنتظام کرنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس رات کی آخری فلائٹ میں میری سیٹ کنفرم ہو چکی تھی۔''

جمال نے راحیل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا:

''بہت بعد......ہاں جب وہ سارا وقت گزر چکا تھا جو میری گرفت میں آ سکتا تھا......مجھے ایک باوثوق ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ میرے باپ کا قتل' بدلے میں ایک اور معصوم کا قتل اور دشمنوں کی جانب سے میرے خلاف قتل کا مُقدمہ' اِس سب کچھ کے پیچھے میرے چچا کا ہاتھ تھا۔ سارا ڈرامہ چچا نے میرے باپ کے دشمنوں سے مِل کر رَچایا تھا کہ اسی طرح وہ اس ساری جائیداد پر قابض ہو سکتا تھا جو میرے باپ اور پھر میری وجہ سے تقسیم ہو کر اس کے ہاتھوں سے

پھسلتی جارہی تھی۔‘‘

جمال نے اَپنی مٹھیاں بھینچ لیں، ہونٹ دانتوں تلے کاٹے اور لفظ چباتے ہوئے راحیل سے کہا:

’’کاش میں موت سے نہ بھاگتا...... مارا جاتا یا پھانسی چڑھ جاتا...... اس طرح کم از کم نہ ختم ہونے والے مسلسل اَذِیّت کے عذاب سے تو بچ جاتا‘‘

اس نے اَپنی مٹھیاں کھول دیں، کہنیوں کو میز پر ٹکاتے ہوئے اَپنی کنپٹیوں کے اُن بالوں کو اَپنی انگلیوں میں پھنسالیا، جو اس عرصے میں سفید ہو گئے تھے...... پھر کہیں دُور سے آتی ہوئی آواز میں اُسے بتانے لگا:

’’وہ بہت بہادر تھی...... وہ کہ جو حیا کا مجسمہ تھی...... اور...... جس نے شاید پہلی مرتبہ اَپنی محبت کا اقرار لفظوں میں کیا تھا...... اور جس نے یقیناخُون کے رِشتوں سے باہر مجھ سے پہلی محبت کی تھی...... اور سچ کہا تھا کہ میں اسے نہ بھول پاؤں گا......‘‘

جمال ایک لمحے کو چپ ہو گیا...... ایک گہری سانس لینے کے بعد ٹھنڈی کافی کا آخری گھونٹ بھرا اور دوبارہ جاچکے لمحوں کی وادی میں کھو گیا۔ راحیل کو وہ لفظ بتائے جو اُس نے خودکئی سال پہلے ڈیپارٹمنٹ آف پتھالوجی کے عقب والے خوبصورت لان کے پاس سے گزرتے ہوئے، حسینہ کے بھیگے ہونٹوں سے سنے تھے۔ پھر جمال نے اُسے بتایا تھا کہ حسینہ کیسے رودی تھی۔ اُس کا خیال تھا:

’’بے شک وہ رودِی تھی، مگر تھی جی دار، کہ موت کی وحشت اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ تب ہی تو وہ مجھے کہ رہی تھی:

’’دیکھو ایک ہی ہلے میں مرجانا اَذِیّت ناک نہیں ہوتا...... ہاں اندر اور باہر کے جذبوں کی خلیج کے ساتھ زِندگی کا جبر سہنا بہت اَذِیّت ناک ہوتا ہے......‘‘

جمال کہ، جس کا چہرہ پچھتاوے کے دَرد سے تن گیا تھا، کہنے لگا:

''اس لمحے میں اُس کی بات نہ سمجھ سکا تھا...... مگر اب جب کہ بیتے ہوئے ایک ایک لمحے میں موت کا زہر میرے ایک ایک خلیے میں اُتر تا رہا ہے اور میں قسط در قسط موت کی کڑواہٹ چکھنے پر مجبور رہا ہوں...... مجھے اس کی بات حرف بہ حرف درست معلوم ہوتی ہے......''

اُس نے پہلو بدلتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی:

''جینفر وہ لڑکی تھی جو شریکِ حیات بن کر میری زِندگی میں آئی...... خوب صورت اونچے اونچے پلازوں اور عمارتوں والے مین ہنٹن کے ہاورڈ جانس ہوٹل میں وہ مجھ سے ملی تھی...... پہلے دوستی ہوئی...... پھر جینفر نے خیال ظاہر کیا کہ ہم دونوں بہترین لائف پارٹنر ثابت ہو سکتے تھے ......لہٰذا ہماری شادی ہوگئی...... اُس میں گرمجوشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی......

سنہرے بالوں' سبز آنکھوں اور کچے دودھ جیسی رنگت اور ذائقے والی جینفر نے میری شخصیت کو بڑی حد تک سہارا دیا تھا...... اور میں مالی طور پر بھی مستحکم ہوتا چلا گیا۔

میں نے یقین کر لینا چاہا تھا کہ زِندگی مجھ پر مہربان تھی۔

مگر میں اندر ہی اندر سے اُس جا چکے لمحے کی گرفت میں تھا کہ جب حسینہ نے مجھے اپنی محبت کا یقین دلایا تھا...... اور کہا تھا...... کہ میں اسے نہ بھول پاؤں گا...... جب بھی آنکھیں جھپکاؤں گا اس کی صورت سامنے پاؤں گا۔''

جمال نے پہلو بدلا' ایک لمبی سانس بھری:

''آہ!...... میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے میرے دوست...... میں آسودگی کے اُن دِنوں میں بھی اُسے یاد کرتا رہا ہوں۔ خصوصاً وہ لمحے تو میرے لیے بہت اذِیّت ناک بن جاتے' جب بہ ظاہر میں جینفر کو پیار کر رہا ہوتا مگر آنکھیں بوجھل ہوتے ہوتے بند ہو جاتیں۔ اور...... اور...... بند آنکھوں میں حسینہ آسماتی......''

اب راحیل پہلو بدل رہا تھا...... اَندر ہی اَندر کھول رہا تھا...... چاہتا تھا' موضوع بدل جائے...... مگر جمال کی آواز میں وہ درد اور تسلسل تھا کہ وہ اُس کی کہانی کو آخر تک سننا چاہتا تھا۔

جمال کہہ رہا تھا۔

''پھر یوں ہوا کہ میں اپنی باطنی کیفیات کی وجہ سے چڑچڑا ہوتا چلا گیا۔

باپ کے قتل اور مقدمے میں پھنسائے جانے کا اصل سبب معلوم ہونے کے بعد میرے باطن میں اِنتقام کی ایک آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ میرے اندر کا بزدل کہیں لمبی تان کر سو گیا تھا۔ لحہ لحہ میرے وجود میں اُترنے والا موت کا زہر میرے باطن میں دفن جذبوں کے لاشوں کے لیے تریاق کا کام کر رہا تھا...... اپنا وطن' اپنے دشمن' اپنے لوگ' اپنی نفرتیں' اپنا کلچر' اپنی محبتیں اور سب سے بڑھ کر اپنی حسینہ' سبھی میرے جذبوں میں نئی حیات پا رہے تھے۔

جینفر کے ہاں ماریہ پیدا ہوئی تو اُس وقت تک بہت کچھ موقع بے موقع میرے سینے سے باہر اُبلنا شروع ہو گیا تھا۔''

جمال کہہ رہا تھا:

''ایک روز' کہ جب ماریہ گھٹنوں کے بل چلنے کے قابل ہو گئی تھی' میں اس کے پاس سے گزرا تو اُس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے میری پتلون کے پائنچے کو تھام لیا۔ میں نے جھک کر اُس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کی' نگہ چہرے پر پڑی تو عجب سی اُلجھن میں گرفتار ہو چکا تھا۔

ماریہ جب سے پیدا ہوئی تھی' روزانہ سینکڑوں مرتبہ میں نے اُسے دِیکھا تھا' اُس سے پیار کیا تھا۔ مگر اُس روز کہ جب وہ اپنا وہ کھلونا حاصل کرنا چاہتی تھی جو میز کے اوپر پڑا تھا......اور جس کے لیے اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر ٹھہر گئے تھے......اور اس نے میری مدد حاصل کرنے کے لیے مجھے روکا تھا...... اُس روز مجھے یوں لگا تھا' وہ تو ہو بہ ہو حسینہ کی تصویر تھی۔ وہی نیم گھونگھریالے بال' وہی بھوری آنکھیں' چھوٹے چھوٹے ہونٹ' صاف شفاف شفق کے رنگ میں گندھی جلد' اُبھرے اُبھرے گال۔ ستم بالائے ستم یہ کہ گالوں پر دو آنسو بھی ویسے ہی ٹھہر گئے تھے' جیسے اس آخری روز حسینہ کے گالوں پر ٹھہرے تھے؛ جب اس نے پہلی مرتبہ محبت کے لفظ سے اپنے ہونٹوں کو گیلا کیا تھا۔''

راحیل ہمہ تن گوش تھا مگر اُس کے سینے میں دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اتنی زور سے کہ راحیل کو خدشہ تھا' دِل کے دھڑکنے کی آواز جمال تک بھی پہنچ رہی ہوگی۔

مگر جمال اس کی کیفیات سے بے نیاز' شیشے کی دیوار سے پرے' ہوا کے جھولے میں ہلکورے کھاتے بادلوں کو دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

''پھر حسینہ مجھے بند آنکھوں کے ساتھ ساتھ کھلی آنکھوں سے بھی نظر آنے لگی۔ جینفر مجھ سے دور' بہت دور ہوتی چلی گئی۔ وہ کب آتی' کب جاتی؟...... مجھے پرواہ نہ تھی۔ شروع شروع میں تو وہ جھنجھلا اُٹھتی اور مجھے جھنجھوڑ کر اَپنی موجودگی کا احساس دِلانے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر رفتہ رفتہ اس کا دَم گھٹنے لگا......اور جب ماریہ' جو اچھی بھلی تھی' ایک رات چپ چاپ مرگئی تو جینفر مجھ سے یوں جدا ہوگئی' جیسے ہمارا ساتھ کچھ دیر کی مسافرت کا ساتھ تھا۔ اُس کا ٹرمینل آیا اور وہ اُتر گئی تھی۔''

جمال اُٹھ کھڑا ہوا۔ شیشے کی دِیوار تک پہنچا' اُس پر جمے پانی کے قطروں کو اَپنی انگلیوں سے چھوا' پھر واپس اَپنی نشست تک آیا اور بیٹھ گیا۔ کہا:

''راحیل میرے دوست! زندگی مجھے بس یونہی چھوتی رہی ہے' جیسے باہر بادل شیشے کی دیوار کو چھو رہے ہیں۔ مگر میرے اَندر دُکھ قطرہ قطرہ بن کر جم گئے ہیں۔ ماریہ کے مرنے اور جینفر کے بچھڑنے کے بعد سوچا' لحہ لحہ قسطوں میں مرنے کی بہ جائے ایک ہی جست میں اَذِیّت سے رہائی کی جدوجہد کیوں نہ کروں......''

اُس نے راحیل کی طرف دیکھا اور اَپنی بات کا تسلسل برقرار رکھا:

''پھر میں نے خود کو سمیٹنا شروع کر دیا اور یوں واپس پلٹ آیا۔

کل جب ایئرپورٹ پر اُترا تو میں خیال کے کئی الجھاووں میں پھنسا ہوا تھا۔ میرے سامنے سب سے اَہم بات چچا سے بھگت چکے عذابوں کا حساب چکانا تھا اور اُس کے لیے میں نے طرح طرح کی منصوبہ بندی کی تھی۔ مگر جونہی ایئرپورٹ پر اترا اور لاؤنج میں پبلک کال آفس پر نگہ پڑی؛ جی چاہا' حسینہ کے گھر فون کر کے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔''

راحیل بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اب کے اُسے واقعی ایسے لگا' دِل حلق سے باہر آ گرے گا...... جمال کہہ رہا تھا:

''میں نے وہیں اُپنا وہ سوٹ کیس کھولا' جس میں میرے اندازے کے مطابق میری اس ڈائری کو ہونا چاہئے تھا' جس میں حسینہ نے آخری روز اپنے ہاتھ سے میرے لیے ایک نظم لکھی تھی پھر میری خواہش پر اپنا پتہ اور فون نمبر بھی لکھ دیا تھا۔ یہ ڈائری ہمیشہ میرے پاس رہی تھی۔ ڈائری مجھے مل گئی۔ میں نے فون نمبر ملایا۔ دوسری طرف غالباً اس کی امّی کی ٹھہری آواز تھی۔ میں نے اپنا تعارف یونیورسٹی کے ایک قدیم دوست کی حیثیت سے کرایا اور حسینہ کا حال پوچھا۔ اس کی امی نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ آج کل مری میں ہے۔ یہ سنتے ہی مرا دِل بوجھل ہو گیا۔ ٹیلی فون کے اس جانب ہیلو ہیلو کی آواز آ رہی تھی۔ مگر میں نے ریسیور کریڈل پر رَکھ دیا۔ یہ بھی نہ پوچھ سکا تھا کہ وہ کون خُوش نصیب ہے جو اس کا جیون ساتھی بنا؟''

راحیل کا دورانِ خُون معمول پر آنا شروع ہو گیا...... جمال نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں' کہا:

''دوست معلوم نہیں' میں کیوں مری آیا ہوں؟ بے ارادہ اِدھر قدم اُٹھ گئے ہیں...... اور اب جب کہ میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں تو میرے اندر یہ خواہش بھی جنم لے رہی ہے۔ کاش جس طرح تم مجھے یونہی سرِ راہ مل گئے ہو' وہ بھی مل جائے...... اور میں اسے بتا سکوں کہ برسوں پہلے اس نے جو کچھ کہا تھا' سچ کہا تھا...... پل پل اَندر اور باہر کی دُوئی کے ساتھ جینا واقعی اَذِیّت ناک ہوتا ہے۔

اور اسے بتا سکوں کہ میں نے نہ صرف اُسے بند آنکھوں میں دِیکھا ہے بل کہ ہر ہر پل خود پر مسلط ہوتے پایا ہے...... کاش اُس سے پوچھ سکوں کہ کیا وہ بھی میری طرح اَندر اور باہر کے متصادم جذبوں کی ننگی کٹار پر برہنہ پا چلتی رہی ہے؟...... کیا اُسے بھی اُپنے بچوں میں اُس لمحے کی تصویر نظر آتی ہے' جب پہلی مرتبہ اُس کے ہونٹ محبت کے لفظ سے بھیگے تھے کیا اس نے بھی بند

آنکھوں کا عذاب جھیلا ہے؟۔اور......اور......''

جمال بولے جا رہا تھا اور راحیل کے ذِہن میں بھونچال اُٹھ رہے تھے۔ نہ جانے کب اُس نے اَپنی گفتگو کا سلسلہ روکا' نہ جانے کب اُس نے اِجازت چاہی اور وہ چل دیا تھا۔

مگر جب وہ کچھ دور جا چکا تو راحیل کو اَپنی سرد مہری پر دُکھ ہوا۔ وہ معذرت کے لیے اُس کے تعاقب میں چل پڑا۔ اس نے جمال کو ایک ہوٹل میں داخل ہوتے دِیکھ لیا تھا۔ کاؤنٹر سے اس کا کمرا نمبر پوچھا اور اس کے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگا......ابھی آخری سیڑھی پر نہ پہنچا تھا کہ اس کے قدموں نے ساتھ دِینے سے اِنکار کر دِیا اور وہ وہیں سے لوٹ آیا۔

جمال سے ملنے کے بعد سے لے کر اس لمحے تک ......کہ جب وہ سن روم میں بیٹھا اُن بادلوں کو دِیکھ رہا تھا جو پار درختوں کی پھنگیوں سے اُٹھے تھے اور اس کے آنگن میں آ کر اِدھر اُدھر اُڑ رہے ہیں' تشکیک' تذبذب' بے یقینی اور بے قراری کے کانٹوں کی چبھن بدن کے ایک ایک خلیے پر محسوس کر رہا تھا۔ گئی رات اس نے اپنے سارے وسوسوں کو جُھٹک دِیا اور حسینہ کی جانب پہلے کی سی وارفتگی سے بڑھا تھا مگر چند ہی لمحوں کے بعد جب حسینہ کی آنکھیں پیار سے بوجھل ہو کر بند ہونے لگیں تو اسے یوں لگا تھا؛ جیسے ایک بجلی کا کوندا تھا جو اس پر لپک پڑا تھا۔

اِن بند آنکھوں سے پَرے......نہیں نہیں

وہ اَپنا خیال جُھٹک کر اُٹھ بیٹھا۔ دیر تک باہر پھلواڑی میں گھومتا رہا۔ بادلوں کی چند ٹکڑیوں کے سنگ اٹکھیلیاں کرتی چاندنی کو دِیکھتا رہا' محسوس کرتا رہا۔

حسینہ بلاشبہ اس اترتی چاندنی کی طرح پاکیزہ تھی......مگر بند آنکھیں......؟

اُسے اپنا دِل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا......پھر حسینہ کی ریاضتیں یاد آئیں جو اُس نے اُس کی خُوشنودی کے لیے ہر آن کی تھیں...... خیال آیا' ایسا تو ہر مشرقی بیوی کرتی ہے......مگر دِل کے اندر کون ہے؟

رات یونہی کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزر گئی......

اور اب جب کہ اس نے بچوں کے چہروں کی لکیروں کو بھی ٹٹول لیا تھا...... تو عجب عجب خدشے سر اٹھانے لگے تھے۔ کہیں جمال واقعی حسینہ کے مقابل ہو گیا ہو تو؟......

اس کا تصور ہی راحیل کے لیے جان لیوا تھا...... وہ دھیرے دھیرے اُٹھا' کپڑے بدلے' بیوی کو کل شام تک واپس لوٹ آنے کا کہا...... ارادہ تھا' جمال کے چچا کو ایک اہم اطلاع دینے اس کے گاؤں جائے گا...... مگر ابھی ایک قدم دہلیز سے باہر تھا کہ اسے لگا' دوسرا قدم اٹھا نہ پائے گا۔

دہلیز اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی جا رہی تھی جو اس کے وجود کو دولخت کیے دیتی تھی۔

اُس کا سینہ درد سے بھر گیا۔ آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ سر گھومنے لگا اور سارا بدن ڈولنے لگا۔ یوں جیسے وہ بے پتوار کشتی میں سوار منھ زور لہروں کے تھپیڑوں کی زد میں ہو۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ دفعتاً حسینہ کی نگہ راحیل پر پڑی۔ وہ گھبرائی ہوئی اس تک پہنچی۔ کچن سے مرچوں کی دھانس اُٹھ کر نتھنوں میں گھس رہی تھی مگر حسینہ کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے اور وہ راحیل پر جھکی ہوئی تھی۔ راحیل نے بوجھل آنکھوں کو تھوڑا سا وا کیا۔ گھبرائی ہوئی حسینہ کی آنکھوں میں جھانکا اور دھیرے سے آنکھیں موند لیں۔

باہر پھلواڑی سے بچوں کے چیخنے کی آوازیں اسی طرح آ رہی تھیں۔

Fall Down

Fall Down

حسینہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے جھولتے بدن کو سہارا دیا جو ڈھیلا پڑنے لگا تھا مگر وہ نیچے...... اور نیچے...... عین دروازے کے بیچ ڈھلکتا چلا جا رہا تھا۔

دُکھ کیسے مرتا ہے

ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوتے ہی نبیل کا دِل اُلٹنے لگا، زخموں پر لگائی جانے والی مخصوص

دواؤں کی تیز بُو نے سانسوں کی ساری اَمی جمی اُکھاڑ دی تھی۔

اُسے میڈیکل وارڈ نمبر تین جانا تھا مگر اس ہسپتال میں خرابی یہ تھی کہ اندر داخل ہوتے ہی پہلے ایمرجنسی وارڈ پڑتا تھا' جس میں کوئی لمحہ شاید ہی خالی گزرتا ہوگا' جب کوئی نیا مریض نہ لایا جاتا ہوگا۔ نبیل نے تو جب بھی دیکھا' کٹے پھٹے' اُکھڑی ہوئی سانسوں والے اور بری طرح تڑپتے مریضوں کو لائے جاتے دیکھا۔ نرسیں اور ڈاکٹر بھاگ بھاگ کر اُن کی جانیں بچا رہے ہوتے۔ کسی کے زخموں کے راستے بدن سے باہر بہنے والے خُون کو روکا جا رہا ہوتا' کسی کی رَگوں میں ٹھہر جانے والے لہو میں چھاتی دَبا دَبا کر بہاؤ لانے کی کوشش ہو رہی ہوتی اور کوئی خود ہی کھانس کھانس کر پھیپھڑوں میں اکٹھی ہو جانے والی رَت حلق تک منہ کھول کھول کر اُلٹ رہا ہوتا۔ اُس نے ہر بار سوچا ان میں سے کئی بچ جاتے ہوں گے......ضرور بچ جاتے ہوں گے' مگر وہ تو جب بھی داخل ہو رہا ہوتا یا باہر نکلنے کو اُدھر جاتا ایک دو لاشیں اسٹریچر پر دھری ہوتیں اور ان پر بے قابو ہو کر گرتی پڑتی روتی چیختی عورتوں کو ان کے مرد صبر کی تلقین کرتے ہوئے الگ کر رہے ہوتے۔

مرنے والوں پر صبر آ ہی جاتا ہوگا۔

نبیل عین اس لمحے میں ایسا نہیں سوچتا تھا جب کہ وہ جگر پھاڑ ڈالنے والی چیخیں اور بین سن رہا ہوتا' بل کہ تب سوچتا جب وہ کارڈیالوجی وارڈ کی طویل راہداری میں پہنچتا......اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے یہاں سے ایسی ایسی لاشیں لائی جاتی دیکھ رکھی تھیں' جن کے ارد گرد چلنے والوں میں سے کوئی بھی چیخ نہیں رہا تھا۔ کوئی دبی دبی سی سسکی......ضبط کرنے کے باوجود نکل آنے والا آنسو......کچھ بھی تو نہیں۔ سب کے چہرے سفید کفن کی طرح صاف تھے......اور وہ اسٹریچر کے ساتھ ساتھ یوں چل رہے تھے' جیسے اس لاش کے احترام میں خامشی سے چلنے کی وہ برسوں سے مشق کرتے آئے تھے......اور اب موقع آ گیا تھا تو صبر کے آئینے میں بال لا کر وہ ساری ریاضت ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ عین اُسی لمحے اُس نے یہ بھی سوچا تھا کہ یہ جو اچانک

مصیبت آ جاتی ہے' یہ آدمی کو بوکھلا کر بے صبرا بنا دیتی ہے ورنہ تو صبر آ ہی جایا کرتا ہے۔

ایمرجنسی سے ملحق کارڈیالوجی وارڈ تھا یہاں پہنچ کر اور ایسا سوچ کر اُس کی سانسوں میں توازن آ جاتا۔ نبیل اس وارڈ سے مانوس تھا۔ کئی ہفتے پہلے وہ یہاں تین بار آیا تھا۔ تینوں بار اسے ندرت لائی تھی۔ اُس کے ڈیڈی کو وہم ہو گیا تھا کہ شاید ندرت کی مما کو ہارٹ پرابلم ہو گیا تھا۔ ندرت نے اُسے بتایا تھا کہ ایک دوپہر اُس کی مما کھانا کھا کر حسب معمول گھنٹہ بھر کے لیے لیٹی' اُٹھی' تو چھاتی پر بوجھ تھا۔ ایک گولا سا ناف کے اوپر سے اُٹھتا اور پسلیوں کے اس وسطی احاطے میں' جہاں کہیں دل تھا' معدوم ہو کر ایک چبھن چھوڑ جاتا تھا۔ اُس کے ڈیڈی اُس کی مما کو یہاں لے آئے تھے اور جب تک سارے ٹیسٹ ہونے کے بعد ڈاکٹروں نے ہر طرح سے تسلی نہیں کرا دی اُسے ہسپتال سے واپس نہیں لے گئے تھے۔

خود نبیل کو دِل کی بیماری کا شائبہ تک نہ تھا...... اور اُسے یقین تھا کہ اُس جیسا آدمی' جو زِندگی کے معاملات کو دِل پر انتہائی صبر اور احتیاط سے لیتا ہو' اُسے دل کی بیماری لگنی بھی نہیں چاہیے مگر اس کے باوجود جب اُسے پہلی بار ندرت کی مما کو دیکھنے آنا پڑا تھا تو دِل میں اختلاج سا ہونے لگا تھا۔ اس پر اُس نے دوسرے وزٹ تک قابو پانا سیکھ لیا۔ شاید جو اُس نے یوں سیکھا' وہ ضبط تھا۔ صبر کرنا اور ہوتا ہے اور ضبط کرنا اور...... اور صبر کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ تو اِسے بہت پہلے کا سیکھ چکا تھا۔

میڈیکل وارڈ آ گے تھا۔ دائیں ایک' بائیں دو اور سامنے تین۔ اِسی تیسرے وارڈ کے پرائیویٹ روم نمبر پچیس میں اس کی اَپنی ماں پڑی ہوئی تھی۔ ماں بیمار تو کب کی تھی' شاید اب تو اُسے بھولنے لگا تھا کہ وہ کبھی ٹھیک بھی رہی ہو گی۔ اُسے ابا کے مرنے کے بعد دائیں طرف فالج پڑا تھا اور وہ بستر سے جا لگی تھی۔

شروع شروع میں جب پیاس سے اُس کا حلق خشک ہونے لگتا' بھوک سے انتڑیوں میں گُڑوَل پڑتے یا پھر انجانے میں بستر گیلا ہو جاتا' اتنا زیادہ گیلا کہ وہ کمر کاٹنے لگتا' تو وہ اُسے

بلانے کی کوشش کرتی تھی۔ 'اوں آوں' جیسی آوازیں نکالنے کے لیے اُسے حلق اور چھاتی پر اتنا بوجھ ڈالنا پڑتا تھا کہ نچلا جبڑا ایک طرف کو ڈھلک جاتا اور سارا بدن سکڑ کر دہرا ہونے لگتا۔ وہ پہنچ جاتا...... پہلے پہل فوراً...... لپک کر' مگر یہ معمول کا حصہ ہو گیا تو لپک جھپک میں وقفے پڑنے لگے...... کہ بعد میں اُسے خود کو تیار کرنا پڑتا تھا۔

ایک روز جب اُس کی ماں آواز دینے کے بعد اپنا جبڑا ڈھلکا چکی تھی اور گھٹنے اُوپر کو کھسا کر اُس نے اپنا بدن بھی دہرا کر لیا تھا کہ کال بیل بجی......

''ٹ......ااا''

یوں جیسے باہر بٹن پر آہستگی سے اُنگشت رکھ کر فوراً ہٹالی گئی ہو اور ادھر اندر کال بیل کی آواز ٹوٹ کر گر گئی ہو ...... پھر خاموشی چھا گئی ...... طویل خاموشی' اتنی کہ ماں کی آواز اُس میں کہیں ڈوب گئی۔ اُس کا اپنا دِل رُک سا گیا' ایک قدرے طویل آواز کے لیے۔

ندرت جب بھی آتی تھی پہلی بار پش بٹن کو ذرا سا چھو کر ہاتھ گرا دیا کرتی تاہم دوسری بار معمول سے کہیں لمبی ''ٹررارارارن'' ہوتی۔ اتنی کہ وہ اس آواز کے بند ہونے سے پہلے تک صدر دروازے تک بہ سہولت پہنچ جایا کرتا تھا۔ اُس روز بھی ایسا ہی ہوا' اور وہ باہر پہنچ گیا۔ وہ اندر نہیں آئی تھی ......اس کے انداز بتا رہے تھے وہ اندر بیٹھ کر باتیں کرنے کو آئی ہی نہیں تھی۔ اُس نے بغیر کچھ کہے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ندرت کے لیے اُس کا ارادہ کوئی معنی نہیں رَکھتا۔ نبیل خود بھی اُسے سامنے پا کر اپنا ارادہ منہا کر لیا کرتا تھا۔ وہ ہے ہی ایسی' رَکھ رَکھاؤ اور دبدبے والی۔ اگر وہ صرف غیر معمولی حد تک حسین ہوتی تو شاید ایسی نہ ہوتی۔ معاشی آسودگی اس کے انگ انگ سے اور اُس کی ہر ادا سے بہتی تھی......یوں جیسے کوئی شریر ندی ڈھلوان میں لپکتی ہے۔

ڈھلوان میں نبیل تھا ...... اور ہر بار وہ بہہ جاتا تھا' بے ارادہ ہی۔

اُس روز جب وہ کئی گھنٹوں کے بعد گھر پلٹا تھا تو اندر داخل ہوتے ہی پیشاب کی سڑاند کے

بھکوں نے اُس کا منھ پھیر کر رکھ دیا۔ اُس کی نظر ماں کی چار پائی کے نیچے پڑی۔ وہاں' جہاں سارا فرش گیلا ہو رہا تھا۔ ڈھلوان چوں کہ دروازے کی سمت تھی لہذا ایک گیلی سی لکیر اُدھر تک بہہ آئی تھی۔ دُکھ اور ندامت ایک ساتھ اُس کے اندر سے پھوٹ پڑا' بے ارادہ ہی۔

آدمی ارادے سے دُکھی کہاں ہوتا اور ارادہ کر کے اپنے دُکھ دَرد کیسے ٹال سکتا ہے۔

زِندگی کی وہ ساری دِل کشی جو جذبوں سے کناروں تک بھری ہوئی ایک لڑکی کے سبب کچھ دیر پہلے تک مہک بن کر اس کی سانسوں میں رچی بسی ہوئی تھی' اب وہ کہیں نہیں تھی۔ ماں نے اُسے دیکھ کر منھ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ اُس نے ماں کے اوپر چادر ڈالی اور اپنا منھ بھی دوسری طرف پھیر لیا۔ اب صرف اس کے ہاتھ کام کر رہے تھے اور جب وہ ماں کا بدن پونچھ پانچھ کر اُسے خشک کر چکا تو منھ پھیرے پھیرے اسے دونوں بازؤں میں اُٹھا کر پاس پڑی دوسری چار پائی پر ڈالا۔ نبیل کو یہ جان کر شدید صدمہ ہوا کہ ماں اپنا وزن بڑی تیزی سے گرا چکی تھی۔

جس انہماک' تردّد' احتیاط اور احترام سے اُس نے ماں کے بدن کو دوسری طرف دیکھتے رہتے ہوئے سکھایا تھا' چادر کی اوٹ تلے اس کا لباس بدلا تھا۔ پیشاب سے سَنے ہوئے بستر کو الگ کر کے صاف ستھرا گدا بچھا کر اوپر یوں چادر پھیلائی تھی کہ اس میں ایک شکن بھی باقی نہ رہی تھی اس نے ماں کی پیشانی کی ساری شکنیں معدوم کر دی تھیں اور اُس کی پوری طرح کھلی رہنے اور ہر دم پھڑکنے والی دائیں آنکھ کو آنسوؤں سے بھر دیا تھا۔

ہسپتال کی راہداری میں' کارڈیالوجی وارڈ سے ذرا آگے' جہاں ایک اور راہداری پہلی کو کاٹتی تھی؛ وہیں' چاروں کونوں پر' دیواروں کے ساتھ لوہے کے بینچ جڑے ہوئے تھے۔ وارڈ نمبر تین میں داخل ہونے سے پہلے وہ یہاں کچھ لمحوں کے لیے بیٹھ جایا کرتا تھا...... شروع شروع میں نہیں' تب سے کہ جب ماں کو ہسپتال میں داخل ہوئے دو مہینے سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ پھر تو اُسے یہاں پہنچ کر جب بھی کوئی بینچ خالی نظر آتا تو ضرور بیٹھتا تھا۔

پہلی بار وہ ندرت کے ساتھ یہاں بیٹھا تھا، مگر جاتے ہوئے نہیں، ماں کو کمرا نمبر پچیس میں دیکھ کر آنے کے بعد۔ ندرت کو بہت تشویش تھی کہ پیشنٹ میں سروائیول کے امکانات بہت کم تھے۔ وہ ہسپتال اُس کی ماں کو دیکھنے پھر کبھی نہیں آئی تھی تاہم اس کے بعد جب بھی اس نے اسے فون کیا وہ ہر بار اُس کی ماں کی بیماری کی طوالت کے خوف سے سہمی ہوئی لگی۔ نبیل کی ماں کی بیماری واقعی طویل ہوگئی تھی۔ شوگر کے سبب بیڈ سولز بھی ٹھیک نہ ہو رہے تھے۔ وہ سانس لیتی تو چھاتی میں سیٹیاں بجتی تھیں۔ کچھ عرصہ تو ڈاکٹروں نے آکسیجن کا ماسک منھ پر چڑھائے رکھا مگر جب ہر سانس پر سارا بدن جھٹکے کھانے لگا تو انہوں نے نرخرے کے قریب کٹ لگا کر نالی اندر پھیپھڑوں میں گھسیڑ دی۔ کوئی بھی ڈاکٹر یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُس کی ماں کے پھیپھڑے خود سے سانس لینے کے لیے کب تک قابل ہو پائیں گے۔ کبھی تو وہ بہت امید افزا باتیں کرتے اور کبھی بالکل ہی مایوس کر دیتے تھے۔

ندرت ہسپتال آنے کے اگلے پندرہ دنوں میں ہی اُس سے مایوس ہو چکی تھی۔ اسے مایوس کرنے میں اس کے ڈیڈی اور مما دونوں کا ہاتھ تھا۔ ان کی اپنی فیملی کا ایک اچھا لڑکا کب سے اُن کی نظر میں تھا مگر ان کا بس نہ چل رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتے تھے مگر اس پر اپنا کوئی فیصلہ ٹھونسنا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم ہسپتال سے واپسی پر جب ندرت نے اس کی ماں کی کنڈیشن بتائی تھی تو دونوں کو اُسے قائل کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ ایک ایسے لڑکے کا انتظار جو اپنی ماں کے ساتھ اسقدر اٹیچڈ تھا کہ فی الحال کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا اس کا کتنا انتظار کیا جا سکتا تھا؟

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ وہ عمر کے اس مرحلے میں تھی کہ اگر وہ سروائیو کر بھی جائے تو بھی اُسے بہت کیئر، سہارے اور مسلسل میڈیکل ایڈ کی ضرورت رہے گی۔ ندرت کے لیے یہ بات بہت مایوس کُن تھی۔ مگر مایوس کرنے والی بڑھیا کا بیٹا بہر حال ڈاکٹروں کی باتوں سے اُمید کے معنی

نکال لیا کرتا تھا۔

اگلے پندرہ دن نبیل نے مزید اِنتظار کیا۔ ندرت اُسے ملنے تونہیں آئی تاہم اس نے ہر روز فون کیا۔ اگر چہ وہ اُس سے صرف اُس کی ماں کی بیماری کی باتیں نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ کوئی دوسری بات کر سکنے سے پہلے ہی اس قدر نڈھال ہوجاتا تھا کہ وہ کوئی اور بات چھیڑنے کا حوصلہ ہی نہ کر پاتی تھی۔ ایک خوبصوت لڑکی جس کے سامنے زِندگی کے راستے پوری طرح کھلے تھے وہ کسی بھی ایک لڑکے سے محبت تو کر سکتی تھی مگر اس لڑکے سے صرف اس کی ماں کی بیماری کی باتوں پر اِکتفا نہیں کر سکتی تھی......اور نہ ہی وہ کوئی اور بات کرنے کے لیے طویل اِنتظار کر سکتی تھی۔ لہذا بہت تیزی سے دِل کے اندر خُوشبو کی طرح بسی ہوئی محبت کے معدوم ہونے پر اسے کوئی بہت زیادہ الجھن نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے پندرھویں دِن ہی اَپنے کندھے اُچکا کر جھٹک دیئے اور سوچا شاید اس کی محبت کی پوریں اس لڑکے کے دِل پر بس اِتنے ہی دورانیے کے لیے ٹھہر سکتی تھیں۔ تاہم اگلے دو روز اس نے اسے مسلسل کئی بار کالز کیں۔ وہ اسے موجودہ دباؤ کی صورت حال سے باہر کھینچ لانا چاہتی تھی۔وہ باہر نہ آ پایا تو وہ اُس سے مکمل طور پر مایوس ہوگئی۔

نبیل ایسا بیٹا نہ تھا جو اَپنی ماں سے مایوس ہو جاتا۔ کبھی کبھی تو خود اُسے یوں لگتا جیسے وہ ابھی تک ماں کی کوکھ ہی میں تھا' سنگ تراش عباس شاہ کے اس ہیوج مجسمے کی طرح' جو پتھر سے نہیں تراشا گیا تھا مگر نہ چھوؤ تو سنگ مرمر کا لگتا تھا اور جس کے عین وسط میں ماں کے پیٹ کے اندر گھٹنوں میں سر گھسیڑے ایک بچہ تھا۔

وہ بچہ وہ خود تھا۔

حاملہ ماں کے بلوریں پتھر کے نظر آنے والے مجسمے کو اس نے تجسس سے چھوا' وہ تھرموپول جیسے اتنے ہلکے مٹریل کا بنا ہوا تھا کہ چھونے پر لرزنے لگا تھا۔

اس کی ماں کا جسم اسی مجسمے کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا تھا مگر چھونے پر لرزتا نہ تھا۔

وہ بے سدھ پڑے وجود کو دیکھتا تو عجب وسوسے اس کے بدن پر تیر جایا کرتے اور اس وجود سے الگ رہنے کا خیال ہی اس کے بدن پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔ تاہم ہوائیوں کہ دن گزر رہے تھے اور گزرتے دنوں کو کون روک سکتا تھا۔ ندرت جس کے پہلے فون آ جایا کرتے تھے اب نہیں آ رہے تھے۔ دو تین بار اس نے اس سے خود رابطے کی کوشش بھی کی مگر ہر بار اسے بتایا گیا کہ وہ گھر پر نہیں تھی۔ حتیٰ کہ اس کا اپنا فون آ گیا۔ اُس نے اس کی ماں کا حال بھی نہیں پوچھا اور بغیر کسی تمہید کے اَپنی منگنی کی خبر دے دی۔ اُسے ندرت کی آواز میں ایک لرزاہٹ سی محسوس ہوئی مگر فون سنتے ہوئے اُس کا صبر اور ضبط کا خوگر دِل اس شدت دھڑکا اور اتنی گہرائی میں ڈوبنے لگا تھا کہ لفظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور وہ کچھ بھی نہ کہہ پایا۔ وہ مایوسی کے پانیوں میں ڈوب رہا تھا مگر اسے یقین کیسے آتا کہ اس کی محبت اس سے بچھڑ گئی تھی، یوں کہ ساری رفاقت خواب سی لگنے لگی تھی۔

تاہم اُس نے خود کو سنبھالا دِینا تھا......اور اُس نے خود کو سنبھالا دیا کہ اُس کے علاوہ اُس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ پورے حواس میں تھا جب ڈاکٹر کہہ رہے تھے:

''حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا' پیشنٹ کتنے روز تک سٹیبل ہو پائے''

پھیپھڑوں کو سہولت دینے کے لیے جو نالی ڈالی گئی تھی اُسے نکالا جاتا تو سانسوں کے جھٹکے پھر سے سارے بدن کو جھنجھوڑنے لگتے۔

اُسے وہیں بینچ پر بیٹھے بیٹھے شاید اُونگھ آ گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُسے وہاں اُونگھتے اُونگھتے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ رات ماں کی حالت بہت بگڑ گئی تھی اگرچہ ڈاکٹروں نے آکسیجن کی نالی پھیپھڑوں میں ایک بار پھر گھسیڑ کر فوری ریلیف فراہم کر دیا تھا مگر وہ نالی جو ناک سے معدے تک گھسیڑی گئی تھی ماں کو بہت اُلجھا رہی تھی۔ وہ بار بار نالی کھینچنے کے لیے ہاتھ اوپر لے آتی۔ شاید نالی گزارتے ہوئے جلد جہاں اندر کہیں چھِل گئی تھی، وہیں جلن ہو رہی تھی۔ نبیل نے ڈیوٹی

پر موجود ڈاکٹر کو جا کر بتایا بھی۔ مگر اس کا کہنا تھا:

''معمولی سا ر یپچر ہے خود ہی ہیل اپ ہو جائے گا' ذرا دھیان رکھیں کہ پیشنٹ نالی نکال نہ دے۔''

ماں اگر چہ غنودگی میں تھی مگر اس کا ہاتھ بار بار ناک کی طرف کھسکنے لگتا تھا۔ وہ ہاتھ تھام کر رَکھتا تو وہی الجھن ماں کے کپکپاتے ہاتھ کے راستے خود اس کے اندر اتر جاتی۔ یہاں تک کہ اس کا دِل چاہنے لگا' وہ اس نالی کو خود ہی ماں کی ناک سے کھینچ کر اُلجھن سے نکل آئے۔

وہ رات بھر جبر کرتا رہا اور جاگتا رہا۔ کھڑکی سے ذرا سا صبح نے جھانکا تو وہ اس کے تعاقب میں باہر نکل گیا۔ وہ ادھر اُدھر گھومتا رہا' یوں ہی۔ واپس پلٹا تو اس کے بدن پر عجیب طرح کا خالی پن قابض ہو چکا تھا۔ ہسپتال میں داخل ہوتے ہوئے ایمرجنسی میں ہونے والی بھاگ دوڑ کو بھی اس نے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ بین کرتی عورتیں بہت بے ہودہ لگیں۔ اس نے اُلجھتے ہوئے سوچا کہ ان کے یوں دہرے ہو ہو کر گرنے سے کیا مردے زندہ ہو جائیں گے؟......اور ایک تلخ سی ہنسی ہنس دیا۔

اندر سے اُٹھنے والے سوال کا اس کے نزدیک یہ مناسب جواب تھا۔

رونے والیوں میں ایک لڑکی بہت خوب صورت تھی اور مرنے والی ماں جیسی بوڑھی بہت پر وقار۔ دونوں کو اُس نے صرف ایک نظر ہی دیکھا اور آگے بڑھ گیا تھا۔

ایمرجینسی سے کارڈیالوجی وارڈ کی راہداری تک وہ ہمیشہ دُکھ کی گرفت میں رہتا تھا مگر اس روز وہ اندر سے بالکل خالی تھا۔ بینچ پر بھی وہ ارادہ کر کے نہیں' یوں ہی بیٹھ گیا تھا اور اِتنی دیر تک اونگھتا رہا کہ وقت کے تیزی سے گزرنے کا اِحساس پوری طرح معدوم ہو گیا۔

وہ ٹھیک سے اندازہ نہ کر پایا کہ ایک اسٹریچر کے تیزی سے دھکیلے جانے کے باعث اُٹھنے والے شور نے اُسے کتنی دیر بعد بیدار کیا تھا۔ اسٹریچر وارڈ نمبر تین کی راہداری ہی سے لایا جا رہا تھا

اُسے غیر معمولی تجسس ہوا کہ وہ اس کا چہرہ دیکھے۔ اس نے اس کا چہرہ دیکھا بھی مگر یہ اس کی ماں کا چہرہ نہیں تھا۔ وہ الٹے قدموں چلتا' بینچ پر ڈھے گیا۔ شاید یہ وہ پہلا روز تھا جب نبیل نے اَپنی ماں کی مشکل آسان ہونے کی دعا کی تھی۔

وہ دعائیں کرتا رہا۔ حتی کہ اس کے ہاں اثاثہ سمجھے جانے والے سارے مقدس لفظ معنوں سے خالی ہو گئے۔ یوں' جیسے اسے باثروت بنانے والے سارے کرنسی نوٹوں کے مارکے اُڑ گئے ہوں۔

زبان کی ڈھیری پر کیڑوں کی طرح کلبلانے اور رینگنے والے یہ لفظ بے دھیانی میں ہونٹوں پر آ کر تیرنے لگتے اور پھر اسی بے خبری میں تالو سے چپک کر بے سدھ ہو جاتے۔ وہ دیکھ رہا تھا مگر مرنے والوں اور ان کے ساتھ زندہ درگور رہنے والوں کے بیچ کوئی تمیز نہ کر پا رہا تھا۔ لاشیں اس کے سامنے سے گزرتی تھیں۔ وہ ان پر نظر ڈالتا' یہ لاشیں اُسے دُکھ کی بہ جائے تسکین دینے لگی تھیں۔ تسکین نہیں اُس کا سا احساس۔ ملتا جلتا اور الگ سا بھی۔ اور یہی احساس شاید خود اس کے زندہ ہونے کی علامت تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ مرنے والوں کی نہیں بل کہ انتظار کھینچنے والوں کی مشکلیں آسان ہو رہی تھیں۔ ایسے میں اسے اپنے اندر سے تعفن اُٹھتا محسوس ہوا۔ اُس نے اپنا سارا بدن ٹٹولنے کے لیے اُدھیڑ ڈالا۔ بہت اندر گھپ اندھیرے میں دو لاشیں پڑی تھی۔ اُس نے صاف پہچان لیا ان میں سے ایک اس کی اَپنی محبت تھی اور دوسری کو دیکھے بغیر منھ پھیر لیا اور پورے خلوص سے رونے کی سعی کی مگر تعفن کا ریلا اسے دُکھ سے دور' بہت دور بہائے لیے جاتا تھا۔

پارِینہ لمحے کا نزول

سولہ برس' سات ماہ' پانچ دِن' دو گھنٹے' اِکیس منٹ اور تیرہ سیکنڈ ہو چلے تھے' اَپنے لیے اُس کے ہونٹوں سے پہلی بار وہ جملہ سنے جو سماعتوں میں جلترنگ بجا گیا تھا مگر دِل کے عین بیچ یقین کا شائبہ تک نہ اُتار سکا تھا۔

ایسے جملوں پر فوری یقین کے لیے کچی عمر کی جو نرم گرم زمین چاہیے ہوتی ہے وہ دائرہ در دائرہ گزرتے گھومتے ایک سے یخ بستہ دِنوں کی تہ در تہ برف تلے کب کی گل کر نیچے بہت دُور کھسک چکی تھی' ایسے میں وہ جملہ جو سماعت بیچ جلترنگ بجا گیا تھا' پکی عمر کی پتھریلی سطح کے کرخت پن سے پھسل کر بدن کی کھنکتی مٹی پر جھنکار چھڑ کنے لگا تھا۔ کیوں کہ بدن کی تنی کمانوں کی تانت جو کب کی ڈِھیلی پڑنے لگی تھی' پھر سے تن گئی تھی۔

یقین نہ تھا' ہاں گماں تھا۔ گماں بھی یوں تھا کہ اِنتظار کی ڈِھیلی ڈور کے اُس سرے پر اُوپر کی بے آبرو ہوا میں جھولتی پتنگ اَبھی تک بہ ہر حال تھی' اگرچہ نہ ہونے کے برابر تھی کہ ہتھیلی پر کشید لکیروں سے لگی ڈور اُنگلیوں کی پوروں کو تو کاٹتی تھی مگر کوئی بھی تنکا بے حیثیت ہوا میں ڈولتی پتنگ تک منتقل نہ ہونے دیتی تھی۔

میں اُوپر دیکھتی تھی اور جھولتی پتنگ کے سنگ خود بھی جھول جاتی تھی کہ آنکھ چندھیاتی تھی اور اُوپر سے برستی دُھوپ بارش سارا بدن بھگوتی تھی۔ کچھ خبر نہ تھی کہ ڈور کے اس سرے پر پتنگ بندھی تھی یا اُس سرے پر میں خود۔ ایسے میں یقین دل کے بیچ کیوں کر اُترتا مگر اِنتظار کی ڈُور سے لگا اُمید کا مانجھا تھا اور لپٹتی چرخی' جو مسلسل لپیٹے جا رہی تھی ...... تاہم جھول تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اِنتظار دَھاگے کو دُھوپ بارش میں کھنچتے کھنچتے سارا بدن پاؤں کی اس اِیڑی جیسا ہو گیا تھا جس کی جلد تڑخ کر منھ کھول دِیتی ہے اور تب تک کھولے رَکھتی ہے جب تک مرہم اُس کے بیچ نہ اُترے۔

اَیسے ہی دِنوں میں سے ایک دِن تھا جب میرا باپ اَپنی حویلی کے طویل آنگن کو پاٹتا' بارہ

دری طے کرتا گھمن گھیری ڈالتے زِینے چڑھتا وہاں آیا جہاں مجھ پر دُھوپ کی عجب بارش برس رہی تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ تو پہلے ہی روز سے مجھے بھلائے ہوئے تھا' پھر وہ یہاں تک چل کر کیسے آیا۔ مگر جب میں نے اُس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی وہ لاٹھی دِیکھی جو اس کا سارا وجود سہارے ہوئے تھی تو میں نے حیرت کی پھیلی چنی سمیٹ لی کہ اس کی ساری مجبوری سمجھ آنے لگی تھی۔

اس کی پہلی مجبوری یہ تھی کہ پہلی دو میں سے ایک کی کوکھ خالی بھڑولے کی طرح نکلی تھی جب کہ دوسری سے میں برآمد ہوئی تھی حالاں کہ وہ کچھ اور اُمید باندھے بیٹھا تھا۔ پھر اِنتظار کے طویل برآمدے سے گزر کر کئی اور کوکھیں اُس نے قدموں تلے کچل ڈالی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ لڑکھڑا گیا اور اَب اِس لڑکھڑاہٹ کے خوف نے وجود کو سہارے کے لیے اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھما دی تھی ؛ جو اس کی دوسری مجبوری تھی۔

یوں تو میرا وجود بھی مجبوری کی بیل بَن کر اُس کے خالی خولی آنگن میں اس کے اندیشوں کی دیوار پر چڑھتا چلا جاتا تھا مگر میرا یہ وجود اُسے تب نظر آیا جب اس کے ہاتھ دوسری مجبوری لگی تھی۔

اُس نے گھوم کر پہلے اَپنی حویلی کے طول وعرض کو دیکھا۔

ایسا کرتے ہوئے اُس کا ہاتھ اُس کے دِل پر تھا۔

پھر اُس نے کلف لگے شملے کو تھام کر بے توقیر ہوا میں ڈولتی پتنگ کو دیکھا اور نفرت سے منھ موڑ کر حدِ نظر تک پھیلے سرسبز قطعات کو دیکھنے لگا جنہیں دیکھنے سے نظر نہ بھرتی تھی۔ اُس کی نظر ابھی تک نہ بھری تھی مگر اس کے کلف لگے شملے کا بوجھ اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ اُس کی نگاہ خود بخود اس لاٹھی پر جا پڑی جو کچھ عرصے سے اُس کے بدن کا حصہ بن گئی تھی۔ میں نے اُس لاٹھی کو دِیکھا جو میرے باپ کے بدن سے کوئی مَیل نہ کھاتی تھی مگر اُس کے پورے وجود کو سہارے ہوئے تھی۔ میرے باپ کے رَعشہ زَدہ ہاتھوں نے میرے ہاتھوں سے ڈور تھام لی اور پتنگ بے توقیر

ہوا سے اُتر کر اُس کے قدموں میں لوٹنے لگی، پھر وہیں ڈھیر ہو گئی؛ اس زمین پر کہ جس پر فقط میرے باپ کا نام لکھا تھا۔ ایسے میں مَیں نے اُسے دِیکھا تھا، جو میرے باپ کی لاٹھی بن کر آیا تھا اور اُس کا وہ جملہ سنا تھا جو میرے چٹختے وجود کے بیچ پوری طرح سما گیا تھا۔

یوں نہیں تھا کہ اس کے صدق کی ایسی آنچ مجھ تک نہ پہنچ پائی تھی جو بدن میں یقین اُتارتی۔

اور یہ بھی نہیں تھا کہ میرے دِھیان کا دَھاگہ سپنوں کی کوئی اور پوشاک بن رہا تھا۔

وہ اَپنے پورے مگر کچے بدن کی پوری سچائیوں کے ساتھ میرے مقابل تھا اور میں اَپنے سارے مگر کرخت وجود کی مکمل صداقت کے ساتھ اُس کے سامنے تھی۔ تاہم سچ کے نامعلوم پانیوں میں یقین کی ایسی سنہری مچھلی تھی، جو گرفت میں نہ آتی تھی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ وہ لمحہ میری حیات کے عناصر منتشر ہونے تک میرے پلّو سے بندھا رہے گا اور مجھے اپنے پلّو سے باندھے رکھے گا۔

میں نے جس لمحے کو ایک خاص مدت سے ماپ کر نشان زدٗ کیا ہے (اس میں آپ اب مزید سترہ سیکنڈ کا اِضافہ کر سکتے ہیں) میرے بدن کی کھنکتی ٹھیکری کے بیچ یوں جھنکار چھڑکتا رہا ہے کہ مجھے گزری مدت کو ماپنے کے لیے اب تک کوئی کلینڈر نہیں دیکھنا پڑا؛ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر نہیں ڈالنا پڑی۔ نہ اُسے دِیکھنا پڑتا ہے اور نہ ہی آئینے میں خود کو...... اَندر ہی اَندر ٹک ٹک ہوتی رہتی ہے اور وقت ساعت ساعت پہلے سے موجود حاصل جمع کا حصہ بنتا رہتا ہے۔ یوں کہ جیسے ہر منظر کی لہر شعور کے پانیوں کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔

ایک خاص لمحہ عجب طور پر میرے اَندر ٹھہر سا گیا تھا جو اگرچہ ایک ساعت کی کئی ہزارویں تقسیم کی رفتار سے پرے کھسک رہا تھا مگر اپنے حوالے کی ڈور مضبوطی سے لمحہ موجود سے باندھے ہوئے تھا۔ بہت پہلے کہ جب مجھے اوپر کی بے توقیر ہوا سے سابقہ نہ پڑا تھا تاہم مہکتے پھولوں کا طواف کرتی تتلیوں کو پوروں سے چھو لینے اور کچے رنگوں کی ملائمت کو اُنگلیوں کے بیچ مسلنے کا عرصہ

گزر چکا تھا' تب مجھ پر لفظوں کے گہرے پانیوں میں غوطہ زن ہونے اور پہروں سانس روک لینے کا خبط سا ہو چلا تھا۔ اُن ہی دِنوں میں نے مارکیز کو پڑھا تھا اور وہاں کہ جہاں اُس نے وقت کو ایسے ماپا تھا جیسے بعد ازاں میں ایک خاص لمحے کو ماپتی رہی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی تھی...... مگر اب مجھے حیرت نہیں ہوتی۔

یہ سارا عمل ابھی چند سکینڈ پہلے تک حیرت کے پانیوں سے پَرے عین یقین کی دھرتی پر یوں ہوتا رہا ہے جیسے سانس لی جاتی ہے' دیکھا جاتا ہے' سونگھا جاتا ہے۔ غیر محسوس طریقے سے' جانے بوجھے بغیر' بے خبری میں ..... یوں' کہ جیسے میرا بیٹا میری نظر کے سامنے اِتنا بڑا ہو گیا تھا کہ میرے ہی ہونٹوں اور گالوں پر بوسہ دینے سے جھجکنے لگا تھا۔

میں معمول کی طرح آنکھیں بند کیے چہرہ اُس کے سامنے کیے بیٹھی رہی۔ منتظر تھی اور پر یقین بھی کہ ابھی میرے بیٹے کے ہونٹ تتلیوں کی طرح میرے ہونٹوں اور گالوں پر اُتریں گے اور اپنے لمس کی خُوشبو اور نمی کے دھنک رنگوں سے مجھے نہلا ڈالیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ گزشتہ سارے عرصے میں کرتا آیا تھا اور جس کی سرشاری میں' مَیں اس لمحے کی جھنکار کو بدن ہی کے بیچ سمیٹے ہوئے تھی۔

میں منتظر تھی...... منتظر رہی۔

اور وہ جھجک کر دور کھڑا اسراسیمہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

اگرچہ میری آنکھیں بند تھیں مگر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اُلٹے قدموں دُور ہو رہا تھا۔

مجھے یوں لگا جب وہ دور ہو رہا تھا تو اس کے ننھے منے ہاتھوں میں پارینہ لمحے کے بوکے سے بندھی رَسی تھی جو بدن کی چرخی سے گھوم کر سارے درد کا پانی باہر نکال لائی تھی۔

درد کا یہ پانی رُکا کب تھا؛ اندر ہی اندر رِستا رہا تھا مگر اَب کے یوں لگا کہ میرے بیٹے کی جھجک نے بوکا بھر کر اس پڑچھے میں ڈال دیا تھا جو سیدھا بدن کے باہر گرتا تھا۔

میں نے آنکھیں پوری طرح کھول کر پرے کھڑے دِیوار سے لگے بیٹے کو دیکھا اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا' جیسے وہ میرا بیٹا نہ تھا' وہ تو وہ تھا جس نے کبھی میرے بدن کی کمانوں کی ڈھیلی تانت تن دِی تھی۔

میں بھاگ کر وہاں گئی جہاں ایک کونے میں وہ بیٹھتا تھا جس کا عکس میں نے اپنے بیٹے کے چہرے پر دیکھا تھا؛ وہ وہیں کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا تھا۔ کتابوں کے ڈِھیر کے بیچ بیٹھا کچھ لکھتا رہتا۔ اُس کے اِردگرد کاغذ ہی کاغذ تھے یا پھر بس کتابیں۔ ہاں' ملنے والے آجاتے (جو اکثر آتے رہتے) تو وہ ان سے باتیں کرتا رہتا۔ حکمت کی باتیں' دانش بھری باتیں' بڑی بڑی باتیں .... ایسی باتیں کہ جو اس کا قد میری نظر میں اور پستہ کرتی رہتیں۔ تاہم یہی وہ باتیں تھیں جو اُس سے ملنے والے اُسی جیسے لوگوں میں' اس کے لیے عقیدت بڑھاتی رہتی تھیں۔

میں دیکھتی ہوں......مگر......وہ نہیں دیکھتا۔

یک لخت مجھے یوں لگا کہ اُس کا قد بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اس قدر بڑا کہ میں ایک چیونٹی جیسی ہو گئی۔ اُس کا وجود پورے گھر میں پھیل گیا اور میں کہیں بھی نہیں تھی۔ حالاں کہ اس سے پہلے میں سارے گھر میں تھی۔ اس سارے گھر میں کہ جس کے باہر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی اور وہ خود کہیں نہیں تھا۔ اس کونے میں' کہ جہاں وہ بیٹھا رہتا' شاید وہاں بھی نہیں تھا۔

اس نے میرے وجود کے اجنبی پن سے گھبرا کر جہاں پناہ لی تھی' وہاں تخلیق کی دِیوی اس پر مہربان ہوئی......یوں کہ وہ اَپنے اندر اور باہر دونوں سمت پھیلتا چلا گیا۔ جب کہ وہ نہ تو میرے اندر تھا اور نہ ہی میرے باہر۔

نہیں' شاید وہ میرے اَندر بھی تھا اور میرے باہر بھی' اپنے اس جملے کی طرح جو بہت پہلے میرے بدن کی تنی کمان کی تانت بن گیا تھا۔

بس میں ہی اَپنی آنکھیں بند کیے ہوئے تھی' اندر کی بھی اور باہر کی بھی۔

وہ میرے لیے ناکارہ' بے حیثیت وجود کی طرح تھا جو ایک کونے میں پڑا' ایسے لفظ جنم دیتا رہتا تھا جو اسے میری نظر میں معتبر نہ کر سکتے تھے۔

مجھے اس کے لفظوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

مجھے اس سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔

بس اتنا تھا (اور یہ کافی تھا) کہ وہ تھا اور میرے بیٹے کے لیے اس کا نام تھا۔ ایک ایسا نام جو اس گھر کی چاردیواری سے باہر بہت محترم تھا۔ اس کا اپنا وجود میرے لیے بے حیثیت تھا' بے مصرف' کاٹھ کباڑ جیسا' جس پر دھول جمتی رہتی ہے۔

وہ پہلے پہل مجھ سے محبت جتلاتا رہا۔ میں اس کی محبت کے دعووں کو قہقہوں میں اڑاتی رہی۔

پھر وہ میرے وجود کے گلیشئر سے لگ کر یخ بستہ ہو گیا۔

اور بیچ میں وہ خاص مدت گزر گئی جس میں اب آپ کو مزید اکیس سکینڈ جمع کرنے ہوں گے۔

اِس سارے دورانیے میں ہم دونوں کے بیچ کچھ نہ رہا۔

محبت نہ نفرت

بے حسی نہ گرم جوشی

عزت نہ تحقیر

نہ وہ میرے لیے تھا اور نہ میں اس کے لیے تھی۔

جب کوئی اُس سے ملتا اور میرے لیے تعریف کے کچھ جملے کہہ دیتا تو اُسے خُوش ہونا پڑتا حالاں کہ یہ اس کے لیے نہ تو کوئی خُوشی کی بات ہوتی نہ دُکھ کی خبر۔

جب اُس کا نام اخبارات میں چھپتا' اس کی تخلیقات کے ساتھ' اس کے اعزاز میں تقاریب ہوتیں یا دوست احباب اس کے بہت اچھا ہونے کی اطلاع دیتے تو میرے چہرے پر خُوشی آجاتی

'اطلاع دینے والے کے لیے' حالاں کہ میرے اندر اس کے لیے کوئی جذبہ نہ تھا۔

مگر اَبھی اَبھی' چند لمحے پہلے' مجھے بھاگ کر وہاں آنا پڑا تھا کہ میرا بیٹا جھجک کر پرے کھڑا ہو گیا تھا اور اُلٹے قدموں دور چلا گیا تھا اور اس کے چہرے سے اس کا چہرہ جھلک دینے لگا تھا۔

وہ ایک کتاب پر جھکا ہوا تھا...... میں اُس پر جُھک گئی۔

اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اِس حیرت پر اُن سارے لمحوں کے جالے تنے تھے جن میں اب آپ کو مزید اِتنی صدیاں جمع کرنا ہوں گی جن کی گنتی میں اَب بھول چکی ہوں۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پورا وجود اس کے سامنے کر دیا۔ یوں کہ بہت مدت پہلے ادا کیا گیا جملہ دوسرے سیارے سے آٹھ ہزار سال کے بعد پہنچنے والے سگنل کی طرح میرے بدن کے فلک کا پارچہ پھاڑتا عین میرے دِل کے بیچ اُترا' اور سنگلاخ چٹانوں کو توڑتا اندر کی مہکتی سوندھی مٹی کے قطعے میں بیج کی طرح دفن ہو گیا۔

میں نے آنکھیں بند رکھیں...... اس لمس کے اِنتظار میں' جس میں مہک تھی اور اُس نمی کے لیے' جس سے دَھنک رَنگ پھوٹتے تھے۔

ملبا سانس لیتا ہے!

جب آوی کے پاس فرشتے اترے

ماسٹر فضل بُوٹھیک ٹھیک آنکنے میں ناکام رہے تھے کہ اُنھوں نے کتنی دیر تلاوت کی تھی۔ رمضان کے عین آغاز میں ہی وہ تخمینہ لگا چکے تھے کہ روزانہ اِتنا پڑھیں گے تو ستائیسویں کو ختم القرآن کی مطلوبہ تعداد مکمل ہو گی۔ مگر جوں جوں روزے ایک ایک کر کے کم ہو رہے تھے اُن کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ جس قدر اُنہیں پڑھنا چاہیے تھا' وہ پڑھ نہیں پا رہے تھے اور بعض روز تو یوں ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں رات بھر تلاوت کرتے رہتے تھے مگر جو ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھتے تو خود کو کوسنے اور شیطان مَردُود کو پھٹکارنا شروع کر دیتے کہ آخر تلاوت کرتے کرتے وہ کہاں چلے جاتے تھے۔

تو یوں تھا کہ آج بھی وہ کہیں اور تھے۔

رَات تَراوِیح سے لوٹے تو یہی کوئی گھنٹہ پون گھنٹہ ہی کمر سیدھی کر پائے ہوں گے کہ انہیں لگا جیسے کوئی روئی جیسے ملائم ہاتھوں سے اُن کے پاؤں کے تلوے سہلا رہا ہو۔ اُنہیں مزا آ رہا تھا مکّر مار کر پڑے رہے حتیٰ کہ تراویح میں مُسلسل کھڑے رہنے سے ٹانگوں میں جمع ہو کر جم جانے والا خون نرم و گداز لمس کی لطیف حرارت سے پھر رواں ہو گیا۔ ایسے میں ہی شاید' دائیں پاؤں کے تلوے کی عین ڈھلوان میں' وہاں جہاں پوست قدرے زیادہ ڈھیلا پڑ جانے کی وجہ سے سہولت سے چٹکی میں آ جاتا ہے' چٹکی میں لا کر مسل دیا گیا۔ چٹکی میں آنے والے پوست سے لگے گوشت نے لمحہ بھر کے اندر اندر ایک میٹھے درد کو پورے بدن میں جھونک دیا۔ وہ ہڑ بڑا کر اُٹھے اور ابھی نظر کا چشمہ تلاش نہ کر پائے تھے کہ ایک کھنک سی فضا میں تیر گئی۔ اُن کے سنبھلتے سنبھلتے سارا کمرا گہری خاموشی اور اکیلے پن کے احساس سے گونج رہا تھا۔

کمرے میں مدھم روشنی والا بلب' فینسی شیڈ کے اندر سے اُن کے بستر سے قدرے دور' دبیز قالین پر' ایک دائرے میں روشنی پھینک رہا تھا۔ وہ کچھ بھی سوچے بغیر ہڑ بڑ اس دائرے کو بہت دیر تکتے رہے حتی کہ خواب میں بدن کا حصہ ہو جانے والا لطیف احساس خود بخود معدوم ہو گیا۔ اب انہیں اس ماہ مبارکہ کی پاکیزہ ساعتوں کے یوں ہی گزر جانے کا احساس تڑپا رہا تھا لہذا اُٹھے اور سیدھے واش روم میں گھس گئے۔

وضو تازہ کرنے کے بعد وہ تب سے پڑھنے بیٹھے تھے' اور سحری کے لیے جگانے والے سرکاری سائرن کی دوسری لمبی گھوں پر وہ بوکھلا کر سیدھے ہو گئے تھے۔ یہ بوکھلانا اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ گود میں پڑا ہوا قرآن پھسلنے لگا تھا۔ انہوں نے فوراً اُسے تھام لیا۔ ہڑ بڑاہٹ کچھ کم ہوئی تو اس نشانی کو تلاش کیا جہاں سے انہوں نے تلاوت کا آغاز کیا تھا۔ پھر تیز تیز ورق اُلٹتے الٹتے وہاں پہنچے جہاں تک' وہ اَپنی دَانست میں پڑھ چکے تھے۔

''ہائیں' بس اتنا ہی''

یہ انہوں نے قدرے اُونچی آواز میں کہا تھا اور ابھی تک فضا میں اُن کی بات ٹھہری ہوئی تھی کہ اُنہوں نے قرآن پاک کو دونوں طرف سے اور وسط میں بار بار بوسے دینے اور دائیں بائیں آنکھوں سے لگانے کے بعد چھاتی سے یوں بھینچ لیا جیسے فضیلت بھینچ لیا کرتی تھی۔

جب اُس کی ڈولی اُٹھی تھی تو فضیلت جان کو سولھوں لگا تھا۔ اَلہڑ اِتنی کہ ایڑھیاں زمین پر ٹکتی نہ تھیں۔ قد نکلتا ہوا' رَنگ کِھلتا ہوا اور آواز یوں کہ آدمی سنے تو مست ہو جائے۔ جب وہ آئی تھی تو اس کا نام فضیلاں تھا اور اسے بہت ساری باتوں کی سمجھ بھی نہ تھی۔ جیجو کمہار کی بے ماں بیٹی' جو باپ کے ساتھ مٹی ڈھوتے' اسے گوندھتے' صحنکیں' گھڑے' بٹھل' چھونیاں' کوزے' چلمیں اور ہو بیجے چاک پر چڑھاتے اور ان کی صورتیں بناتے ہوئے خود ایسی بھولی بھالی صورت میں ڈھل گئی تھی کہ اٹھی نظر ہٹتی نہ تھی۔ جیجو خود بھی اسے دیکھتا تو اس کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ فضیلاں کے پیدا ہونے اور فضیلاں کی ماں کے مرنے کا واقعہ ایک ساتھ ہوا تھا۔ تب سے اب

تک وہ اس کے لیے امتحان تھی۔ اور جب اس کا امتحان اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو خدا نے اس کی مشکل خود ہی آسان کر دی۔

یہ مشکل یوں آسان ہوئی تھی کہ فضل جُو بھی اُس کے گھر کے پھیرے لگانے لگا تھا۔

فضل جُو جو ابھی خاکوٹ کے پرائمری اسکول میں ماسٹر نہیں لگا تھا' دوسرے نوجوانوں کی طرح بلاسبب کئی کئی بار مٹی کے تباخ اور صراحیاں خرید چکا تھا۔ وہ اس کے گھر کے چکر کیوں لگا رہا تھا؟ وہ بہت جلد سمجھ گیا تھا اور یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ یہاں سے جو کچھ خرید لے جاتا تھا' گھر نہ لے جاتا تھا۔ اگر لے گیا ہوتا تو پیش امام صاحب' اور بی بی صاحبہ کو ضرور کھٹک جاتا۔ تاہم وہ بے بس تھا اور اِتنا کم حیثیت کہ کوئی خدشہ یا کوئی شکایت منہ پر لانے کا سوچتا بھی تو اس کی کمر کے کپڑے گیلے ہو جاتے تھے۔

واقعات کے اِسی تسلسل میں' جب جیجو مایوسی کی اس انتہا کو پہنچ گیا تھا جس میں خود سے خدشہ ہونے لگتا ہے کہ اس روگ سے تنگ آ کر کہیں اپنی جان کا نقصان ہی نہ کر بیٹھے' ایک ایسا واقعہ ہوا کہ مایوسی اس کے بدن سے خود بخود نچڑ گئی۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ فضل جُو گاؤں کے دوسرے لونڈوں سے اُلجھ پڑا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور جیجو کی آوی کے چکر لگائے۔ یہ اکیلا تھا اور وہ چار' لہٰذا انہوں نے فضل جُو کی ہڈیاں کوٹ کر رَکھ دِی تھیں۔ یہ واقعہ اگرچہ خُوشگوار نہ تھا مگر اس ایک واقعے نے کل تک گاؤں بھر کے دوسرے لونڈوں جیسا نظر آنے والے فضل جُو کو ان سب سے مختلف ہو کر دیا تھا جو اس کی بیٹی فیضلاں پر شرمناک نظریں گاڑنے اور لپ لپ رالیں ٹپکانے والے تھے۔

پیش اِمام صاحب جتنی بار مسجد جاتے تھے' فضل جُو لگ بھگ اتنی ہی بار بہانے بہانے سے جیجو کے گھر کے پھیرے لگا آتا۔ فضل جُو کا باپ گاؤں کی مسجد میں پیش امام تھا اور جیجو کمہار ماشکی۔ جیجو مسجد کا پانی تو باقاعدگی سے بھرتا تھا مگر نمازی وہ عید بقر عید والا تھا کہ اس بہانے اسے کپڑوں کا نیا جوڑا پہننے کو مل جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نئے کپڑے جسم پر نماز کے بعد ہی حلال

ہوتے اور زیادہ عرصے تک چلتے تھے۔ کپڑوں کے نئے جوڑے میں برکت کی نیت سے وہ مسجد کے اندر جا کر ماتھا ٹیک آتا تھا مگر پوری یکسوئی سے نماز اس لیے نہ پڑھ پاتا کہ رکوع میں جاتے ہوئے یا پھر سجدہ کرتے ہوئے کپڑوں کا نیا پن اسے اپنی طرف متوجہ رکھتا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے نکلتے ہی اسے فکر لاحق ہو جاتی تھی کہ سجدہ کرتے اور رکوع میں بیٹھتے ہوئے اس کے کپڑے گھٹنوں تلے آ کر مسک گئے ہوں گے۔ وہ تسلی کرنے لیے راہ میں کئی بار جھک کر انہیں دیکھتا' ہاتھوں میں تان کر اور پھٹک کر جانچتا۔ ایسا کرنے میں وہ اس قدر مگن ہو جاتا تھا کہ اکثر راہ گیروں سے ٹکرا جاتا تھا۔ ایسے میں اسے تو بہت خجالت کا سامنا کرنا پڑتا تھا جب کوئی بڑی عمر کی خاتون اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتی تھی۔

گاؤں کی دوسری روایات کی طرح کمہار ہونے کی حیثیت سے ماشکی کا کام بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ نمازیوں کی خدمت کا جذبہ اس کے اندر شاید اس لیے پیدا نہ ہو سکا تھا کہ مسجد کا حوض بھرتے بھرتے اس کی کمر دوہری ہو گئی تھی۔ جب بھی اس کے کپڑے پھٹتے تھے' یا تو کمر سے پھٹتے' جہاں وہ مشک ٹکایا کرتا تھا یا پھر عین گھٹنوں کے اوپر سے۔ اسے ہر بار شک ہوتا کہ پہلے روز سجدہ کرتے وقت گھٹنوں تلے آ کر کپڑا زمین سے رگڑ کھا کر پتلا ہو گیا ہوگا اور چھاننی بن جانے والا کپڑا تو ایک روز پھٹ ہی جایا کرتا ہے۔ ایسے میں وہ خلوص دِل سے تمنا کرتا کہ کاش وہ ماشکی نہ ہوتا اور صرف کمہار ہوتا مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی حماقت پر رونا آ جاتا تھا کہ بھلا کیسے ممکن تھا؛ ایک آدمی کمہار تو ہو اور ماشکی نہ ہو؟

کمہار ہو کر مسجد کا ماشکی ہونا اسے وراثت میں ملا تھا۔ اس کا باپ' بہت پہلے شدید سردیوں میں' ابھی تاروں کی چمک مدہم نہیں ہوئی تھی اور شیدے بانگی نے فجر کی اذان بھی نہیں دی تھی' پانی بھر کر لاتے ہوئے عین مسجد کی پرلی نکر کے پاس' ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گر گیا۔ یوں کہ' چمڑے کی مَشک کے منہ پر مضبوطی سے جما اُس کا ہاتھ ڈِھیلا پڑ گیا' اور گڑ گڑ کرتا پانی نکل کر اسے پوری طرح بھگو گیا تھا۔ اُسے گھٹنے پر چوٹ آئی' چوٹ اگرچہ زیادہ نہ تھی مگر کسی پتھر کی نوک پر پڑنے سے

گھٹنے میں اتنی فوری اور شدید تکلیف ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں کے آگے ترمرے ناچ گئے تھے۔ جب تک اس درد کی شدت مدھم ہوئی' مشک کا یخ پانی اسے پوری طرح بھگو چکا تھا۔ گھر پہنچا تو وہ ٹھرٹھروں کر رہا تھا۔ پھر اسے تپ چڑھا اور اس تپ نے اسے اتنی ہی مہلت دی کہ مشک بیٹے کو تھما دیتا۔ بیٹے کی مسیں ابھی پوری طرح بھیگی نہ تھیں کہ بھیگا ہوا باپ ٹھٹھر کر مر گیا۔ اسے مشک سے نفرت ہو گئی...... مگر وہ اس نفرت کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور تھا۔

جیجو اپنے مرحوم باپ کی طرح وضو خانے سے ملحق حوض کو پانی سے بھرتا رہتا۔ حوض ہر نماز کے بعد خالی ہو جاتا تھا۔ اسے ان لوگوں پر بہت غصہ آتا جو اس کے گمان میں زیادہ پانی خرچ کرتے تھے۔ ان میں سے جاز و جولاہے' فیقے مستری اور میر شفیع کو وہ مسجد سے واپس آتے ہوئے ہر بار اس حال میں دیکھا کرتا کہ ان کی قمیضوں کے دامن' داڑھیاں یا پھر شلواریں گھٹنوں تک تر نظر آتی تھیں۔ سودے لُون کے بارے میں تو گاؤں بھر میں لطیفہ مشہور تھا کہ اسے اپنا ایک ایک عضو بھگونے کے لیے الگ سے بھرا ہوا پانی کا لوٹا چاہیے ہوتا ہے۔

جیجو جب بھی خالی مشکیزہ کندھے پر جما کر سائیں سوجھے کی چٹی قبر کے پیچھے سے ہوتا پہاڑی کے مُڈھ سے بل کھا کر گزرتے پتلا پانی تک پہنچتا تھا تو اس کے پاؤں کے پنجے ڈھلوان میں مسلسل اُترنے کی وجہ سے اوپر اٹھنا بھول چکے ہوتے تھے۔ اسے وہاں سے مشکیزہ بھرنا ہوتا تھا وہاں پتھروں پر آگے ہی آگے پچھلتی پھسلتی چلے جانے والی اُتھلے پانی والی یہ ندی پیالہ بن کر لمحہ بھر کے لیے پانی ٹھہرا کر آئینہ بنا لیتی تھی۔

وہ مشکیزہ بھر کر اس کا منہ مٹھی میں دبا لیتا اور شیشہ بنے پانی میں خاکوٹ کے مکانوں کے عکس دیکھتا تو اس کا دِل بیٹھ جاتا تھا۔ ایسے میں جھک کر کندھے پر مشکیزے کو اٹھانا اور بھی مشکل ہو جاتا۔ تاہم وہ بوجھل دِل کے ساتھ اوپر کو چل دیتا تھا۔ مسجد تک پہنچتے پہنچتے اسے سودے لُون سے جاز و جولاہے تک جو بھی یاد آتا اس کی دِل ہی دِل میں ماں بہن ایک کرتا جاتا۔ تاہم وہ واقعہ جس نے اس کے روّیے کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا' وہ فضل جُو کا گاؤں کے دوسرے لونڈوں سے مار کھانا تھا۔

اَب وہ اوپر سے پتیلے پانی تک جس طرح بھاگتا ہوا جاتا تھا اور جیسے پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ اٹھا کر پنجوں کے بل اچھلتا کودتا اوپر پہنچتا تھا' اُس پر سائیں سوجھے کی چٹی قبر ہر بار اسے حیرت سے دیکھنے لگتی تھی۔

بُری طرح پِٹ کر زخمی ہونے والے فضل جُو کو جب لوگوں نے اُس کے گھر پہنچایا تو اس کی ماں' جو بچیوں کو قرآن پڑھانے کی نسبت سے گاؤں بھر میں محترم تھیں اور سب انہیں بی بی صاحبہ کہتے تھے' پہلے تو بیٹے کی حالت دیکھ کر چکرا کر گریں' اور جوں ہی ہوش آیا' چھاتی پیٹ پیٹ کر اپنے بچے پر یہ ظلم ڈھانے والوں کو کوسنے لگیں۔ پیش امام صاحب عصر کی نماز کے بعد مسجد گئے تو واپس پلٹنے کی بہ جائے اپنے مُرشد کے ملفوظات کی کتاب پڑھنے کے لیے وہیں حجرے میں بیٹھ گئے تھے' خلاف معمول اَپنی بی بی کی کوسنے اٹھاتی آواز سنی تو ہڑ بڑا کر حجرے سے باہر نکلے اور مسجد کے دروازے سے ملحق اپنے گھر کے دروازے پر جمع ہجوم کو چیرتے اندر گھس گئے۔ لوگوں نے اتنے قلیل عرصے میں وہ اشارے کر دِیے تھے جو بیٹے کی حالت دیکھ کر اور بی بی کے بین سن کر انہیں سارا معاملہ سمجھا گئے تھے۔ تاہم اس لمحے جب وہ اپنے گھر کے آنگن میں کھڑے تھے' انہیں نہ تو زخمی بیٹا نظر آ رہا تھا نہ پڑوسنوں کے درمیان کھڑی چھاتی کوٹتی اور گالیاں بکتی بی بی کہ وہ تو اَپنی اس نیک نامی اور عزت کو خاک میں ملتا دیکھ رہے تھے جو عمر بھر کی ریاضت کا حاصل تھی۔ انہوں نے چھاتی کو وہاں زور سے دبایا جہاں انہیں بوجھ محسوس ہو رہا تھا' آنکھوں کے آگے اندھیرا سا لہرانے لگا۔ اس خدشے کے باعث کہ کہیں چکرا کر وہ گر ہی نہ جائیں وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔

بی بی صاحبہ نے پیش امام کو یوں زمین پر بیٹھتے دیکھا تو ان کی آواز حلقوم ہی میں ڈھے گئی تھی۔

شام کی نماز سے پہلے پہلے وہ ہوش میں آ گئے تھے' مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ مسجد جائیں۔ تاہم انہوں نے یہ نماز قضا نہیں ہونے دی۔ اور جب وہ رو رو کر اپنے ان گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے جو ان کی یادداشت سے باہر پڑے تھے اور جن کی سزا اُنہیں اِس رُسوائی کی صورت مِل رہی تھی تو آنسوؤں سے اُن کی داڑھی بھیگ گئی تھی۔ وہ بہت دیر بعد مصلے سے اٹھے'

زخمی فضل جُو کا ہاتھ تھاما' یوں زور سے جُھٹکا دے کر اُسے چارپائی سے اتار' کہ اگر وہ نہ اُترتا تو ہو سکتا تھا اُس کا بازو ہی کندھے سے اُتر جاتا۔ بی بی صاحبہ نے یہ دیکھا تو بھاگتے ہوئے بیچ میں آئیں۔ پیش امام صاحب نے اسے دوسرے ہاتھ سے پرے دھکیل دیا۔ وہ فضل جُو کو گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گئے۔ گاؤں والے ایک بار پھر بی بی صاحبہ کی چیخیں سُن رہے تھے۔

جیجو کے لیے اَن ہونی ہو گئی تھی۔ پیش امام صاحب نے کچھ نام لیے اور انہیں فوراً بلالانے کو کہا۔ جیجو سب کو بلا لایا حالاں کہ یہ سارے وُہ لوگ تھے' جن کی داڑھیاں' دامن یا گیلی شلواریں ہمیشہ اسے جی ہی جی میں مغلظات بکنے پر مجبور کیا کرتی تھیں۔ مگر جب وہ ان سب کو آوی کے پاس اپنی ٹوٹی ہوئی ان دو چارپائیوں پر بیٹھا دیکھ رہا تھا جن کے علاوہ اس کے گھر بیٹھنے کو کچھ تھا ہی نہیں' تو یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہرے نور دھارے نے اجال رکھے تھے۔ پیش اِمام سمیت یہ سارے لوگ اُسے آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے لگ رہے تھے۔

لذت کہاں تھی؟

ماسٹر فضل جُواب مڑ کر فضیلت کے بارے میں سوچتے تھے تو انہیں یوں لگتا تھا جیسے وہ تو ان کے لیے آسمان سے اُتری تھی' پنکھ لگا کر۔ وہاں جہاں جیجو کی آوی تھی۔ گاؤں کے لڑکوں سے پٹنا' ماں کا چھاتی کوٹ ڈالنا' ابا کا چکرا کر گرنا اور پھر گاؤں والوں کا جیجو چاچے کی آوی پر اکٹھے ہو کر اس کا نکاح کر دینا بس ایک بہانہ اور وسیلہ تھا۔

جب وہ چھاتی سے قرآن لگائے فضیلت کو سوچنے لگتے تو ڈھیروں وقت تیزی سے معدوم ہو جاتا تھا۔ جتنا وقت انہوں نے فضیلت کو سوچتے گزار دیا تھا' اتنا تو وہ ان کے پاس رہی بھی نہیں تھی۔ جس طرح فضیلت کو جنم دیتے ہوئے اس کی ماں مر گئی تھی بالکل اسی طرح' اپنی شادی کے لگ بھگ چوتھے سال' جب کہ ابھی وہ محض انیس سال کی تھی' ماسٹر فضل جُو کے بیٹے کو جنم دیتے ہوئے وہ خود بھی دم توڑ گئی تھی۔ ان چار برسوں کی رفاقت انہوں نے کھینچ تان کر ساری عمر پر پھیلا لی تھی۔ چپکے سے چلے جانے والی' پنجوں کے بل چل کر آجاتی تھی اور سارے میں اُجالا پھیل جاتا

تھا۔

''فضیلت ادھر آؤ تمہیں پڑھنا سکھادوں''

وہ اُسے پاس بلاتے' قرآنی قاعدہ کھول کر پہلے حرف پر انگلی رکھتے اور اس کی بھولی صورت دیکھ کر ''آ'' کی آواز نکالنے کو کہتے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

یہ کیا پڑھنا ہوا جی' اس طرح تو میں ابا کے کہنے پر شیدو ہاتو کی مرغیاں گھیرا کرتی تھی......''آ' آ' آ''

فضیلت اتنے بھولپن سے یہ کہتی تھی کہ فضل جُو کی بھی ہنسی چھوٹ جاتی۔

وہ فوراً ہی مچلنے لگتی کہ اسے اسی طرح پڑھنا سکھایا جائے جس طرح خود لہک لہک کر ماسٹر جی تلاوت کرتے تھے۔ وہ بھاگ کر جاتی اور کارنس سے قرآن پاک اٹھا لاتی۔ محبت سے اس کا غلاف الگ کرتی۔ اسے دائیں اور بائیں آنکھ سے لگا کر چومتی اور دونوں بازوؤں میں یوں بھینچ لیتی تھی جیسے وہ اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو اپنے سینے میں اتار لینا چاہتی ہو۔ ماسٹر فضل جُو کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کی اس خواہش کو کس طرح پورا کرے۔ وہ شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی لفظوں کو پوری صحت کے ساتھ اور صحیح مخرج سے ادا کرنے پر قادر نہ تھی۔ بعض اوقات تو وہ سبق دہرانے میں اتنی شدید غلطیاں کر جاتی تھی کہ وہ ''نعوذ باللہ' نعوذ باللہ'' کا ورد کرنے لگتے تھے۔ انہیں ساری عمر افسوس رہا تھا کہ وہ اسے نہ تو ڈھنگ سے نماز پڑھنا سکھا پائے تھے نہ قرآن۔ مگر جس طرح وہ سینے سے قرآن لگا کر لہک لہک کر گاتی رہتی تھی اس کی بابت سوچتے تو پورے بدن میں ایک عجب طرح کا کیف اور مستی بھر جاتی تھی:

''اَسّٰل کھرسی وِچ قرآن

آسوں پاسوں' تو رحمان

لوہے دِیاں کنجیاں' ترامے دِے تالے

یا نبی تُساں کرماں والے

کول میرے، بن کوئی نئیں تھوڑ

اللہ والے مینوں تیری لوڑ

یا نبی دِی چڑھی سواری

چواں گُٹھاں دِی خبرداری''

اپنے پاک نبی کی اِس خبرداری میں وہ نہال رہتی تھی۔ تاہم ''آیت'' اور ''کرسی'' کے عام سے الفاظ بھی وہ صحیح طور پر ادا کرنے پر قادر نہ تھی۔ ''آیت'' اور ''ال'' کو ملا کر پڑھتی تو ''اٹل'' ہو جاتا اور ''کرسی'' کی بہ جائے وہ ''کھرسی'' کہتی تھی۔ ماسٹر صاحب سمجھاتے:

''کھرسی نہیں کرسی''

اور وہ سوچے سمجھے بغیر انتہائی عقیدت اور محبت سے دہراتی:

''کھرسی نہیں کھرسی''

جتنی بار اس کی تصحیح کی جاتی وہ اتنی بار، ویسے ہی پڑھ دیتی تھی جیسا کہ کوئی لفظ شروع سے اس کی زبان پر چڑھا ہوا ہوتا تھا۔ تاہم جب وہ خود تلاوت کرنے لگتے تو اصرار کرتی کہ آواز ذرا بلند رکھی جائے۔ وہ لپٹ لپٹا کر پاس ہی بیٹھ جاتی اور ہر آیت میں حروف کی ادائی کے دوران جس طرح آواز اوپر نیچے ہوتی اس کی سانسیں بھی پھولنا شروع ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ وہ ہچکیاں باندھ کر رونے لگتی تھی۔ نماز کے لیے وہ اماں بی بی صاحبہ کی طرح دوپٹہ خوب اچھی طرح لپیٹ لیتی تھی۔ پانچوں وقت مصلے پر ضرور کھڑا ہوتی۔ ماسٹر صاحب یہ سوچ کر کہ وہ نماز میں کیا پڑھتی ہو گی اپنے تئیں بہت شرماتے رہتے مگر نماز میں اس کی حضوری کا عالم دیکھتے تو خود پر شرماتے تھے۔ انہیں بہت جلد اِحساس ہو گیا تھا کہ قرآن پڑھنے کا معاملہ ہو یا نماز روزے کا نادُرست ہو کر بھی وہ سب کچھ اتنے یقین، محبت اور اہتمام سے کرتی تھی کہ انہیں اس کے مقابلے میں اپنا ایمان اور علم دونوں ہیچ لگنے لگتے تھے۔ وہ مر گئی تو بھی ماسٹر صاحب اس کے مقابلے میں خود کو کمتر سمجھتے رہے۔ اسے خوابوں میں بلاتے اور اس سے اس خالص پن کا سبق لیتے جو اس کے وجود سے نور بن بن کر چھن

رہا تھا۔

مگر، کچھ دنوں سے یہی نور اُن کی آنکھوں میں چبھتا اور سینے میں چھید کرتا تھا۔ شاید اب ماسٹر فضل جُو کچھ زیادہ ہی زود حِس ہو گئے تھے۔ انہیں فضیلت کا یوں آنا بار بار ستانے کے مترادف دِکھنے لگا تھا۔ تاہم اس کا تو وہی معمول تھا جو ہمیشہ سے رہا تھا۔ رات کے کسی پہر چلے آنے والا، پنجوں کے بل......اور چپکے سے وجود میں سرایت کر جانے والا......اس معمول میں کبھی رخنہ نہیں آیا تھا۔ اور شاید اس سے کم پر فضیلت خود بھی راضی نہ تھی۔

ماسٹر صاحب نے خوب اِحتیاط سے ان زیادہ ستائے جانے والے دنوں کا حساب لگایا تو یہ اتنے ہی بنتے تھے جتنے دنوں سے وہ اپنے بیٹے کے ہاں اُٹھ آئے تھے۔ اَب پیچھے پلٹ کر دِیکھتے تھے تو بیٹے کے ہاں اُٹھ آنا انہیں یوں لگنے لگتا جیسے زِندگی یک دم رس سے خالی ہو گئی ہو۔ ایک خوب صورت سنہرے سیب جیسی زِندگی، جو ماسٹر صاحب کی دَست رَس میں تھی، وہ اس پر اپنے دانت گاڑھ سکتے تھے مگر اس میں سے لذّت نکلتی ہی نہ تھی۔ ہر بار منھ پھوگ سے بھر جاتا تھا۔

زمین کے چلنے سے پہلے

جو زِندگی وہ تج کر یہاں آ گئے تھے اُس کے آخری حصے میں ان کی روح کے لیے اگرچہ لذّت کے ہلکورے باقی تھے مگر بدن کے ضعف نے اس میں سو طرح کے رَخنے ڈال دیے تھے۔ اُن کی سانسیں ناہموار رہتیں اور جوڑوں میں درد بھی وقفے وقفے سے جاگ اُٹھتا تھا۔ ایسے میں ماسٹر فضل جُو نے وہ جو عمر بھر کی ریاضت سے دین اور دنیا میں توازن کا ایک نظام قائم کر لیا تھا، اس میں انہیں سو طرح کی خرابیاں نظر آنے لگتیں۔ ان کی زِندگی کرنے کا وتیرہ ان کے بہشتی باپ سے بالکل مختلف تھا۔ گزرے ہوے زمانے کے ایک پیش امام کی دنیا ہو بھی کتنی سکتی تھی۔ ڈیڑھ دو سو گھروں پر مشتمل چھوٹی سی بستی خاکوٹ میں زِندگی تھی بھی بہت سادہ اور اکہری مگر پیش امام اس سے بھی دست کش رہے تھے۔ مسجد، اس کا حجرہ یا پھر ایک کمرے اور پسار والا گھر۔ مسجد سلکھنی

کے صحن سے گاؤں کے بچوں اور ان کے گھر سے بچیوں کے سبق دہرانے کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں...... یوں، جیسے سپارے نہ پڑھے جا رہے ہوں، بہتا پانی پتھروں سے پھسلتا' گنگنا کر گزرے چلا جاتا ہو۔

بی بی صاحبہ کی زِندگی کی ضروریات تو پیش امام کی ضرورتوں سے بھی کم تھیں۔ چولہا بھی کبھی کبھار ہی جلنے پاتا تھا کہ گاؤں والوں نے اپنے آپ ہی دِن باندھ لیے تھے۔ کسی نے دِن کے اُجالے میں پیش اِمام اور بی بی صاحبہ کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا تھا۔ حتّٰی کہ فضل جُو کو بھی ماں باپ کا باہم صلاح کرنا یا کسی بات پر کُھل کر قہقہہ لگانا یاد نہ آتا تھا۔ بعد میں جب بھی انہوں نے اپنے باپ کو ذہن میں لانا چاہا اُن کے دھیان میں مسجد سلکھنی کا' روئی کے گالوں جیسی داڑھی والا پیش اِمام آجاتا تھا' جس کا سر ہمیشہ کروشیئے والی سفید ٹوپی اور بُمّل بندھے چارخانوں والے رومال سے ڈھکا رہتا تھا۔

پیش امام صاحب گھر میں داخل ہونے کے بعد جوں جوں پسار کی طرف بڑھتے توں توں اُن کی گردن جھکتی چلی جاتی۔ اس اثنا میں اُن کی ماں کا گھونگھٹ بھی نکلنے لگتا تھا۔ وہ اپنی انگلیاں ماتھے کے وسط سے اوپر' وہاں سے چادر کو گرفت میں لے کر لمبا گھونگھٹ نکال دِیتی تھیں' جہاں سے چاندی جیسے بالوں کے درمیان' بالکل سیدھ میں مانگ نکلی ہوتی تھی۔ اُن کا گھونگھٹ اِتنا لمبا ہوتا کہ وہ اس لمحے فضل جُو کی ماں یا اس کے باپ کی بیوی نہ رہتی تھی بی بی صاحبہ ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں فضل جُو کی سماعتوں میں پسار کے اندر سے پتلے پانی کے بہاؤ کی رچی بسی گنگناہٹ خود سے جاری ہو جاتی تھی۔

فضل جُو میں حوصلہ تھا نہ ہمت کہ وہ پیش امام صاحب جیسی زِندگی کو اپنے لیے اختیار کرتے۔ محکمہ تعلیم میں نوکری مل گئی تھی' ہر طرف سے احترام ملا جسے دیکھو' ماسٹر صاحب' ماسٹر صاحب' کہتے تھکتا نہ تھا۔ لوگ سلام کرنے میں پہل کرتے۔ جہاں وہ تھے وہاں ابھی استاد ہونا یا صاحب علم ہونا واقعی لائق تکریم تھا۔ جب ہر طرف سے اتنی عزت ملی تو چھاتی پھولنے اور شملہ تننے لگا۔

تاہم اس سب کو وہ اس کی عطا سمجھتے رہے تھے جس کے لیے اُن کے اَبا جی نے دنیا تج دِی تھی۔

جب تک وہ اَپنی زِندگی میں رُجھے رہے‘ سب کچھ ٹھیک چلتا رہا۔ مگر ریٹائرمنٹ کے بعد‘ اور اَپنی عمر سے مات کھا کر‘ جب سے وہ بیٹے کے ہاں اُٹھ آئے تھے اُن کے اَندر بہت توڑ پھوڑ ہوئی تھی۔ انہیں جس خدا سے معاملہ رہا تھا وہ اس جدید طرز کے ٹاور کے کسی اور حصے میں ہو تو ہو وہاں نہیں تھا جہاں اُن کا بیٹا اور بہو رہتے تھے۔ شاید یہی سبب ہو گا کہ اپنے کمرے میں انہیں اسے پاس بلانے رابطہ خاص قائم کرنے اور اس کا ہو جانے میں بہت جتن کرنے پڑتے تھے۔ اگرچہ اس گھر میں اشیاء نے بہت جگہ گھیر رکھی تھی تاہم یہ خلوص سے جتن کرتے تھے تو وہ راہ بناتا چلا آتا تھا۔

اس رات کہ‘ جس کے معدوم ہو چکنے کے بعد بھونچال کو چپکے سے آ کر سب کچھ تلپٹ کر کے رَکھ دِینا تھا‘ عین اسی رات کو فضیلت نے آ کر ماسٹر فضل جُو کو بہت ستایا تھا۔ وہ پڑھتے ہوئے بار بار اونگھتے اور اِسی اونگھ جھپکی میں لمبا غوطہ کھا جاتے‘ یوں جیسے پینگ ہلارے لیتے لیتے ایک لمبی جست لے اور بادلوں میں اتر کر واپس آنا بھول جائے۔ خواب کے اس لمبے ہلارے نے جن بادلوں میں انہیں اتارا تھا‘ وہاں فضیلت تھی‘ جو بار بار پوچھے جاتی تھی:

”ماسٹر جی تم ان کے لیے کیوں پڑھتے ہو جو خود پڑھ سکتے ہیں‘ مگر پڑھنا نہیں چاہتے؟“

ماسٹر جی چپ رہے تو وہ تن کر اُن کے سامنے کھڑی ہو گئی:

”دیکھیں جی‘ میں جو ہوں آپ کے سامنے‘ بالکل کوری‘ ایک بھی مبارک لفظ ڈھنگ سے نہ پڑھ سکنے والی‘ لیکن ایک ایک لفظ کے لیے اپنے پورے وجود کو سماعت بنا لینے والی ...... آپ میرے لیے کیوں نہیں پڑھتے جی؟“

انہیں کوئی جواب نہ سوجھا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئے اور پورے بدن کو جھلا جھلا کر پڑھنے لگتے۔ غالباً وہ تیسرا یا چوتھا جھلارا ہو گا کہ ایک سرگوشی کی سنسناہٹ پورے کمرے میں تھرا گئی:

”کوئی نہیں سن رہا“

انہوں نے اس آیت پر انگلی رکھی جسے پڑھ رہے تھے اور کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ چپکے چپکے اور ٹھہر ٹھہر کر۔ یوں جیسے انہیں یقین ہو کہ وہاں کوئی تھا مگر اَپنی ناراضی ظاہر کرنے کے لیے ان کی نظروں میں آنے سے بچ رہا تھا۔ تھک ہار کر ان کی نظریں پاک صحیفے پر سرنگوں اَپنی شہادت کی انگلی پر آ کر رک گئیں مگر زبان تالو کے ساتھ چمٹی رہی۔ انہوں نے قرآن پاک کو وہیں سرہانے پر کھلا رکھ دیا اور ٹانگیں سیدھی کر کے پلنگ سے لٹکانا چاہیں۔ ایک آدھ لمحہ اُس اینٹھن کو جھٹکنے میں لگ گیا جو ایک ہی رخ بیٹھے بیٹھے ان ٹانگوں میں ہونے لگی تھی۔ تاہم جب ٹانگوں پر بوجھ ڈال کر کھڑے ہوئے تو وہ بہت جلد توازن برقرار رکھنے کے قابل ہو چکے تھے۔

انہوں نے کھڑے کھڑے فضا میں متحرک ان مقناطیسی لہروں کو محسوس کیا جو پہلے کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی تھیں۔ یہ لہریں اُن کے جسم پر یوں رینگنے لگیں جیسے چیونٹیاں رینگتی ہیں، جس سے ان کے بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ اُن کے دِل پر بھی خُون کا دباؤ بڑھ رہا تھا جس نے انہیں بوکھلا دِیا۔ اس بوکھلاہٹ میں ان کے قدم دروازے کی سمت اٹھنے لگے۔ جب وہ دروازے کی طرف جا رہے تھے تو انہیں یوں لگا تھا؛ جیسے عین ان کے عقب میں فضلیت بھی پنجوں کے بل چلی آتی تھی۔ وہ غصے میں دھونکنی کی طرح چلنے والی اس کی سانسوں کی آنچ بھی اَپنی گردن پر محسوس کر رہے تھے:

''وہاں کوئی نہیں ہے''

اُنہوں نے پیچھے مڑ کر دِیکھا وہاں آواز نہیں، ایک سسکاری تھی۔ دِل بیٹھنے لگا تو دھیان ہٹانے کے لیے آگے بڑھ کر دروازہ چوپٹ کر دیا......

وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

لاونج کے خالی پن کو چیر کر ان کی نظریں اپنے بیٹے اور بہو کے بیڈ روم کے بند دروازے پر پڑیں۔ ایک عجب طرح کی بے پرواہی وہاں ٹھہری ہوئی تھی۔

دروازے میں کھڑے کھڑے جب اُن کے سوچنے کے لیے کچھ نہ رہا تو ماسٹر فضل جُونے

گردن موڑ موڑ کر کمرے میں دیکھنا بھی معطل کر دیا تھا۔ وہ جان چکے تھے کہ وہاں اب کسی کی خُوشبو تھی نہ قہقہے، سرگوشیاں تھیں نہ لہجے کی وہ آنچ جو کب سے ان کی محسوسات کا حصہ تھی۔ وہاں فقط برہم اور اجنبی سی مقناطیسی لہریں تھیں۔ تعطل کے اسی عرصے میں انہیں یاد آیا کہ وہ بستر کے سرہانے قرآن کھلا چھوڑ آئے تھے:

"بیٹا قرآن یوں کھلا نہیں چھوڑتے' شیطان پڑھنے لگتا ہے"

یہ بی بی صاحبہ کی آواز تھی۔ نحیف سی آواز جو انہوں نے مدت بعد سنی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ شیطان کے قرآن پڑھ لینے والی بات محض اس لیے کی جاتی تھی کہ بچیاں قرآن پڑھنے کے بعد غلاف میں لپیٹ کر اور کارنس پر رکھ کر جایا کریں۔ تاہم بعد میں انہوں نے اس کا یہ مفہوم خود سے اخذ کر لیا تھا کہ مومنین کے لیے ہدایت بنتی آیات کو شیطان مردود کھلے قرآن سے اُچک کر ان میں سے اپنے مطلب کے معنی نکال کر اِدھر اُدھر پھیلا دیتا ہوگا؛ تب ہی تو پہلی عمر میں تواتر سے سنے گئے اس جملے کے سچا ہونے کا انہیں یقین سا ہو چلا تھا۔ انجانے خوف کے زیرِ اثر وہ بھاگتے ہوئے اپنے بیڈ تک پہنچے' سرہانے سے قرآن پاک کو اُٹھا کر تہ کرتے ہوئے کئی بار بوسے دیئے۔ اسے آنکھوں سے لگا کر سینے کے ساتھ چمٹایا اور دروازے میں آ کھڑے ہوئے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب زمین اپنے آپ چل پڑی تھی۔

ملبا درد کی گرہیں کھولتا ہے

کہتے ہیں جب پیش امام صاحب' نے کچی لکیر پار کی تھی تو پیش امام نہیں تھے۔ وہ تو اُدھر پونچھ میں صاحب حیثیت آدمی تھے۔ ماں باپ نے لس جُو نام رکھا اور اِسی نام سے پکارے جاتے تھے۔ ایک بار یوں ہوا کہ وہ حضرت بل کے پاس سے گزرتے ہوئے بے ارادہ اندر داخل ہو گئے۔ دِل پر ایسا رُعب پڑا کہ کئی گھنٹے باہر نہ آ سکے۔ اِسی بے خودی کے دورانیے میں اُنہیں کچی لکیر پھاند لینے کا حکم ہوا۔ انہوں نے سب کچھ سے ہاتھ جھٹکا' اور ادھر اٹھ آئے تھے۔

کچھ کو یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ ان کا جوان بھائی مار دِیا گیا اور مارنے والے ان کے تعاقب میں تھے لہٰذا ادھر آنے کا حیلہ انہوں نے اُپنی جان اور نسل بچانے کے لیے کیا تھا۔

لس جُو نے جان بچالی تھی مگر اس کی نسل کے قدموں تلے' اب جو زمین تھی' وہ اپنے آپ چل پڑی تھی۔

جب لس جُو پونچھ سے تتری کوٹ آئے تھے تو ان کا وجود ایک عجب طرح کے شدید اِحساس سے لرزتا رہتا تھا۔ یہاں ادھر کی خبریں آتی رہتی تھیں جو احساس کے عُجب اور شدت میں اضافہ کرتی رہتیں۔ پوری طرح سمجھ میں نہ آنے والا یہ اِحساس انہیں کبھی تو ایک بار پھر کچی لکیر پار کرنے پر اکساتا اور کبھی اس سے دور پٹخ دیتا تھا۔ اس پر اسرار اِحساس سے چھٹکارا پانے کے لیے انہوں نے اپنا گھر کاندھے پر رَکھ لیا اور پہاڑوں کے اندر بھٹکنے لگے۔ کبھی گڑ منڈہ' سدھن گلی' کامی منجہ اور حسّہ تو کبھی پرس' بٹل اور چناری حتیٰ کہ وہاں سے خاکوٹ آگئے جس نے انہیں اپنے اندر بسالیا تھا۔ پہلی بار تتری میں رہائش اختیار کرنے کی مناسبت سے وہ ایک عرصہ تک لس جو تتری کہلاتے رہے۔ پھر یوں ہوا کہ مسجد سلکھنی کی پیش امامی ان کی زندگی کا وظیفہ ہوگئی جس نے ان کا اصل نام سب کے ذہنوں سے محو کر دیا تھا۔

جس روز بھونچال آیا تھا' اس روز دن ڈھلے تک سب یہ سمجھ رہے تھے کہ اسلام آباد کے پوش علاقے میں بس ایک ملٹی سٹوری ٹاور گرا تھا۔ وہی' جس کے چھٹے فلور پر ماسٹر فضل جو شیطان کی نظر کھلے ہوئے قرآن پر پڑنے کے خدشے سے اپنے بیڈ تک آئے تھے اور قرآن چھاتی سے چمٹا کر واپس دروازے کی چوکھٹ میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ عین اس وقت کہ جب بہت سارے کیمروں کو گواہ بنا کر حکومت کا سربراہ اس ٹاور کے ملبے پر چڑھ کر اعلان فرما رہا تھا کہ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' اس وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ ادھر پہاڑوں پر کتنی بڑی قیامت ڈھے چکی تھی۔ وہاں زمین نے کئی پلٹے کھائے اور پہاڑوں نے بھر بھرا ہو کر خاکوٹ کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ مسجد سلکھنی کے میناروں' پیش امام صاحب اور بی بی صاحبہ کی قبروں' جیجو کی اجڑ

چکی آوی اور اوپر سے نیچے کو ڈھیے سروں میں بہنے والے پتلے پانی' اور اس کے مکینوں کی نارسائیوں اور معصومیت سمیت سب کچھ خاک کا رزق ہو چکا تھا...... کہ اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

لگ بھگ یہ وہی وقت بنتا ہے' ملبے کے اوپر چڑھ کر تصویریں بنوانے والا' اور وہ بھی یوں جیسے کوئی شو باز شکاری پہلے سے مرے ہوئے شیر کو دیکھے اور اس کے بدن پر پاؤں رکھ کر لوگوں کے دلوں پر دھاک بٹھانے کے لیے تصویریں اتروانا شروع کر دے'...... ہاں' عین مین وہی وقت' جب اوپر سے کدال پڑنے' اور لوہا کاٹنے کی آوازیں آنے والے کے پروٹوکول میں کچھ وقت کے لیے معطل ہو گئی تھیں۔ تب سیمنٹ اور سریے کی کئی تہوں تلے ماسٹر فضل جُو کو اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔ بہت جلد زِندگی کے اِس اِحساس کو ان کی دِکھی سے' ٹانگوں' پنڈلیوں اور کمر سے بازوؤں' گردن اور گدی سے اٹھنے والے درد نے پچھاڑ دیا تھا۔ وہ بے بسی اور درد سے جس قدر بلبلا سکتے تھے بلبلائے' روئے اور پھر سسکتے چلے گئے۔ مگر جب اُنہیں اِحساس ہوا کہ اُن کی چیخوں اور رونے دھونے کو سننے والا وہاں کوئی نہیں تھا تو وہ یوں چپ ہو گئے جیسے ازل سے بولنا جانتے ہی نہ تھے۔ تب انہیں اپنا بیٹا اور بہو ایک ساتھ یاد آئے۔ اپنے بہشتی ماں باپ کی طرح انہیں بھی انہوں نے آپس میں کم ہی صلاح کرتے یا کھل کھلا کر ہنستے دیکھا تھا۔ تاہم اس ایک وتیرے کی تاثیر دونوں کے ہاں بالکل مختلف اور متضاد ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں' جو اندر تھے ان کی آنکھوں کے سامنے والے دروازے کے پیچھے' یقیناً وہ ایک بیڈ پر ہوں گے مگر وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ مصروفیت کی تھکن نے انہیں دونوں کناروں پر ہی گرا دیا ہوگا؛ یوں کہ وہ پہلو بدل کر قریب بھی نہ ہو پائے ہوں گے۔ اس فاصلے کو انہوں نے ان کے بیڈ روم کے دروازے پر کھڑا ہو دیکھ لیا تھا۔ یہ جو آنے والا وقت اُن کی محسوسات پر دستک دینے لگتا تھا اس سے بچنے کے لیے انہوں نے اندازے لگانا بند کر دیے تھے۔

ابتدا میں جو اندازے لگائے جا رہے تھے وہ سارے ہی غلط ہو چکے تھے۔ تتری کوٹ سے خاکوٹ تک پہاڑوں پر بستیاں لاشوں سے بھری پڑی تھیں اور انہیں بے گور و کفن پڑے اتنا

وقت گزر چکا تھا کہ وہ تعفن چھوڑنے لگی تھیں۔ انہیں یا تو دفنانے والا کوئی نہ بچا تھا اور اگر کوئی بچ گیا تھا تو اپنوں کی اتنی لاشیں زمین میں دبا چکا تھا کہ اس کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ ادھر شہر کے وسط میں ڈھے جانے والے ٹاور سے بھی لاشیں نکالی جا رہی تھیں۔ ملبے میں سے گاہے گاہے زندہ لوگ بھی نکل آتے تھے۔ اور جب ایسا ہوتا تو متحرک اور ساکت تصویریں بنانے والے کیمروں کو اٹھائے میڈیا کے منتظر لوگ بھاگ بھاگ کر اس کی تصویریں اتارنے اور رپورٹیں نشر کرنے میں سبقت لے جانے میں مگن ہو جاتے۔ ایسے میں یوں لگتا تھا جیسے موت کے سناٹے سے زِندگی کی ہماہمی نے یک لخت جنم لے لیا ہو۔ تاہم ابھی تک نہ تو ماسٹر فضل جُو کو دریافت کیا جا سکا تھا اور نہ ہی ملبے کے ڈھیر میں دبی ہوئی ایک بیڈ کے دونوں کناروں پر پڑی ان کے بیٹے اور بہو کی لاشوں کو نکالا جا سکا تھا۔

ماسٹر فضل جُو اِس سارے عرصے میں دَرد سہے چلے جانے کے لائق ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں انہیں یہ اِحساس بھی ہوا تھا کہ قرآن پاک اُن کی چھاتی سے لگا ہوا تھا۔ تاریکی کی بے شمار تہوں کے باوجود انہوں نے چاہا کہ اُسے کھول کر پڑھیں۔ اَپنے بازوؤں پر زور لگا کر ایسا کرنا بھی چاہا مگر بازو جہاں تھے، وہیں جمے رہے۔ ملبے نے چاروں طرف سے اُن کے بازوؤں کو جسم سمیت دَبا رکھا تھا، یوں کہ وہ ذرا سی حرکت بھی نہ کر سکتے تھے۔ تب اُنہیں ایک بار پھر ایک نحیف سی آواز سنائی دے گئی تھی؛ وہی شیطان سے چوکنا کرنے والی ماں کی آواز۔ انہوں نے بازوؤں کو کھولنے کے جتن ترک کر دِیے تھے۔

جب ٹھہرے ہوئے وقت اور تاریکی کو کاٹ ڈالنے کا کوئی بھی حیلہ ان کے ہاتھ نہ لگا تو انہوں نے اَپنی یادداشت پر زور ڈال کر کچھ آیات تلاوت کرنا چاہیں مگر ہوا یہ کہ وہ سورۃ زلزال کی اِبتدائی آیات کے بعد سورۃ والعصر کی اِنسان کو خسارے میں بتانے والی آیات پڑھ گئے تھے۔ انہوں نے پھر سے درست درست پڑھنا چاہا تو ایسا متشابہ لگا کہ کہیں سے کہیں نکل گئے۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ اس پر وہ اتنا بوکھلائے کہ اُمید کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایسے میں

انہیں احساس ہوا کہ وہاں تو سانس لینے کے لیے ہوا ہی نہیں تھی۔

اور جب ماسٹر فضل جُو نے اَپنے تئیں ملبے کے اَندر پھنسی ہوئی ہوا کو کھینچنے کے لیے آخری حیلہ کیا تو اُن کی پسلیاں چٹخنے لگیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب سیمنٹ اور سریے کی تہیں کاٹ کر فضیلت وہاں پہنچ گئی تھی؛ سارے غصے کو تھوک کر' اور اُن ساری آوازوں کو ساتھ لے کر' جو ملبے میں دبنے والوں کے دُکھ سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ یہ آوازیں گنتی میں نہ آنے والے لوگوں کے سینوں سے اُبل اُبل کر ویسی ہی گنگناہٹ پیدا کر رہی تھیں جیسی ماسٹر فضل جُو کی سماعت میں خاکوٹ کے پتلا پانی نے بسا رکھی تھی۔ تب ماسٹر صاحب کو یوں لگا تھا کہ جیسے ان کے بازو تو ویسے ہی جکڑے ہوے تھے مگر اُن کے حصار میں موجود' ایک مُدت سے خوابیدہ سارے مبارک اور روشن لفظ' خود بخود ان کی چھاتی کے اندر مقطر ہو رہے تھے۔ فضیلت نے آتے ہی اَپنے ہاتھوں کے ملائم لمس سے اُن کے وجود کی ساری گرہوں کو کھولنا اور سارے دَردوں کو سمیٹنا شروع کر دِیا تھا۔

وہ اَپنی ہی دُھن میں مگن رہی' حتیٰ کہ اس کی ریاضت مستجاب ہوئی اور اسے اپنے سنگ آنے والی ساری آوازوں کے ساتھ ان کے وجود کے اَندر حلول کر جانے کا اِذن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی زِندگی کی لذّت میں گندھا ہوا تازہ ہوا کا لطیف جھونکا ملبے میں گھس کر ان کے ڈھے جانے والے وجود کے اندر بہت گہرائی میں اتر گیا...... اب صرف وہی سانس نہ لیتے تھے' پورا ملبا سانس لیتا تھا۔

تکلے کا گھاؤ

کاغذ پر جھکا قلم کمال محبت سے گزر چکے لمحوں کی خُوشبو کا متن تشکیل دینے لگتا ہے:

''ابھی سمہ بھر پہلے تک دونوں وہ ساری باتیں کر رہے تھے' جو دنبل بن کر اندر ہی اندر بسیند ھتی' پھولتی اور گلتی رہیں یا پھر اُلکن ہو کر تتے کورنوالے کی طرح حلق میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ تتا کورنوالہ' نہ نگلنے جوگا نہ اُگلنے والا۔ جب باتوں کی طویل لانگا ٹیرالانگ پھلانگ چکی' تو اُنہیں اندازہ ہی نہ ہو پایا تھا کہ کتنی دیر وہ بھوسہ ملی چکنی مٹّی کے گارے سے لپے ہویے ویہڑے میں پاس پاس دَھری ڈِھیلی اَدوائنوں والی جھابڑ جھلّی کھاٹوں میں اِدھر اُدھر بیٹھے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھامے رہے اور خورے کب کیسے اُن کے ہاتھ ایک دوسرے کے بیچ سے آپو آپی پھسل گئے اور کیسے ان دونوں کو جھلنگا کھاٹوں کے جُھول نے سمیٹ لیا۔''

کہانی تخلیقی ترنگ میں رواں رہتی ہے:

''ہر کہیں بھاڑ پڑا بھُن رہا تھا کہ سارے میں ٹیکل دُھوپ جانے کس پر اُدھار کھائے بولائے پھرتی تھی۔ ایسے میں گھنّی دَھرِیک کی گوڑھی چھاؤں میں بھی بلا کا سِیک اور اِنتہا کی تپش تھی۔ ستیاناسی دھوپ کے خوف سے سارے پنّچھی کسی غین غرچّے جھوت جھوڑپ میں ہونک ہو رہے ہوں گے کہ کہیں نظر نہ آتے تھے۔ بس وہ دو نموہے جنے تھے کہ دھریک تلے اس لُو کی لَپٹ میں بھی بے خبرے پڑے تھے۔ تاہم پیڑ کی پھننگ سے چھچھلتی اِکا دُکا جُھک کا جھک کرنوں سے بچنے کو وہ

اُتھا چٹ ہو رہے تھے؛ یوں جیسے ایک دوسرے اور آلے دوالے سے بالکل بے خبرے ہوں۔ اسی بے خبری میں وہ اَپنی اَپنی حیاتی کی جھلنگ میں جھانکنے لگے تھے اور جوں جوں وہ اس میں جھانکے جاتے تھے توں توں اُلجھتے ہی جاتے تھے کہ موئی حیاتی کا اُلجھیڑا بھی تو مکڑی کے جالے کی طرح ہوتا ہے؛ پہلے ایک تابناک لکیر اور پھر اُلجھنیں اور اُلجھنوں ہی کی جھنجھوٹی۔''

یہاں پہنچ کر مجھے اَپنا قلم روک دینا پڑا ہے کہ میرا بیٹا عاصم تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ یوں عجلت سے اَندر آیا ہے کہ اس کی سانس اور دروازہ ایک سی آواز دینے لگے ہیں۔ جب کبھی میں بے دھیانی میں لگ بھگ اتنی ہی تیزی سے داخل ہونے کو مجبور ہو جاتا ہوں تو میری سانسوں کی بے ہنگم سیٹی اور دروازے کی چرچراہٹ کی بابت وہ انگریزی کی ایک اصطلاح Squeak استعمال کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ لفظ چوہے یا سور کی طرح تیز کٹیلی آواز نکالنے کے لیے مستعمل ہے۔ میں نے اِس لفظ کے اِستعمال پر ایک بار احتجاج بھی کیا تھا مگر وہ اِس کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ میری اس حرکت سے پیدا ہونیوالی آواز کی وجہ سے اُس کی Concentration بری طرح Shatter ہو جاتی ہے۔ تاہم چوں کہ وہ میرا بیٹا ہے لہذا میں اُس کے لیے ایسا کوئی بھی لفظ اِستعمال نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی کہانی کی گرفت اِتنی مضبوط ہے کہ میں پھر پلٹ کر قلم تھام لیتا ہوں۔ جوں ہی میرا قلم اور دِھیان کاغذ پر جھک جاتے ہیں عقب سے آتی بڑبڑاہٹ کھٹاک کی آواز میں معدوم ہو جاتی ہے اور کہانی سناٹے سے نچڑ کر قلم کی نوک پر آ جاتی ہے:

''پہلے پہل اُنہیں اَپنی اَپنی ہستی اور اُجڑی حیاتی کے تجربوں کی باتیں پلّو نہ پکڑاتی تھیں۔ پھر سارے رَاز و نیاز سہج سہج یوں پاس آنے لگے جیسے اُن کے پیروں پر مہندی لگی ہو اور گیلی ہو۔ حتّٰی کہ وہ دونوں اُس اُلاس کی گرفت میں آ گئے کہ دبی ہوئی راکھ کی چنگاریاں بھی دھونکے جاتے

تھے۔ یہ نسیان کے چھپڑ میں وِیلے کی کائی جمے پانی تلے پڑی باتیں بھی عجیب دھین دھوکڑ ہوتی ہیں' موٹے تازے ست ایانے اور بے فکرے وجود کی طرح۔ نہ چھیڑو تو مکر مار کر بے سُدھ لاش بنی پڑی رہیں اور جو بھولے سے کسی کانے کھچچ سے ٹھنک دو تو اُلل بچھڑے کی طرح دِھیان کے سارے آنگن میں کُدکُداڑے مارتی بھلی لگتی ہیں۔ مگر جب یہی مچل جاتی ہیں تو اَپنے اُگتا پیچی کے کھرّوں تلے لتاڑ کر رکھ دیتی ہیں۔"

ایک بار پھر قلم تھم جاتا ہے کہ اِس بار عاصم باقاعدہ قدموں سے اِحتجاجی آواز نکالتا کمرے کے دروازے پر پہنچ کر پوری قوت سے دروازہ کھولتا ہے؛ یوں کہ اَندر کا سارا سناٹا گھبرا کر باہر نکل جاتا ہے۔ میں پہلے کی طرح اُسے دیکھتا ہوں۔ اب کی بار غُصّے سے اس کے دانت بھنچ گئے ہیں۔

جب کبھی غصے سے میرے دانت آپس میں یوں بھنچ جاتے ہیں تو وہ اس کے لیے ''Locknut'' کی اِصطلاح اِستعمال کرتا ہے۔ میں جانتا ہوں Locknut ایسی ڈِھبری کو کہتے ہیں جو خود ڈھیلی نہیں ہوسکتی کہ اُس کے اوپر ایک اور ڈِھبری ہوتی ہے جو اُسے قابو کیے رَکھتی ہے۔ عاصم کو خبر ہے کہ جب میں اس کیفیت میں ہوتا ہوں تو خود سے نارمل نہیں ہو پاتا۔ لہذا اُسے اپنے تایا کا ذکر چھیڑنا پڑتا ہے کہ میں اَپنے بڑے بھائی کی باتوں کی میٹھی لذّت کے پانیوں سے نہا کر تازہ دم ہو جاتا ہوں۔ مگر ایک مدت سے اس نے اپنے تایا کا نام نہیں لیا۔ اس کی ایک وجہ تو وہ یہ بتاتا ہے کہ وہ Mature ہو گیا اور ایسی Stupidity کے لیے اُس کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اب اُس کی ممی باقاعدہ ایسے تذکروں سے چڑنے لگی ہے۔ جب دِھیان کی ڈِھبری کسی رہی تو یہ کسا وُرفتہ رفتہ کہانی کی صورت میرے اَندر گونجنے لگا اور اَب یہ حالت ہے کہ میں مدت بعد قلم تھام کر بیٹھ گیا ہوں اور ایک پرانی کہانی اَپنی بھرپور بوسیدگی اور تُندی کے ساتھ کاغذ پر اُبلنا شروع ہو گئی ہے۔

میں عاصم کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہانی کی آواز پر دِھیان دینے کو مجبور ہو جاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے اُس نے طیش میں آ کر اپنا بدن صوفے پر گرا دیا ہے۔ تاہم اُس کی موجودگی کا اِحساس دِھیرے دِھیرے معدوم ہوتا گیا اور کہانی کے قدیم قدم پھر آگے بڑھنے لگے۔

''چُڑ سے ہوئے وجود والے بڑے نے اَپنے محبت بھرے ہاتھوں کی اَندھی پوروں پر تجسس کی آنکھیں اُگا کر بات شروع کی تو چھوٹے کو اَپنا وجود دِیے کی بتّی جیسا لگا۔ بہ ظاہر روشنی دیتا مگر جلتا ہوا' راکھ ہوتا ہوا۔ اور جب بڑے نے گلہ کیا تھا کہ وہ اَپنی رَچنی مہندی والی حیاتی میں اِتنا کیوں رُجھ گیا تھا کہ اُسے اَپنے نمانے بڑے بھائی کا دِھیان تک نہ آیا تو اُسے بڑا بھائی اَپنی دھواں دیتی رَجلی کھُلی زِندگی کی گاڑی سے رَہ جانے' حسرت سے دیکھنے اور دھواں پھانکنے والی اُس بے چاری سواری کی طرح لگا' جو کھانسے جاتی ہو اور کوسے جاتی ہو۔ لمبی مسافت میں پیچھے رہ جانے والے اَپنی ہی چھاتی پر سانسوں کے ہتھوڑے مارنے اور اَپنا ہی جی جلانے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔ وقت اَپنی ہلگت کے موافق مونچھوں سے چنگاریاں نکالتا' گولر کا پیٹ پھڑوانے کو ہڑکائے پھرتا تھا۔ مگر دھریک کے عین تلے بیٹھے دونوں بھائیوں کی پنیائی دِیکھتے ہوئے مسٹ مار کر بیٹھنے کو مجبور ہو گیا۔ تاہم کب تک...... اَب کے یوں ہڑک اُٹھی کہ نئے بانکے کی طرح تاڑ کی تلوار اُٹھائے اوچھے وار پر تُل گیا۔''

کہانی ٹھٹک کر رُک جاتی ہے کہ میرا بیٹا' نہ جانے کب' صوفے سے اُٹھ کر عین میرے پیچھے کھڑا ہو گیا ہے...... اور...... اب وہیں سے کہانی پر جھکا ہوا ہے۔ وہ چند سطریں پڑھنے کے بعد منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہے۔ اس بڑبڑاہٹ میں سے جو لفظ مجھ تک پہنچا ہے وہ غالباً Mawkish یا Rubbish تھا۔ میں جانتا ہوں Mawkish کا مطلب متلی آور بودار اور کریہہ ہوتا ہے جبکہ Rubbish بکواس بھی ہے اور کاٹھ کباڑ بھی۔ جس طرح کی زِندگی مجھ پر

مسلط کردی گئی ہے اُس کے لیے یہ دونوں الفاظ بھی اِستعمال ہوتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن میری کہانی کے لیے اِن میں سے کوئی بھی لفظ اِنتہائی نامناسب تھا۔ میرا بیٹا میری طرف دیکھے بغیر سیدھا ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پہلو سے ٹیبل کے قریب آ کر اس پر پڑی CD's کو جان بوجھ کر پٹخنے لگتا ہے۔ حتّٰی کہ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ وہ مزید پندرہ منٹ تک سکون سے بیٹھ جائے۔

اُسے میری بات سن کر تعجب ہوتا ہے اور اُلجھن بھی۔ یہ اس کا اپنا کمرا ہے۔جس میز پر میں بیٹھتا ہوں اس پر اس کا کمپیوٹر پڑا ہے۔وہ اس پر اِنٹرنیٹ کے ذریعے وہ نئی نئی سائیٹس دیکھتا ہے اور ان میں کھویا رہتا ہے۔ یہ بجا کہ کبھی یہ میرا کمرا ہوا کرتا تھا۔ میں یہیں کتابوں میں گم رہتا تھا' کہانیاں پڑھتا اور کہانیاں لکھتا تھا۔ معنیاتی سلسلے اور جمالیات کا عجب جہان تھا کہ جس مِیں' مَیں کھویا رہتا تھا۔ میں تخلیقی وفور کے اِس تجربے میں نہال تھا......مگر فوزیہ کا خیال تھا یہی کہانیاں میری رَاہ کی سب سے بڑی رُکاوٹ تھیں لہذا اُس نے مجھے مجبور کر دِیا تھا کہ میں اپنے مطالعے کے کمرے سے ساری کتابیں سمیٹ لوں اور ٹرنکوں میں بند کر دوں یا پھر پرانی کتابوں کی دُکان پر بیچ آؤں۔

بہ ہر حال اب یہ کمرا عاصم کا ہے اور میں اُسے ہی کہہ رَہا ہوں کہ وہ مزید پندرہ منٹ سکون سے بیٹھ جائے۔ وہ اس بیڈ پر کہ جس پر اس کے کاسٹیوم' سوکس' فیشن میگزینز اور کمپیوٹر ٹیکس کے علاوہ ڈِش کے مختلف چینلز سے مسلسل نشر ہونیوالے یا پھر کوڈ لگے پروگرامز کے بروشرز پڑے ہیں' ڈھیر ہو جاتا ہے؛ یوں کہ اُس کے پاؤں نیچے اِدھر اُدھر لڑھک رہے ہوتے ہیں۔ پالش اُڑے موٹے تلووں اور اُٹھی گردن والے فیشن زدہ بوٹوں سے' کہ جنہیں وہ Rock Shoes کہتا ہے' فرش پر پڑی آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کو یوں ہی اِدھر اُدھر دھکیلنے لگتا ہے۔ مجھے اَپنی طرف متوجہ نہ پا کر اور اُکتا کر وہ ہاتھ بڑھاتا ہے' بیڈ ہی کے ایک کونے میں پڑی ٹائم پیس کو اُٹھا کر اَپنی چھاتی پر رکھ لیتا ہے اور اُسے مسلسل گھورنے لگتا ہے۔

کمرے کے سارے سناٹے میں وقت گزرنے کا اِحساس دَھڑکنے لگتا ہے۔
میں اور میری کہانی دونوں اُس کی پرواہ نہیں کرتے۔
وہ میری طرف دیکھتی ہے اور میں کہانی کی طرف اپنے پورے وجود کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہوں:

''لمحہ لمحہ کر کے آنے والا وقت اَرنڈ کی جڑ ہوتا ہے' بالکل بے بھروسہ۔ لیکن وہ بھڑ وقت آ گیا تھا اور یوں پینترا بدلا تھا کہ چھوٹے پر اگلا وار ہفتے گانٹھنے جیسا تھا۔ پہلے پہل اُسے ہچک سی لگ گئی مگر نگوڑا وِیلا کاہے کو ٹکلا ہو بیٹھتا۔ نیم نہ چھوڑے تنائی۔ گات اُبھارے آگے بڑھا اور اَپنے کھیسے سے وُہی تکلا نکالا جو اس کی بیوی اس کے سینے پر لال ٹماٹر ہوتے موتی بھروں میں چبھونے کو نکالا کرتی تھی۔ اس تکلے کا وار گہرا تھا بہت ہی گہرا۔''

یہاں پہنچ کر میں گہرا سانس لیتا ہوں اور فتح مندی کے اِحساس کے ساتھ اَپنے بیٹے کے کھولتے ہوئے وجود کو دیکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ تو وہی کھولاؤ ہے جو ایک مُدت سے میرے اَندر اُٹھتا رہا...... اور اب کہانی کے راستے زائل ہو رہا ہے......

اِدھر میرے اندر سے یہ کھولاؤ یوں پھوٹ بہا ہے جیسے فصد کا منہ کھل گیا ہو اور اُدھر طرفہ دیکھیے کہ اسی کے باعث میرے بیٹے کے وجود میں فساد مچا ہو ہے۔

بہت پہلے جب میں تواتر سے کہانیاں لکھا کرتا تھا اور میری بیوی کو شکایت تھی کہ کہانیوں کے بوجھ نے میری رفتار مدھم کر دی تھی' اتنی مدھم کہ میں اس کی تیزی سے آگے بڑھتی خواہشات کا ساتھ دینے سے قاصر ہو گیا تھا۔

اُس کا خیال تھا کہ کہانیوں کے اِس بوجھ کا اصل سبب وہ اِحسانات ہیں جو میں اُٹھائے پھرتا ہوں۔ اور اس نے تجویز کیا تھا کہ مجھے اَپنے سارے پرانے اِحسانات کا بوجھ اُتار پھینکنا چاہیے۔

خصوصاً بڑے بھائی کے' کہ جس نے میرے طالب علمی کے زمانے میں آدھی زمین اور میری شادی پر باقی بچ رہنے والی آدھی ملکیت بھی رہن رَکھ دِی تھی ......اور اب اپنا بیٹا میرے پاس رہنے اور اپنا مستقبل بنانے کو بھیجنا چاہتا تھا۔

میری بیوی کا خیال تھا مجھے فوراً ایک معقول رقم بھائی جان کو بھیج کر معذرت کر لینی چاہیے۔

یوں تو وہ وقتاً فوقتاً میرے گاؤں کے سب ہی عزیزوں سے معذرت کر چکی تھی تاہم اس معقوم رقم کے بندوبست ہونے اور معذرت کر دیئے جانے کے بعد زِندگی میں میرے آگے بڑھنے کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی ......

اِتنی تیز کہ ساری کہانیاں بھی کہیں پیچھے رہ گئی تھیں۔

مگر ریٹائرمنٹ کے بعد وہ فاصلہ جو میرے اور میری بیوی کے بیچ تھا اور وہ فاصلہ جو میرے اور میرے بیٹے کے درمیان دِیوار کی صورت نہ جانے کب تن کر کھڑا ہو گیا تھا' میرے لیے نا قابل برداشت ہوتا چلا گیا......

حتّٰی کہ میں زبردستی اَپنے بیٹے کے کمرے میں آ گھسا اور اَپنا/اُس کا ٹیبل خالی پا کر کاغذ قلم تھام لیا۔

ایسے میں کہانی پوری شدت کے ساتھ میرے تڑختے ہوئے وجود سے بہہ نکلی۔

اور اب میرے پاس اُن پندرہ منٹوں میں سے صرف پانچ منٹ باقی ہیں جو میں نے کہانی کی تکمیل کے لیے اَپنے بیٹے سے لیے تھے۔

مجھے فوراً کہانی مکمل کرنی ہے کہ لمحے تیزی سے کچرا بن کر ڈسٹ بِن میں گرتے جا رہے ہیں۔

میں سنبھل کر بیٹھ جاتا ہوں اور اب تک لکھا جا چکا آخری جملہ پڑھتا ہوں۔

''اس کے تکلے کا وار گہرا تھا' بہت ہی گہرا''

اور پھر ذہن پر زور دے کر اگلا جملہ لکھنا چاہتا ہوں کہ دِھیان بیڈ کی طرف بھٹک جاتا ہے۔

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ وہاں عاصم نہیں ہے۔

ساتھ ہی ساتھ کمرے کے باہر چار قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

میں اس چاپ کو پہچانتا ہوں کہ اسی تلے تو میرا دل گِلا جاتا رہا ہے۔

میں عجلت میں قلم اُٹھاتا ہوں اور لکھتا ہوں:

''چوڑی چکلی چھاتی پر تکلے کا گھاؤ......''

جملہ نامکمل رہ جاتا ہے کہ ماں اور بیٹا دونوں تکلے کی سی تیزی کے ساتھ زِندگی کے کمرے کے اندر گھس آتے ہیں......یوں کہ کہانی بھی نامکمل رہ جاتی ہے۔

آدمی کا بکھراؤ

سی سی یو میں کامران سرور کو کئی گھنٹے قبل لایا گیا تھا مگر اُبھی تک اُس کے دِل کی اُکھڑی ہوئی دھڑکنیں واپس اَپنے معمول پر بیٹھ نہ پائی تھیں۔ وہ اَپنے حواس میں نہیں تھا تاہم ڈاکٹر قدرے مطمئن ہو کر یا پھر اُکتا کر دوسرے مریضوں کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے ایک طرف ہو جانے کے بعد عالیہ نے اُس کے نتھنوں پر ایک جنبش کو سرسراتے پایا۔ صدمے کی وہ دبیز تہ جو اس کے اَندر دھول کی طرح جم چکی تھی' اسے جھاڑنے کی خواہش نے اُس کے دِل میں انگڑائی لی تو وہ فوری صدمے کے اثر سے نکل آئی۔ ایک ہی لمحے میں وہ اِس قابل ہو گئی تھی کہ ذہنی تناؤ کو جھٹک کر پہلے تو پھیپھڑوں میں محبوس ساری ہوا کو ایک ہی ہلے میں کھینچ کر باہر پھینک دے اور پھر لمبا سانس لے کر نئی ہوا کو اس کی جگہ لینے بھیج دے۔ سانس کے اس اَدل بدل سے اعصابی تناؤ ٹوٹ گیا اور تعطل میں پڑا کسل اس پر چڑھ دوڑا تو اُس کے اندر جھپکی لے لینے کی خواہش جاگ اُٹھی۔ وقفے وقفے سے اُس کی آنکھیں مندنے لگیں اور وہ بینچ پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف کو لڑھکنے لگی۔ اسی کیفیت میں عین اس وقت کہ جب اس کا گرنا یقینی ہو رہا ہوتا وہ جھٹکا کھا کر سنبھلتی اور جم کر بیٹھ جاتی تھی۔ جب وہ کئی بار جھٹکے کھا چکی تو اُس نے اس کے بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر اپنے بازوؤں کو فضا میں اُچھالا' ٹانگوں کو تان کر سیدھا کیا' کمان کی طرح جھول کھا چکی کمر کے بل نکالے اور ایک بار پھر ایک لمبی مگر بے روک سانس کو بھر لینے کی پوری گنجائش پیدا کرنے کے لیے اس نے کونوں کھدروں میں اُلجھی ہوئی سانسوں کو بھی کھینچ کھانچ کر باہر نکال پھینکا۔

عین اس لمحہ کہ جب دوسری بار اُس کے پھیپھڑے سانسوں کی تازگی سے آباد ہو رہے تھے' ایک لطیف گداز اس کے سینے سے پورے منظر نامے میں بھر گیا...... یوں' کہ مرتے ہوئے

مریضوں نے بھی اس لمحے میں مرنا معطل کر دیا تھا۔ عالیہ ابھی لمبی سانس کی تانت کا لطف پوری طرح نہ لے پائی تھی کہ اسے اپنے بدن کو چھیدتی بہت ساری نگاہوں کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ اُس کے جسم کا گداز کس قدر حشر اُٹھا سکتا تھا' اس کا وہ اندازہ لگا سکتی تھی لہٰذا جھینپ کر اُس نے ایک جھٹکے سے بازؤوں کو نیچے گرا دیا۔ کھسیانی ہو کر چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا' چھاتیوں پر چڑھ آئی قمیض کی تہ کو کھینچ کر سیدھا کیا' ان پر آنچل کو جمانے کی کوشش میں انھیں مزید نمایاں کر دیا اور پوری کوشش کر کے اپنے آپ کو اِدھر اُدھر کے دھیان سے الگ کیا۔ اِحساس اور توجہ کی حاضری کے ساتھ کامران کو دِیکھنے کے قابل ہوئی تو اندر کی جھینپ سے چھٹکارا پا چکی تھی لہٰذا کامران کے پاؤں کی جانب بیڈ پر ہی بیٹھ گئی۔

اگرچہ ابھی تک کامران اِسی طرح بے سدھ پڑا ہوا تھا تاہم زِندگی کے ننھے منے آثار اس کے نتھنوں سے اُس کے پپوٹوں پر منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ خود کامران کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کتنی دیر گہری تاریکی میں ڈوبا رہا تھا۔ تاہم اب اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک نامعلوم سی سرسراہٹ' دبیز تاریکی کے ٹھہرے ہوئے پانیوں کو چھو کر گزر رہی تھی' یوں کہ اس گاڑھے اندھیرے میں جا بہ جا لہریں اُٹھنے لگی تھیں۔ یہ لہریں' بیر بہوٹی کی طرح مکر مار کر بے سدھ پڑے اس کے دل میں ایک اٹھان سی بھر رہی تھیں۔ چھاتی کی گہری کھائی میں لڑھکا ہوا اس کا دِل اب واپس اپنے ٹھکانے پر آنے کے جتن کر رہا تھا۔ لگ بھگ یہی وہ دورانیہ بنتا ہے جب کامران کے پورے وجود پر زِندگی سے اس کی محبت ایک تھرتھری کی صورت تیر گئی۔ اس حیات اَفزا تھرتھری کو اُس کے قدموں کی سمت بیٹھی عالیہ کے نازک دِل نے بھی بھانپ لیا تھا۔ اس نے بدلے ہوئے اس شخص سے اُنس محسوس کیا اور اِطمینان کی ایک نظر اُس کے بدن پر ڈالی' ٹانگوں کو سکیڑ کر اوپر کیا اور وہیں قدموں میں گچھ مچھی ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

اُس کے دماغ میں یوں گونج دار شور پیدا ہو رہا تھا جیسے کوئی بڑا اِنجن گڑگڑا کر چل رہا ہو۔

اس گڑگڑاہٹ اور شور کو اس نے ایک بہت بڑے خالی کنٹینر سے جوڑ لیا جسے وہ خود کھلی طویل اور خالی سڑک کے بیچوں بیچ مسلسل دوڑا رہا تھا۔ اس نے اپنے پہلو میں دیکھا سیٹ خالی تھی۔ پلٹ کر اُپنی سیٹ کے پیچھے جھانکا وہاں ایک دیوار اُگ آئی تھی۔ اسی دیوار کے چورس روزن سے کنٹینر پر لدا اُچھلتا کودتا خالی پن اُس کے چہرے پر تیز بوچھاڑ کی طرح پڑنے لگا۔ اس نے پیچھے دیکھنا موقوف کر دیا۔ جوں ہی اُس کی بل کھاتی گردن سیدھی ہوئی اور وہ سامنے دیکھنے کے لائق ہوا تو اس کے حواس جاتے رہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کے اِس قلیل دورانیے میں سڑک نعرے لگاتے اور چیختے چلاتے لوگوں سے بھر چکی تھی اور اس نے نہ جانے کتنوں کو روند ڈالا تھا۔ سڑک کا کھلا پن سمٹ گیا تھا۔ کامران نے بوکھلا کر اپنا پورا زور بریک پر ڈال دیا۔ پاؤں بریک پیڈل پر جھول کر رہ گیا تھا کہ بریک کام ہی نہیں کر رہے تھے۔ لوگ مسلسل کنٹینر کے نیچے یوں گھسے چلے آتے تھے جیسے انھیں پیچھے سے دھکیلا جا رہا تھا۔ اُس نے بے بسی سے ایک بار پھر چورس شگاف میں دیکھا؛ وہاں سڑک کے درمیان دور تک کچلی ہوئی لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ اُس سے یہ منظر دیکھا نہ گیا گردن سیدھی کر لی۔ سامنے کی سڑک ایک دم خالی ہو گئی تھی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا' لوگ نہ نعرے۔ اگر وہاں کچھ تھا تو ایک خالی پن تھا جو اس کے بدن کے عین وسط میں گونج رہا تھا۔ کامران کو اپنا دِل ایک بار پھر ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا دینے کی کوشش کی تو اس کا وجود جھٹکے کھانے لگا۔ عالیہ نے تو جیسے اس کی بگڑتی حالت کو خواب میں دیکھ لیا تھا' ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھی' ایک نظر کامران پر ڈالی جس کی سانسیں اُکھڑی ہوئی تھیں اور بدحواس ہو کر ڈاکٹر کو بلانے جانا ہی چاہتی تھی کہ وہ مانیٹر پر اُچھلتی لکیر دیکھ کر خود ہی چلا آیا۔ بہت دیر تک کامران ڈاکٹر اور نرسوں کے گھیرے میں رہا۔ عالیہ کا دِل بھی ڈوبنے لگا تھا۔ ڈاکٹر کی نگاہ عالیہ کے زرد ہوتے چہرے پر پڑی تو اُس نے اسے باہر بھجوانے کی ہدایت کی۔

کامران کی حالت کو اِس بار سنبھلنے میں بھی کچھ زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے جاتے جاتے خود ہی سی یو سے باہر کاریڈور میں جھانکا اور عالیہ کو حوصلہ دیا کہ سب کچھ ٹھیک تھا اور یہ بھی کہ

وہ چاہے تو اندر آسکتی تھی۔ وہ اندر آئی تو کامران کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی نہیں تھیں تاہم اس نے دھند میں بھی عالیہ کی موجودگی کا اندازہ لگالیا تھا۔ اُپنی جواں سال بیوی کی طرف دھیان کا یوں جانا اسے اچھا لگا تھا۔

عالیہ کی طرف دِھیان جاتے ہی وہ اُپنی سوچ کو ایک ربط میں لانے پر قادر بھی ہو گیا۔ وہ صاف صاف محسوس کر رہا تھا کہ یہ گھر کا بستر نہ تھا' وہ ہسپتال میں پڑا تھا۔ کندھوں کا عقبی علاقہ' ریڑھ کی ہڈی کا نچلا حصہ' چوتڑوں کی گولائیاں اور پنڈلیاں وہیں پڑے پڑے سن ہو گئی تھیں۔ وقفے وقفے سے ایک نئے اور الگ سے میٹھے سے درد کی لہر اُٹھتی جو بدن کے ایک سرے سے دوسرے سرے میں دوڑ جاتی۔ اُس نے پہلو بدلنا چاہا مگر جسم نے اس کا کہنا ماننے سے اِنکار کر دیا۔

بدن نے انکار نہیں کیا تھا' وہ تو کوئی حکم ماننے کی سکت ہی نہیں رکھتا تھا۔ ایسے میں عالیہ کے دِھیان نے گرفت سے نکل جانا چاہا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ ایک بار پھر اپنے وجود کو یوں دِیکھ رہا تھا جیسا کہ وہ محض ایک لاش تھا۔

بہت ساری لاشوں کے نیچے دبی ہوئی ایک لاش۔

اس کی سوچ بہک رہی تھی لہٰذا اُس نے دِھیان کے بکھراؤ کو سمیٹنے کے لیے اپنے دِن بھر کی مصروفیات کو ایک ترتیب میں لانا چاہا۔ صبح وہ اپنے معمول کے مطابق جاگا تھا۔ ٹیکسلا یونی ورسٹی میں ایک تقریب تھی' وہ وہاں گیا تھا۔ وہاں بھی سب کچھ معمول کے مطابق جا رہا تھا کہ ساتھ بیٹھے شخص کو اُپنے سیل فون پر ایک ایس ایم ایس موصول ہوا۔ اس نے اِن باکس میں جا کر اس میسج کو پڑھا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ کامران کو تشویش ہوئی عادتاً اس سے خیریت دریافت کی تو اس نے میسج سامنے کر دیا۔ جبراً اُپنی ذمہ داریوں سے الگ ہونے والے عدالتی نظام کے چیف کے کراچی پہنچنے پر گولی چلنے سے کئی لوگ مارے گئے تھے۔ یہ پیغام پڑھنے کے بعد وہ وہاں نہیں ٹھہر سکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فوراً گھر پہنچ جائے مگر واپسی پر حکومتی ریلی

میں پھنس گیا۔ وہ آگے نکلنا چاہتا تھا مگر ریلی کے آگے آگے چلنے والی پولیس کی گاڑیاں کچھ یوں ساری سڑک کو روک کر دِھیرے دِھیرے بڑھ رہی تھیں جیسے ساری ریلی کو انہی کی قیادت میں چلنا تھا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد وہ اگلی گاڑیوں کو غچہ دینے میں کام یاب ہو گیا اور گھر پہنچا تو نجی ٹی وی چینل کراچی کی سڑکوں پر لاشیں گرانے کا منظر دِکھا رہے تھے۔ اس نے چینل بدل دیا۔ سرکاری ٹی وی پر اس ریلی کا منظر دِکھایا جا رہا تھا جس میں وہ پھنس گیا تھا۔

⌘

وہ ایک مدت سے شہری زِندگی کے ہنگاموں میں کچھ اِس طرح مشغول تھا کہ اسے ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں تھا کہ دیہات کتنی تیزی سے بدل گئے تھے اور مسلسل بدل رہے تھے۔ گندم کٹنے کا جو منظر اُس کے دِھیان میں چل رہا تھا' کٹائی اور گہائی کی مشینوں کے آنے کے بعد اُس میں بہت زیادہ ترمیم ہو چکی تھی۔ تاہم اس کی اپنے گاؤں کے حوالے سے ٹھہری ہوئی نفسیات کا شاخسانہ تھا کہ اُس نے کسانوں کے دائیں ہاتھوں میں چمکتی ہوئی درانتیاں دیکھی تھیں۔ یہ درانتیاں ایک ترتیب سے اُوپر کو اُٹھتی تھیں' عین ایسے لمحے میں جب وہ اَپنی چھاتیوں کا سارا زور لگا کر 'شاوا ابھی شاوا' کا نعرہ لگاتے ہوئے بائیں ہاتھوں کی مٹھیاں کھڑی فصل کے اگلے ردّے پر جما لیتے تھے۔ درانتیاں کوندے اُچھالتی فصل کی جڑوں کے قریب جمی ہوئی مٹھیوں اور سطح زمین کے درمیان بہنے لگتیں اور اس کے ساتھ ہی فصل اپنے ہی کھیت میں ڈِھیر ہوتی جاتی' وہی کھیت جس میں ابھی ابھی وہ لہرا رہی تھی۔

کیا وہ کھیت میں بچھتی فصل تھی؟ اور کیا وہ لاشیں نہیں تھیں؟؟...... وہ مخمصے میں پڑ گیا۔ خالی طویل سڑک...... کئی ٹائروں والا لمبا چوڑا کنٹینر...... دھڑا دھڑ گرتی ہوئی لاشیں...... اور آدمیوں کا سیلاب جو موت سے نہیں ڈرتا تھا...... وہ سب کیا تھا؟؟؟...... اس نے کبھی کوئی کنٹینر نہیں چلایا تھا' بل کہ یوں تھا کہ جب وہ اَپنی کار میں کہیں جا رہا ہوتا اور اس طرح کے کسی کنٹینر کو اوورٹیک کرنا ہوتا تو اس لمحے جب وہ نصف کے لگ بھگ اوورٹیک کر چکا ہوتا' بوکھلا جایا کرتا تھا۔ ایسے میں نہ جانے

کیوں، اسے یہ وہم ہونے لگتا تھا کہ کنٹینر کبھی ختم نہ ہوگا۔اس کی انگلیاں اسٹیرنگ پر اور مضبوطی سے
جم جاتیں اور بغیر کسی ارادے کے پاؤں ایکسیلیٹر پر اپنا دباؤ بڑھا دیتا۔اس کے پاس نئے ماڈل
کی ایسی کار تھی جس کے شاک بہت اچھے تھے۔اتنے اچھے کہ کار سڑک پر بچھ کر اور جم کر چلتی تھی اور
آدمی کے دھیان کو بھی جھٹکا نہیں لگتا تھا۔

اس نے دِھیان جھٹک کر ایک نئی ترتیب میں لانا چاہا۔اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنی
یادداشت میں اس کنٹینر کے چلے آنے کو اس منظر کے ساتھ جوڑ سکے جو اس نے ایک ٹی وی چینل
پر رات ہی کو دیکھا تھا۔ایک سنسان سڑک کو بند کرنے کے لیے یہی کنٹینر کچھ اس طور کھڑا کیا گیا تھا
کہ کوئی بھی سڑک عبور نہ کر پائے۔اس کے سارے ٹائروں سے ہوا بری طرح نکال دی گئی تھی اور
اب اس کے ساتھ چلنے کا تصور باندھنا ممکن نہیں رہا تھا......مگر......کامران نے جو دیکھا تھا وہ کنٹینر
تو اپنے پاورفل انجن کے زور پر پوری رفتار سے کھلی سڑک پر، بلکہ لوگوں کے بدنوں پر بھاگ رہا
تھا اور اس کی پشت میں، چورس روزن، اور کنٹینر کے عقبی اچھال سے پرے کچلی ہوئی لاشیں بچھ رہی
تھی۔دفعتاً ایک نیا منظر پہلے فریم کے اندر سے اُبھرا۔ اسی ٹرک کی اگلی نشست پر ایک شخص جھول
رہا تھا۔گولی اس کی گردن میں پیوست ہو گئی تھی۔ جہاں گولی کا چھید تھا وہاں سے خُون دھار بنا کر
بہ رہا تھا۔ کامران نے اسے پہچاننا چاہا تو یہ دیکھ کر بوکھلا گیا کہ بری طرح مضروب شخص کوئی اور
نہیں وہ خود تھا۔

اَپنی گردن میں دھنسی گولی کے خیال نے اس کی بوکھلاہٹ کے ساتھ اس الجھن کو بھی نتھی کر
رکھا تھا کہ وہ اس گولی کو کیسے نکالے گا؟ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے گردن کے
چھید سے اُبلتے لہو میں راستہ بنایا اور اُسے اندر تک گھسیٹرتا چلا گیا۔ اُسے اس پر بھی حیرت نہیں ہو
رہی تھی کہ ایسا کرتے ہوئے اسے کوئی درد کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ زخم ٹٹولتے ٹٹولتے اس کی شہادت
والی انگلی کا ناخن گولی کے چپٹے سرے سے ٹکرایا۔ اس نے ہمت کر کے ساتھ والی دوسری انگلی بھی
زخم میں ٹھونس لی۔ دوسرے ہی لمحے میں گولی اس کے ہاتھوں میں ناچ رہی تھی۔خون اُبلنے لگا

تھا۔ گولی اس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی لاشیں گرنے اور مدد مدد پکارنے کے وہ سارے مناظر جو اس نے رات بھر اپنے ٹی وی پر دیکھے تھے‘ ایک ترتیب میں ڈھل گئے۔

عالیہ نے کامران کی ہتھیلی کی پشت میں کھبے ہوئے کینولا کو دیکھا۔ اس سے جڑی پلاسٹک کی نالی میں کچھ وقت پہلے تک قطرہ قطرہ گلوکوز بہ رہی تھی۔ اسی پلاسٹک کی تھیلی میں ڈاکٹر نے کئی قسم کی دوائیاں انجیکٹ کر دی تھیں جو اب کامران کے خُون کا جز ہو چکی تھیں۔ اڑنے کے لیے پر تولتی تتلی کی طرح کینولا کے دونوں پر پھیلے ہوئے تھے اور عین وہاں جہاں تتلی کا سر ہونا چاہئے‘ وہاں گلوکوز ختم ہونے کے بعد ایک ڈھکن لگا کر خُون کو بہنے سے روک دیا گیا تھا۔ اس نے ڈھکن کی تمام اطراف سے خُون کو جمے ہوئے دیکھا تو بے چین ہو گئی۔ نہ جانے اسے یہ کیوں لگنے لگا تھا کہ کامران کے بدن میں بس اتنا ہی خُون تھا جو باہر ابل کر جم گیا تھا...... اور...... اب اس کے زرد ہو چکے وجود میں خُون نہیں خالی پن دوڑتا تھا۔

جس خالی پن کو وہ ساری عمر پرے دھکیلتی رہی تھی وہ کسی نہ کسی بہانے اس کے اپنے وجود کا حصہ ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ہاں تھی تو وہیں سے اس خالی پن کو اپنے وجود کا حصہ بنا لیا تھا۔ اس کی ماں جب تک زندہ رہی ایک عجب طرح کے خاندانی زعم میں مبتلا رہی۔ وہ شہر میں پلی بڑھی اور اس ماحول میں جوان ہوئی تھی جس میں آسائشیں مزاج کا حصہ ہو جاتی ہیں۔ اس ترنگ میں احساس کی سطح پر جڑنے سے کہیں زیادہ یہ اہم ہوتا کہ وقت کے ایک ایک لمحے کو پھلجھڑی کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ جل کر تماشا دکھانے‘ بجھنے اور پھر معدوم ہو جانے والی پھلجھڑی۔ ماں مر کر معدوم ہو گئی۔ عالیہ اپنی ماں کے جتنا قریب ہو جانا چاہتی تھی اس کی کسک دل میں پالتی جوان ہو گئی تو گھر خالی پن سے گونج رہا تھا۔ کامران جو اس کے سامنے پڑا تھا اس کے باپ کا دوست تھا جو اپنی پہلی بیوی سے الگ ہو گیا تھا۔ کیوں؟ یہ سوال اس کے باپ کے لیے اہم نہ تھا۔ اس کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ اپنے اثاثوں کے اعتبار سے وہ بہت مستحکم تھا۔

استحکام آدمی کے اندر کہاں سے آتا ہے؟...... کامران نے اپنے کانپتے دل کو تھاما اور سوچا مگر یہ سوال اس کے اندر چکراتا اور بدن کی باطنی دیواروں سے دیر تک ٹکراتا رہا۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اسے ایسا تہذیبی آدمی کہا جا سکتا تھا جسے ثقافتی بارشوں کی بوچھاڑ نے پس پا کر دیا تھا۔ اس کی پہلی بیوی فائزہ کو ہمیشہ شکایت رہی تھی کہ اس کے اندر گاؤں کا ضدی اور اکھڑ کسان دھرنا مارے بیٹھا ہوا تھا۔ زمین سے اگا ہوا اور اپنے ایمان کے ساتھ جڑا ہوا آدمی۔ زمین پیچھے گاؤں میں رہ گئی تھی اور وہ ایمان ساتھ لیے پھرتا رہا۔ فائزہ چاہتی تھی کہ وہ تیزی سے ترقی کر کے سوسائٹی میں مقام بنا لے مگر جس بوجھ کو وہ اٹھائے پھرتا تھا وہ اس کی چال میں رخنے ڈال رہا تھا۔ وہ اس پر مسلسل کام کرتی رہی حتیٰ کہ اسے بدلنا پڑا۔ اس نئی دنیا اور نئی چال کا اپنا ہی آہنگ تھا۔ پہلا قدم طعنے سن سن کر طے کیا تھا۔ پھر یوں بدلا کہ فائزہ بھی اسے، بالکل بدل جانے سے نہ روک پائی تھی۔

کامران جیسے دیہاتی آدمی کا بے ہنگم بدلنا کہ جس کی زِندگی ایک خاص آہنگ میں چل رہی ہوتی ہے اُپنی جگہ ایک واقعہ تھا مگر اس سریع تبدیلی نے اس کے اندر خلا پیدا کر دیا تھا۔ ایک ایسا خلا جو اس کی پچھلی زِندگی کو اندر سے کاٹ کر پھینک دینے سے بن گیا تھا۔ فائزہ میں اتنی ہمت، فراست اور صلاحیت نہ تھی کو وہ اس خالی پن کو کسی اور ادا سے پاٹ سکتی کہ وہ تو ڈھنگ سے نہ وہ لطف دے پاتی جو اس کا وجود مانگتا تھا اور نہ ہی اس رفتار سے چل پا رہی تھی جس سے اب اس کا شوہر چل رہا تھا۔ وہ راستے کی دھول ہو گئی تو عالیہ اس کی زِندگی میں آ گئی جو اس نے پہلے تو نئے پن کے جوش میں اسے بہت قریب کر لیا۔ اس نے بھی اس عرصے میں کئی رخنے پاٹ دیے ہوں گے مگر وہ ایک اور ہی طرح کا خالی پن ساتھ لے کر آئی تھی جو سارے میں دندناتا پھرتا تھا۔

گوشت پوست کے آدمی کے اندر کیا کچھ سما سکتا تھا اس کا اندازہ کامران کو صحیح طور پر تب بھی نہ ہو سکا جب وہ اس میں بہت کچھ گھسیڑ چکا تھا کہ اب بھی وہ خالی کنستر کی طرح بجتا تھا۔ وہ ڈھنگ سے اس خاموشی اور خلا کی اس گونج کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہتا کہ وہ مسلسل ایک کیفیت میں

رہنے سے احساس کی اس سطح سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ایسے میں اس پر جھلاہٹ طاری ہو جاتی۔ اس نے اس جھلاہٹ سے چھٹکارے کے لیے خود کو خوب تھکانے اور مسلسل مصروف رکھنے کا حیلہ کیا اور اس حیلے ہی کو اَپنی عادت بنا لیا۔ شروع شروع کا وہ زمانہ جو اس نے اڑیل بیل کی طرح ٹھہر ٹھہر کر گزارا تھا اس کے تمام ہوتے ہی وہ محسوس کی دنیا سے جست لگا کر طلب کی دنیا میں داخل ہو گیا تھا۔ احساس کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اس کے ناتے رشتوں کے ساتھ جڑ جاتا اور روحانی طہارت کے دریچے بدن پر کھول لیا کرتا تھا جب کہ طلب کے تقاضے کچھ اور تھے کہ یہ پہلے تو ضرورت بنتی اور پھر ہوس ہو کر حواس پر چھا جاتی گئی تھی۔ کامران کے جسم میں ہوس ہی ہوس بولنے لگی تو اس کے مطالبے فائزہ پورا کر سکنے کی سکت نہ رَکھتی تھی۔ اگرچہ اس خلا کو عالیہ نے بھر دیا تھا مگر جو خالی پن وہ اپنے بدن میں چھپا کر لائی تھی اسے کامران کے بدن کا ضعف پاٹنے سے قاصر تھا۔ اس کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ وہ احساس کی وہ سطح چھونے کا جھنجھٹ ہی نہ پال سکتا تھا جس میں تعلق گہرا ہو کر روحانی چھب دینے لگتا ہے۔ پہلے پہل آسائشوں اور بدنوں کی تندی تیزی نے معاملے کی نزاکت کو پرے دھکیلے رکھا پھر عالیہ خود ہی اپنے اندر سمٹ گئی اور کامران کی طنابیں ڈھیلی چھوڑ دیں وہ تو جیسے یہی کچھ چاہتا تھا جلد ہی اپنے آہنگ پر لوٹ گیا۔

⁂

جب تک اسے فرصت میسر آتی تب تک عالیہ اپنا بدن توڑ کر ایک پہلو پر یوں ڈھے جاتی کہ اگلے صبح ہی اٹھا کرتی۔ کامران ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹیلی وژن کے چینل بدلتا رہتا۔ کبھی تو وہ اتنی تیزی سے چینل بدلتا کہ پورا بیڈ روم پلکیں جھپکتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایسے میں اس کا ہاتھ ان ہاٹ چینلز پر بھی نہ رکتا جو ایک عرصہ تک اسے بہت مرغوب رہے تھے، ننگی رانیں اور کھلے سینے دکھانے والے ان چینلز کو دیکھتے دیکھتے وہ فائزہ سے اُوب گیا تھا اور اب جب کہ عالیہ اس کے بالکل پاس تھی اسے نیلے پانی میں نہاتی، ریت پر دوڑ دوڑ کر اپنے اعضا نمایاں کرتی عورتوں والے مناظر دیکھتے ہی اَپنی چھاتی بیٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب تک آسائشوں کے لیے ترستا اور فائزہ

کے طعنے سنتا رہا تھا اسے خبروں والے چینلز میں دل چسپی رہا کرتی تھی۔ دنیا جس طرف جا رہی تھی اس پر وہ کڑھتا تھا۔ مگر جب وہ دنیا کی رفتار کے آہنگ میں آیا تو وہاں پہنچ گیا جہاں فائزہ کا ساتھ نہیں دی سکتی۔

جن دنوں اسے معمول کی خبروں سے کوفت ہونے لگی تھی ان دنوں اس نے ایسے چینلز ٹیون کر لیے تھے جن کے ذریعے وہ بریکنگ نیوز کی تھرل سے جڑے ہوئے تھے۔ ٹکڑوں میں آنے والی خبروں میں بہت کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ لاشیں گرائے جانے والے مناظر سے لطف لینے لگا' بالکل یوں کہ جیسے عالیہ مضبوط جسم والے ریسلرز کی ان کشتیوں سے لطف اٹھاتی تھی جن میں کوئی قانون اور ضابطہ کام نہ کرتا تھا۔ کچھ عرصے سے آدمیوں کے گم ہونے یا پھر ان کے مارے جانے ' دھماکے ہونے اور بدنوں کے چیتھڑے اڑنے کی خبروں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ اس تسلسل نے اس کی نفسیات کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ ہاٹ چینلز سے اس کے دل کے اوبنے کی وجہ عورت کے وجود سے وابستہ اگر چٹ پٹے اور لذیذ مناظر کی بہتات تھی تو دھماکوں میں بدنوں کے اڑتے چیتھڑوں کی متواتر خبروں نے اس کے اندر سے انسانی وجود کی وقعت ہی ختم کر دی تھی۔

جس روز ٹیکسلا سے آتے ہوئے وہ سرکاری جلوس میں پھنس گیا تھا اسی روز وہ دیر تک وہ کراچی میں گرائی جانے والے لاشوں کے مناظر بہت دل چسپی سے دیکھتا رہا تھا۔ اس کا دل معمول کے مطابق دھڑکتا رہا۔ عالیہ اس کی توجہ پانے کے لیے کوئی نہ کوئی بات چھڑتی رہی۔ یہ باتیں ''ہاں' ہوں'' سے زیادہ پر اسے مائل نہیں کر پا رہی تھیں۔ ایک چینل جس کے لوگ اُپنی عمارت میں پھنس کر رہ گئے تھے اس کی خاص توجہ پا گیا۔ اس چینل کی عمارت کے دونوں طرف گولیاں چل رہی تھی لہٰذا وہ تھرل سے بھرے ہوئے مناظر فراہم کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ ایک گروہ نے نیچے پارک کی گئی گاڑیوں کو توڑنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے ہجوم گاڑیوں کی چھتوں پر لوہے کی سلاخیں برساتا یا ونڈ سکرین کے ٹکڑے فضا میں اچھلتے تو اسے اپنے خُون میں عجب طرح کی تیزی محسوس ہوتی۔ اس چینل کا کیمرہ مین بڑا جی دار نکلا۔ وہ عمارت کے اوپر کہیں پاؤں ٹکائے

سارا منظر براہ راست دکھانے کے قابل ہو گیا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ پولیس والے وہاں ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ کر رہے تھے۔ جب سے سیاسی کارکنوں کو پولیس میں بھرتی کرنے اور مخالفین کو دبانے کے لیے سرکاری وسائل کے بے دریغ استعمال کی ریت چلی تھی ایسے مناظر تواتر سے نظر آنے لگے تھے۔ بھاگ بھاگ کر آگے آنے اور گولیاں برسا کر عمارتوں کی آڑ لے لینے والے ان کی پرواتک نہ کرتے تھے۔ گویا ان کے لیے سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر کمرے میں پھیلے خلا کو ماپا اور پھر اپنے پہلو میں پڑے جوان سال خوب صورت جسم کو دیکھا۔ دہشت کے ان لمحات نے اس کی کشش قضا کر دی تھی۔ عالیہ نے اپنے مرد کو متوجہ پا کر جلدی میں کچھ کہا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا اس میں کامران کے لیے کوئی دل چسپی کا سامان نہیں تھا۔ عالیہ اپنے تئیں جس پہلو سے نیم دراز تھی اس میں اس کے ابھار نمایاں ہو کر اسے متوجہ کر سکتے تھے مگر اس ادا نے بھی اس کی توجہ کو گرفت میں نہ لیا کہ اس نے دل ہی دل میں اس منظر کو بھی ایسے معمولی مناظر سے مماثل سمجھ لیا تھا جو انگلش میوزک نشر کرنے والے چینلز پر ہر دوسرے فریم میں دکھاتے تھے۔ کامران نے اپنی نظریں پھر ٹی وی کی اسکرین پر مرکوز کر دیں۔ وہاں اب ایسی لاش دکھائی جا رہی تھی جس کی چھاتی سے خُون ابلتا تھا۔ چھاتی...... وہ بوکھلا گیا اور پلٹ کر اس چھاتی کو دیکھنا چاہا جس سے خُون نہیں ابل رہا تھا۔ وہاں منظر بدل گیا تھا۔ عالیہ نے کامران کی توجہ پانے میں ناکام ہو پورے بدن کو اوندھایا اور آنکھیں موند لیں تھیں۔

جب کامران کی سماعتوں میں باہر کی سرسراہٹیں بھی رسنے لگیں تب تک عالیہ کی سانسوں کی پھوار نیند کے غلبے سے آہنگ پا کر اس کے دائیں پاؤں کے ٹخنے پر پڑنے لگی تھی۔ اسے پہلے پہل سمجھ نہیں آیا کہ اس کے ٹخنے پر کیا ہو رہا تھا تاہم عالیہ کے سینے کا گداز اور گرمی لیے سانس کے ان جھونکوں نے اس کے حواس کی طرف پلٹنے کے عمل میں سرعت پیدا کر دی۔

کامران کا اپنے وجود میں اپنے آپ کو ریزہ ریزہ ڈالنے کے باقاعدہ جتن کرنا اور عالیہ کا

سانسوں کے آہنگ کی تاثیر سے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے ٹانگوں کو پھیلائے چلے جانا' ایک ساتھ شروع ہوا تھا۔ جب ایک ہی رخ پڑے رہنے کی وجہ سے عالیہ کا ایک پہلو دکھنے لگا تھا اور اس نے چت لیٹ جانے کے لیے نیند ہی نیند میں اپنے پورے وجود کو حرکت دی' تب ایک نوجوان ڈاکٹر' جو اس کے قریب سے گزر رہا تھا' وہاں ٹھہر جانے پر مجبور ہو گیا۔ ڈاکٹر تب تک وہاں رکا رہا جب تک عالیہ کا جسم پشت پر جم کر جھولتا رہا۔ اس نے پیشہ ورانہ احساس کے تحت قصداً ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مریض پر ڈالی اور اس مانیٹر پر بھی جس میں سے کوئی فوری خطرہ نہیں جھانک رہا تھا۔ مریض کے جسم میں حرکت پا کر ڈاکٹر بلاسبب کھسیانا ہوا' منھ سیدھا کیا اور وہاں سے کھسک گیا۔

سی سی یو کے وسط میں شیشے کی دیواروں والے احاطے میں ڈاکٹر اور نرسیں ڈیوٹی کے لیے موجود رہتیں۔ چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ لکڑی کے تختوں سے آڑ بنا کر کیبن بنا لیے گئے تھے۔ یہ سارے کیبن سامنے سے کھلے تھے۔ ہر کیبن میں ایک بیڈ اور ایک ہی بینچ تھا جس پر دو آدمی بہ مشکل بیٹھ سکتے تھے۔ کیبن کے اندر سامنے والی دیوار پر اوپر سے آنے والی آکسیجن کی نالی اور ایک چوکور باکس میں نصب سبز لکیر اچھالتا مانیٹر نمایاں تھا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر وہیں شیشے کی دیوار سے پرے کھڑے وقفے وقفے سے انھی مانیٹرز پر اچھلتی لکیروں کو دیکھ لیتے تھے۔ جس وقت ڈاکٹر کھسیانا ہو کر واپس ہو رہا تھا غالباً یہ وہی وقت تھا جب گھنٹوں بے سدھ پڑے رہنے کے بعد پہلی بار کامران کو اپنے ٹخنے پر پڑنے والی عالیہ کے سانسوں کی پھوار کا خُوشِ گوار احساس ہوا تھا۔ نرم' ملائم اور بھیگی بھیگی پھوار جو اس کے اندر اس کے لہو کا حصہ ہو کر اس میں آنچ بھر رہی تھی۔

جب وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ گھر کی بہ جائے ہسپتال میں تھا اور عالیہ عین اس کے قدموں میں نہ جانے کب سے پڑی تھی تو اسے عالیہ کے وجود نے گرفت میں لے لیا جو اس کی نظر میں پوری طرح نہ آ رہا تھا۔ اس نے سر اچک کر دیکھنا چاہا مگر ناکام رہا۔ اسے گردن اٹھانے کے لیے ٹانگوں کو قدرے دہرا کر کے زور لگانا پڑا تھا جس سے نہ صرف اس کا چہرہ اس کے گھٹنوں کی اوٹ میں آ گیا تھا' سانسوں کی پھوار کا وہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا جو اس کے اندر

توانائی بھر رہا تھا۔اس ذراسی کوشش میں نقاہت نے اس پر ہلہ بول دیا۔ وہ اتنی ہمت والا تھا کہ ایک اور کوشش کرتا مگر سانسوں کی پھوار کا یوں ٹوٹنا اسے اچھا نہ لگا تھا۔اس ایک لمحے میں اس نے ہمکتی سانسوں سے معمور چھاتیوں والی ایسی عورتوں کو بھی دیکھا تھا جو کبھی اسے پچھاڑ دینے اور اوندھا کرر کھ دینے والی لذت کا باعث ہو جاتی تھیں مگر اب وہ اوپر سے گرتی ہوئی لاشوں میں کہیں گم ہو رہی تھیں ۔انھی لاشوں کے ڈھیر میں اس نے اپنے آپ کو بھی دیکھا اور یقین کرنا چاہا کہ وہ زندہ تھا۔کنٹینرز'......لوگوں پر اس کا دوڑنا' ......گولی کا اس کے بدن میں پیوست ہونا' ...... عالیہ کا منھ موڑ کر لاش کی طرح پرے ڈھے جانا' سب جھوٹ تھا۔سچ یہ تھا کہ اس کا دل دھڑک رہا تھا اس آہنگ میں جس سے اس کا تہذیبی وجود مانوس تھا۔اس کے پاؤں پر پڑتی سانسوں کی پھوار اس کے اندر کٹ چکے احساس کی پنیری پھر سے کاشت کر رہی تھی ۔یہ کیفیت ایسا اعلامیہ تھی کہ وہ نئے سرے سے زِندگی کو آغاز دے سکتا تھا۔اس نے سکون سے آنکھیں موندلیں اور ہاتھ کھسکا کر عالیہ کے گورے چٹے پاؤں پر رکھ دیا جو اس نے نیند میں ابھی ابھی اس کی بغل میں گھسیڑ دیا تھا۔

اللہ خیر کرے

اُسے دفتر پہنچے یہی کوئی پندرہ بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

محسن کو ایک عرصے کے بعد یاد آیا' دِل کی دھڑکن کبھی کبھی سینے سے باہر بھی اُبل پڑتی ہے...... دَھک' دَھک' دَھک...... یوں' جیسے کوئی زور زور سے میز پر مکے برسا رہا ہو۔

رات بھر کی بے آرامی آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور صبح صبح ایک دَھڑکا تھا جو لبنیٰ نے ساتھ کر دیا تھا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی دوسری بار بجی۔ اُدھر لبنیٰ ہی تھی جو اُسے گھر جلدی پہنچنے کو کہہ رہی تھی۔

جب وہ اَپنے میز کی دراز کو تالا لگا رہا تھا تو اِس بات پر بھی پیچ وتاب کھا رہا تھا کہ لبنیٰ کو ڈاکٹر ساجدہ پر ہی اعتماد کیوں تھا؟ ...... حالاں کہ وہ جانتا تھا' اِعتماد کیا نہیں جاتا' وہ تو ہو جایا کرتا ہے اور زور ازوری سے اعتماد کہیں ٹکا بھی دِیا جائے تو وہ وسوسوں کے سیج پر پہلو ہی بدلتا رہتا ہے۔

مگر ڈاکٹر ساجدہ ہی کیوں؟

وہ اس اُلجھاوے سے نہ نکلنے پر تُلا بیٹھا تھا۔

تمام لیڈی ڈاکٹرز تو ایک ہی جیسی ہوتی ہیں...... اور جو کام ڈاکٹر ساجدہ نے کرنا ہے' وہ کام کوئی اور بھی تو کر سکتی ہے۔

اس نے خود کو وہی دلیل دِی' جو صبح لبنیٰ کو دِی تھی' اور لبنیٰ خوف زدہ ہو کر اُسے تکنے لگی تھی۔

لبنیٰ رات بھر کراہتی رہی تھی' نہ خود سوئی نہ اسے سونے دیا۔ محسن نے جب ڈاکٹر ساجدہ کی بابت ہسپتال والوں کا کہا لبنیٰ کو سنایا کہ وہ شام چار بجے کے بعد ہی مل سکیں گی تو لبنیٰ نے ترت

فیصلہ سنادِیا تھا:

''شام ہی کو ہسپتال چلیں گے'' ......

ہونہہ شام کو؟ ......

وہ بڑبڑایا' بیگ اُٹھایا اور دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔

''اب کیا ہوگا؟''

بے چینی اس کے بدن میں تیرنے لگی۔

گزشتہ سارے عرصے میں ڈاکٹر ساجدہ ہی لبنیٰ کا چیک اَپ کرتی آئی تھی۔ سارے ٹسٹ اس کے سامنے ہوے اور اب آخری مرحلہ تھا......

اور لبنیٰ کسی اور پر بھروسہ کرنے کو تیار نہ تھی۔

جب وہ گھر میں داخل ہوا تو لبنیٰ بیڈروم ہی میں تھی۔ محسن پہلی مرتبہ اُسے ایک نئے زاویے سے دِیکھ رہا تھا۔

چھوٹے قد اور بے تحاشہ بڑھے ہوے پیٹ نے لبنیٰ کو مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ گھٹنے پر ٹکا کر فرش پر پڑے کُشن کو اُٹھانا چاہتی تھی مگر ہاتھ گھٹنے سے قدرے اوپر ہی ٹکا پائی۔ کراہتے ہوے بس اِتنا جھک سکی کہ محض دواُنگلیاں کشن کو چھو رہی تھیں۔

محسن آگے بڑھا' لبنیٰ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر صوفے پر بیٹھنے میں مدد دی' اور خود میز گھسیٹ کر سامنے بیٹھ گیا۔

اب اس کے چہرے پر لبنیٰ کے لیے ہم دردی اور تشویش گتھم گتھا ہو گئے تھے۔

''تمھیں خود اپنا خیال رکھنا چاہیے''

اس کے لیے صوفے پر جم کر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ محسن اٹھا' فرش پر پڑے کشن کو اٹھایا اور اس کی پشت کے ساتھ ٹکا دیا۔ اگرچہ اب بھی وہ صوفے کے اگلے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی' مگر کمر کشن کے ساتھ ٹیک کر بہتر محسوس کر رہی تھی۔

وہ مسکرادی......

اور محسن کو لگا' یہ مسکراہٹ تو محض اس کے لیے تھی۔ ورنہ وہ اندر سے بہت ڈری ہوئی تھی کہ اسے تو ٹنچر کی بوتک سے بوکھلاہٹ ہونے لگتی تھی......

اور اب اسے ہسپتال جانا تھا اور ایک بے بی کو جننا تھا۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر ساجدہ کا خیال تھا کہ وہ صحیح رخ پر نہیں تھا۔

اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

گزشتہ ایک مہینے سے وہ بہت مشکل میں تھی۔ چلنا چاہتی تو چلنا دوبھر ہو جاتا۔ یوں لگتا' پیٹ کا سارا بوجھ نیچے کی جانب تھا اور کوئی ٹھوس شے تھی جو اندر ہی اندر سے پشت میں گھسی چلی جاتی تھی اور میٹھا سا درد پیدا کر رہی تھی۔ رات لیٹتی تو عین پہلو اور پسلیوں کے نیچے درد کی شکایت کرتی۔

وہ ہسپتال کے کئی چکر لگا آئے تھے اور ہر دفعہ یہ کہ کر تسلی دے دی گئی...... کہ ''بعض اوقات یوں ہو جاتا ہے...... پریشانی کی کوئی بات نہیں''

لبنیٰ حد درجہ پریشان تھی۔

ان کی شادی کو پونے دو سال گزر چکے تھے۔

اور ان پونے دو سالوں میں لبنیٰ اور محسن ایک دوسرے کے بہت عادی ہو چکے تھے۔ اِس قدر کہ لبنیٰ کی ماں' بیٹی کے میکے نہ آنے پر ناراض ہو گئی تو محسن کو دفتر سے چھٹی لینا پڑی...... اور جتنے دن لبنیٰ میکے رہی' محسن بھی رہا۔ اکیلے گھر رہتا تو کیا کرتا؟...... دفتر کے لیے تیار کیسے ہوتا' واپس پلٹتا تو راہ کون دیکھ رہا ہوتا؟...... کپڑے بدلنے میں مدد کون کرتا؟...... کھانا کون چنتا اور ہنس ہنس کر میٹھی میٹھی باتیں کون کرتا؟ ادھر محسن کو پیچھے رہ جانا عجب لگ رہا تھا تو اُدھر لبنیٰ نے بھی صاف کہہ دیا تھا۔

''آپ ساتھ چلیں گے' تو چلوں گی۔ ورنہ میں بھی نہیں جا رہی' ابھی فون کیے دیتی ہوں۔''

یوں ایک دوسرے کو دیکھتے' ایک دوسرے کا اِنتظار کرتے' ایک دوسرے کے قہقہوں میں قہقہے ملاتے پونے دو سال گزر گئے۔

بہ ظاہر اِن کی رفاقت مثالی تھی۔ ہموار' مطمئن اور پُرسکون زِندگی' گہرے پانیوں کی طرح......لبنیٰ کی جانب سے ایک وارفتگی تھی' جو ٹھہرے پانی میں دِھیرا سا اِرتعاش پیدا کرتی تھی......مگر محسن کو یوں لگتا' کچھ ہے' جو نہیں ہے......ایسا' جو دِل کو جکڑ لے اُسے مسلے اور مسلتا ہی چلا جائے۔

''بچہ ہونا چاہئے''

یہ خواہش پہلے لبنیٰ کے من میں جاگی۔ ابھی پہلے سال کی دوسری تہائی بھی پوری طرح نہ گزر پائی تھی کہ اس کی خواہش شدید ہوتی چلی گئی۔ جب پہلا سال ختم ہو رہا تھا اور اس کے سہیلیاں اِشاروں کنائیوں میں اُس سے پوچھتی تھیں:

''سناؤ لبنیٰ......کوئی نئی خبر؟......کچھ ہے نا؟......''

تو اس کا دِل بیٹھ بیٹھ جاتا تھا اور وہ سچ مچ رو دِیتی تھی۔

دوسرے سال کی پہلی چوتھائی میں ہی خواہش کی شاخ پر اُمید کی کونپل مسکرا دی۔ اب ایک سرشاری تھی جو اُس کے بدن پر دھنک کی طرح برس رہی تھی۔ وہ سوتی تو خوب صورت خواب دیکھتی' بیدار ہوتی تو مزے مزے سے سارے خواب محسن کو سناتی......

یوں بعد میں محسن بھی ایک ننھے منے وجود کے اِنتظار کی لذّت محسوس کرنے لگا تھا۔

اور اب لبنیٰ محسن کے سامنے تھی تو اس طرح کہ اُس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ بال جو کبھی نفاست سے کنگھی کیے ہوئے کندھوں پر جھولتے رہتے تھے' سختی سے پیچھے کی جانب بندھے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے خُون نچڑے زرد چہرے پر چھائیاں ہی چھائیاں ابھر آئی ہوں۔

محسن جو کچھ دِیر پہلے ہم دردی اور تشویش سے گتھم گتھا تھا' اب لبنیٰ کو دیکھ کر عجب سی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ اسے خُوشی تھی کہ وہ جلد ہی باپ بننے والا تھا مگر لبنیٰ کا بے ڈھب بدن اور بجھا بجھا

چہرہ اس کے اندر حیران کن اُکتاہٹ اُتار رہا تھا۔

لبنیٰ بہت زیادہ خوبصورت کبھی بھی نہ رہی تھی۔ مگر کنوار پنے میں جوانی کا جوبن ایسا مرحلہ ہوتا ہے جب ہر لڑکی حسین لگتی ہے۔ اور ایسا مرحلہ لبنیٰ پر بھی آیا تھا...... اور عین اس مرحلے میں لبنیٰ محسن کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

محسن ایسا لاا ُبالی بھی نہ تھا کہ جسے دیکھا دِل پھینک دیا۔ مگر لبنیٰ میں کچھ نہ کچھ تھا جو اسے لبنیٰ کو زِندگی بھر کا ساتھ بنانے پر مجبور کر رہا تھا۔

کرنل فاروق، محسن کے ابا جی کا بہت پہلے ہم جماعت وہم مکتب رہا تھا۔ ان کے گھر کے ساتھ جو حویلی مدّت سے خالی پڑی رہی تھی، کبھی یہی کرنل صاحب کا آبائی گھر تھا۔ مگر عمر بھر کی مصروفیات نے انہیں پیچھے پلٹنے نہ دیا۔

ریٹائرمنٹ اور عمر کا ڈھلنا دو ایسے عوامل ہوتے ہیں جو اِنسان کے اَندر اُتھل پتھل مچا دیتے ہیں۔ کرنل صاحب بھی اس عمل سے گزر رہے تھے۔ کبھی ان کی مونچھوں کے ساتھ ان کی نگاہیں بھی اوپر ہی کو اٹھی ہوئی تھیں، مگر اب وہ نیچے بھی دیکھنے لگے تھے...... اور اس دیکھا دیکھی میں، انہیں اپنے آبائی گاؤں کو بھی دیکھنے کا خیال آیا تھا۔

''کس کے پاس جاکر ٹھہریں......؟''

محسن کے ابا یاد آئے۔ ایک ہی ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھا تھا۔ یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ محسن کے ابا نے بچپن کے ہم جماعت کو دیکھا تو بچھ بچھ گئے۔

کرنل صاحب کا پورا گھرانہ فوجی کلچر میں رَنگا ہوا تھا۔ وہی نشست برخاست، وہی رَکھ رَکھاؤ، وہی گفتگو میں دلائل کے ساتھ انگریزی لفظوں کا سہارا۔ کرنل صاحب جس قدر اونچے لمبے تھے، ان کی بیگم اسی قدر ٹھگنی۔ جب کرنل صاحب محض کیپٹن تھے تو یہ پستہ قد عورت ایک میجر جرنل کی بیٹی تھی۔ بس یہی خوبی تھی جس نے اس وقت کیپٹن کو اس کا شوہر بنا دیا۔ کہتے ہیں فوج میں سفارش نہیں چلتی مگر بہ ہر حال فوجی بھی اِنسان ہی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ربط ضبط

رَکھتے ہیں، سنتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور میجر جرنل کا داماد ہونا بھی ایک ایسی کوالیفیکیشن تھی کہ کیپٹن کے بعد کے کئی مرحلے بڑی خوبی سے طے ہوتے چلے گئے۔ میجر جرنل صاحب یوں تو جلد ریٹائر ہو گئے مگر مردہ ہاتھی سوالاکھ کا نکلا اور وہ کیپٹن جو اُن کا داماد تھا، کرنل بن چکنے تک اُنہی کا دست شفقت اپنے سر پر محسوس کرتا رہا۔

لبنیٰ نہ تو ساری ماں پر گئی تھی نہ باپ پر۔ قد چھوٹا رہ گیا تھا تو بدن کی تراش اور اُبھار جاذبِ نظر تھے، جو چھوٹے قد پر بھی جچ رہے تھے۔ چہرے کے نقوش زیادہ متناسب نہ سہی مگر بُرے نہ لگتے تھے...... لیکن اس سب سے بڑھ کر جو چیز لبنیٰ کو خوبصورت کہہ دینے کا باعث بن سکتی تھی وہ اس کی نیلگوں آنکھیں تھیں۔

محسن پہلے فوجی زِندگی کے رکھ رکھاؤ سے متاثر ہوا تھا اور پھر لبنیٰ سے۔

وہ سلجھی ہوئی گفتگو کا فن جانتی تھی اور مختلف موضوعات پر بات کرتے ہوئے نظریں اس پر جمائے رَکھتی تھی۔

اور غالباً انہی گفتگوؤں کے درمیان ایک لمحہ ایسا آیا تھا، جب محسن نے نیلی آنکھوں کی گرفت اندر بہت اندر محسوس کی تھی اور انہی نیلی آنکھوں میں جذب ہو کر اس نے لبنیٰ کو دیکھا تھا تو وہ پوری کی پوری حسین لگنے لگی تھی......

اس قدر حسین کہ اس کے پیچھے زیبو کہیں چھپ گئی تھی۔

زیبو...... وہی کہ جس کا بھائی دوبئی گیا ہوا تھا اور اس کی کمائی سے، ان کے اَبا نے کرنل کی حویلی خرید لی تھی......

زیبو، کہ جس نے محض ابھی میٹرک پاس کیا تھا مگر گاؤں کی مست ہواؤں نے اس کے بدن میں عجب طرح کی مستی بھر دِی تھی۔ اِس مستی میں ایک مہک تھی کہ جو اُٹھتی تھی تو اٹھتی ہی چلی جاتی تھی...... اس کی ہنسی میں کھنک تھی۔ نگاہیں چمک سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ اور اس کی جلد پیتل کے چمکتے ہوئے چھنّے کی طرح چکنی تھی...... یوں لگتا تھا، وہ انگور کے اس دانے کی مانند تھی جو

میٹھے رَس سے تن گیا ہو۔

جب گھر کی دِیواریں تک سانجھی ہوں تو دِن میں سامنا ہونے کے بیسیوں مواقع نکل آتے ہیں۔ محسن نے جب بھی اُسے دِیکھا' نظر جما کر نہ دیکھ سکا۔ ہر دفعہ مرعوب ہوا۔ اس کے بدن سے اٹھتی مہک نے اسے بے قابو کیا۔ من میں ایک خواہش پیدا ہوتی' کاش وہ اُسے چھو سکے' اس کی تنی ہوئی چکنی جلد کے اندر ٹھاٹھیں مارتے رَس کو محسوس کر سکے۔ اسے لگتا اس نے زیبو کو چھو لیا تو اس کی پوروں میں اس کے بدن کا رنگ رس اُتر آئے گا۔ محسن اس کی جانب قدم بڑھاتا تھا تو الٹے پڑتے تھے۔ نظر تھی کہ پھسل پھسل جاتی اور دِل اُچھل اُچھل کر حلق سے باہر جھانکنے لگتا۔ جب کہ زیبو اُس سے بے خبر اور بے نیاز 'ماسی' ماسی' کی صدا لگاتی' اَپنے مطلب کی بات کہتی' چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتی۔ تب محسن کے بدن میں اینٹھن ہونے لگتی۔ پورا آنگن جو کچھ لمحے پہلے جگمگا تا ہوا محسوس ہوتا تھا' بجھ بجھ جاتا اور وہ اِنتہائی خلوص سے حسرت کرنے لگتا۔ کاش یہ آنگن یونہی جگ مگ جگ مگ کرتا رہتا۔ یونہی مہک اٹھتی رہتی۔

مگر لبنیٰ یوں آئی کہ زیبو کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔

لبنیٰ کے بدن میں اتنی اہلیت نہ تھی جو وہ زیبو کو اپنے پیچھے چھپا سکتا۔ مگر محسن جو پہلے ہی فوجی زِندگی کے رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو چکا تھا' باتوں باتوں میں اَپنی ساری توجہ نیلگوں آنکھوں پر مرکوز کر بیٹھا تھا۔ اور ان میں جذب ہو کر اُس نے لبنیٰ کو دیکھا تھا تو اسے اس کے پیچھے چھپی زیبو بالکل نظر نہ آئی تھی۔

اور اب جب کہ لبنیٰ محسن کے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی تو اس کی آنکھیں بھی بجھی بجھی تھیں اور چہرہ بھی ...... وہ پوری لبنیٰ کو دِیکھ سکتا تھا اور یہی غلطی وہ عین ایسے عالم میں کر بیٹھا تھا جب اسے ایک نئی خُوشی نصیب ہونے والی تھی۔ نہ جانے کیوں' ایک عجب سی مہک کی گھٹا یادوں کی فضا سے اٹھی تھی اور اس پر چھا کر سارا بدن بھگو گئی تھی ...... اور ایک چمک تھی جو آنکھوں میں سما رہی تھی ...... اور پوریں تھیں کہ چھو لینے کی خواہش میں بے اختیار اُٹھ رہی تھیں۔ اسی بے اختیاری میں اس نے لبنیٰ

کے چہرے کو چھولیا' جو پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

عجب طرح کے درد تھے جو لبنیٰ کے بدن سے اُٹھ رہے تھے۔

''اب ہسپتال میں شرابور ہو رہا تھا۔

عجب طرح کے درد تھے جو لبنیٰ کے بدن سے اُٹھ رہے تھے۔

''اب ہسپتال چلنا چاہیے''

''ہاں مگر سنٹرل ہسپتال میں' کہ ڈاکٹر ساجدہ دِن کو وہاں ہوتی ہیں۔ میں نے ٹیلیفون پر بات کر لی ہے۔''

اس کے خیال میں وہ اتنا اچھا ہسپتال نہ تھا مگر مجبوری تھی۔ ہسپتال پہنچے چیک اَپ کیا گیا۔ پچھلی رپورٹیں دیکھی گئیں جو لبنیٰ ساتھ لائی تھی۔ اور فوراً لیبر روم لے جایا گیا۔

آنے والا ایک ایک لمحہ اس کی بے چینیوں کو بڑھا رہا تھا۔

اچانک اس کی نگاہ سیڑھیوں پر پڑی۔ ڈاکٹر ساجدہ کے پیچھے ایک نرس نمودار ہو رہی تھی۔ اُسے یوں لگا' جیسے سارے میں روشنی پھیل گئی ہو...... وہ ...... وہ تو زیبو تھی۔

اس کے اندر بے چینیوں کی ہیئت یک دم بدل گئی۔

وہ بے اختیار آگے بڑھا۔ اِتنی تیزی سے کہ پونے دو سال کا سارا فاصلہ ایک ہی جست میں پھلانگ گیا۔ مہک بھی اپنا اثر دِکھا رہی تھی۔ پوریں چھو لینے کی خواہش میں اُس کی سمت اُٹھنا چاہتی تھیں۔

ڈاکٹر ساجدہ کا سپاٹ چہرہ اُس کی جانب مڑا اور کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا۔

زیبو رُک گئی......اُسے دیکھا......پہچانا......کہا:

''اوہ محسن صاحب خیریت تو ہے نا؟''

وہ ہڑبڑا گیا۔

اٹھی ہوئی پوریں لیبر روم کی جانب اِشارہ کرتے ہوئے کپکپا رہی تھیں۔

زیبو کچھ سمجھتے ہوئے کہنے لگی۔

''اچھا اچھا جو اندر پیشنٹ ہے' وہ آپ کی بیگم ہیں' فکر نہ کریں' اللہ خیر کرے گا''

اور وہ پاس سے گزر گئی......

یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا۔

روشنی پھیلی'

مہک اٹھی'

پوریں جاگیں

اور......وہ لمحہ گزر گیا......

مگر یوں کہ محسن پر قیامت ڈھا گیا تھا۔

''اللہ خیر کرے گا''

اس کے کانوں میں دعائیہ جملہ گونج رہا تھا۔

اندر بہت ہی اندر' وہاں جہاں کچھ مَسلا گیا تھا' کچلا گیا تھا' ایک سوئی ہوئی خواہش ڈھٹائی سے بڑبڑائی۔

اندر کی بڑبڑاہٹ کا مفہوم وہ نہ تھا' جو ابھی ابھی فضا میں بکھرا تھا اور کانوں میں گونج رہا تھا۔

''لَاحول وَلاقُوۃ''

اُس نے جبر کر کے اندر کی بڑبڑاہٹ کو پرے پٹخ دیا اور اسی تصور کا ہیولا بنانے کی کوشش کی' جس میں لبنیٰ کے پہلو میں ننھا سا وجود کلکاریاں مار رہا تھا......اور جس میں ڈاکٹر ساجدہ کو مسکراتے ہوئے اسے مبارک باد دے رہی تھی۔

اُسے ڈاکٹر کی مسکراہٹ زہر لگی۔ تصور بھٹک گیا تھا اب ڈاکٹر چپ چاپ کچھ کہے بغیر کھسک رہی تھی' وہ جسے دیکھ کر مسکرا دیا تھا......

اور وہاں فقط کلکاریاں تھیں۔

''نہیں نہیں......''

اس نے تصور کی مسکراہٹ نوچنا چاہی۔

بدن میں سراسیمگی اُتری جو بڑبڑاہٹ میں ڈھل گئی۔

پاس کھڑا شخص، جو پہلے بھی چونک کر اسے دیکھ چکا تھا' ایک مرتبہ پھر اسے دیکھنے لگا۔ محسن اگرچہ سامنے دیکھ رہا تھا مگر اُسے محسوس ہوا کہ دیکھنے والے کی نظریں اس کے چہرے کو چھید ڈالیں گی۔

بار بار بدلنے والا پہلو ایک بار پھر بدلا......زور زور سے دہرایا۔

''اللہ خیر کرے......اللہ خیر کرے......''

بدن کے اندر کی بڑبڑاہٹ ہونٹوں سے پھسلنے والے لفظوں سے کٹی ہوئی تھی۔ نہ صرف کٹی ہوئی تھی بل کہ اب تو اندر کھلم کھلا نفی ہو رہی تھی۔

وہ بہ ظاہر 'اللہ خیر کرے' کا ورد کر رہا تھا مگر دراصل وہ اندر کی گونجتی خواہش کے پھن کو ''خیر'' کے بھاری پتھر سے کچلنا چاہتا تھا۔ لوگ اسے دلاسا دینے کو آگے بڑھنا چاہتے تھے اور اُس نے سمجھا' اس کے اندر کی گونج سن لی گئی تھی......اُسے لگا' چاروں جانب سے نظریں اس کے بدن میں چھپی چور خواہش کو ٹٹول رہی تھیں۔

اس کی سراسیمگی بڑھتی چلی گئی۔ خیر کا بھاری پتھر تھا جو اس نے اٹھا رکھا تھا اور وہ سیڑھیاں تھیں، جن سے ابھی روشنی پھوٹی تھی' مہک اٹھی اور نتیجے میں پوریں جاگ پڑی تھیں۔

وہ دَرَڑ' دَرَڑ سیڑھیاں اُترتا جا رہا تھا کہ پاؤں دوسرے پاؤں سے الجھ گیا اور وہ شڑاپ لڑھکتا نیچے جا پڑا۔

محض چند سیڑھیاں تھیں جن سے وہ پھسلا تھا اور نیچے جا پڑا تھا......مگر اسے لگ رہا تھا۔ وہ نیچے بہت لڑھکتا چلا جا رہا ہے۔

ننھے منے وجود کے میٹھے انتظار کی لذت کڑواہٹ ہو گئی تھی۔

اور ایک مہک تھی جو کبھی اٹھتی تھی اور کبھی معدوم ہوتی تھی اور روشنی تھی جو کبھی بڑھتی اور کبھی گھٹتی تھی……

اور دو چہرے تھے جو ایک ایک کر کے جل بجھ رہے تھے……

اور وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

''اللہ خیر کرے……اللہ خیر کرے……''

موت کا بوسہ

جب اُس کا جنازہ اُٹھا تو شور وشیون نے دِل کو برچھی بن کر چھید ڈالا تھا۔

مرنے والے مرجاتے ہیں...... دنیا سے منہ پھیرتے ہی اس شورِ قیامت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، جو اُن کے پیاروں کی چھاتیاں ٹوٹ کر اِدھر اُدھر ڈھیر کر دیتی ہیں۔

بیٹے، بیٹیاں، بیوہ، بھائی بہنیں، عزیز واقارب، دوست احباب...... جو جتنا قریب ہوتا ہے اُس کا سینہ اتنی ہی شدت سے ٹوٹتا ہے اور تڑاخ کی آواز چیخ بن کر اُتنے ہی آسمانوں کو چھوتی ہے۔

مسلم ٹاؤن کی گلی نمبر پانچ سے جب اُس کا جنازہ اُٹھا تھا تو رونے والوں کی چیخیں میرے سینے میں برچھی کی طرح اُتری تھیں۔

اور جب اُس کا جنازہ کندھوں پر اُٹھا کر گلی سے باہر لے جایا جارہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ زِندگی اور موت کو کیوں کر سمجھا جاسکتا تھا؟

سارتر جب بچہ تھا اُسے مادام پکارڈ نے چمڑے کی جلد والی ایک ایسی کتاب دِی تھی جس کے اوراق کے کنارے سنہرے تھے۔

میں مرنے والے کے بہت زیادہ قریب نہیں رہا (ویسے بھی کوئی کسی کے بہت زیادہ قریب ہونے کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے؟) تاہم اتنا فاصلہ بھی نہیں تھا کہ میں اس کی شخصیت کی آنچ کو محسوس نہ کرسکتا۔ میری اُس سے کئی ملاقاتیں ہوئیں...... وہ سب ملاقاتیں اوران میں ہونے والی باتیں

مجھے یاد ہیں۔ مگر اِن یادوں اور باتوں میں گردے کا عارضہ کہیں نہیں تھا۔ اُس کے دِل کی خستگی بھی مجھ پر نہ کُھلی تھی اور میں اس تھائی راڈ کے بارے میں جان نہ پایا تھا جو ہزار میں سے ایک مریض کے ہاں باہر سے اندر منتقل ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ سے اُس کے بیمار رہنے کی خبریں آنے لگی تھیں، مگر میرے سامنے ہمیشہ ایک مضبوط دِل والا شخص ہی رہا۔ ایسا شخص جو کچھ بھی نہ تھا اور اَپنی ہمت سے بہت کچھ بن گیا تھا۔

میں اُسے ایسی کتاب کی طرح سمجھتا رہا جس کی جلد سرخ چرم سے بنائی گئی تھی اور جس کے صفحات کے کنارے سنہرے تھے...... اِتنے سنہرے کہ سارے میں روشنی سی کھنڈنے لگتی تھی اور مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ تو زِندگی کی کتاب کھول چکا تھا...... اور اُس میں موجود سوالات کا سامنا کر رہا تھا۔

یہ تو مجھے تب پتہ چلا جب میں نے یونہی اپنے دوست علی کے گھر فون کیا اور بھابی سے اس موت کی خبر ملی جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں...... سُرخ کتاب کے خُونی سوالات میرے سامنے تھے۔ ہر موت پہلے پہل بوکھلا دیا کرتی ہے۔ اُس کی موت نے بھی ایسا ہی کیا۔ مجھے یقین نہ آ رہا تھا مگر ایسا ہو چکا تھا۔

سارتر کا کہنا تھا کہ وہ نوعمری ہی میں کتابیں پڑھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اُس کی ماں کو یہ بات بہت کَھلتی تھی، مگر مادام پکارڈ کا خیال تھا؛ اگر کتاب اچھی ہو تو اُس کا پڑھنا نقصان دِہ نہیں ہوتا۔ اِس حوصلہ افزائی سے سارتر نے ہمت پا کر ''مادام بواری'' پڑھنے کی اِجازت مانگ لی تھی۔ اس کی ماں نے سنا تو پریشان ہو اُٹھی، کہا:

''اگر میرا بیٹا اس عمر ہی میں اِس نوع کی کتابیں پڑھنے لگا تو بڑا ہو کر کیا کرے گا''

سارتر نے معصومیت سے جواب دیا تھا:

''وہی جو اِن کتابوں میں لکھا ہوتا ہے......''

اور کیا' آدمی وہی نہیں کرتا جو اس کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے؟

مگر یہ جو کتابوں میں آدمی مقدور بھر لکھتا ہے' کیا کوئی عین مین وہی کر پاتا ہے......؟

شاید نہیں...... لکھنے والا' نہ پڑھنے والا...... کہ دونوں کے لیے نارسائی گھات لگائے بیٹھی رہتی ہے۔

مرنے والا بے شک کتاب اور قلم سے وابستہ رہا مگر زِندگی اس کے لیے کبھی ویسی نہ رہی تھی جیسی کہ اس نے پڑھی......اور نہ ہی ویسی' جیسی کہ تخلیقی لمحوں کی عطا کے سبب اس نے لکھ دی۔ ایک لکھنے والا جب اِنتہائی اِعتماد سے (یا پھر کمال معصومیت سے) لامکاں سے پرے رسائی کی بات کر رہا ہوتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ نارسائی ہی نے اُس کا مقدر ہونا ہی (شاید وہ ایسا جاننا ہی نہیں چاہتا)......وہی نارسائی جو مرنے والے جیسے ہر سیلف میڈ آدمی کی ذات سے ہونی شُدنی کی طرح بندھ جاتی ہے۔

میں بتا آیا ہوں کہ جب تک وہ زندہ رہا کتاب سے وابستہ رہا...... اور اب مجھے صاف صاف بتانا ہے کہ وہ کتاب سے زِندگی کی لذت کشید کرتا تھا۔ جو کتاب سے یوں وابستہ ہو جاتا ہے اُس کی لیے زِندگی ذرا سی مختلف اور کچھ کچھ حوصلہ افزا ہو جاتی ہے۔ لفظ تھوڑی سی جرأت اور کچھ خوف کے ساتھ ساتھ چپکے سے فرار کا راستہ بھی سجھا دیتا ہے۔ آپ کتاب پڑھ رہے ہوں یا لفظوں کو اپنے لہو سے غسل دِے کر ایک متن تخلیق کر رہے ہوں......تو...... جہاں آپ بہادر ہوتے ہیں عین اُسی لمحے میں بز دل بھی ہوتے ہیں۔ لفظوں کو ڈھال' تلوار اور پناہ گاہ بنانے والے بہادر بز دل...... یہ کیفیت ایک لکھنے والے کو مختلف بھی بنا دیتی ہے۔

سارترا بھی پڑھنے کے لطف کا اسیر ہوا تھا' لکھتا نہ تھا......مگر طرفہ یہ ہے کہ پڑھنے کے سبب ہی مختلف ہو گیا تھا...... مختلف بھی اور عجیب وغریب بھی...... بہادر بھی' بز دل بھی۔ جب اس نے معصومیت سے تڑاق پڑاق کہہ دیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر وہی کرے گا جو کتاب میں لکھا ہوا ہے تو مادام

پکارڈ کا یوں لذّت لینا اچھا لگتا تھا......

ایک لکھنے والا جب لکھتا ہے، تو فوراہی لکھنے نہیں بیٹھ جاتا پہلے وہ حیرت سے زمانے کو دیکھتا ہے......اِتنی حیرت سے کہ وہ سنسنی بن کر اُس کے بدن میں دوڑ جاتی ہے ......تب کہیں اُس کے لفظوں کو زمانہ حیرت سے دیکھتا ہے،یوں جیسے مادام پکارڈ نے ننھے سارتر کو دیکھا تھا۔ زِندگی کا ماحصل لکھنا ہو تو لکھنا مشغلہ نہیں رہتا زِندگی بن جاتا ہے......اور یہی مرنے والے کی زِندگی تھی جس نے اُسے مختلف کر دیا تھا۔

سارتر کی ماں کو مادام پکارڈ کا یوں لذّت لے کر سارتر کے معصوم جملے دہرانا اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ کہتی تھی:

''تم اس لڑکے کو بگاڑ دوگی۔''

جب کہ سارتر خود مادام پکارڈ کی لذّت سے لطف کشید کرتا تھا......اِتنا کہ اُسے وہ موٹی، بھدی، بوڑھی اور بے ڈھب عورت اپنے چہرے کی زردی کے ساتھ نہ دِکھتی تھی......وہ عین وسط سے اُسے دیکھتا تھا اور اُسے ایک سکرٹ نیچے قدموں میں ڈھیر ہوتا نظر آتا تھا......پھر وہ دیکھتا تھا......دیکھنے جیسا دیکھتا......اور دیکھتا ہی رہتا تھا۔

میں نے سارتر کی یہ دل چسپ کہانی پڑھی تو یوں لگا کہ جیسے زِندگی مادام پکارڈ کی طرح ہے ......موٹی، بھدی، زردرو......جس میں مادام بواری کی سطروں جیسی لذّت ہے...... ایسی لذّت کہ جس کے سبب اس کا بھداپن، زردی اور بدصورتی اس کے جامے سمیت اُس کے قدموں میں ڈھیر پڑی ہے۔

اِس زِندگی کے ہاتھ میں وہ کتاب ہے جس کی جلد سُرخ اور جس کے کنارے سنہرے ہیں۔

اور جس میں سوال ہی سوال ہیں۔

ایسے سوال، کہ جن کا کوئی حتمی جواب نہیں ہوتا......بس ایک گماں کا ہیولا اُٹھتا ہے اور ہمیں

اس پر جواب کا التباس ہونے لگتا ہے۔

جب تک معصومیت مادام پکارڈ کے بھرے بھرے کولہوں کی لذّت سے جدا ہو کر زِندگی کی سُرخ کتاب کھولتی ہے‘ تب تک اس کے سوالات دہشت اور خوف قطرہ قطرہ دِل میں اُنڈیل چکے ہوتے ہیں۔

مجھے یاد ہے‘ میں نے اُس کے مرنے کی خبر سنی تھی تو شدید دُکھ نے فوری طور پر مجھے گرفت میں نہ لیا تھا۔ ایسی گرفت میں کہ جس میں دُکھ خنجر کی طرح پوست کاٹتا ہے‘ گوشت چھیدتا سیدھا دل کو چھوتا ہے‘ اَپنی تیز نوک سے۔ تاہم مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب اس کی نعش مسلم ٹاوٴن کی ایک تنگ سی گلی سے چیخوں کے بیچ اُٹھائی گئی تھی تو دُکھ کا یہی خنجر میرے دِل کے پار ہو گیا تھا...... جب گُری روڈ کے قبرستان کے باہر اُس کی نماز جنازہ پڑھائی جا چکی اور لوگ قطار بنا کر اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے تو میں ہک دَک پار کھڑا یہ محسوس کر رہا تھا کہ موت کا چہرہ دیکھنے والے کیسے بالکل مختلف ہو جاتے تھے۔ جب وہ قطار کے اِس طرف ہوتے تھے تو اُن کے چہروں پر اِشتیاق اور تجسس ہوتا تھا‘ مگر جب وہ نعش کی دوسری طرف اُترتے تھے تو تھوڑی سی موت کی زردی بھی اُن کے چہروں پر ملی ہوئی ہوتی تھی۔

تو کیا زِندگی کا انجام یہی موت کی زردی ہے؟

موت کو منہا کر دیں تو دم بہ دم بدلتی کائنات میں زِندگی ہمیں کتنی دِل کش دِکھنے لگتی ہے مگر موت اور فنا کے اس کریہہ چہرے کے ساتھ...... اُف‘ نہ صرف یہ زِندگی بل کہ پوری کائنات کا وجود بھی اِعتبار کھونے لگتا ہے۔

زِندگی کی حقیقت جاننے کے جتن کرنے والے کچھ لوگ پہلے پہل کائنات کو ٹھہرا ہوا اور جامد قرار دیتے رہے مگر بہت جلد مردود ٹھہرے کہ بگ بینگ کے نظریے نے جامد کائنات والی جامد فکر کے پرخچے اُڑا دیے تھے...... یہ جو ایک عظیم دھماکے سے دنیا بنی ہے‘ قطرہ قطرہ اور خلیہ خلیہ بکھر

رہی ہے۔ہم جُرعہ جُرعہ موت سے مانوس ہو چکے ہیں۔

مسلم ٹاؤن کی گلی نمبر پانچ میں جب چیخیں اُٹھی تھیں تو مجھے لگا تھا جیسے اس کا مرنا اس کے پیاروں کے لیے بگ بینگ جیسا تھا......اور......ذرا سا فاصلے سے نظارہ کرنے والوں کے لیے کائنات کے فلک سے محض ایک ستارہ ٹوٹنے کا نظارہ......جو ٹوٹتا ہے' توجہ حاصل کرتا ہے اور گم ہو جاتا ہے......اور پھر یہ زِندگی لشٹم پشٹم آگے بڑھنے لگتی ہے۔

ہم سب قطار میں تھے' علی' اصغر' سعید اور کئی دوسرے......جنہیں میں جانتا تھا وہ بھی......اور جنہیں میں نہیں جانتا تھا وہ بھی۔ کچھ قطار میں مجھ سے آگے' کچھ پیچھے۔ قیوم اِس قطار میں نہ تھا؛ کہ وہ سمجھتا تھا' دوستوں کا صرف زندہ چہرہ ہی دیکھنا چاہیے۔ جب موت بدن بیچ دندناتی پھرتی ہو' تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی قطار سے باہر رہ جائے؟

سب کو اسی قطار میں لگنا پڑتا ہے......بس یوں ہے کہ کوئی سوال کے ساتھ آتا ہے اور کوئی اِستعجاب کے ساتھ۔

''دُکھ تو یہ ہے کہ اس کے سب بچے ابھی چھوٹے ہیں''

ایک آواز سرسراتی ہے......میں پورا دھیان اس آواز پر لگا دیتا ہوں۔

''اور جو کچھ اس کے پاس تھا اُسی کی بیماری پر اُٹھ گیا ہے......''

دوسری آواز اتنی ہی تلخ حقیقت میری سماعتوں میں اُنڈیلتی ہے۔

سارتر کو جب مادام پکارڈ کی سرخ کتاب تحفہ میں ملی تھی اور اُس نے اُسے اپنے نانا کی میز پر رکھ کر کھول لیا تھا تو بہت مایوس ہوا تھا کہ کتاب میں زِندگی کا اِستعجاب نہ تھا' بس سوال ہی سوال تھے۔

جنگ کے بعد کا زمانہ تھا۔ سارتر اور اُس کی ماں اس قدر قریب تھے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہم سن سمجھنے لگے تھے۔ ماں تو اپنے بچے کو کبھی کبھی اپنا محافظ' سردار' اور کبھی ننھا عاشق کہ

کر پکارتی...... مگر کچھ اور بھی تھا جو دونوں کے بیچ ٹھہر سا گیا تھا...... شاید موت...... ہاں وہی موت جو زندہ بدنوں میں اُنڈیل دِی جاتی ہے۔

جب سارتر کی ماں جوان تھی تو حسن اُس پر ٹوٹ کر برساتھا...... سروقد ایسی کہ سب سے پہلے اسی پر نظر ٹھہرتی تھی...... نظر ٹھہرتی کہاں تھی اُس کی شفاف جلد پر پھسلتی رہتی۔ ایک چالیس سالہ بیمار مرد نے اُسے دیکھا تو اُس کا بوسیدہ دِل زور زور سے دھڑکنے لگا...... یوں کہ اُس نے آگے بڑھ کر اُسے پالیا' شادی کرلی اور خوب خوب تیمارداری کرائی۔ پھر ایک بچہ اُس کی گود میں ڈالا اور مر گیا۔ سارتر نے موت کو یوں دیکھا تھا' لہٰذا جب سنہرے کناروں والی سرخ کتاب کھول کر نانا کی میز پر بیٹھا اور یہ سوال پڑھا کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے تو اُس نے لکھا تھا:

''ایک سپاہی بن کر مرنے والوں کا بدلہ لینا''

میں رفتہ رفتہ قطار میں آگے بڑھتا رہا...... حتّٰی کہ وہاں پہنچ گیا جہاں اُس کا چہرہ موت کا بوسہ لے کر ساکت پڑا تھا۔ ایک سیلف میڈ مرا ہوا آدمی۔ ایک ساکت نعش۔ موت کے ہاتھوں بُری طرح نچڑا ہوا جسم۔

میں نے پلٹ کر انہیں دیکھا جو اُس کے پیچھے رہ گئے تھے اور جن کے سامنے مرنے والے کا سارا سفر کالعدم پڑا تھا۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔

موت کے بوسے کی زردی سارے میں کھنڈ گئی تھی۔

میں نے چٹکی بھر زردی وہاں سے اچک لی' جہاں سے وہ پھوٹ رہی تھی اور چپکے سے اپنے چہرے پر مل کر سوچا' یوں بھی تو موت سے بدلہ لیا جا سکتا تھا۔ مگر حادثہ یہ ہوا ہے کہ مرنے والے نے میرا بدن پہن کر موت کا جامہ میری طرف اُچھال دیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ جامہ میرے بدن پر خوب چست بیٹھا ہے۔ میں اس میں خُوش ہوں اور اسے پہن کر ایسی سرخ کتاب کھول چکا ہوں جس کے کنارے بلاشبہ سنہرے سہی مگر اس میں زِندگی کا ایک بھی اِستعجاب نہیں ہے اگر ہیں

تو بس سوال ہی سوال ہیں۔

وراثت میں ملنے والی ناکردہ نیکی

اماں کہتی ہیں' میرے پیدا ہونے کے بعد وہ چھلّہ ہی دھو پائی تھی کہ میرے ابا نے اسے سامان باندھنے کا حکم سنا دیا۔ ڈھور ڈنگر بیچ ڈالے گئے' زمین ٹھیکے پر چڑھا دی گئی اور ابا نے اماں اور مجھ ننھی جان کو ساتھ لے شہر آ کر دم لیا۔ ابا کا خیال تھا' یوں میں ان تمام محرومیوں سے محفوظ رہوں گا جن کے یخ بستہ گھنے سائے تلے وہ خود عمر بھر ٹھٹھرتے رہے۔

میرے نزدیک ابا مرحوم کا تب کا فیصلہ بروقت اور اِنتہائی دانشمندانہ تھا۔

اماں کہتی ہیں؛ تمہارے ابا آنے کو شہر آ گئے تھے مگر جب تک زندہ رہے ان کی روح گاؤں کی گرد آلود گلیوں میں ہی بھٹکتی رہی۔

دادی اماں تو تب ہی فوت ہو گئی تھیں جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم گاؤں سے شہر آ گئے تو دادا جان نے چپکے سے اپنے اندر کو دُکھ کا گھن لگا لیا۔ اماں کہتی ہیں؛ دادا جان نے ابا کو شہر منتقل ہونے سے نہ روکا تھا البتہ جب شہر کے لیے روانہ ہونے لگے تھے' تو اُن آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے جنہیں کبھی کسی نے روتے نہ دیکھا تھا۔

جب دُکھ کے گھن نے دادا جان کو اندر ہی اندر سے چاٹ لیا تو وہ ایک رات چپکے سے مر

گئے۔

ابا میری طرح دادا جان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ دادا کا مرنا تھا کہ حویلی خالی ہوگئی۔ اماں کہتی ہیں یہ وہ حویلی تھی جس کے ایک کمرے میں اسے نے کئی برس پہلے رات بھر زِندگی اور موت کی خوفناک جنگ کے بیچ میری پہلی چیخ سنی تھی۔ اسے وہ چیخ اب تک نہیں بھولتی' جو موت کی شکست اور ہم دونوں کی زِندگی کی فتح کا اعلان تھی۔ اسے وہ حویلی اس لیے بھی یاد آتی تھی کہ اس نے شادی کے بعد وہیں قدم رکھا تھا اور میٹھی یادوں کی ایک تسبیح تھی' جس کے موتی اس حویلی کے کونے کونے میں بکھرے پڑے تھے۔

مگر حویلی خالی ہوگئی تو خالی پن سے بوسیدگی کے وسوسے نے ابا کے کانوں میں ذیلداروں کی بات مان لینے کی سرگوشی انڈیلی' جو حویلی کی قیمت تھامے ابا کے سامنے بیٹھے تھے۔

اور یوں حویلی بِک گئی۔

ابا کے پاؤں تلے سے گاؤں کی زمین اُسی روز کھسک گئی تھی جب وہ اماں اور مجھے لے کر شہر منتقل ہوے تھے۔ دادا جان کے مرنے اور حویلی کے بکنے کے بعد زمین ہاتھوں سے بھی کھسکنے لگی۔ ٹھیکیدار' کہ جن سے ٹھیکے کی رقم لینے ابا کو گاؤں کے کئی کئی پھیرے لگانے پڑتے تھے' اب وہ زمین کا سودا کرنے خود ابا کے پاس آرہے تھے۔ ابا کے نزدیک معاوضہ اچھا خاصا تھا۔ شہری زِندگی کی عمارت میں جگہ جگہ ضرورتوں کے شگاف پڑ گئے تھے۔ زمین بِک گئی تو ان شگافوں کو بھی کسی حد تک پاٹنے میں مدد ملی۔

بہ ظاہر گاؤں سے تعلق کے سارے واسطے ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے تھے مگر ابا اُپنی حیاتی کے آخری لمحے تک گاؤں سے جڑے رہے۔ گاؤں کے سادہ لوح دیہاتی اور عزیز و اقارب شہر میں اپنے چھوٹے موٹے کاموں سے لے کر پیچیدہ سے پیچیدہ امور کے حل کے لیے ابا سے رابطہ کرتے تھے۔ اور جب میں چیزوں کو سمجھنے لگا تو محسوس کیا' ابا کی روح ان لوگوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ گاؤں سے لوگ آتے' پہروں مجلسیں جمتیں' احوال پوچھے جاتے' کبھی کسی کے ساتھ پٹوار

خانے جاتے تو کبھی تھانے کچہری کا چکر لگاتے۔ شام گئے پلٹتے تو بدن تھکن سے چور ہوتا مگر ایک سرشاری چہرے پر بشاشت بن کر تیر رہی ہوتی۔

ابا مرے تو بھی کچھ عرصہ تک لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں' میرے پاس آتے رہے۔ وہ سب کچھ میرے بس میں نہ تھا جو ابا ان کے لیے کیا کرتے تھے۔ میرے پاس وقت نہ تھا کہ اُن کی باتیں سنوں' ہم دردی کے الفاظ نہ تھے کہ ان کے دُکھوں پر مرہم رکھ سکوں۔ بے ساختہ قہقہے نہ تھے کہ اُن کے غیر دل چسپ قصوں پر موقع بے موقع لگا سکوں۔ پٹواریوں کے پاس جاتا' تحصیل اور کچہریوں کے چکر لگاتا تو کیوں؟ کہ کئی اہم کام کرنے کو پڑے تھے۔

تو یوں تھا کہ میرا رویہ خود بخود ایک دیوار گاؤں اور میرے بیچ بلند کرتا چلا گیا تھا۔

مگر وہ بوڑھا' کہ جسے میری بیٹی نے ماڈل بنا رکھا تھا' اسی دیوار میں اپنی معصومیت اور اُمید کے تیشے سے اپنے لیے جگہ بنا کر مجھ تک آ پہنچا تھا۔

بدن پر میلے چکٹ بوسیدہ کپڑے' پاؤں برہنہ' کمر خمیدہ' بال مسافت کی گرد سے اَٹے ہوئے۔ وہ لاٹھی ٹیکتا اندر داخل ہوا۔ مجھے لان میں بیٹھے دیکھا تو سیدھا وہیں آ گیا۔ میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی...... وہاں جھریوں نے جالا بن رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ میری نظریں پھسلتے پھسلتے اس کے قدموں پر جا پڑیں جو تھکاوٹ سے لڑکھڑا رہے تھے۔ گرد سے پھٹی ایڑیاں خُون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ وہ دَھم سے میرے قدموں میں یوں بیٹھ گیا کہ چند ثانیے اور نہ بیٹھتا تو خود بخود گر پڑتا۔ جب وہ اپنی سانسیں بحال کر چکا تو کہنے لگا:

''میاں برخوردار! تُو چوہدری شہباز خان کا بیٹا طاہر خان ہے نا؟''

میری جانب سے اثبات پر اس نے ابا کے ساتھ اپنے تعلق خاص کا ذِکر کچھ ایسی محبت اور عقیدت سے کیا کہ میں اس تذکرے کی مہک سے مسحور ہوتا چلا گیا۔ باتوں سے اُس کا جی نہ بھرتا تھا اور اس کی باتوں کی کشش مجھے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ مگر مجھے چند ضروری امور انجام دینے تھے۔ اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ اور روا روی میں کہا:

''باباجی کوئی میرے لائق خدمت؟''

اس کا چہرہ کھل اٹھا' کھسک کر میرے اور قریب ہوگیا' پھر ڈھیروں دعاؤں کے بعد کہنے لگا:

''بیٹا سنا ہے تم بہت بڑے افسر لگے ہوئے ہو' میرا بیٹا اکرم ہے نا وہ ایک عرصے سے بے روزگار پھر رہا ہے۔ اس کی ملازمت کا بندوبست کردو۔ زمین کا جو ایک ٹکڑا تھا وہ بیچ باچ کر اس کے پڑھنے کا شوق پورا کیا۔ سوچا تھا' پڑھ لکھ جائے گا تو اپنے جوگا بھی ہوگا اور ہمیں بھی بڑھاپے میں سہارا دے گا مگر یونہی جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے مایوسی نے اسے چڑچڑا کر دیا ہے۔ بیٹا تم ہی کچھ کرونا۔ کرو گے نا کچھ اس کے لیے......؟''

میں نے اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا:

''ہاں ہاں کیوں نہیں' اپنے بیٹے کو میرے پاس دفتر بھیج دینا''

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہونے کو اٹھا ہی تھا کہ میری بیٹی مدیحہ آگئی۔ اُسے دیکھا' ٹھٹھک کر وہیں کھڑی ہوگئی۔ کہنے لگی:

''ونڈر فل...... مجھے ایسے ہی چہرے کی ضرورت تھی۔''

پھر وہ مجھ سے اصرار کرنے لگی کہ باباجی کو روک لوں تاکہ وہ اس کا پورٹریٹ بنا سکے۔

بوڑھا میری بات مان گیا۔

مدیحہ اپنے ضروری سامان کے ساتھ جھٹ لان میں پلٹی اور پوری یکسوئی سے کینوس پر بوڑھے کے چہرے کی جھریاں منتقل کرنے لگی۔

میں انہیں وہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

اماں کو دُکھ تھا کہ میرے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی تھی۔ اماں کے نزدیک دادا جان خُوش قسمت تھے جو ان کے ہاں میرے ابا پیدا ہوئے تھے اور ابا مقدر والے تھے کہ میں ان کے آنگن کا پھول بنا......مگر میری قسمت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتی تھیں۔ مجھے

اماں کے اس رویے پر حیرت ہوتی۔ کیوں کہ مدیحہ مجھے بہت عزیز تھی۔ شاید اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اس سے اتنا پیار نہ کر سکتا' جتنا میں اپنی بیٹی کو کرتا ہوں۔ مدیحہ فائن آرٹس کی فائنل ایئر کی طالبہ ہے۔ مگر اس کم سنی میں ہی اس نے فن مصوری میں وہ کمال حاصل کیا ہے کہ اس کا نام اب ملک کے چوٹی کے چند فن کاروں میں ہونے لگا ہے۔

پچھلے دنوں جب وزارت ثقافت نے عالمی مقابلہ میں شرکت کے لیے پورٹریٹس طلب کیے تو مجھے حیرت ہوئی کہ مدیحہ اس کے لیے کوئی تیاری نہ کر رہی تھی۔ وجہ پوچھی۔ کہنے لگی:

''ابھی تک ایسا چہرہ ہی نہیں ملا جس کا پورٹریٹ بنا سکوں۔ وہ اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق کام کرنے کی عادی ہے۔ میں چاہتا تو اس کی گیلری سے کوئی بھی فن پارہ اٹھا کر مقابلے میں شرکت کے لیے وزارت کو بھجوا دیتا۔ سیکرٹری صاحب سے میری اتنی علیک سلیک تھی کہ وہ اس فن پارے کو دوسرے منتخبہ فن پاروں کے ساتھ بیرون ملک مقابلے میں بھیج دیتے...... مگر خدشہ تھا کہ اس طرح مدیحہ بپھر جائے گی کہ ایسا سب کچھ وہ پسند نہیں کرتی۔

جوں جوں مقابلے میں شرکت کی آخری تاریخ قریب آ رہی تھی' مدیحہ کی بے قراری بڑھتی چلی جاتی تھی۔ میرے پاس لان میں بیٹھے بوڑھے پر نظر پڑتے ہی وہ کھل اٹھی تھی۔ جب میں گھر سے نکل رہا تھا تو وہ بنیادی خاکہ بنا رہی تھی اور جب واپس پلٹا تو بوڑھا جا چکا تھا اور مدیحہ اپنے کمرے میں بند ہو چکی تھی۔

چند روز بعد ابھی میں دفتر نہ گیا تھا' مدیحہ خُوش خُوش میری راہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی:

''میں آج بہت خُوش ہوں''

حالاں کہ اُسے یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ مسرت اُس کے چہرے کے خلیے خلیے سے چھلک رہی تھی۔ مجھے کھینچتے کھینچتے اپنے کمرے میں لے گئی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے کسی بھی فن پارے کے بارے میں فنی رائے دینے کا سلیقہ نہیں آتا مگر مدیحہ نے ایسا فن پارہ تخلیق کیا تھا کہ دِل پر ہاتھ

پڑتا تھا۔ بوڑھا اپنے جھریوں بھرے چہرے کے ساتھ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو:

''میرے بیٹے کو ملازمت دو گے نا؟''

میں نے مدیحہ کو دیکھا وہ خُوشی میں نہال تھی۔

جس نے میری بیٹی کو اتنی خُوشیاں دی تھیں میں اس کے لیے معمولی سا کام کیوں نہ کروں گا۔ دفتر میں ایک آسامی خالی تھی۔ کسی نہ کسی کو تو اُسے پر کرنا ہی تھا۔ دِل میں عہد کیا' کوئی اور کیوں؟ بوڑھے کا بیٹا ہی سہی۔

جب میں دفتر جانے لگا' تب تک مدیحہ پورٹریٹ کر فریم میں لگا کر پیک کر چکی تھی۔ کہنے لگی:

''آج مقابلے میں شرکت کے لیے فن پارے بھجوانے کی آخری تاریخ ہے۔ اگر وقت ہو تو اسے وزارت کے دفتر جمع کراتا چلوں۔''

میں نے کہا:

''کیوں نہیں......؟......میرے پاس وقت نہ بھی ہو تو اپنی پیاری سی بیٹی کے لیے ضرور نکال لوں گا''

ہنس کر کہنے لگی:

''ایک بات یاد رکھیے گا کہ مجھے یہ پورٹریٹ ہر قیمت پر واپس بھی چاہیے۔ اگر مقابلے کے بعد واپس مل سکے تو جمع کرائیں' ورنہ واپس لیتے آئیں کہ اس شاہکار کی تخلیق ہی میری سب سے بڑی خُوش بختی ہے۔''

میں سیدھا وزارت کے دفتر پہنچا۔ مطلوبہ معلومات حاصل کیں' کوائف لکھوائے' پورٹریٹ جمع کرایا اور ابھی واپس پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ فصیح الدین سے سامنا ہو گیا۔ وہ مجھے دِیکھتے ہی خُوشی سے کِھل اُٹھا۔ اصرار کر کے مجھے چائے کے لیے روکا۔ میرے آنے کا مقصد جاننے کے بعد کہنے لگا:

''چیئرمین کمیٹی اپنا یار ہے دوست' فکر نہ کرو تمہاری بیٹی کا پورٹریٹ مقابلے کے لیے ضرور بھیجا جائے گا۔''

میں مدیحہ کے لیے سفارش نہیں کرنا چاہتا تھا کہ سفارش کرنے پر وہ چڑ جاتی تھی مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کہہ دِیا کہ وہ خیال رکھے...... حالاں کہ مجھے یقین تھا مدیحہ کے بنائے ہوئے پورٹریٹ کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اُٹھنے لگا تو فصیح الدین کہنے لگا:

''فاطاں میرے ہاں مدت سے گھریلو کام کرتی ہے۔ سچ پوچھو تو گھر کا سارا انظام اُسی نے سنبھال رکھا ہے۔ اس کے بیٹے کو ملازمت چاہیے۔ رکھنے کو تو میں اسے یہاں رکھ لیتا لیکن مجھے کچھ آک ورڈ لگتا ہے۔ ایک اور جگہ اسے ملازمت ملی ہے اور اب وہ ماں کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ منتقل ہو جائے جب کہ ہم فاطاں کا یوں چلے جانا افورڈ نہیں کر سکتے۔ اس طرح تو گھر کا سارا انظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اب آپ کو دیکھا ہے تو ایک خیال آیا ہے...... کیوں نہ آپ اسے دفتر میں ملازم رکھ لیں آپ کا دفتر تو ہمارے گھر کے قریب ہی ہے نا۔ اس طرح فاطاں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ کوئی آسامی خالی ہوگی نا آپ کے دفتر میں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں!''

میں نے کہا' پھر فاطاں کے بیٹے کو دفتر بھیجنے کا کہہ دیا۔ اگلے روز میں دفتر میں بیٹھا ہی تھا کہ فصیح الدین نے لڑکا دفتر بھیج دیا......ضروری کارروائی مکمل ہوئی اور تقرر نامہ جاری کر دیا گیا۔

اُسی روز کہ جب فصیح الدین کی ملازمہ فاطاں کے بیٹے کی ملازمت کی چھٹی میرے دستخطوں سے جاری ہوئی تھی...... ہاں اسی روز میرے ابا کی خُوش گوار یادوں کے سہارے مجھ تک پہنچنے والے بوڑھے کا بیٹا اکرم بھی دفتر آ دھمکا۔ آسامی ایک تھی اور وہ پُر ہو چکی تھی۔ میں اکرم کو خُوش اُسلوبی سے ٹالنا چاہتا تھا کہ اس کے بوڑھے باپ کی وجہ سے میری بیٹی نے ایک شاہ کار پورٹریٹ تخلیق کیا تھا۔ لہٰذا اس کی تسلی کے لیے اس سے اسناد لیں' سٹینو سے کہا کہ جتنے محکمے اس کے ذہن میں آتے تھے سب کو اس کی ملازمت کے لیے درخواستیں بمعہ اسناد کی عکسی نقول بھیج دے۔

پھر اکرم سے کہا فی الحال ہمارے ہاں کوئی آسامی خالی نہیں ہے' ہاں کوشش کروں گا کہ کہیں نہ کہیں اسے ملازمت مل جائے۔

وہ مطمئن ہو گیا تو میں نے اسے واپس چلے جانے اور انتظار کرنے کو کہا۔

اب میں بھی مطمئن تھا کہ نہ تو بوڑھا پلٹے گا اور نہ ہی اس کا بیٹا۔ میرے پاس وقت نہ تھا کہ میں مختلف محکموں میں اس کے لیے سفارش کرتا پھرتا...... لہٰذا بات آئی گئی ہو گئی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا اور ایک روز یوں ہوا کہ میری بیٹی خُوشی سے چیختی چلاتی داخل ہوئی' مجھے دیکھتے ہی کانگر یچولیشن کا نعرہ لگایا اور مجھ سے چمٹ گئی۔ پوچھا:

''ارے ارے کس بات کی مبارکباد؟''

کہنے لگی:

''میرا پورٹریٹ بیرون ملک مقابلے میں شرکت کے لیے جانے والے فن پاروں میں شامل کر لیا گیا ہے۔''

میں نے خُوش ہو کر کہا:

''مجھے یقین تھا بیٹی کہ ایسا ضرور ہو گا اس لیے کہ تم ڈیز رو کرتی ہو''

مدیحہ نے نفی میں سر ہلایا۔ کہا:

''ہوں ہونہہ...... اس میں ان باباجی کا کمال ہے جو باہر لان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔''

باباجی؟......'' میں بڑبڑایا۔

''ہاں باباجی'' ...... اُس نے دہرایا۔

میں دَم بخود کھڑا تھا۔ مدیحہ اصرار کرنے لگی کہ باہر لان میں باباجی کے پاس چلتے ہیں۔ ندامت نے میرے قدم جکڑ رکھے تھے۔ اس نے میرا بازو چھوڑا اور سامنے کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی:

''مجھے آپ کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے''

''میرا شکریہ؟'': میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں آپ شکریہ'': وہ چہک کر بولی:

''اس لیے کہ آپ نے میرے محسن بابا جی کے بیٹے کو ملازمت دلوانے میں مدد کی ہے''

میں کچھ نہ سمجھ رہا تھا اور جب میں لان میں بوڑھے کے مقابل کھڑا تھا تو اس نے کہا:

''بیٹے تم نیکو کار کی اولاد ہو' اپنی مٹی سے تعلق جوڑے رکھنے والے کی اولاد۔ تم نے مجھ سے یہ نیکی کر کے مجھے ساری حیاتی کے لیے خرید لیا ہے۔ تمہاری کوششوں سے میرے اکرم کو نوکری مل گئی۔ لوگ بکواس کرتے ہیں کہ تم اپنوں کے کام نہیں کرتے۔ تم تو بالکل اپنے باپ کی طرح نیک اور اپنوں کے کام آنے والے ہو۔''

وہ مسلسل مجھے دعائیں دے رہا تھا۔ میں نے مدیحہ کو دیکھا۔ وہ تحسین بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی......اور میں دعاؤں اور نظروں کی ٹکٹکی پر چڑھا اور اشت میں ملنے والی ناکردہ نیکی کو اپنے اندر ٹٹول رہا تھا۔

آٹھوں گانٹھ کمیت

یوں نہیں ہے کہ میری بیوی میرا دِھیان نہیں رَکھتی بل کہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کم بخت کا دِھیان میری ہی طرف رہتا ہے۔ اَجی یہ کم بخت جو میری جیبھ سے پھسل پڑا ہے تو اس سے یہ تخمینے مت لگا بیٹھنا کہ خدانخواستہ ہم دونوں میں محبت نہیں ہے۔ میں اس خُوشبو بھرے جذبے سے دست کش ہو سکتا ہوں، نہ میری بیوی، کہ یہ سالی محبت ہی تو ہے جس کی آڑ میں کئی جھلاہٹوں کو جھاڑنے کا موقع مل جاتا ہے اور زِندگی گوارا ہو جاتی ہے۔

یہ جو میں نے محبت کو سالی کہا ہے تو خاطر جمع رکھو کہ سالی کی محبت میں نہیں کہا بل کہ سالی کی بہن کی محبت میں کہا ہے، جو اِتفاق سے میری جورو بھی ہے۔ یہ غریب کی جورو کی طرح نہیں کہ ہر ایک کی بھابی ہو جائے، ساری محبت مجھ پہ لٹاتی ہے اور مجھے دِھیان میں رَکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ سارے، جو شادی سے پہلے اس کے اَپنے تھے، فاصلوں پر بیٹھے ہیں اور ہم دونوں کے بیچ کوئی فصل نہیں ہے...... مگر مجھ پر یہ افتاد آ پڑی ہے کہ میں اس کے بہت زِیادہ دِھیان سے بہت زِیادہ اُلجھنے لگا ہوں۔

میں کئی کام اَپنی مرضی اور اَپنی سہولت سے کرنا چاہتا ہوں، مزے لے لے کر، اور ہونے والے کام کے ایک ایک مرحلے سے لطف اُٹھا کر۔ وہ ہر بار میری اِس عادت کو سُست روی سے

تعبیر کرتے ہوئے طعنہ زَن ہو جاتی ہے کہ میں کچھوا ہو گیا ہوں۔ اِسی طرح میں کئی ایسے امور کو، جنہیں وہ اہم سمجھتی ہے، جیسے تیسے نمٹا کر ایک طرف ہو جانا چاہتا ہوں۔ وہ اڑنگا لگا کر مجھے عین بیچ میں گرا لیتی ہے؛ کہتی ہے:

''یہ چھلانگیں لگا کر کہاں نکلے جاتے ہیں آپ؟''

ایسے میں، میں سمجھتا ہوں کہ میرا اُلجھنا بنتا ہے۔

مجھ سے اُلجھتے رہنے میں اُسے لطف آتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس اُلجھا اُلجھی میں وہ ایسے لذّت لیتے محسوس ہوتی ہے جیسے میں اَپنی چھاتی کے بالوں میں اُس کی اُنگلیاں اُلجھنے پر لیا کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ یہ سب کچھ خلوص نیت اور میری محبت میں کر رہی ہوتی ہے۔ محبت میں جو کچھ وہ کرسکتی ہے کرتی ہے......او......ر......ر...... میں ٹھس آدمی نہیں ہوں، مجھ سے بھی جو بن پڑتا ہے کرتا ہوں مگر یوں ہے کہ میں اِظہار نہیں کرتا۔ جب اُس سے محبت کرتا ہوں، تو اُسے خود جان لینا چاہیے کہ محبت کرتا ہوں۔ کہنا تو جتانے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ بدلے میں ویسے ہی جذبوں کے مطالبے کے ساتھ۔ کتنا چھچھورا پن ہے یہ؟ مگر وہ اِس معاملے میں حد درجہ چھچھوری ہے۔ چھچھوری بھی اور لالچی بھی۔ جتنا کہتی اور کرتی ہے اس سے کئی گنا زیادہ کا مطالبہ سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ مجھے محبت کے سلسلے میں گُھنا کہتی ہے۔ میں نہیں جانتا اس سے اُس کی مراد کیا ہوتی ہے تاہم جب وہ ایسا کہتی ہے تو میں آدھا مطمئن اور آدھا مضطرب ہو جاتا ہوں۔ یہ جو آدھا آدھا تقسیم ہونا ہے، یہ مجھے حد درجہ لطف اَندوز کرتا ہے۔

مگر......اور یہ مگر میں نے اِس لیے کہا ہے کہ اَب میں اِس مزے کے غارت ہونے کی بات دہرانے لگا ہوں۔ میں نے کہا نا، یہ سارا مزہ تب غارت ہوتا ہے جب اُس کا دِھیان مسلسل میری ہی طرف رہنے لگتا ہے۔ اور سنو! میں ایسے میں مشتعل ہو جایا کرتا ہوں۔ مشتعل بھی اور اَندر سے باغی بھی۔ اس کھدر وجود سے باغی جو وہ اَپنے نہ ٹوٹنے والے دِھیان دَھاگے سے بُنتی

رہتی ہے۔

بس یوں جان لو کہ میں گھر میں وہ نہیں ہوں، جو باہر ہوتا ہوں۔ گھر میں بس وہ ہی وہ ہوتی ہے۔ یا اس کی محبت میں ڈھلا ڈھلایا میرا وہ وجود جس سے میں بغاوت کر چکا ہوں۔

''آج آپ بتائیں نا کیا پکاؤں۔''

''زین، نومی کیا کرتے ہو ڈیڈی کو سب آوازیں جا رہی ہیں۔''

''اے بہن کیسے وقت آ گئی ہو، وہ گھر پر ہیں، ابھی اُن کے لیے مجھے شاہی ٹکڑے بنانے ہیں۔''

''واش روم اچھی طرح صاف کرنا نگوڑی، زین کے ڈیڈی صبح شیو کرتے ہوئے بُو سے بچنے کو ناک سکیڑ رہے تھے۔''

''اِدھر کچن ہی میں آ جائیں نا، اُدھر اکیلے میں پڑے کیا چھت کو گھور رہے جاتے ہیں۔''

''بہن میں یہی سوٹ سلواؤں گی، زین کے ڈیڈی کو یہ رنگ تو بہت پسند ہے۔''

''اوہ آپ اِدھر کہاں گھسے آتے ہیں، پیاز کاٹ رہی ہوں، آنکھوں میں چبھن ہو گی۔''

''کیا کہا قورمہ بنا لوں، ...... بنا تو لوں...... مگر آپ کھانے کو بیٹھتے ہیں تو ہاتھ کھینچتے ہی نہیں...... پہلے ہی ڈِھڈی نکل آئی ہے''

''اے ہے، دودھ لاتے ہو کہ نل کے نیچے سے ڈبا اُچک لاتے ہو۔ زین کے ڈیڈی کو اِس کی چائے ذرا نہیں بھاتی۔''

غرض بات بات میں وہ مجھے ڈال لیتی ہے کہیں چٹکی میں لے کر...... یوں، جیسے آٹے میں نمک ڈالتے ہیں، کہیں قلاوہ بھر کر...... کچھ اِس وَالہانہ پن سے کہ اُسے کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔ نہ بچوں کے اَندر، نہ اُس خاتون میں جو اُسے ملنے آئی ہوتی ہے۔ کام کاج میں ہاتھ بٹانے والی، سائیکل کے کیریئر پر میلے کپڑوں کی گٹھڑی لے جانے والا دھوبی، گیٹ کھٹکھٹا کر کچرا وصول کرنے

والا‘ دُودھ والا‘ اخبار والا‘ باہر سے گھنٹیاں بجا بجا کر بھیک طلب کرنے والا‘ گلی گلی پھر کر ’’سپارے‘ قاعدے‘ نور نامے‘ جنتریاں‘‘ کی آوازیں لگانے والا‘ گھر کے اندر گُھس آنے والی نوجوان سیلز گرل جو اِمپورٹیڈ پیڈز‘ انڈر گارمنٹس‘ میک اَپ کا سامان اور نہ جانے کیا کچھ بیچتی پھرتی ہے...... سب کے اَندر سے میں نکل آتا ہوں۔

’’یہ اخبار اُنہیں پسند نہیں بدل دو‘ وہ کہتے ہیں کوئی خبر ہی نہیں ہوتی اس میں۔‘‘

’’ذرا دیکھنا بھائی‘ کچرے میں ان کا کوئی ضروری کاغذ نہ چلا جائے۔‘‘

’’ذرا دَم بھی لیا کرو بابا زین کے ڈیڈی آرام کر رہے ہیں اور تم گھنٹی پر گھنٹی بجائے جاتے ہو۔‘‘

’’میں یہ جنتریاں لے کر کیا کروں گی ان کی اَپنی کتابیں سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔‘‘

’’رہنے دے یہ ساوی گچار‘ اُنہیں تو بلیک انڈر گارمنٹس ہی اَچھے لگتے ہیں۔‘‘

’’اے ہے اس کی تو ٹک ہی نہیں کھلتی‘ وُہ اِسی میں اُلجھے رہیں گے۔‘‘

باتیں کرتے کرتے وہ ہنستی ہے‘ کبھی تو بے اِرادہ‘ جیسے بند ٹوٹنے پر سارا پانی ایک ہی ہلے میں بہہ نکلے...... اور کبھی طے کر کے‘ ہنسی کو روک روک کر چھوڑتے ہوئے‘ یوں جیسے پائپ ٹونٹی پر چڑھا ہو اور سرے پر انگوٹھا دَھرا ہو۔ جب چاہا دَبا لیا‘ جب چاہا چُس چُس کر کے گرتے پانی کی تیز دَھار بنالی۔ اُس کی ہنسی میں ایک خمار ہے...... اور ایک چٹکی بھی۔ یہ خمار وہ خود رَکھ لیتی ہے اور چٹکی میری سمت اُچھال دیتی ہے۔ میں اسٹڈی میں ہوں یا بیڈ روم میں‘ لاونج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہوں یا ٹیرس پر دُھوپ سینکوں‘ مجھے اُس کی آوازیں مسلسل آتی رہتی ہیں اور پتہ چلتا رہتا ہے کہ کب اُس نے آنکھیں شرارت سے نچائی ہیں‘ کب سر کو میری سمت جنبش دِی ہے اور کب فقط ایک جملہ اَدا کرتے ہوئے پورے بدن کو یوں جھول جانے دیا گیا ہے جیسے رنگ دی ہوئی چنری کو جھلا را دیتے ہیں۔

اتوار چوں کہ چھٹی کا روز ہوتا ہے لہذا میں دیر سے اٹھتا ہوں۔

میں بھی اور وہ بھی۔

بل کہ سچ تو یہ ہے کہ وہ جب تک لیٹنا چاہتی ہے، مجھے اُٹھنے ہی نہیں دیتی۔ میں جانتا ہوں کہ جب وہ سچ مچ سوئی ہوتی ہے تو اس کے سانسوں کے آہنگ اور بدن کی خُوشبو میں عجب سا اَلھڑ پنا اُتر آتا ہے۔ اور جب وہ جاگنے کے بعد بھی مکر مار کر پڑی رہتی ہے، خود کو سوتا ظاہر کرنے کے لیے، تو سانسیں ہموار ہو جاتی ہیں اور مہک میں رخنے پڑنے لگتے ہیں۔

تو وہ اتوار کی صبح تھی۔ اُس کی سانسیں ہموار ہوئے آدھ گھنٹے سے بھی زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔

اور وہ لمحہ آ گیا تھا کہ جب میں نے سوچا تھا کہ سارا دن میں وہ بن کر نہ رہوں گا جو اس نے مجھے بنا کر رکھا ہوا ہے۔ کہیں نکل بھاگوں گا۔ کہیں بھی۔ مفرور لمحوں کا ساتھ دینے کے لیے۔ جی، یہ میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

اس کا بازو میرے اُوپر تھا، پھول سا بازو۔ مگر جب میں نے فیصلہ کر لیا تو اس کا بازو، وزن میں پہاڑ سا لگ رہا تھا اور اس کے تلے میری چھاتی دبنے لگی تھی۔

میں نے سوچا اگر میں تھوڑا سا دائیں کو کھسکتا ہوں اور دائیں ہی کو پہلو بدلتا ہوں تو وہ اپنے بازو سمیت پوری کی پوری وہیں پڑی رہ جائے گی اور میں بہ سہولت نکل جاؤں گا۔ میں نے کھسکنے سے پہلے اُس کے چہرے کو دیکھا، ہونٹوں پر تھوڑا سا دباؤ تھا۔ ننھی مُنّی ناک کے نتھنوں کے دونوں طرف گال قدرے پھول رہے تھے۔ بند آنکھوں کے تلے خفیف سے لرزے کا شائبہ سا ہوتا تھا۔ نظریں چہرے سے پھسلتی نیچے آئیں۔ شفاف گردن میں دونوں طرف کی رَگوں میں کچھ کھچاؤ تھا۔ نرخرہ سوتے وقت جہاں پڑا ہونا چاہیے، وہاں نہیں تھا، ذرا اوپر کو تیر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سچ مچ سو نہیں رہی تھی، سونے کا ڈرامہ کر رہی تھی۔ میں مزید محتاط ہو گیا

اور سارے بدن کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ مگر یہ اِحتیاط اُلٹی پڑی کہ ایک تناؤ سا خلیے خلیے میں تیر گیا تھا۔ اس کا بدن ایسا کایاں ہے کہ اِدھر کی معمولی سی لرزش کو بھی فوراً گرفت میں لے لیتا ہے۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا مگر ایسا ہو گیا تھا تاہم مجھے ہمت تو کرنا ہی تھی۔ ہمت کی بھی۔ مگر اس سے پہلے کہ کھسک کر پہلو بدلتا اور اٹھ جاتا' اس کے بازو میں تناؤ آ گیا۔ وزن بڑھتا گیا۔ اتنا زیادہ کہ میری چھاتی چیخ گئی۔

لو مزے کی بات سنو......اِس چیختی ہوئی چھاتی کو سہلانے میں اُس لڑکی کو بہت مزا آتا ہے جس سے میں محبت نہیں کر سکتا۔ تم ہی کہو بھلا ایک شوہر ایک محبت کرنے والی بیوی کے ہوتے ہوئے ایک ایسی لڑکی سے کیسے محبت کر سکتا ہے جس کا بازو کسی بھی اُچھی لگنے والی لڑکی کے لیے بہ سہولت جھٹکا جا سکتا ہو۔

(یہ کہانی پہلے پنجابی میں لکھی گئی تھی)

پارو

جب وہ آنگن چت کبرے کو باندھ رہا تھا تو دھیرے دھیرے یہ بھی بڑبڑا رہا تھا:

''جب اساڑھ آئے گا اور بھڑولے بھر جائیں گے تو تجھ جیسا ایک اور ضرور لاؤں گا''

کھونٹے سے بندھی رسی کو اس نے کھینچ کر گرہ کی مضبوطی کا اِطمینان کیا پھر سیدھا کھڑا ہو گیا اور چت کبرے کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

ایسا کرنے پر اسکے بدن میں عجب سی سرشاری اترنے لگی۔

ابھی اطمینان کی یہ سرشاری پوری طرح اس کے بدن میں نہ اُتر پائی تھی کہ اُسے اَپنی پُشت پر بے ہنگم سانسوں کے طوفان کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے گھوما' مگر تب تک یہی بے ہنگم سانس ایک دردناک چیخ میں ڈھل کر فضا کو چیر چکے تھے۔

لوگ کہتے ہیں:

''وہ پارو کی آخری چیخ تھی''

پارو ولایت خان کی بیوی تھی جس پر جنات کا سایہ تھا۔

لوگ یہ بھی کہتے ہیں:

"اس آخری چیخ کے بعد پارو کو کبھی دورہ نہ پڑا"

لیکن یہ واقعہ بھی اپنی جگہ ہے کہ اس کے بعد کسی نے اُسے بولتے بھی نہ سنا۔

لوگ پارو کی اِس کیفیت پر دُکھ کا اِظہار کرتے ہیں اور اُن دنوں کو بہتر خیال کرتے ہیں جب اُسے دورے پڑتے تھے مگر جونہی وہ جنات کے اثر سے نکلتی تھی تو چنگی بھلی ہو جاتی۔ اتنی اچھی کہ ولایت خان اُسے دیکھتا رہ جاتا اور سارا گھر اس کی مسکراہٹوں سے بھر جاتا۔

لیکن اس آخری چیخ کے بعد یوں ہوا کہ اُس کے سارے لفظ' اُس کی ساری مسکراہٹیں' حتیٰ کہ اس کی چیخیں بھی کہیں گم ہو گئی تھیں۔ اُسے دورے نہ پڑتے تھے مگر اُس کے ہونٹوں پر فقط چپ کی پپڑی تھی۔

اماں حجن پارو کی ویران گود اور لمبی چپ کو دیکھ کر ولایت خان سے کہتی:

"میں جانتی ہوں تم پارو کا بہت خیال رَکھتے ہو۔ پارو جنات کے زیرِ اَثر رہی' چیخی چلائی مگر تم نے اُسے پھولوں کی طرح رَکھا۔ اب دِل جکڑ لینے والی چپ ہے اور گھر کا سُونا پن۔ مگر تم واقعی حوصلے والے ہو جو تم نے دوسری عورت کا سوچا تک نہیں۔ کوئی اور ہوتا تو کب کی دوسری لا چکتا۔ میری مانو تو وقت کو تھام لو۔ ایک اور بیاہ کرلو۔ خدا نے چاہا تو اس سونے آنگن میں بہار آجائے گی۔"

ولایت خان جب بھی یہ سنتا اُس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ وہ کچھ کہنے کی بہ جائے پارو کے ہونٹوں کو تکنے لگتا جن پر فقط چپ کا پہرہ تھا۔

شروع شروع میں اس گھر میں اُس کی مسکراہٹیں تھیں جو پورے گھر کو اُجال دیا کرتی تھیں۔ یہ مسکراہٹیں بہت جلد مدہم پڑنے لگیں۔ ایسے میں ولایت خان آنگن کے اُس سرے پر کھرلیوں کے پاس بندھی بیلوں کی وہ جوڑی پر اپنا دھیان مرکوز کر لیا کرتا تھا' جو ہر میلے میں جیت کر لوٹتی تھی۔

ولایت خان اپنے سوہنے بیلوں کی جوڑی کو دیکھتا تو سر فخر سے بلند کر لیتا اور جب پارو کو دیکھتا تو آنکھیں چمک کر بجھنے لگتیں اور سینے کے اندر دِل کہیں گہرائی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا۔

اُدھر پارو بھی عجب مخمصے میں تھی۔

ابھی اُن کے بیاہ کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔

اور بہ ظاہر مخمصے میں پڑنے کی کوئی خاص وجہ بھی نہ تھی...... مگر کچھ تھا جو اُسے سمجھ نہ آ رہا تھا۔ اور جو اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اُسے اُلجھاتا چلا جاتا تھا۔ یہی اُلجھاوا ہنسی کے اُس پرنالے میں پھنس کر رکاوٹ بن گیا تھا جو بے اِختیار شڑاپ شڑاپ بہتا سارے گھر کو جل تھل کر دیا کرتا تھا تاہم ولایت خان‘ کہ جو کبڈی کے ہر اکھاڑے میں مقابل کو مٹی چاٹنے پر مجبور کر دیتا تھا‘ کی وجاہت کسی نہ کسی طور اس کے اندر اطمینان اتار دیتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ اطمینان کے کڑوے گھونٹ‘ جو وہ اپنے حلق سے جبراً اُتارتی رہی تھی‘ اُس کے سارے وجود میں زہر بن کر سرایت کرنے لگے۔

یہ تب کی بات ہے جب ولایت خان کو گھر میں چت کبرا لائے سال‘ سوا سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

گاؤں بھر کے وہ چند ایسے جوانوں میں سرفہرست تھا جنہیں ہر کوئی محبت سے دیکھتا ہے۔

محبت سے دیکھے جانے کی ایک وجہ تو اس کا اپنا مضبوط جثہ‘ مناسب کلا جبڑا‘ اونچا قد کاٹھ اور کبڈی کے ہر میدان میں فتح تھی تو دوسری وجہ بیلوں کی وہ خوبصورت جوڑی تھی جو ہر میلے اور ہر مقابلے میں پنجالی گردن پر پڑتے ہی یوں گراہ لے کر دوڑتی کہ مقابل اس کی دھول تک کو نہ چھو پاتے۔

اپنا جثہ بنائے رَکھنے کا فن وہ جانتا تھا۔ منھ اندھیرے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ میلوں دوڑتا‘ پلٹتا تو کلہاڑا لے کر کئی من لکڑیاں کاٹ ڈالتا۔ غذا میں دیسی گھی میں تلے پراٹھے‘ دودھ اور لسی کا اہتمام کرتا۔ شام کو بدن کی مالش ہوتی۔ گھنٹہ بھر کے لیے دوستوں سے زور اور ڈنٹر پیلنا اُس کے معمولات کا حصہ تھے۔

بیلوں کی جوڑی کے ساتھ بھی وہ خوب تھکتا۔ انہیں نہلاتا‘ خوب رگڑ کر ان کا بدن صاف

کرتا، سینگوں اور کھروں پر تیل لگاتا۔ خود چارہ کاٹ کر لاتا، کترا بناتا، ونڈا بھگوتا، ونڈے اور کترے کو چھی طرح صاف کیے ہوئے بھوسے میں ملا کر گتاوا بناتا اور کھرلی تک خود بیلوں کو کھول کر لاتا تھا۔

اور جب دونوں بیل مزے مزے سے گتاوا کھانے لگتے تو اسے تب چین آتا تھا۔

لیکن جب اتنا تھک چکنے کے بعد اُسے بے چینی رہنے لگی تو وہ چت کبرا لے آیا۔

اُس کا اِرادہ تھا، اساڑھ میں جب بھڑولے بھر جائیں گے تو وہ چت کبرے کے مقابل کا ایک اور بیل لے آئے گا جو پہلی جوڑی کی جگہ لے لے گا۔

اُساڑھ آیا اور گزر گیا۔

منھ تک بھر جانے والے بھڑولے دِھیرے دِھیرے خالی ہوتے چلے گئے۔

مگر، دوسرا بیل نہ آیا۔ کیسے آتا؟ کہ ولایت خان کا ارادہ بدل چکا تھا۔

یوں تو وہ دُھن کا پکا تھا، جو من میں آتا اُسے پتھر پر لکیر سمجھتا، جب تک کر نہ چکتا چین سے نہ بیٹھتا تھا۔

لیکن اس بار نہ صرف ارادہ بدل چکا تھا بل کہ ایک لذّت بھی اس کے بدن میں اُتر رہی تھی۔

ہوا یوں کہ ابھی چت کبرے کو آئے چند ہی روز ہوئے تھے اور ولایت خان اس کے فوطے کچلوانے کے لیے، ہسپتال لے جانے کا ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ فضلو اَپنی گائے لے آیا۔

گائے پر دِن آئے ہوئے تھے۔

اور فضلو کے خیال کے مطابق دور نزدیک کے کسی گاؤں میں کوئی اچھی نسل کا بیل نہ تھا۔

جب کہ وہ گائے کی نسل نہ بگاڑنا چاہتا تھا۔

ولایت خان کو پہلے پہل تامل ہوا۔

ویسا ہی تامل، جیسا پارو سے شادی کے وقت ہوا تھا۔

اُس کا خیال تھا' اکھاڑے میں اُترنے والوں کو عورت ذات کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہیے۔ لیکن ضد میں آ کر اسے اپنا خیال بدل دینا پڑا۔

وہ ضد میں یوں آیا کہ اس کے اکھاڑے کے دوستوں نے اُسے پارو دِکھائی اور کہا:

''مرد وہ ہے جو اُسے حاصل کرے گا۔''

پارو نمبردار فیروز کی بیٹی تھی اور پچھلے کچھ عرصے میں یک دَم جوان ہو گئی تھی۔

اس قدر جوان کہ سارے گاؤں پر اس کی جوانی چھا گئی تھی۔

ایک مُدت سے گاؤں کی لڑکیوں پر جوانی چپکے چپکے آ رہی تھی' یوں کہ اِردگرد والوں کو تو کیا خود لڑکیوں کو بھی اس کی خبر نہ ہوتی تھی۔

مگر پارو پر جوانی چیختی چنگھاڑتی آئی تھی۔ کچھ اس ڈھج سے کہ اس کا سارا بدن اپنے جوان ہونے کا زور زور سے اعلان کرنے لگا تھا۔

یہ اعلان ولایت خان نے بھی سنا۔ تاہم نہ تو اس کے اندر کوئی خواہش جاگی' نہ بدن پر بے چینی کی چیونٹیاں رینگیں لیکن لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اُترنے والے اُس کے ساتھی پارو کو حاصل کرنے والے ہی کو مرد تسلیم کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔

اور وہ چاہتا تھا اسے مرد تسلیم کیا جائے۔

وہ ضد میں آ گیا اور قسم کھا بیٹھا کہ وہ پارو کو حاصل کر کے دَم لے گا۔

اگرچہ وہ بہت بڑا زمیندار نہ تھا مگر جتنی بھی زمین اس کی ملکیت تھی وہ اس کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ تھی۔ خوبصورت جسم' کبڈی کے ہر میدان کا فاتح' صاف ستھرا شجرہ نسب۔ یہ وہ عوامل تھے جو پارو کے حصول میں اُس کے معاون بنے تھے۔

اور جب وہ پارو کو حاصل کر چکا تو بالکل ویسی ہی بے کلی اُس کے بدن میں اُتری تھی جیسی کہ اب فضلو کی بات سنتے ہوئے اُتری تھی۔

فضلو کہہ رہا تھا۔

''دیکھ پُت ولایت گائے اعلیٰ نسل کی ہے۔ دریا پار سے لایا تھا تو بوری نوٹوں کی اُٹھ گئی تھی اِس پر۔ دودھ دیتی ہے تو ولٹو ہے کناروں تک چھلکنے لگتی ہیں۔ سچ جانو تو میں اس کی کھیری بھی دیکھتے ہوئے جھجکتا ہوں کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ اور ماشااللہ تمہارا بیل' واہ' دیکھنے میں اس قدر صحت مند لگتا ہے کہ آنکھ دیکھتے ہوئے بھتی نہیں ہے۔ یقیناً اس سے نسل بھی اچھی چلے گی۔''

فضلو اس کے بعد بھی بہت کچھ کہتا رہا مگر ولایت خان چپ چاپ اپنے قدموں پر اُٹھا اور فضلو کو گائے چت کبرے کے پاس لانے کا اشارہ کیا۔

جب فضلو کی گائے کا خوبصورت اور صحت مند سا بچھڑا ہوا اور دُودھ کی مِقدار پہلے سے بھی بڑھ گئی تو وہ سیدھا ولایت خان کے ہاں پہنچا۔

ولایت خان نے سنا تو عجب سی سرشاری اُس کی نَس نَس میں دوڑ گئی۔

فضلو مہینہ بھر اُس کے ہاں دُودھ بھیجتا رہا۔

ولایت خان اُسے منع کرتا رہا مگر وہ باز نہ آیا۔

اسی دودھ کی لَسی بلوتے بلوتے ایک روز پارو کو دورہ پڑا۔ یوں کہ اُس نے بدن کے کپڑے پھاڑ ڈالے' بال نوچ لیے' جبڑے اکڑ گئے اور ہاتھ پاؤں ٹیڑھے میڑھے ہونے لگے۔

اماں حجن کا خیال تھا' پارو پر جنات کا سایہ ہو گیا ہے۔

تعویذ گنڈے ہونے لگے۔ مزاروں کے چکر کاٹے گئے۔ دھونی دھکائی گئی۔ حصار باندھا گیا۔ چلہ کشی ہوئی۔ مگر جنات کا سایہ ویسے کا ویسا رہا۔

ولایت خان پارو کی اِس کیفیت کو دیکھتا تو دُکھی ہوتا۔ اُسے سمجھ نہ آ رہا تھا اس معصوم نے جنات کا کیا بگاڑا تھا جو وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔

پارو کے دورے اور چت کبرے کی تعریفیں ایک ساتھ شروع ہوئی تھیں۔

فضلو نے اپنے بچھڑے کی خوبصورتی اور دودھ میں اِضافے کا ڈھنڈورا یوں ہر کہیں پیٹا تھا

کہ ولایت خان نہال ہوتا چلا گیا۔

پھر یوں ہوا کہ نہ صرف اُس کے اپنے گاؤں بل کہ اردگرد کے مواضعات کے لوگ اَپنی گائیں چت کبرے کے پاس لانے لگے۔

صحت مند بچھڑوں کی پیدائش کی خبریں اور بعدازاں دودھ نذرانے آنا معمول بن گئے۔

گھر میں دودھ گھی کی فراوانی نے اُس کے بدن میں مزید نکھار پیدا کیا۔

مگر پارو‘ کہ جس پر پہلے پہل لسّی بلوتے جنات آیا کرتے تھے‘ اَب موقع بے موقع دوروں میں لوٹنے لگتی تھی۔

جب وہ جنات کے زیر اثر آتی تو عجب عجب حرکتیں کرتی۔ کبھی کبھی یوں لگتا وہ کسی ننھے منے بچے کو پیار سے پچکار رہی ہو۔

غالباً یہی وہ حرکت تھی‘ جسے دِیکھ کر اماں حجن نے خیال ظاہر کیا تھا:

”اگر پارو کے ہاں اولاد ہوتی تو شاید اسے دورے اس شدت سے نہ پڑتے۔“

دوروں میں شدت بڑھتی چلی گئی کہ پارو کی گود ہری ہونے کا دُور دُور تک نشان تھا نہ آس اُمید۔

”یہ جو عورت کا بدن ہوتا ہے نا! یہ نرا گورکھ دھندا ہے۔ باہر سے نوا نکور ہوگا مگر اندر نہ جانے کیا کیا روگ پال رکھے ہوتے ہیں۔ اب جو ولایت خان جیسے شینہہ جوان کے ہاں اولاد نہیں ہو رہی تو یقینا پارو میں کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے۔“

اماں حجن نے جو کہا سب نے اس پر یقین کر لیا۔

ایک مرتبہ پھر پیروں فقیروں کے پاس لے جایا گیا۔ سنیاسیوں کے نسخے اِستعمال ہوئے۔ مزاروں پر منتیں مانی گئیں...... مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

پارو اب اپنے لیے آسانی سے تعویذ لینے یا دوا کھانے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ اماں حجن کا اصرار تھا۔

''پارو کا علاج ہونا چاہیے۔''

علاج ہوتا رہا مگر اولاد نے نہ ہونا تھا...... نہ ہوئی۔

ولایت خان یہ سب کچھ لاتعلقی سے دِیکھ رہا تھا' جیسے راضی بہ رضا ہو۔

اُس کے لیے یہ بھی بہت کچھ تھا کہ گاؤں سے کوئی نہ کوئی فرد اپنے ہاں بچھڑا پیدا ہونے کی خبر سناتا تھا اور دودھ کی بھری بالٹیاں بھیج دیتا تھا۔

دِنوں کا یہی معمول تھا۔ وہ اَپنے صحن میں چت کبرے کے بدن پر محبت سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پاس کھڑا' ساتھ والے گاؤں کا ایک شخص اُسے اپنے ہاں صحت مند بچھڑے کی پیدائش کی خبر سنا رہا تھا۔ ایسے میں اُسے برآمدے میں لسی بلوتی پارو کے تڑپ کر گرنے اور چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بھاگ کر برآمدے میں آیا۔ پارو چت زمین پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کا منہ اَدھ رِڑکے کی جھاگ سے بھرا ہوا تھا۔ چیخیں ہونٹوں پر جم گئی تھیں اور وہ نہایت محبت سے چکنی گیلی مدھانی پر یوں ہاتھ پھیر رہی تھی جیسے کہ وہ ایک ننھا سا بچہ ہو۔

تب ولایت خان نے ایک فیصلہ کیا۔ اپنے قدموں پر پلٹا چت کبرے کو کھونٹے سے کھولا سیدھا ہسپتال جا پہنچا۔

اور جب وہ چت کبرے کے فوطے کچلوا کر واپس پلٹا تھا تو اپنی پشت پر پارو کی بے ہنگم سانسوں کو کرب ناک چیخ میں ڈھلتے پایا۔

لوگ کہتے ہیں:

''وہ پارو کی آخری چیخ تھی جو سنی گئی تھی۔''

لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اب اُس پر دورے نہیں پڑتے مگر لوگ افسوس کرتے ہیں کہ جنات پارو کے سارے لفظ اُپنی گٹھڑیوں میں باندھ کر لے گئے تھے۔

کتابُ الاموات سے میزانِ عدل کا باب

جس قدیم کتاب کو اُنہوں نے موت سے منسوب کر رکھا تھا اُس کے نیم تصویری باب میں ایک بہت بڑی ترازو تھی جس کے پلڑوں میں زنگار نے سوراخ کر دیے تھے۔ قدیم کتاب کے پاورقی حاشیے میں جو عبارت لکھی ہوئی ملی اس کو پڑھ لینے کا دعویٰ رکھنے والوں نے بتایا ہے کہ اس ترازو کو میزانِ عدل کا نام دیا گیا تھا۔ کتاب الاموات پر تحقیق کرنے والوں نے گزر چکے وقتوں کی نامانوس عبارت سے اِس واقعے کو بھی اخذ کیا ہے کہ اس میزانِ عدل پر خود کو تلوانے کی خواہش رکھنے والوں کو پہلے اس آتشیں گڑھے میں اُترنا ہوتا' جو راہ میں پڑتا تھا۔ اس ترازو کی راہ میں اور بھی بہت کچھ پڑتا تھا' گہری دھند' سرمئی بادل' کڑکتی بجلیاں اور کالی بارشیں۔ قدیم کتاب کے اُن صفحات پر جو ابھی تک کرم خوردہ نہیں ہوئے' اِس طرح کی عبارت کی بھی نشاندہی ہوئی ہے جس کے مطابق یہ راہ کی رکاوٹیں دراصل شیطان مردُود کی طرف سے ہوا کرتیں کہ جس کی آخری لمحے تک یہی کوشش رہتی تھی کہ کوئی میزانِ عدل تک نہ پہنچ پائے۔

اِس قدیمی میزان عدل پر جسم نہیں روحیں تلتی تھیں۔

جسے ہم نے اُپنی سہولت کے لیے اوپر شیطان مرُدود لکھ دِیا گیا' اُسے اِن خستہ اور بوسیدہ اوراق میں 'سَت ' کا نام دِیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ دِیوتا تھا۔ یہ وہی سَت دِیوتا ہے جس نے اَپنے بھائی 'اَسر' کو قتل کر دیا تھا۔ سَت اور اَسر کا یہ قصہ یوں دِلچسپ ہو جاتا ہے کہ اَسر قتل ہونے کے بعد پھر زندہ ہو گیا تھا۔ اور اِس زِندہ ہو جانے والے دِیوتا پر قاتل دِیوتا نے کئی گھناؤنے الزامات لگائے اور اُسے میزانِ عدل تک کھینچ لایا تھا۔

کتاب' الاموات کے عبارت والے حصے میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اس واقعہ نے سَت کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ کوئی قتل ہو کر کیسے زندہ ہو سکتا تھا؟ بعد کے زمانے کے اپنے قاری کو اس مخمصے میں پڑنے سے بچانے کے لیے قدیم متن نے یہ وضاحت بھی محفوظ رکھی ہوئی ہے کہ مقتول سَت بھی دیوتا تھا۔ اِنصاف کا دیوتا۔ لہذا اُس کا یوں قتل ہونا بنتا ہی نہیں تھا۔ ایک دیوتا اگر اپنے دیوتا بھائی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا تو انہی قدیم روایات کے مطابق اُس کا پھر سے جی اُٹھنا بھی لازم تھا۔

بوسیدہ کتاب کے وہ حصے جو اَبھی تک زمانے کی دست برد اور تصرفِ بے جا سے محفوظ رہ گئے ہیں اُن میں مرقوم ہے کہ پہلے دونوں بھائیوں میں ایسی مخاصمت نہ تھی کہ ایک' دوسرے کو قتل کر دیتا اور دوسرا' اپنا مُقدّمہ لے کر میزان عدل کی جانب رجوع کرتا۔ وہ بھائی جسے اُوپر شیطان سے تشبیہ نہیں دِی گئی ہے وہ سَت کی خباثتوں کو دَرگزر کر دِیا کرتا تھا۔ اِس لیے کہ ایک تو وہ اُس کا بھائی تھا اور دوسرا یہ کہ وہ بھی تو آخر کو ایک دیوتا تھا۔ ضابطہ جو اپنایا جا رہا تھا' یہ تھا کہ ایک دِیوتا بھائی کو اپنے دِیوتا بھائی کا پاس ہونا ہی چاہیے۔ اِس عبارت کی تفہیم کرنے والوں نے کہا ہے کہ اَسر دِیوتا کو بھائی کا پاس تھا یا نہیں اِس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم یہ یقینی تھا کہ وہ اپنے بھائی کی طاقت سے بہت خائف تھا۔ اُس کے بھائی کے پاس ایسے لوگوں کی سرداری بھی تھی جو اَپنی پیٹھوں پر ڈھالیں اور بغل میں تلواریں سجائے رَکھتے تھے اور گروہ کی صورت آگے بڑھتے تھے۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تب تک کسی دِیوتا کو میزانِ عدل کے سامنے

لاکھڑا کرنے کی روایت نہیں پڑی تھی۔ کیسے پڑتی کہ سَت دِیوتا کے جی میں جو آتا اُسے اپنے پشت پناہوں کے بِرتے پر نڈر ہو کر کرتا تھا۔

سَت کیا کِیا کرتا تھا؟ اس ضمن میں اِس قدیم نوشتے میں ایک مُفصّل باب موجود ہے۔ اِسی باب میں' ذرا آگے چل کر' بتایا گیا ہے کہ سَت دِیوتا نے میزانِ عدل کی طرف جانے والوں کو روکنے کے لیے توات کے علاقے کو بچھا دیا تھا۔ توات کے ایک سرے پر' جُوں کہ آسمانی سمندر کی نیلی لہریں ٹکرا ٹکرا کر ایک بھید بھری گونج پیدا کرتی رہتی تھیں لہذا وہاں وہ لوگ بستے چلے گئے جن سے ان کے اپنے پاؤں کی زمینوں کے بھید چھین کر اُنہیں باہر دھکیل دِیا گیا تھا۔ ان لوگوں کی اس زمین بدری کو ان کی مجبوری بنا ڈالنے کا وظیفہ سَت دیوتا نے اپنے ایک پیارے کے ذمہ لگایا تھا۔ اِس پیارے نے توات کو ایسا علاقہ بنا ڈالا جس میں لوگوں کو سہولت سے اغوا کیا جا سکتا اور اُن کے پہلوؤں میں چُھرے گھونپے جا سکتے تھے۔ اُنہیں بوریوں میں بند کر دِیا جاتا۔ حتّٰی کہ اُن کی روحیں الگ ہو جاتیں۔ اِن الگ ہو جانے والی روحوں کو اُن سیاہ گھوڑوں پر بٹھا کر اَمن تت لے جایا جاتا' جن کی چھاتیاں سفید تھیں۔

امن تت کی ترکیب سے اس علاقے کے امن سے تعلق کا مغالطہ ہو سکتا ہے۔ تاہم پرانی عبارتوں کو خواب جیسا جان کر ان کی تعبیر کرنے والے ایک معبّر نے وضاحت کی ہے کہ امن تت علاقے کا نقشہ اور اس میں جنگل اُگانے کی ترکیب میں یہ قرینہ تو ضرور پیش نظر رہا ہو گا کہ اُس کے اَندر کوئی جھانک نہ سکے۔ اور جو کوئی دُور سے دِیکھے وہ اس سرسبز علاقے کو امن کا خطہ جانے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اِس علاقے کا اِنتخاب ہی اِس لیے کیا گیا تھا کہ میزانِ عدل اور اُس کے بیچ ایک اوٹ میسر آ جائے۔

تو یوں ہے کہ وہ اوٹ میسر تھی۔

سَت کے حوصلے بڑھ گئے تھے یہاں تک کہ اُسے میسر آڑ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اِنصاف کا دیوتا اس کا اپنا ہی دِیوتا بھائی تھا۔ وہ بھائی جس کے دِل میں اُس کی قوت کا سہم

بیٹھ چکا تھا۔ جن روحوں کو کالے گھوڑوں پر سوار کر کے امن تت لایا جاتا' اُنہیں ایک آرے سے چیر کر اُس گہرے گڑھے میں پھینک دِیا جاتا تھا جس میں روح خور درندے رہتے تھے۔ قدیم متن کے مطابق ارواح کے وہ حصے' جن کا تعلق بدنوں کے زِیریں حصے سے ہوتا تھا' اِن درندوں کی چیر پھاڑ سے محفوظ رہتے تھے۔ تاہم بدنوں کے اُوپر والے حصے وہ رغبت سے کھاتے تھے۔ اپنا مرغوبہ کھاجا شکموں میں اُتارنے کے بعد وہ باقی بچ جانے اور تڑپے چلے جانے والے آدھے حصوں سے منھ موڑ لیتے۔ ایسے میں وہ منھ بلند کر کے ایسی خوفناک آوازیں نکالا کرتے تھے کہ آدھی تڑپتی روحیں اپنا تڑپنا بھول جاتی تھیں۔

موت کی اِس بوسیدہ کتاب کے جس حصے میں آدھی روحوں کا قصہ بیان ہوا ہے وہ بہت کٹا پھٹا ہے۔ اتنا کٹا پھٹا کہ قدیم عبارتوں کو پڑھنے کا ہنر رکھنے والے اسے ڈھنگ سے نہیں پڑھ سکے ہیں۔ تاہم کتاب کے دوسرے حصوں کی عبارات کو اس حصے کے غیر مربوط متن سے ملا کر پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ روح خور درندوں کا اِس طرح اُوپر دِیکھ کر مکروہ آوازیں نکالنے کا مطلب اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا کہ ان کا دیوتا سَت ان کی طرف متوجہ ہو اور اسے یہ اطلاع بھی ہو جائے کہ وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ اَمن تت کے گڑھے سے آدھی بچ جانے والی روحوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا جاتا اور اُنہیں سیاہ گھوڑوں پر لاد دِیا جاتا۔ یہی سیاہ گھوڑے اُنہیں یہاں لائے تھے۔ اِس بار چوں کہ اُن پر پہلے کے مقابلے میں آدھے سے بھی کم وزن لدا ہوتا تھا لہذا گھوڑے برق رفتار ہو جاتے۔

آدھی روحوں کو اُٹھا کر واپس بھاگنے والے گھوڑوں کی رفتار حد سے حد پہلے کے مقابلے میں دونی ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر قدیمی متن چغلی کھاتا ہے کہ واپسی پر اُن کی رفتار اس قدر تیز ہوتی کہ امن تت کی جانب جاتے سمے کی چال سے اس نئی چال کے تناسب کا تخمینہ ممکن ہی نہ تھا۔ دانش وروں اور ماہرین نے اِس سے یہ اِستخراج کیا ہے کہ ان روحوں کا غالب وزن اوپر والے اس حصے کا تھا جو دماغ اور دِل سے کھینچ کر باہر نکالی گئی تھیں اور جنہیں روح خور درندے چٹ کر

گئے تھے۔

امن تت کا گڑھا اُس گڑھے سے مختلف تھا جو میزان عدل کی راہ میں پڑتا تھا۔ میزانِ عدل کے ذِکر کے ساتھ جس گڑھے کا حوالہ آتا ہے' اُسے آتشیں گڑھے سے موسوم کیا جا چکا ہے اور اُس کی بابت یہ بھی بتایا جا چکا کہ اُس میں سے ہو کر ہی انصاف کے ترازو تک رَسائی ہو سکتی تھی۔ اُوپر جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ سَت دِیوتا اس جانب آنے والے لوگوں کو روکنے کا ہر حیلہ کیا کرتا تھا' وہیں گہری دُھند' سرمئی بادلوں' کڑکتی بجلیوں اور کالی بارشوں کا ذِکر ہوا تھا اور انہیں شیطانی حیلوں کے زُمرہ میں رَکھا گیا تھا۔ جب کہ بادل' بارش اور حاملہ ہوائیں قدرت کی عطا تسلیم کی جاتی رہی ہیں۔ قدیمی نسخوں کے ماہرین نے سارے حوالے اِکٹھا کرنے کے بعد کہا ہے کہ قدرت کے معاملات کا تعلق چوں کہ کتاب کے دوسرے حصوں میں سَت دیوتا کے بہ جائے اسَر دیوتا سے جوڑا گیا ہے لہذا یہاں یہ معاملہ مشکوک ٹھہرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہو نہ ہو سفید چھاتیوں والے سیاہ گھوڑے آدھی روحوں کو اُٹھا کر پلٹتے ہوئے' وہیں اُوپر سے' جَست لگاتے ہوئے گزرتے تھے۔ اُن کے بدنوں کی باقی ماندہ سیاہ جلد چھاتی کے سفید رنگ میں مل کر سرمئی ہو جاتی تھی۔ وہ اِتنی اونچی زقند بھرتے کہ نیچے سے اُن کے بدن سرمئی بادل لگنے لگتے۔ برق رَفتار گھوڑوں کے سُم ٹھٹھری ہوئے منظر کی چٹان پر پڑتے تو چنگاریاں اُٹھتیں۔ اِن چنگاریوں کو بجلی کا لپکا سمجھا جاتا۔ وہ پانی جو گھوڑوں کے بدن چھوڑتے اُس پر بارش کا گمان ہوتا تھا۔

قدیم متون کا دَرک رَکھنے والے اس مخمصے میں پڑتے رہے ہیں کہ جب عدل سے منسوب اسَر دیوتا نے اپنے دیوتا بھائی سَت کی جانب سے سیاہ پٹی باندھ کر اَپنی آنکھوں کو بند کر رکھا تھا تو آخر وہ کیا افتاد ٹوٹ پڑی تھی کہ سَت کو اِسی کی میزان سے رجوع کرنا پڑا۔ اِس پرانے نسخے میں لکھا ہوا ہے کہ اسَر دیوتا کو اُن لوگوں کے بارے میں بہت تشویش تھی جو مسلسل غائب ہو رہے تھے۔ غائب ہونے والے جب کہیں بازیاب ہوتے تو وہ محض لس لس کرتے وجود رہ جاتے تھے ۔ یہیں یہ المناک حقیقت بھی لکھی ہوئی ملتی ہے کہ وہ عہد سوچنے سمجھنے اور بے ریا محبت کیے چلے

جانے والوں سے بہت سُرعت سے خالی ہوتا جارہا تھا۔ جب عدم پتہ ہو جانے والوں کی عورتوں کے بین جگر پھاڑنے لگے تو اسر دِیوتا کو اپنی کالی پٹی تھوڑا سا سرکانا پڑی۔ اُس نے ازخود نوٹس لے کر حقیقت کو میزانِ عدل پر چڑھانا چاہا۔ اُس کے بھائی سَت دیوتا نے اسے اپنے خلاف ایک سازش جانا اور بپھر گیا۔ اُس نے طیش میں اپنے دیوتا بھائی کو آتشیں گڑھے کے اُوپر سے اپنی جانب گھسیٹنا چاہا مگر ترازو کے اوپر نکلے ہوئے بانس پر بیٹھے چوکس بندر نے اپنی بصیرت سے خطرہ بھانپ لیا تھا۔ اس نے خوب شور مچایا۔ سَت دیوتا نے بوکھلا کر اپنے دیوتا بھائی کو قتل کر دیا۔

کتاب الاموات کے چند اور اوراق پلٹیں تو اوپر کو نکلے بانس پر بیٹھنے اور شور مچانے والا بندر اس دِیوی میں بدل گیا تھا جس کے نیچے کا بدن ڈھکا ہوا ہوتا تو اس کی زبان سچ بولتی تھی اور دیوی لباس گرا دیتی تو سارے بدن سے شہوت ٹپکتی تھی۔ یہ دِیوی جو سَت دِیوی پر بہت مہربان تھی' اس کے چہرے کی کرختگی کو پڑھ کر نامہربان ہو گئی تھی اور اپنا بدن سمیٹ کر سب کو اس کے مذموم ارادوں کی خبر دے رہی تھی۔ قتل کرنا سَت دِیوتا کے لیے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر اس بار یہ اُسے مہنگا پڑا۔ وہ دِیوی جس نے بندر کی جگہ لے لی تھی اور کتاب میں جسے معات دِیوی کا نام دِیا گیا تھا' جگر پھاڑ دینے والی آوازوں میں اپنی آواز ملانے لگی۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے اِحتجاج کے نعرے بھی گونجنے لگے۔

جسے قتل کر دیا گیا تھا' اسے ان آوازوں نے زندہ کر دیا تو سَت نے میزان عدل سے رجوع کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ کچھ معبّر یہ کہتے ہیں کہ اسر دِیوتا کو ان گونجتی آوازوں نے نہیں بل کہ پسد جسَت نے زندہ کیا جو' بقول اُن کے' ایسے منصف دیوتاؤں کی مجلس تھی جو ترازو ہاتھ میں لیتے وقت آنکھوں پر سیاہ پٹی نہیں باندھا کرتے تھے۔ دوسرے معبّر اس تعبیر کو ماننے سے اِنکاری ہیں۔ وہ اس خوف کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو اس مجلس کے ہر رکن کے دِل میں کپکپاہٹ پیدا کرتا تھا۔ خیر حقیقت کچھ بھی ہو میزان عدل قائم کر دی گئی تھی۔ کوئی نہیں جانتا' یہ کتنے وقت کے لیے تھی۔ وہ جسے قتل کیا گیا تھا' نیم زِندہ ہو گیا تھا۔ عجب مُقدّمہ تھا' جس میں سے کئی اور

مقدمے پھوٹ نکلے تھے۔ وہ دُھول اُڑائی جا رہی تھی کہ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ سَت دِیوتا مسلسل اُن گناہوں کی فہرست سب کو سنا تا رہا تھا جو بقول اس کے، اَسر دیوتا سے سرزد ہوے تھے۔ امن تت کے علاقے سے بھی اس کے حق میں آوازیں اٹھتی تھی کہ بقول اس کے یہ علاقہ بھی اُس کی طاقت کا استعارہ تھا۔

کتاب الاموات کی اس قدیم میزان عدل کا قصہ بھی عجیب ہے۔ قتل کا معاملہ سامنے کا تھا اور قاتل کو بہ سہولت اُپنے انجام تک پہنچایا جا سکتا تھا مگر دِلوں کو لرزانے والے خوف کی ابتلا نے انہیں بوکھلا رکھا ہے۔ وہ فیصلے پر فیصلہ دیتے ہیں مگر ہر فیصلہ ادھورا رہ جاتا ہے حتّٰی کہ انہیں کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ ادھورے فیصلوں میں کئی اور قتل گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ دِیوتاؤں کے قوانین کی کتابیں ایک طرف دَھری کی دَھری رہ جاتی ہیں۔ یوں لگنے لگتا ہے کہ وہ بے معنی دلیلوں اور نامکمل فیصلوں کو ہی کافی سمجھنے لگے ہیں۔ اپنے اپنے مقتولین پر بین کرنے والیوں کے گلے رُندھ گئے ہیں۔ احتجاجی نعروں کی گونج ماند پڑ گئی ہے اور معات دِیوی ادھر سے اُوب کر اپنا جامہ گرا کر لوگوں کو رُجھانے میں مگن ہو جاتی ہے۔ وہ مُقدّمہ کون جیتا؟ اَسر دِیوتا یا سَت دیوتا؟ کتاب 'الاموات کے اگلے سارے صفحات کو دِیمک نے کچھ اِس طرح چاٹ ڈالا ہے کہ یہ سوال ہی بے معنی ہو گیا ہے۔

سجدۂ سہو

ایکا ایکی اُسے ایسے لگا جیسے کوئی تیز خنجر اُس کی کھوپڑی کی چھت میں جا دھنسا ہو۔ اس کا پورا بدن کانپ اُٹھا۔ جسم کے ایک ایک مسام سے پسینے کے قطرے لپک کر باہر آ گئے۔ اُس نے سر پر دو ہتڑ مار کر لاحول وَلا قُوۃ کہا۔ عین اُس لمحے اُس کے ذِہن کی سکرین پر اپنے ایک سالہ سعیدے اور اس کی ماں نوری کی تصویر اُبھری۔ نوری سعیدے کو لوری دے کر سُلا رِہی تھی اور وہ سونے کی بہ جائے اُسے دِیکھ دِیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

اِس خیال کے آتے ہی اُس کے جسم کا تناؤ آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو دبا کر نچوڑا تو اُسے یوں لگا' جیسے سر نچوڑنے سے عاشو منھ میں آ گئی ہو۔ منھ اِدھر اُدھر ٹیڑھا کر کے لعاب جمع کیا اور تھوک کے ساتھ عاشو کو بھی زور سے دور پھینک دیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اِنسان سوچوں اور خیالات کے آگے بے بس کیوں ہو جاتا ہے' پیچھا چھڑانا بھی چاہے تو نہیں چھڑا سکتا۔

کہیں یہ سوچیں مجھے شکست نہ دے دیں۔

اِس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ کانپ اُٹھا۔ بے شک وہ گبھرو جوان تھا لیکن سوچیں تو جسم پر نہیں ذہن پر وار کرتی تھیں۔ اس نے س سر کو شرقاً غرباً کئی جھٹکے دِیے۔ صافہ سر پر باندھا' چادر کے پلو کسے' ایک نظر رہٹ چلاتے بیل پر ڈالی۔ بیل بڑے سکون کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ منھ ہی منھ میں بڑبڑانے لگا۔

''کیسا چالاک ہے اُلو کا پٹھہ' مجھے غافل پا کر نہ جانے کن خیالوں میں مگن کھڑا ہے''

اپنی سوچ پر پہلے تو وہ جھینپا پھر اپنے آپ پر ہنسنے لگا۔

بھلا بیل بھی سوچتے ہیں کیا؟ بیل انسان تو نہیں؟

لیکن وہ تو اِنسان تھا اور ابھی ابھی سوچوں سے چھٹکارا پا کر اُٹھا تھا۔

کئی مرتبہ ایسا ہوتا' وہ نوری' سعیدے اور ماسی رضو سے بچ بچا کر سوچوں کے جوہڑ میں جا دھنستا اور دیر تک ڈبکیاں لگاتا رہتا۔ پھر جس آن اُسے اندیشہ ہوتا کہ کوئی دیکھ نہ لے' جھٹ پٹ لاحول وَلاقوۃ کہتا اور دھیان جوہڑ سے باہر نکل آتا۔ ایسے میں اُسے لگتا جیسے اُس کے جسم سے اس جوہڑ کے گندے پانی کی بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے ہوں۔

بیل اَپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔

اور وہ بھی اَپنی جگہ خاموش کھڑا نتھنوں کو پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اُسے اَپنے اور بیل میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔

''وہ مجھے غافل پا کر اپنے خیالات میں مگن' نہیں نہیں' خاموش کھڑا ہے۔ اور میں بھی کسی کو غافل پا کر سوچوں میں غرق ہوں''

اس نے ایک موٹی سی گالی اپنے آپ کو اور ایک اِسی وزن کی گالی بیل کو دی۔

بیل تو جیسے اِسی گالی کا منتظر تھا' فوراً چل پڑا۔ ٹینڈیں پانی بھر بھر کر اُوپر لانے لگیں تو وہ کھالے کے ساتھ چلتا ہوا گنگنانے لگا:

نیچاں دِی اَشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا

لِکرتھ اُنگور چڑھایا تے ہر گُچھا زخمایا

ہو......و......نیچاں دِی اَشنائی کولوں......

آخری کھیت پر پہنچ کر پانی کا رُخ بائیں کھیت کی طرف موڑنے کے لیے اُس نے پانی کا ناکا کھول دِیا۔ پانی دائیں بائیں دونوں کھیتوں میں جا رہا تھا۔ اُس نے دائیں کھیت کے ناکے کو بند کر دیا کہ وہ سیراب ہو چکا تھا۔ اِس کام سے فارغ ہو کر اُس نے کمر پر ہاتھ رکھا اور سیدھا کھڑا ہو کر گاؤں کی طرف دِیکھنے لگا۔ اُس کے اَندازے کے مطابق نوری کو کھانا لے کر اَب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔

اور اس کا خیال درست نکلا۔

نوری واقعی ایک ہاتھ سے سعیدے کو اور دوسرے میں کھانا تھامے چلی آ ہی تھی۔ وہ واپس رہٹ کے پاس آیا اور اُسی بوہڑ کے نیچے آ بیٹھا جہاں کچھ دیر قبل عاشو کے خیال سے جنگ کرتا رہا تھا۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ عاشو بہت حسین تھی۔ اُس کا قد سرو کی مانند تھا نہ گردن صراحی کی طرح۔ اُس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑی جیسے تھے نہ رنگت ہی سرخ و سپید۔ یہ سب کچھ تو بس عام لڑکیوں جیسا تھا لیکن اُس کی آواز میں بلا کی کشش تھی۔ وہ بولتی تو راہ چلتوں کے قدم تھم تھم جاتے۔ سرسوں کے پیلے پیلے پھول' کہ جن سے عاشو نے اپنے چہرے کا رنگ چرایا تھا' جھوم جھوم اُٹھتے۔ گاؤں کی تمام اَلہڑ مٹیاروں کی طرح وہ بھی کھیتوں پر کام کو جاتی۔ گھر کے ڈھور ڈنگر سنبھالتی' بالکل ایسے ہی جیسے خود عبدل کی بیوی نوری یہ سارے کام کرتی تھی۔

لیکن عبدل پر عاشو کا خیال بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔

وجہ عبدل خود بھی نہ جانتا تھا۔

جونہی اُس کا ذہن دیگر تفکرات سے خالی ہوتا' عاشو آ کر قبضہ جما لیتی۔ کئی بار تو یوں ہوتا کہ وہ رات کو اچھا بھلا سونے لگتا مگر دیر تک دشتِ خیالات میں بھٹکتا رہتا۔ پھر جب رات کے

پچھلے پہر سعید ااُپنے پوتڑے گندے کر کے رونے لگتا تو وہ چونک اٹھتا اور لاَحول وَلاقُوۃ کہ دِیتا۔ نوری بے چاری سمجھتی' اس ننھے شیطان کے رونے پر عبدل نے غصے میں آ کر لاَحول وَلاقُوۃ کہا ہے۔ چناں چہ وہ جلدی جلدی اُس کے پوتڑے بدلتی۔ اُسے تھپکتے اور دودھ پلاتے سلانا شروع کر دیتی۔ اُس کے ساتھ ہی عبدل کو یوں لگتا' نوری نے سعیدے کو نہیں خود اُسے تھپکیاں دِے کر سُلا دِیا تھا۔

نوری قریب پہنچی تو اُسے ڈر لگنے لگا؛ کہیں سوچوں کے گندے جوہڑ کی بو نوری بھی نہ سونگھ لے۔ اُسے دُکھ ہو رہا تھا کہ وہ عاشو کے بارے میں کیوں سوچتا رہتا تھا؟ اس جرم کے احساس کی شدّت کو کم کرنے کے لیے وہ نوری کو دِیکھ کر مسکرا دیا۔ اور جب اُس کی نظر سعیدے پر پڑی تو اس کا چہرہ گُلِ نوشگفتہ کی طرح کھل اُٹھا۔ لپک کر آگے جھکا' نوری کی گود سے سعیدے کو اُچکا اور سینے سے لگا لیا۔

بے تحاشا پیار کی پھوار تھی جو سعیدے پر مسلسل برس رہی تھی۔

نوری نے یہ دِل رُبا منظر دِیکھا تو نہال ہو گئی۔ کھانا بوہڑ کی چھاؤں تلے رَکھا اور بانہیں پھیلا کر کہنے لگی۔

''سعیدا مجھے دو اور تم کھانا کھاؤ کہ بھوک ستا رہی ہو گی''

عبدل نے نوری پر ایک اُچٹتی نگہ ڈالی' سعیدے کی پیشانی پر پیار سے ایک اور بوسہ دیا اور اُسے نوری کی پھیلی بانہوں میں ڈال دیا۔ جب وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تو نوری بھی اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔ سعیدا اُس کی گود میں لیٹا مسکرا کر باپ کو دِیکھ رہا تھا اور توتلی زُبان میں کچھ کہے جاتا تھا۔ اُس نے روٹی کے کپڑے کی گرہ کھولی۔ باجرے کی روٹی اُس پر سرسوں کا ساگ اور مکھن کی سوندھی خُوشبو۔ اُس کی بھوک چمک اُٹھی۔ لسی کا گلاس بھر کر قریب رکھا اور کھانے میں مگن ہو گیا۔ نوری اُس سے بھولی بھالی باتیں کرتی رہی۔ وہ سنتا رہا۔ اور جانے کب نوری خاموش ہو کر بچے کو پانی پلانے جو بچے کے پاس لے گئی تھی کہ عاشو کہیں سے آ کر عبدل کے ذہن

پر براجمان ہوگئی۔ دوسرے ہی لمحے سعیدے کی کلکاریوں اور ''مم مم'' نے خیال کے اس کھلونے کوتوڑ کر دور پھینک دِیا اور وہ مطمئن ہوکر کھانا کھانے میں لگ گیا۔ کھانا کھا چکا تو نوری نے برتن سمیٹے اور سعیدے کو اُٹھا کر واپس چل دِی۔ عبدل وہی صافہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی نوری نظروں سے اوجھل نہ ہوئی تھی کہ وہ دھڑام سوچوں کے گندے جوہڑ میں جا گرا۔

عاشو سے اُس کی ملاقات دو سال قبل فضلو کی شادی پر ہوئی تھی۔ بارات دلہن کو لینے دوسرے گاؤں گئی تھی۔ ابھی وہ دلہن کے گاؤں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ شمال سے بادل اُٹھے اور پورے آسمان پر بکھر گئے۔ بجلی کڑکی اور اس کے ساتھ ہی رِم جھم بارش برسنے لگی۔ گاؤں پہنچنے تک بارش کچھ اور تیز ہوگئی تھی۔ بارات میں موجود سیانوں کا یہی فیصلہ تھا:

دلہن لے کر فوراً واپس چل پڑنا چاہئے کہ کہیں راہ میں پڑنے والے برساتی نالے میں تغیانی نہ آجائے۔ اگر ایسا ہوگیا تو پانی اُترنے تک یہیں رکنا پڑے گا۔

چناں چہ دلہن لے کر برات بارش ہی میں واپس چل پڑی۔

وہ دوسرے باراتیوں کے ساتھ نالے میں اُترا ہی تھا کہ اُس کے پہلو سے عاشو لڑکھڑا کر اُس کے ساتھ ٹکرا گئی۔ عبدل کے پاؤں بھی اُکھڑ گئے اور وہ بھی عاشو کے ساتھ ہی پانی میں گر پڑا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ابھی نالے کا آغاز تھا' پانی گھٹنوں سے اُوپر نہ تھا۔ وہ خود سنبھلا' عاشو کو سنبھالا دیا۔عاشو نے ہنس کر اُسے دیکھا۔ شکریہ ادا کیا اور اپنا ہاتھ اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا:

''ذرا پار تک مجھے تھامے چلو''

عاشو کے ذِہن پر اُس لمحے کسی اور خیال کی پرچھائیں تک نہ تھی۔ وہ تو بس نالے کے پار تک جانا چاہتی تھی مگر عبدل کے خیالات کا منھ زور گھوڑا لگام تڑا کر سرپٹ بھاگے جارہا تھا۔ اُس کے بعد جب بھی وہ اکیلا ہوتا' لڑکھڑا کر ندی میں جا پڑتا' پھر عاشو کو سنبھالا دیتے ندی کے پار تک آتا۔ ذہن کے بحرالکاہل میں کتنی ہی موجیں اُٹھتی تھیں اور وہ بے حال ہوجاتا تھا۔

لمحہ لمحہ کر کے دو سال بیت گئے مگر عاشو کے ہاتھوں کا لمس تھا کہ وہ بھول نہ پایا تھا۔ تاہم

جیسے ہی اُسے سعیدے کی ماں کا خیال آتا وہ اپنے آپ کو کوسنے لگتا اور آسمان کی طرف دیکھ کر زور زور سے کہنے لگتا:

''خدایا! تیرا شکر ہے کہ تو نے میری اور میری ماں کی دُعائیں سن لیں اور مجھے سعیدا عطا کیا''

عبدل کی ماں رضو' گاؤں بھر کے لیے ماسی تھی۔ سب کے مسئلوں کا حل ماسی رضو کے پاس تھا' لیکن ماسی رضو خود جس کرب میں مبتلا تھی اُس کا حل کسی کے پاس نہ تھا۔ پیش امام کی بیوی صغراں اس کی رازداں تھی۔ جب بھی اُس سے مشورہ کیا' اُس نے یہی کہا:

''عبدل کو ایک اور شادی کرا دو''

ماسی رضو سے اپنے بیٹے کا دُکھ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ شادی سے پہلے اور دو سال بعد تک تو وہ گاؤں بھر کی محفلوں کی جان بنا رہا تھا۔ کُشتی ہوتی یا بیلوں کا میلہ' کتوں کی دوڑ ہوتی یا مرغوں اور بٹیروں کی لڑائی ہر موقع پر وہ آگے ہی آگے ہوتا؛ مگر اب الگ تھلگ' نہ کسی سے تعلق' نہ کسی واسطہ۔ یوں لگتا تھا' وہ اندر ہی اندر سے ٹوٹتا چلا جاتا تھا۔

اِدھر عبدل کی بیوی گاہراں تھی کہ خزاں کے ٹنڈ منڈ شجر کی طرح۔

چناں چہ اُس نے صغراں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے فیصلہ دے دیا:

''عبدل کے لیے دوسری شادی بہت ضروری ہے''

ماسی رضو کے لیے یہ کام کون سا مشکل تھا۔ ادھر عبدل سے کہا: گاہراں کو فیصلہ سنا دو' اُدھر نازو کو دُلہن بنا کر گھر لے آئی۔ پھر کئی سال اِنتظار میں بیت گئے۔ عبدل کے سر میں چاندی کی طرح سفید بال چمکنے لگے۔ ماسی رضو نڈھال ہو گئی۔ اتنی سکت نہ رہی کہ خود چل کر پانی پی سکے۔ برتن اٹھانا چاہتی تو وہ کپکپا کر گر جاتا۔ پوتے کے اِنتظار کے دُکھ نے اُس کے لبوں پر چُپ کا جالا بُن رکھا تھا۔ صغراں آتی تو اپنے غم کی پٹاری اُس کے سامنے کھولتی۔ لیکن صغراں کا تو بس ایک

مشورہ تھا:

''ماسی رضو اللہ کا دیا سب کچھ ہے تمہارے پاس۔ اللہ بخشے تمہارا گھر والا تمہیں بہت کچھ دے کر اس دنیا سے گیا ہے۔ روپے پیسے اور جائیداد کی کمی نہیں۔ عبدل کے لیے عورتوں کا کیا کال ہے۔ دوسے اولاد نہیں ہوئی تو تیسری کرادو۔''

اور عبدل سے ماسی رضو نے کہہ دیا:

''بیٹا ایک شادی اور کرلو''

عبدل نہ مانا۔ مایوسی نے اُسے چاروں شانے چت گرادِیا تھا۔ ماسی رضو منتوں پر اُتر آئی:

''بیٹا ایک شادی اور...... میرے لیے اور صرف میرے لیے...... میں تمہیں بے اولاد دیکھ کر مرنا نہیں چاہتی''

ماں کی التجا اور آنسو بھری آنکھیں عبدل سے دیکھی نہ گئیں۔ یوں نوری دلہن بن کر گھر آ گئی تھی۔ شاید قدرت بھی اسی لمحے کی منتظر تھی۔ عبدل اور ماسی رضو کو مزید اِنتظار نہ کرنا پڑا۔ جس روز سعیدا پیدا ہوا' اس روز تو عبدل کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ ماسی رضو کو کوئی دیکھتا تو یوں محسوس کرتا' جیسے اُس کے پیکر میں کوئی جواں روح داخل ہوگئی تھی۔ کئی روز تک جشن کی سی کیفیت رہی اور پھر خُوشی کے یہ لمحات دیکھتے دیکھتے ماسی رضو اللہ کو پیاری ہوگئی۔

وہ دولت کہ جس کے لیے عبدل نے طویل اِنتظار کا کرب اُٹھایا تھا' سعیدے کے روپ میں عبدل کے سامنے تھی' نہ جانے یہ کمبخت عاشو کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔ اس نے اُس کا سکون درہم برہم کر دیا تھا۔ عبدل کب کا بڑھاپے کی دہلیز پھلانگ چکا تھا۔ بالوں میں سفیدی ہی سفیدی تھی۔ جلد جو کبھی تنی ہوئی ہوتی تھی' اب ڈھلک گئی تھی۔ لیکن اِس عمر میں بھی اُسے اٹھارہ سالہ عاشو کا خیال نڈھال کیے دِے رہا تھا۔

پہلے پہل تو عبدل لاَحول وَلاقُوۃ کہہ کر عاشو سے چھٹکارا پاتا رہا۔ رفتہ رفتہ لاَحول وَلاقُوۃ

کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور پھر وہ لمحہ بھی آیا جب سعیدا' نوری اور لاحول ولاقوۃ تینوں بے بس ہو گئے اور اُس نے عاشو کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔

کرمو غریب مزارع تھا۔ عبدل جیسے صاحبِ حیثیت زمیندار نے رشتہ طلب کیا تو بھلا وہ کیسے انکار کر سکتا تھا۔

اور یوں عاشو دُلہن بن کر عبدل کے گھر آ گئی تھی۔

نوری روئی' چلائی' سعیدے کے واسطے دیے۔ عبدل کے ارادوں نے بدلنا تھا' نہ بدلے۔ اُس کے سامنے اجازت نامے کا کاغذ رکھا اور کہہ دیا:

''شادی کی اجازت دے دو یا پھر مجھ سے فیصلہ سن لو''

فیصلے کی بات سن کر اس کی روح تک لرز گئی۔ چپکے سے انگوٹھا اٹھایا اور کاغذ پر ثبت کر دیا۔

گویا اب عبدل کو قانونی تحفظ اور عاشو کی جانب سے باقاعدہ اجازت نامہ مل چکا تھا۔

اسی اجازت نامے کے سہارے عاشو اُس گھر میں داخل ہو گئی تھی جو کبھی نوری کا تھا۔ اس کے سعیدے کا تھا۔ وہ لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

عاشو گھر میں اِٹھلاتی پھرتی تھی...... یہاں وہاں۔

جب کہ سعیدا اور نوری گھر میں ہوتے ہوئے یوں نظر انداز کر دِیے گئے تھے' جیسے پھٹے پرانے لیر لیر کپڑے۔ وہ بھری دوپہر کے اس سائے کی طرح تھی جو کونوں کھدروں میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ خوف اس کی نس نس میں بھرا ہوا تھا۔ بے یقینی اس کی آنکھوں میں تیر رہی تھی اور مایوسی اس کے دِل میں پوری طرح اُتر گئی تھی۔

ہاں جب جب وہ سعیدے کو دیکھتی تھی تو عبدل کے حوالے سے ایک آس بندھتی تھی۔

مگر نوری کا بھائی محمد حسین بیچ میں یوں کودا' کہ رہی سہی اُمید کا کچا دھاگہ بھی ٹوٹ گیا۔

وہ کراچی میں ملازمت کرتا تھا' بہن پر بیتی سنی تو مشتعل ہو گیا۔ سیدھا گاؤں پہنچا دوڑا دوڑا

بہن کے گھر گیا اور نوری کو ساتھ لے کر چل دیا۔ نوری جاتے جاتے کہتی رہی:

''میں اِس گھر سے نہیں جاؤں گی۔ کیا ہوا جو عبدل نے نئی شادی کر لی ہے۔ میں اس گھر کی دِہلیز سے مر کر ہی نکلوں گی''

زبان کچھ اور کہہ رہی تھی جب کہ اس کے اندر اُٹھتی اِنتقام کی لہریں نفرت کے ایسے بیج بو چکی تھیں کہ اُس کے قدموں میں بھائی کا ساتھ دینے کا حوصلہ بھر گیا تھا۔

محمد حسین کا لہو کھول رہا تھا۔ وہ نوری کو تقریباً گھسیٹتا گھر لے گیا۔ ادھر عاشو تو جیسے اسی لمحے کی منتظر تھی۔ اس کا جادو عبدل کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ لہٰذا نوری کو طلاق کا فیصلہ بھی سنا دیا گیا۔

نوری نے یہ سنا تو چکرا کر رہ گئی۔ خود کو کوسنے دیئے۔ بھائی کا گریبان پکڑ لیا اور اس پر برس پڑی:

''تم نے مجھے اُس گھر سے لا کر بہت بُرا کیا۔ اب میں کس کے سہارے جیوں گی۔ پہاڑ سی زِندگی کیسے کٹے گی؟''

نوری نے سعیدے کو دیکھا تو کلیجہ منہ کو آ گیا۔ دھاڑیں مار کر روتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔ جب خوب رو چکی تو کہنے لگی:

''اس معصوم نے کون سا گناہ کیا ہے کہ اسے بھی میرے ساتھ سزا مل رہی ہے۔ اس کا باپ زندہ ہے لیکن یہ یتیم ہو گیا ہے''

جب نوری، محمد حسین کا گریبان پکڑے اسے جھنجھوڑ رہی تھی تو محمد حسین پتھر کے مجسمے کی طرح ڈول رہا تھا۔ دُکھ کی ایک گہری جھیل میں اس کا بدن ڈوبے جا رہا تھا۔ اُس کے دِل میں لمحہ بھر کو ایک چنگاری چمکی اور نہایت اَہم فیصلے کا شعلہ بھڑک گئی۔ بہن کو دِلاسا دیا۔ سعیدے کو پیار سے تھاما اور کہنے لگا:

''بہن فکر نہ کرو، سعید ایتیموں کی طرح نہیں، شہزادوں کی طرح پلے گا۔ میں پوری

زِندگی تمہیں کوئی غم نہ آنے دوں گا۔''

جب وہ یہ کہہ رہا تھا تو اس کا گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جو غم اور روگ نوری کو لگ چکا تھا' اس کا علاج ممکن ہی نہ تھا۔ کتنے ہی غم ہوتے ہیں جو انسان ہنسی خُوشی سہہ جاتا ہے لیکن کچھ دُکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زِندگی کو قبر کی مٹی اور کفن کی طرح چاٹتے رہتے ہیں۔

محمد حسین نے اپنا آبائی مکان اور وہ تھوڑی سی زمین' جو اُس نے خُون پسینے کی کمائی سے خریدی تھی' بیچ ڈالی۔ بہن اور اس کے بیٹے کو ساتھ لیا اور کراچی پہنچ گیا۔ اس نے سوچا ماحول بدلے گا تو زخموں پر مرہم لگ جائے گا۔

X

''انسان بڑا ہی ناشکرا ہے''

پیش امام کی بیوی صغراں عبدل کا دُکھ سن کر کہنے لگی:

''تم اولاد کو ترستے تھے' جب اولاد ملی تو اُس سے بے نیاز ہو گئے۔ آہ!......خدا کا شکر ہے کہ آج ماسی رضو زندہ نہیں۔ وہ زندہ ہوتی تو یہ دُکھ جَر نہ سکتی۔ تم نے ڈاکٹروں' حکیموں اور سنیاسیوں کو آزما دیکھا۔ اب عاشو کی گود کیا ہری ہو گی۔ تم آج بھی اولاد کو ترس رہے ہو۔ اب تو میں تمہیں یہ مشورہ بھی نہیں دے سکتی کہ ایک اور شادی کر لو۔ خبر نہیں نوری کہاں اور کس حال میں ہو گی؟ محمد حسین تو اُسے ساتھ لے کر یوں گم ہوا ہے کہ کہیں کوئی نشان نہیں ملتا۔ کراچی میں اُس نے اَپنا ٹھکانہ تک بدل لیا تھا کہ کہیں تم پچھتا کر اُدھر نہ جا نکلو اور اپنا بیٹا نوری سے چھین کر اس کے زخم ہرے کرو۔ اللہ کرے سعید اٹھیک ہو۔''

صغراں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی برس رہی تھی۔ اُسے ماسی رضو کے ساتھ اُنس تھا اور عبدل ماسی رضو کی نشانی تھی۔ مگر ماسی رضو کی اس نشانی کو دیکھتی تو کلیجہ کٹ کٹ جاتا۔ صغراں سے مزید وہاں بیٹھا نہ گیا۔ چادر کے پلو سے آنسو پونچھے' لاٹھی اُٹھائی اور وہاں سے اُٹھ

گئی۔

عبدل کے سینے سے درد کی ایک لہر اُٹھی اور پورے وجود کو چیرتی چلی گئی۔

عبدل کا دُکھ عاشو کے لیے جان لیوا تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی؟ بس عبدل کو دیکھتی اور دیکھتی ہی رہ جاتی۔ یوں جیسے پیاسی زمین بانجھ بادلوں کو حسرت سے تکتی رہ جاتی ہے۔ پورے بارہ سالوں کا ایک ایک پل عبدل نے دُکھ کے پل صراط پر چل کر گزارا تھا۔

گاؤں کے ایک ایک فرد سے محمد حسین کا پتہ پوچھ ڈالا۔

خود کئی مرتبہ کراچی سے ہو آیا۔

لیکن نوری کا سراغ ملا نہ اس کے سعیدے کا۔

⌘

فجر کی نماز پڑھ کر عبدل کھانستا کھانستا گھر کی جانب پاؤں گھسیٹے جا رہا تھا کہ پٹواری لال دین نے پیچھے سے آواز دی۔ عبدل رُک گیا۔ لال دِین کہنے لگا:

''عبدل میں کراچی گیا تھا۔ اپنے بیٹے چراغ دین سے ملنے۔ اِس مرتبہ محمد حسین سے بھی ملاقات ہو گئی۔''

عبدل کا دِل اُچھلا اور حلق میں آ پھنسا۔ جلدی سے پوچھا:

''کہاں رہتے ہیں وہ؟ کس حال میں ہیں؟ سعیدا کیسا ہے؟ نوری کا کیا حال ہے؟''

ایک ہی سانس میں اتنے سوال۔ یہی وہ سارے سوال تھے، جو بارہ سالوں سے اس کے سینے کو اندر سے ڈس رہے تھے۔ لال دین ہنس دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے سے ہنسی غائب تھی اور دُکھ سے وہ ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہا تھا:

''عبدل بڑے بدنصیب ہو تم۔ تم نے اللہ کی نعمتوں کو ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا۔ محمد حسین مجھے صدر میں ملا تھا۔ سودا سلف خریدنے آیا تھا۔ سعیدا اُس کے ساتھ تھا۔ تمہارے گبھرو پتر کو دیکھا۔ خدا کی قسم یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی سعیدا ہے۔ تین سال کا بچہ تھا' جب ماں کے ساتھ گیا تھا اور اب ایسا خوبصورت جوان بنا ہے کہ جوانی پر رشک آتا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ گھر چلنے کو بڑا اصرار کیا تھا لیکن میں نہ جا سکا کہ میرے ساتھ اور لوگ......''

عبدل نے لال دین کی بات درمیان میں کاٹ ڈالی۔ ان کا پتہ پوچھا اور اسی روز کراچی چل پڑا۔

لانڈھی پہنچا' مطلوبہ مکان ڈھونڈا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

اس کے ساتھ ہی اس کا اپنا دِل بھی زور زور سے دَھک دَھک کرنے لگا۔

بالکل ایسے ہی جیسے اس کے اندر دِل پر کوئی زور زور سے دستک دے رہا ہو۔

چند لمحوں کے بعد ایک پندرہ سالہ خوبصورت لڑکا اُس کے سامنے کھڑا' اُسے سوالیہ نظروں سے تک رہا تھا۔ عبدل کو سمجھنے میں دِیر نہ لگی کہ وہ اس کا بیٹا سعیدا تھا۔ برسوں کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا' دیوانہ وار آگے بڑھا اور بے اختیار پکار اُٹھا:

''میرے بیٹے......میرے سعیدے''

وہ اُسے بانہوں میں جکڑے' سینے سے لگائے رو رہا تھا کہ اندر سے نسوانی آواز آئی۔

''سعیدے بیٹے......کون ہے باہر؟''

عبدل کو یوں لگا' وہ آواز نہ تھی' بجلی کا کوندا تھا جو اس کے بدن پر دوڑ گیا تھا۔ آواز نوری کی تھی۔ بالکل ویسی ہی۔ بس اس میں کپکپاہٹ بھر گئی تھی۔ بارہ لمبے سالوں کی گرد بھی اس کے ذہن میں محفوظ نوری کی آواز کی پہچان نہ دھندلا سکی تھی۔ سعیدا عبدل کے سامنے حیرت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ نوری سعیدے کا جواب نہ پا کر خود دروازے تک آئی۔ عبدل نے نوری کو دیکھا تو

یوں لرزنے لگا جیسے بارش کی زد میں آیا ہوا وہ خشک پتا لرزتا ہے جو خزاں زدہ پیڑ کی کسی لرزیدہ شاخ پر کسی بھی پل ٹوٹنے والا ہوتا ہے۔

نوری کے ہاتھوں میں سہارے کے لیے لاٹھی تھی۔ اس لاٹھی سے وہ راستہ ٹٹول ٹٹول کر قدم آگے بڑھا رہی تھی۔ ویران آنکھیں اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں کہ ان سے نور کب کا رُخصت ہو چکا تھا۔ نوری نے ایک مرتبہ سعیدے سے پوچھا:

''بیٹا بتاؤ نا! کون ہے تمہارے ساتھ؟''

اِس سے پہلے کہ سعیدا کچھ کہتا۔ عبدل نے ایک فیصلہ کیا۔ یوں ہی واپس پلٹ جانے کا فیصلہ۔

وہ اس فیصلے کی کٹار سے اپنے وجود جو چیر کر جرم کے اِحساس کی شدّت کو کم کرنا چاہتا تھا۔

اُس نے اپنے بوجھل قدم اٹھائے' واپس پلٹا اور کہنے لگا' رک رک کر...... یوں کہ جیسے لفظ زبردستی حلق سے باہر دھکیل رہا ہو:

''جی مجھے غلط فہمی ہوئی...... غلط جگہ پر آ گیا ہوں...... دراصل میں کسی اور صاحب سے ملنا چاہتا تھا......''

نوری نے یہ آواز سنی تو عبدل کی طرح اُسے بھی پہنچاننے میں دیر نہ لگی تھی۔ کیا ہوا آنکھوں سے نور رخصت ہو گیا تھا مگر دِل کے نہاں خانے میں' دماغ کے ایک ایک گوشے میں عبدل کی آواز اور تصویر دونوں اسی طرح سجی ہوئی تھیں' جیسے آج سے بارہ سال قبل تھیں۔ فوراً پکار اُٹھی:

''بیٹا! تم نے پہنچانا نہیں' یہ تمہارے ابا ہیں۔ ہاں ہاں بیٹا تمہارے ابا''

اس کے لہجے میں یقین تھا۔

عبدل ایک دم نوری کی جانب گھوما۔

بس ایک ساعت کے لیے اس کا چہرہ اور اس پر برستے یقین کے رنگوں کو دیکھ سکا۔ اور پھر

اس کی جانب کٹے ہوئے شجر کی طرح یوں گرا جیسے سجدہ سہو کر رہا ہو۔

تماش بین

عورت اور خُوشبو ہمیشہ سے میری کمزوری رہے ہیں۔

شاید مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ عورت اور اس کی خُوشبو میری کمزوری رہے ہیں۔

یہ جو اَب میں عورت کو بہ غور دیکھنے یا نظر سے نظر ملا کر بات کرنے سے کتراتا ہوں تو میں شروع سے ایسا نہیں ہوں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا' عورت اور اُس کی خُوشبو ہمیشہ سے مجھے مرغوب رہے ہیں۔

اس روز' جب وہ میرے آفس میں داخل ہوئی تھی' عورت کو چہرے کی بہ جائے نیچے سے اوپر قسطوں میں دیکھنے کی خواہش میرے اَندر شدّت سے مچل رہی تھی۔

ہوا یوں کہ میں نے جیفرے آرچر کی کہانیوں کی کتاب ''اے ٹوسٹ اِن دی ٹیل'' رات ہی ختم کی تھی اور اسکی کہانی جو ایمینڈا کرزن نامی دِل کش دوشیزہ کے گرد گھومتی تھی' میرے حواس

پر بُری طرح چھائی ہوئی تھی۔

میں رات بھر وقفے وقفے سے خواب دیکھتا رہا۔ نامکمل خواب۔

نامکمل کی بہ جائے مجھے تشنہ کہنا چاہیے۔

پہلے سارے میں دُھند ہی دُھند ہوتی' پھر اُونچی اِیڑی والے سیاہ جوتوں اور سٹاکنگ سے جھانکتی گوری گوری سڈول ٹانگیں نظر آتیں' پھر مجھے یوں لگتا جیسے کوئی شطرنج کی چال چل رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی خواب رِی وائنڈ ہو کر رِی پلے ہونے لگتا۔

ایک ہی منظر بار بار دیکھ کر میں خواب میں جھنجھلاہٹ کا شکار ہوا۔ میں نے لڑکی کا پورا ہیولا دِیکھنا چاہا مگر ہر بار میرا تصور ٹوٹ ٹوٹ جاتا۔

جب وہ میرے آفس میں داخل ہوئی تب تک میں اُس کہانی کے چنگل سے نہ نکلا تھا۔ اُس کی آواز سن کر چونکا تو اس کا چہرہ دیکھنے کی بہ جائے نگاہ اس کے قدموں کی طرف لپکی۔ میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں عموماً لڑکیوں کو کس ترتیب سے دِیکھنے کا عادی رہا ہوں۔ ٹھہریئے' مجھے سوچ لینے دِیجئے۔ شاید میں پہلے ہونٹ دیکھتا ہوں گا۔ رَس بھری قاشوں کی طرح سرخ' تروتازہ چھوٹے بڑے' ادا سے کھلتے آپس میں جڑتے ہونٹ۔ یا پھر آنکھیں دِیکھتا ہوں گا' گہری جھیل جیسی آنکھیں' بڑی بڑی آنکھیں کہ جن میں کائنات سما جائے۔ کالی' نیلی یا پھر بھوری آنکھیں۔نہیں میرا خیال ہے میں چہرہ لخت لخت نہیں بل کہ مکمل دِیکھتا رہا ہوں۔ جب کبھی کوئی چہرہ مجھے متاثر کرتا ہوگا تو اُسے مُفصّل دِیکھتا ہوں گا۔

لیکن یہ کبھی بھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی کو قدموں سے دِیکھنا شروع کیا ہو۔ تاہم جیفرے آرچر کی کہانی کے زِیرِ اثر میری نظر اُس کے قدموں پر پڑی۔ ایمینڈا کرزن جب اس کلب کی عمارت میں داخل ہوئی تھی' جہاں شطرنج کا ٹورنامنٹ ہو رہا تھا تو اس نے اونچی اِیڑی والے سیاہ ویلوٹ کے جوتے پہن رکھے تھے۔ میں گزشتہ رات اِنہی سیاہ جوتوں کے اُوپر گوری گوری سڈول پنڈلیاں دِیکھتا رہا تھا۔ میں نے جب اُس کے قدموں کو دِیکھا تو مجھے پہلا دھچکا لگا۔

اس کے پاؤں میں جو سینڈل تھے‘ وہ کبھی سیاہ رہے ہوں گے‘ لیکن کثرت اِستعمال اور پالش نہ ہونے کے سبب اب ان کا کوئی رنگ نہ تھا۔

دوسرا دھچکا مجھے اس وقت لگا‘ جب میں نے بے رنگ سینڈلوں میں سے جھانکتے سانولے پاؤں اور ٹخنے دیکھے۔ میں بے دلی سے اوپر دیکھتا چلا گیا۔

راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی جو میری نظر کو گرفت میں لے لیتی۔

ہاں‘ یہ بتانا تو میں ہی بھول گیا کہ جب میں نے جھولتے پائنچوں کے نیچے اس کے سانولے ٹخنوں کو دیکھا تھا اور گوری شفاف جلد کا تصور ٹوٹ گیا تھا‘ تو میرا باطن مشتعل ہو گیا تھا۔ دِل کرتا تھا اُٹھوں اور اُس کے پائنچے نیچے کھینچ کر اُس کے سانولے ٹخنے‘ پاؤں اور بے رنگ جوتے اُن میں چھپا ڈالوں۔

میں جانتا ہوں یہ ایک بے ہودہ خیال تھا۔ مگر میں اس شاعرانہ خیال کا شدّت سے حامی رہا ہوں کہ...... وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ...... ایسے رَنگ جو میں اَدھورے اَدھورے گزشتہ رات خواب میں دیکھتا رہا تھا‘ اب دَھنک کی طرح اِدھر اُدھر بکھرے دیکھنا چاہتا تھا۔

غالباً میں یہ بتا چکا ہوں کہ ٹخنوں سے اُس کے چہرے تک بیچ میں رُکنے کا کوئی مقام نہ آتا تھا۔

وہ آگے بڑھی اور میرے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

”جی میں بشریٰ ہوں......شاہنواز کی بیوہ۔“

شاہنواز کو میں جانتا تھا۔ میں کیا دفتر کا ہر فرد جانتا تھا۔

اِس تعارف کے بعد میں نے بشریٰ کو غور سے دیکھا۔ وہ کیا بات تھی کہ کمہاروں کی اِس لڑکی کے لیے شاہنواز کو اپنے خاندان کی لڑکی سے منگنی توڑ کر عزیزوں کی ناراضی مول لینا پڑی۔

میں نے آنکھوں میں جھانکا۔ بہ ظاہر آنکھیں کالی تھیں مگر بہ غور دیکھنے پر بھورا رنگ غالب

آنے لگتا تھا۔ پلکیں اُٹھا کر جب وہ اُوپر دیکھتی تھی تو کوئی بھی دِل والا اُن میں ڈوب سکتا تھا۔ چہرہ گول نہ لمبوترا' بھرا بھرا' سانولا مگر شفاف۔ منھ کا دہانہ چھوٹا تھا۔ ہونٹوں پر عموداً نفاست سے بنی لکیریں' یوں جیسے پیمانہ رکھ کر اور مناسب فاصلے دے کر کھینچی گئی ہوں۔ وہ بات ٹھہر ٹھہر کر کرتی تھی' ایسے کہ سیدھی دل میں جا اُترتی۔

یہ تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بشریٰ جیسی لڑکی کے لیے کچھ ناراضیاں مول لی جا سکتی تھیں۔

شاہنواز سے سب ناراض تھے مگر وہ بشریٰ کے ساتھ خُوش تھا۔

یہ بات اس نے کوئی ڈیڑھ برس پہلے تب بتائی تھی' جب اُس کی شادی کو صرف دو ماہ گزرے تھے۔ تب وہ میرے پاس صدر دفتر میں کام کرتا تھا۔ جب اُسے کوئی کام ہوتا تھا تو وہ بار بار سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ منھ سے کچھ نہ کہتا۔ حتّٰی کہ میں خود پوچھنے پر مجبور ہو جاتا۔

ایک روز وہ حسب معمول جب تیسری بار میرے سامنے چپ چاپ کھڑا ہو گیا تو میں نے معنی خیز نظروں سے اُسے دِیکھا۔ اُس نے جیب سے تہہ کی ہوئی درخواست نکالی' اُسے سیدھا کیا اور میرے سامنے رَکھ دی۔

وہ کینٹ برانچ میں تبادلہ چاہتا تھا۔

میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا:

''وہ جی یہاں سے روز گاؤں جانا مشکل ہو جاتا ہے۔''

اس نے یہ اس قدر شرماتے ہوئے کہا کہ میں ہنسے بنا نہ رہ سکا۔

اس کا تبادلہ کینٹ برانچ ہو گیا۔

یہ تبدیلی اس کے حق میں بہتر ثابت نہ ہوئی۔ کینٹ برانچ میں دِن دہاڑے ڈاکہ پڑا۔ گولی چلی اور وہ مزاحمت کرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

برانچ لٹنے سے بچ گئی تھی۔

مجھے شاہنواز کے مارے جانے کا بڑا دُکھ تھا۔ میں نے مناسب اِمدادی رقم کا کیس بنا کر اعلیٰ حکام کو بھیجا' جو منظور ہو گیا۔

میں نے مرحوم کی بیوہ کو اِطلاع کے لیے چٹھی لکھ دی۔

جب وہ آئی تو میں نے جیفرے آرچر کی کہانی زیرِ اثر اُسے ایک نئے ڈھنگ سے دیکھا۔ پھر جب وہ سامنے بیٹھ گئی اور دِھیرے دِھیرے گفتگو کرنے لگی تو مجھے اُس کے ہونٹوں کی جنبش بہت اچھی لگی تھی۔ اِس قدر اچھی کہ میں نے اُس روز اُسے چیک نہ دینے کا فیصلہ کیا۔

مجھے یاد نہیں پڑتا میں نے اُس سے کیا گفتگو کی تھی۔ ہاں اِتنا یاد ہے کہ اُس کے شوہر کی ہمت اور جرأت کی تعریف کی تھی تو اُس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ یوں کہ مجھے اُس کے ہونٹوں پر توجہ مرکوز رَکھنے میں دِقت ہو رہی تھی۔ پھر جب اُس کے اور شاہنواز کے عزیزوں کا تذکرہ چھیڑا تو اس نے بتایا' اسے منحوس گردانا جا رہا تھا اور یہ کہ وہ بالکل اکیلی ہو گئی تھی۔ اُسے زمانے کے خراب ہونے کا بھی گلہ تھا۔ وہ اکیلی شہر آنا نہیں چاہتی تھی مگر کسی کو ساتھ لاتی تو کیسے؟ کہ جوان جہان تھی اور لوگ تو ایسے ہی موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ لوگوں کی زبانیں بھلا کیسے بند کی جا سکتی تھیں؟ لہٰذا وہ احتیاطاً کسی کو بھی ساتھ نہ لائی تھی۔

جب وہ زمانے کی خرابی کا ذِکر کر رہی تھی تو میں نے دِل ہی دِل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں خراب نہ تھا۔ میری خواہشات ہمیشہ سے بے ضرر رہی ہیں۔ میں فقط پھول کو دِیکھتا اور خوشبو سے مشامِ جاں معطر کرتا ہوں۔ ہنستی مسکراتی تر و تازہ چہروں والی لڑکیاں کسے اَچھی نہیں لگتیں مجھے بھی اَچھی لگتی ہیں۔ میں ذرا ہمت والا ہوں اور اُن سے راہ و رسم بڑھا لیتا ہوں کہ اُن سے باتیں کر سکوں۔ اُن کی آنکھوں میں جھانک سکوں اور اُن کے کھنکتے قہقہوں کے پھولوں سے سماعت کی کارنس کو سجا لوں۔

غالباً میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ بشریٰ اُس روز جلدی میں تھی۔ اُسے خدشہ تھا' گاؤں جانے والی آخری گاڑی نکل جائے گی۔ مجھے اُس کی یہ بات اچھی نہ لگی تھی۔ جی چاہتا تھا' وہ کچھ

اور بیٹھے۔ مگر جب وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے اس سے معذرت کی کہ چیک اُسے آج نہ مل سکے گا۔

میں نے اُسے آئندہ بدھ آنے کا کہا۔ وہ نہایت لجاجت سے کہنے لگی:

''اس روز چیک ضرور مل جانا چاہئے کہ بار بار شہر آنا ممکن نہیں۔''

میں نے اُسے یقین دلایا: ''ایسا ہی ہوگا۔''

مگر جب اگلا بدھ آیا' میں دفتر میں کچھ فائلیں نکال رہا تھا اور بشریٰ ابھی تک نہیں آئی تھی کہ شکیلہ کا فون آ گیا۔

وہی شکیلہ جو بات کرتی ہے تو اُس کے گال اُوپر کو اُچھلتے ہیں' ہنستی ہے تو آنکھیں میچ لیتی ہے اور بولتی ہے تو پہروں بولتے ہی چلی جاتی ہے۔

اُس کا فون بہت دِنوں بعد آیا تھا۔ وہ شہر سے باہر تھی۔ اب آئی تھی تو چاہتی تھی' میں اِسی وقت دفتر سے نکلوں' اُسے پک کروں اور کہیں بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں سنوں۔

مجھے اس کی آفر اچھی لگی۔

میرے فرائض میں شامل ہے کہ میں وقتاً فوقتاً ذیلی دفاتر کو سرپرائز دوں۔ اُن کی کارکردگی چیک کروں۔ لہٰذا میرا دفتر سے بغیر اطلاع غائب ہو جانا بھی اِسی زمرہ میں آتا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا اور وہ بیت گیا۔

شکیلہ جیسی لڑکی کا ساتھ ہو تو وقت پلک جھپکتے میں گزر جاتا ہے۔

اُس روز دوبارہ دفتر نہ جا سکا۔

اور اگلے روز جب میں دفتر پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ بشریٰ آئی تھی اور یہ کہ وہ دفتر بند ہونے تک اِنتظار کرتی رہی۔

''مگر اس کی آخری گاڑی تو ساڑھے تین بجے جاتی تھی؟''

''جی۔ وہ بھی یہی کہتی تھی پھر بھی اِنتظار کرتی رہی''

''پھر کہاں گئی؟''

''جی پتہ نہیں۔''

میں رات دیر سے سونے اور صبح دیر سے اُٹھنے کے باعث جلدی جلدی دفتر کے لیے تیاری کرتا ہوں۔ یوں نہ تو ناشتہ سکون سے کرسکتا ہوں اور نہ ہی اخبار پڑھ پاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دفتر آتے ہی پہلے اخبار پڑھتا ہوں۔

اخبار میرے سامنے تھا اور روزمرہ کی طرح سیاست دانوں کے بیانات' حادثات' قتل واغوا کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ من چلے نوجوان' جو راہ چلتی لڑکیوں پر آوازیں کستے ہیں۔ نئے نئے طریقوں سے ستاتے ہیں۔ جدید ماڈل کی کاروں میں لفٹ دیتے ہیں۔ یا پھر سائلنسر اُترے شور مچاتے موٹر سائیکلوں پر سوار ہوکر آتے ہیں اور پرس لے اُڑتے ہیں۔ اِن مَن چلوں کی سرگرمیاں بھی اَخبارات کے چوکھٹوں میں جگہ پانے میں کام یاب ہوگئی ہیں۔ میں نے اَخبار تہہ کرکے ایک طرف رکھ دِیا اور ہاتھ فائلوں کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ بشریٰ آگئی۔

اَب کے وہ آئی تو میرے اَندر اُسے نیچے سے اُوپر قسط دَر قسط دِیکھنے کی مطلق خواہش نہ تھی۔ تاہم نہ چاہتے ہوئے بھی میں اُسے اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر دِیکھ رہا تھا۔ اور دِل سینے کے اَندر ہی کہیں گہرا اور گہرا ڈوبتا جا رہا تھا۔

اُس نے دروازے سے کرسی تک کا فاصلہ یوں طے کیا تھا جیسے اُس پر صدیوں کی مسافت طے کرنے کی تھکن ہو۔

وہ کرسی پر گر گئی۔ نظر سیدھی اُس کے ہونٹوں پر پڑی تو کلیجہ منھ کو آ گیا۔

ہونٹ' یوں لگتا تھا' کسی نے چبا ڈالے تھے۔

اُس نے آنکھیں اُوپر اُٹھائیں۔ سوجی اور اُجڑی آنکھوں سے آنسو کب کے خشک ہو چکے تھے۔

میں بے قرار ہوگیا۔

''خیریت تو ہے نا خاتون؟''

''خیریت؟''

وہ سامنے خلا کو دیکھ رہی تھی۔

میرے اندر بے شمار وسوسے سر اُٹھانے لگے' مگر پوچھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ میں نے گھنٹی دے کر چپڑاسی کو بلایا۔ اُسے چیک لانے کو کہا۔ اور جب وہ چیک لے آیا تو اُسے تھمانے کے لیے بڑھایا۔

''یہ رہا آپ کا چیک''

وہ سسک پڑی۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی:

''چیک...... معاوضہ...... کس بات کا؟...... میرے شوہر کے مارے جانے کا یا پھر......؟''

وہ اور کچھ نہ کہ سکی۔ اَپنے کٹے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا لیا۔

اور مجھے یوں لگا جیسے اس کے گاؤں جانے والی آخری گاڑی مجھے روندتی کچلتی گزر رہی تھی اور میرے سامنے آخری بازی جیتنے والی ایمینڈا نہیں آخری بازی ہارنے والی ایک دوسری بشریٰ تھی۔

نِرمَل نِیر

اِدھر اُدھر جَل تھا۔ جَل ہی جَل۔ پَوِتر جَھر جَھر گِرتا۔

وہ جو مدَ متا تھی، مدمَاتی، مَدَن مد۔

وہ اِسی جَل میں اَشنَان کرتی، چھینٹے اُڑاتی، دوڑتی پھرتی تھی۔

اِس جَل کے بیچوں بیچ وہ جتنا آگے جاتی اتنا ہی جَل اور بڑھ جاتا۔

وہ تھی۔ بس وہ۔ اور جَل۔

ایک بگھی اُس کے واسطے تھی، رَنس سے بنی ہوئی، جگر جگر کرتی۔

جس کی راہ میں کوئی وِگھن نہ تھی

اس کے آگے بارہ بدلیاں جتی ہوئی تھیں۔

بدلیاں بھی ایسی، کہ جن کے پاؤں میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں، ہر دم، تازہ دم۔

لگا میں اُس کے ہاتھ میں تھیں۔

وہ اِس جَل کے اُوپر اِس بگھی کو دوڑاتی پھرتی تھی۔ قہقہے لگاتی یا پھر ہنس ہنس کر دوہری ہو ہو جاتی۔

ایسے میں اُس کا سُندر بدن اور سُندر ہو جاتا۔

تارے جھل مِل کرتے ساری کرنیں اُس پر نچھاور کر دیتے۔

اور لہریں اُچھل اُچھل کر اُس کا اَنگ اَنگ چومنے لگتیں۔

تب وہ شانت ہو جاتی۔

کہ وہ تھی اور جل تھا۔

جل تھا اور وہ تھی۔

ایک روز کہ وہ اپنے جوبن میں مست تھی۔

ایک گنّی اُس پر اُتری۔

اُتری اور قطرہ بن گئی۔

قطرہ بن گئی اور ٹھہر گئی۔

پوری طرح یوں ٹھہری بھی نہ تھی، وہیں لرزتی جاتی تھی۔

اور عین اُس کے بیچ ایک رَنس سمٹی ہوئی تھی جو مَن کے بیچ کھبتی تھی۔

اس نے اَپنے تئیں سوچا۔

کہ وہ تو اِس سَنمانی گنّی کے سمان ہے قطرہ بننے والی، رَنس سمیٹے ہوئے۔

تب اِسی طرح کی ایک اور گنّی اُوپر سے بَرسی۔

وہیں پہلی کے آلے دَوالے۔

دونوں ایک دوسرے کے اور کھسکیں اور مل گئیں۔

دو سے ایک ہوئیں۔

سنجوگ کیا ہوا، دونوں جو اب ایک ہو گئی تھیں، اپنے جوبن پر آ گئیں۔

وہ جَل میں یوں ملیں کہ جَل اُن کی چَھب میں چُھپ گیا۔

یہ جَل اب سارے میں لہروں کی طرح اُچھلنے لگا تھا۔

اُس نے جانا یہ سارا جَل جو پہلے جھر جھر گرتا تھا؛ اور اَب اِدھر اُدھر شُوکتا پھرتا ہے' دو بوندوں کے سنجوگ کے سمان ہے۔

دو بوندیں' جو پہلے دو کنیاں تھیں۔ اور اَب جَل ہی جَل تھا' شُوکتا' شور مچاتا' اُچھلتا کودتا۔

تب اُس کے بھیتَر سے شانت نے شما چاہی۔

اور عجب طرح کی جوالا بھڑکنے لگی۔

اُسے اَپنی سُرت نہ رہی۔

وہ شانتی جو اُس کی دَھروٹ تھی' دو بوندوں کے کارن لٹ گئی تھی

وہ سوچتی:

ایک کَنی جو بوند بنی' وہ تو وہ خود تھی مگر دوسری؟

پھر اُسے چنتا ہوئی:

وہ سمندر کے سمان کیسے ہو سکے گی؟...... کیسے؟؟...... کیسے؟؟؟

یہ جَل جو کبھی اُسے مدھُو لگتا تھا۔

اَب اَگنی بن کر اُسے جلاتا تھا۔

اُس کے اندر سے ساری للک نچڑ گئی۔

ایک کلپنا تھی جو اُسے کلپاتی تھی۔

ایک ہی چِت تھی جس میں وہ اَپنی بُدھ کھو بیٹھی تھی۔

اُس کی بڑھوتری اِسی جل میں ہوئی تھی۔

مگر اب اُسے لگتا تھا' وہ اور تھی اور جَل اور۔

یہ کیسا یُدھ تھا جو اس کے اندر ہو رہا تھا۔

اس نے لہروں کے ساز پر مدھُمات کو چھیڑا۔

یہ سُر پہلے اُسے شانت کرتا تھا' اب تڑپانے لگا۔

عین اُس سمے اُس نے اوپر سے نیچے جھانک لیا۔

نیچے' بہت نیچے' ڈابھ کے اندر' ڈابک کی چمک تھی' یوں کہ جھلک پڑنے پر آنکھیں چندھیاتی تھی۔

اُس نے جانا' پرنتو' وہ ڈابک نہیں' اک گنّی ہے دوسری کنی۔ قطرہ بنے اُس کی منتظر۔

اُس نے اَپنی بگھی کی لگامیں اُس اور موڑ لیں۔

اور دھرتی پر اُتر آئی۔

ڈابک میں مِل جانا تو اس کے مقدر میں نہ لکھا تھا' مَن میں جا اُتری۔

اور آنکھوں میں جا سمائی۔

اور اَب قطرہ قطرہ دَامن بھگوتی رہتی ہے۔

معزول نسل

جانے وہ کون سا لمحہ تھا جب اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ سب سے چھپ کر گاؤں میں داخل ہوگی، چپکے سے صحن میں قدم رکھے گی' پنجوں کے بل چلتی ہوئی اپنی ماں جائی صفو کے عقب میں جا کھڑی ہوگی اور ہولے سے اُس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھے گی:

''بوجھو تو میں کون ہوں؟''

بالکل ویسے ہی جیسے کئی برس پہلے کے اُس سارے عرصے میں اُس کی بہن کو جب بھی موقع ملتا رہا تھا' دبے پاؤں پیچھے سے آتی تھی اور اپنی نرم نرم ہتھیلیوں کو اُس کی آنکھوں پر دھر دِیا کرتی تھی۔

عجب خیال تھا کہ جس کی لذت اور سرشاری سے اُس کا سارا بدن بھیگ رہا تھا۔ اگر گزرتے وقت کا تعین یہی ہے کہ اس دورانیے میں کسی عمل کے وقوع پذیر ہونے کا اِمکان پایا جاتا ہے تو اُس پر یہ عجب لمحہ ٹھہر سا گیا تھا۔ مدت پہلے ہو چکی ایک اٹکھیلی اپنی ہیئت بدل کر اس پر

پھوار کی صورت برس رہی تھی۔ وقت کا پہیہ جس دُھرے پر گھوم رہا تھا' اُس کی دوطرفہ چال کے ہلکوروں میں عجب طرح کا کیف اور بے پناہ مستی تھی۔

گاڑی آگے ہی آگے جس سمت بھاگ رہی تھی اُدھر راہ میں ملکوٹ کا چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ وہیں سے اُسے امن پور جانا تھا۔ کیسے جانا تھا؟ یہ ابھی اُس نے نہیں سوچا تھا کہ اُسے ماضی کے ایک لمحے کو حال میں یا پھر حال کے لمحات کو ماضی میں بلوڈالنے سے فرصت ہی نہیں مل پا رہی تھی کہ وہ اگلی مسافت کی بابت سوچتی۔

اسٹیشن اور امن پور کے بیچ دوکوس کی مسافت پڑتی تھی۔ جن دنوں وہ اس گاؤں میں تھی تب اسٹیشن پر اُترنے والے لوگ پیدل ہی چل دِیا کرتے تھے۔ عورتیں اَپنے بچوں اور شہر سے خریدے گئے سامان کو اَپنی اَپنی کھارِیوں میں ڈال کر سروں پر رَکھ لیتیں۔ مرد اپنے صافے کندھوں پر ڈالے وارث شاہ کی ہیر یا پھر بلھے شاہ کی کافیاں گاتے آگے آگے ہو لیتے۔ کچھ شوقین مزاج ماہیے' ڈھولے یا ٹپے کی لَے میں قدم بڑھاتے جاتے اور سفر کٹ جاتا۔ تاہم کسی کا کوئی خاص مہمان یا کوئی حکومتی کارندہ آرہا ہوتا تو شکورا منداتی اپنا اونٹ لے آتا جس پر کجاوا کس دیا جاتا۔ اونٹ جھٹکے دِے دِے کر قسطوں میں اُٹھتا تو سوار کی چیخیں نکل جاتیں۔ شکورا منداتی سوار کو تسلیاں دِیتا' اپنے اونٹ کے اصیل ہونے کے گُن گاتا' اُس کے نتھنوں کو چیر کر ڈالی گئی لکڑی کی مُنّی سی رنگین نکیل سے بندھی لمبی مہار کو دِھیرے دِھیرے تُنکا دِیتا اور' اُٹھ اُٹھ شابا اُٹھ' حکم اور لاڈ کے مِلے جُلے انداز میں یوں کہتا کہ اونٹ اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر دوکوس کی ریتلی مسافت پر مستی سے رواں ہو جاتا تھا۔

مشہور تھا کہ دوکوس کی یہ پٹی کبھی دریائے نیلان کے پانیوں کی گزرگاہ تھی۔ ایک ہی وقت میں نہیں' وقفے وقفے سے۔ جیسے گہری نیند میں کوئی پہلو بدلتا ہے' بالکل ایسے ہی نیلان پہلو بدلتا رہا تھا۔ کچھ اِس انداز سے کہ پہلے بہاؤ کی گزرگاہ پر ریت چھوڑتا چلا جاتا اور خود اپنے قدم چکنی اور

دلدلی مٹی میں دھنسا لیتا۔ سرخ مٹی ٹھنڈے میٹھے پانیوں کی ننگی پنڈلیوں سے لپٹ جانے کی چاہ میں اَپنی جڑوں سے اُکھڑ جاتی اور سنگلاخ پہاڑوں سے ذرّہ ذرّہ ٹوٹ کر اُترتی ریت وہاں بچھ بچھ جاتی۔ حتّیٰ کہ دو کوس کا یہ ٹکڑا پوری طرح ریت سے اَٹ گیا اور نیلان اپنا راستہ بدل کر امن پور کی دوسری سمت یوں بہنے لگا تھا' جیسے گاؤں سے بہت دور' عاشی کے دِل کے بیچ' ماضی کے گزرے لمحے اَپنی جڑوں سے اُکھڑ کر محبت کے پر جوش پانیوں کے سنگ بہتے ہوے اُس پاٹ سے اَپنی گزرگاہ بدل رہے تھے جو حال کی سنگلاخ چٹانوں کے بیچ پھسلتی خالی پن کی ریت سے اَٹ گیا تھا۔

عین اُس لمحے کہ جب گاڑی دو متوازی پٹڑیوں پر پوری رَفتار سے آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی' وہ اِس خالی پن سے نکل آئی تھی۔ اب وہ اُس لمحے کی لذّت میں اسیر تھی جس میں اُس کی بہن صفو کے ہاتھ اُس کی آنکھوں پر تھے اور اُس کی ہتھیلیوں کی نرم نرم تپش اُس کے پورے بدن میں اُتر رہی تھی۔

''میں کون ہوں؟''

صفو کہتی تھی۔ حالاں کہ اُس کے ہاتھ اُس کی چغلی کھا جایا کرتے تھے اور یہ وہ خود بھی جانتی تھی مگر عاشی گاؤں بھر کی لڑکیوں کے نام ایک ایک کر کے گنوانا شروع کر دیتی کہ اُسے ان لمحات کو طول دینے میں لطف آتا تھا۔ صفو ''نہیں نہیں'' کہتی جاتی اور وہ نام گنوائے چلی جاتی' حتّیٰ کہ وہ ہاتھ سمیٹ کر خود ہی سامنے کھڑی ہو جاتی اور پوچھنے لگتی:

''تم جھوٹ موٹ کیوں نام گنوائے چلی جاتی ہو؟''

تب عاشی' کچھ کہے بغیر' اُس کی نیل گوں آنکھوں میں دیکھتی جنھیں دیکھنے سے اُسے یوں لگتا تھا جیسے نیلان کا سارا پانی اُن میں اُتر آیا ہو۔ پھر وہ اَپنی بہن کے بھرے بھرے بدن سے لپٹ جاتی اور بے سبب ہنستی چلی جاتی۔

نمبردار فقیر محمد کی یہ دو بیٹیاں تھیں۔ دونوں اپنے باپ کی بہت لاڈلیاں۔ اُن تین مشکل

ترین برسوں میں کہ جب لوگ کڑوا باجرہ کھانے پر مجبور تھے' یہ دونوں میٹھے باجرے کی ڈھوڈیاں اور وَصلنیاں کھاتی تھیں۔ یہ باجرہ شوما کراڑ پنڈی سے ملحق ایک گاؤں سے اپنی گدھی پر بطور خاص لاتا تو اُسے دو دن کی مسافت طے کرنا پڑتی تھی۔ سیاہ رنگ کی اُون سے بنی ہوئی دوہری چھٹ کے دونوں پلڑے گدھی کے اِدھر اُدھر جھول رہے ہوتے اور شوما کراڑ تھکاوٹ سے چور پاؤں گھسیٹتا گاؤں میں داخل ہوتا تو لوگ اُسے حسرت سے دیکھتے اور نمبردار فقیر محمد کی اُس محبت پر حیرت کا اِظہار کرتے جو اُسے اپنی بیٹیوں سے تھی۔

اتنی شدید محبت کا روگ تو اُن دِنوں بیٹوں کے لیے پالنا بھی ممکن نہ تھا۔

مسلسل تین برس کی بے وقت بارشوں نے ہر بار کھلیان میں پڑے باجرے کے سِٹوں کو یوں بھگوڈالا تھا کہ وہ گُمبھر ا گئے تھے۔ یہ اُن دِنوں کا تذکرہ ہے' جب گندم کی کاشت عام نہ تھی کہ بیج بہت مہنگا تھا۔ سب جوار یا باجرے پر گزر بسر کرتے تھے۔ مگر گُمبھر نے باجرے کے آٹے میں بھی کڑواہٹ بھر دی تھی۔

یہ کڑواہٹ ایک مرتبہ صفو کے حلق میں ناگواری بن کر اُتری تھی اور اُس نے پہلے لقمہ لینے کے بعد ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ عاشی باقاعدہ اِحتجاج کرتے ہوئے اُٹھ گئی تھی۔

ماں نے یہ دیکھا تھا تو کہا تھا:

''بیٹا خدا کا شکر ادا کرو جس نے یہ بھی عطا کیا ہے۔اور ان کا سوچو جو بھوک سے بلک بلک کر مر جاتے ہیں۔''

صفو نے جھینپ کر دوسرا لقمہ توڑ لیا تھا مگر عاشی کے ذہن میں گمبھر ائی ہوئی کڑواہٹ نے تلخی کی شدّت بھر دِی تھی' کہنے لگی:

''تُمبے مارے اِس اناج کو کھانے سے کہیں بہتر ہے آدمی مر ہی جائے۔''

نمبردار فقیر محمد جو اپنی بچیوں کو دِیکھ دِیکھ کر خوش ہو رہا تھا' یہ سن کر تڑپ اُٹھا۔ دونوں کو چھاتی

سے لپٹا لیا اور کہا:

"تمہیں میری زِندگی بھی لگ جائے' ایسا بھول کر بھی نہیں کہتے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز کپکپا گئی تھی۔ صفو اور عاشی کو یوں لگا جیسے اُن کے ابا کے اندر ہی اندر کوئی چھاتی پیٹ رہا ہو۔ دونوں نے ابا کے چہرے کی طرف دیکھا' ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے' نتھنے تیز تیز سانسوں سے پھڑ پھڑا رہے تھے اور آنکھیں کناروں تک بھر گئی تھیں۔

ماں اُس روز بہت ناراض ہوئی تھی۔ انہیں اپنے روّیے پر پشیمانی بھی تھی۔ شام کو ابا کہیں چلے گئے تھے اور اُنہیں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ماں سے اِس بابت پوچھتیں۔ رات بھر وہ سو نہ سکی تھیں تاہم اگلے روز جب ابا پلٹے تو چہرے پر پہلی جیسی محبت کی گرمجوشی کے رنگ دیکھ کر دونوں مطمئن ہو گئی تھیں۔ ابا نے بتایا' میٹھے باجرے کا بندوبست ہو گیا تھا۔

چاند کی چڑھتل کی ساتویں تھیں جب شوما کراڑ آخری بار باجرے کی اُونی چھٹ گدھی پر لادے گاؤں میں داخل ہوا تھا اور چاند گھاٹویں کے ساتویں پر تھا کہ سانپ نے نمبردار فقیر محمد کو ڈس لیا۔ وہ اَپنی بیوی سے بس اِتنا وعدہ لے سکا تھا کہ وہ بیٹیوں کا دِھیان رکھے گی اور نیلا گھمٹ ہو کر مر گیا۔

رضیہ پہلے تو سُدھ بُدھ کھو بیٹھی' ہوش آیا تو اُس وعدے کے ایفا میں جُت گئی جو نمبردار فقیر محمد نے اُس سے لیا تھا۔ وہ پہلے ہی بچیوں کا بہت خیال رَکھتی تھی' یتیم ہوئیں تو اُس نے اپنے کامل دھیان کی بُکل میں دونوں کو اچھی طرح سمیٹ لیا۔

نمبردار فقیر محمد کے مرنے کے بعد بہت کچھ بدل گیا تھا۔ جب تک وہ زندہ تھا' لوگ اس کے مرحوم باپ کو خُوش بخت کہتے تھے کہ اُسے نمبرداری اور بیٹا دونوں ملے تھے۔ اس پر وہ بجا طور پر ناز بھی کیا کرتا کہ دونوں طاقت کی علامت تھے۔ ایک طاقت کا وجود دوسرا طاقت کی توسیع اور تسلسل۔ مگر فقیر محمد نے وراثت میں ملنے والی نمبرداری کو آمنے سامنے آ کر رُکتی اُن دیوار چوں

کے باہر کھڑا کر کے بُھلا دیا تھا' جہاں اُس وقت دروازہ لگا دیا گیا' جب رضیہ اُس کی زِندگی میں داخل ہوئی تھی۔

رضیہ کیا تھی؟ سدا کی راضی بہ رضا۔ نمبردار فقیر محمد بھولے سے بھی کہہ دِیتا 'ذرا ٹھہرو' وہ وہیں ٹھہر جاتی اور شاید عمر بھر ٹھہری رہتی اگر نمبردار فقیر محمد کو اُس کا دھیان نہ آ جاتا۔ وراثت میں ملی نمبرداری کی کچھ تلچھٹ اُس کے بدن کے پیندے میں کہیں اگر رہ بھی گئی تھی تو اُسے رضیہ کے دھیان کی چھاننی نے چھان کر اُس کے وجود کو نتھار دیا تھا۔

جب نمبردار فقیر محمد سانپ کے کاٹے سے مرا تھا تو وہ تقسیم کا زمانہ تھا۔ امن پور فسادات سے محفوظ رہا تھا۔ تاہم ایک دو خاندان جو مکان خالی کر کے اُدھر سرحد پار سِٹک گئے تھے' اُدھر سے آنے والے اس میں بسنے کو آ پہنچے تھے۔

دائیں سمت دو گھر چھوڑ کر جو مکان تھا اُس میں سفیر احمد اَپنی بیوی بیٹی اور بیٹے پر مشتمل مختصر سے خاندان کے ساتھ قابض ہو گیا تھا۔ پہلے پہل یہ لوگ بہت اجنبی اجنبی سے لگے مگر گاؤں والوں نے بہت جلد انہیں قبول کر لیا۔ سفیر احمد کی بیٹی عظمیٰ صفو اور عاشی کی سہیلی بن گئی۔ میل جول بڑھا تو عظمیٰ کی ماں بھی آنے جانے لگی۔ وہ پہروں رضیہ کے پاس بیٹھے باتیں کرتی جس کا غالب حصہ اس تشویش پر مشتمل ہوتا جو اُسے اپنے بچوں کے مستقبل کے حوالے سے لاحق تھی۔ اُس کا خیال تھا' گاؤں میں رہ کر بچوں کے آگے بڑھنے کے اِمکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

شہر منتقل ہونے کے فیصلے تک پہنچتے پہنچتے سفیر احمد اور اُس کی بیگم' دونوں اِس پر متفق ہو چکے تھے کہ اُنہیں اپنے بیٹے علیم کے لیے عاشی کا رشتہ طلب کرنا چاہیے۔ یوں تو اُنہیں صفو بہت اچھی لگتی تھی مگر نمبردار فقیر محمد نے اَپنی زِندگی ہی میں اُس کا رشتہ رضیہ کے اکلوتے بھانجے سلطان سے طے کر دیا تھا۔

اگلے چند برسوں میں بس اتنا موافق رہا کہ رضیہ اَپنی دونوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش

ہوگئی۔ اس کے بعد حادثے پر حادثہ ہوتا چلا گیا۔ رضیہ اپنی ذمہ داری نباہنے کے بعد نمبردار فقیر محمد سے یوں جا ملی جیسے وہ اِسی اِنتظار میں تھی۔ سفیر احمد نے زرعی زمینوں کے لیے حکومت کو کلیم داخل کیا ہوا تھا جو منظور ہو گیا تھا۔ زمین ملی تو اس نے بیچ ڈالی۔ بہو کو باپ کی طرف سے معقول وراثت پہلے ہی مل چکی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ مزید جائیداد کی حقدار ٹھہری۔ علیم نے اصرار کیا کہ موروثی مکان کے بدلے کچھ اور زمین کا مطالبہ کیا جائے۔ صفو کے شوہر سلطان کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگا تھا مگر صفو نے فراخ دِلی سے وہ سب کچھ دے دیا جو عاشی کے سسرال والوں نے طلب کیا تھا۔ شہر منتقل ہونے کے لیے اس سب کا بکنا ضروری تھا۔ لہذا اس کا بھی سودا طے ہو گیا۔

اس کے بعد تو وقت نے جیسے پَر لگا لیے تھے حتّٰی کہ وہ اتنی تیزی سے اُڑا تھا کہ پیچھے کرب کی ایک تیز دھار لکیر چھوڑتا چلا گیا۔ اتنی تیز دھار لکیر جو عاشی کے وجود کو چیرتی اور اُس کے پارچے بناتی چلی جاتی تھی۔ تاہم اب جب کہ وہ تیزی سے ملکوٹ کی سمت بھاگتی گاڑی میں بیٹھی وقت کے پہیے کی عجب چال کے ہلکورے لے رہی تھی تو اس درد اور کسک کو اُسی وجود میں چھوڑ آئی تھی جسے پارچوں میں بٹ کر وہ بھولے بیٹھی تھی۔

ملکوٹ کے اسٹیشن پر کچھ زیادہ گہما گہمی تھی۔ اُس نے سرسری اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی شناسا چہرہ نظر آ جائے۔ بیچ میں اتنا زیادہ وقت گزر چکا تھا کہ یوں سرسری دیکھنا' کسی کو پہچان لینے کے لیے بہت ناکافی تھا۔ وہ اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلی۔ یہاں بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ یہاں وہاں کچھ دکانیں بن گئی تھیں۔ سوزوکیوں' ریڑھوں اور تانگوں والے بھی موجود تھے۔ یہ سب کچھ پہلے نہ تھا۔ ایک طرف ایک شخص اپنے اونٹ کے پاس اُکڑوں بیٹھا بے زاری سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ عاشی کے قدم خود بخود اُدھر اُٹھنے لگے۔ اونٹ والا ایک اجنبی سلجھی ہوئی بزرگ خاتون کو دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ عاشی کو پہلے تو شکورے منداتی کا شائبہ پڑا۔ مگر وہ تب بھی

اتنا ہی تھا جتنا یہ اونٹ والا اب لگ رہا تھا۔ وہ خود ہی اپنے خیال پر مسکرا دی۔ یہ یقیناً اس کا بیٹا ہوگا' اس نے تخمینہ لگایا۔ شکل وصورت اور ڈیل ڈول سے ایسا ہی لگتا تھا۔ پھر اونٹ کی موجودگی بھی اس کی تصدیق کیے دیتی تھی۔ عاشی نے قصداً اپنے چہرے کو دوپٹے کی اوٹ میں دیے رکھا کہ پہچانی نہ جائے۔

عاشی کجاوے میں بیٹھ گئی۔ دوسری طرف اس کا سامان اور ایک بھاری بھرکم پتھر رکھ کر وزن برابر کیا گیا۔ شتربان راستے میں اُسے بتا رہا تھا کہ اُدھر دوسری جانب سے گاؤں تک سڑک جاتی ہے لہذا زیادہ تر لوگ موٹروں اور تانگوں پر گاؤں جانے لگے ہیں۔ وہ گزرے وقت کو اچھا کہ رہا تھا' جب اونٹوں کے طفیل اُس کے گھر میں خُوشحالی کی ریل پیل تھی۔ وہ جنگل سے لکڑیاں شہر پہنچاتا تھا اور شہر سے اسباب گاؤں لاتا۔ جب کہ گاؤں کے مہمانوں کو بلا اُجرت اسٹیشن لے جاتا اور لے آتا تھا' مگر اب تو صرف یہی اسٹیشن کی سواریاں رزق کا وسیلہ تھیں۔ جب وہ اپنے سارے دُکھ کہ چکا تو اس نے پوچھا:

''بی بی جی آپ کو کہاں جانا ہے''

عاشی چُپ رہی۔ اُس نے اپنا سوال دہرایا تو عاشی نے الٹا سوال کر دیا:

''ہم امن پور ہی جا رہے ہیں نا''

''جی جی''

اُس نے تُرت جواب دیا تھا۔ امن پور کے نام پر شتربان نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش میں اوپر کا آدھا جسم موڑ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔

جب وہ امن پور میں داخل ہوئے تو عاشی کو لگا جیسے واقعی سب کچھ بدل گیا تھا۔ پھر جب اس نے نمبردار فقیر محمد کی حویلی کی سمت چلنے کو کہا تھا تو شتربان نے ایک بار پھر چونک کر' اپنا بدن موڑا اور حیرت سے اُس کی سمت دیکھا۔ بزرگ خاتون نے چہرے کو دوپٹے کی اوٹ میں کیا ہوا

تھا۔ شتربان شاید کسی نتیجے پر پہنچ کرخود ہی خود مسکرائے جا رہا تھا۔

عاشی بھی خوش تھی۔ سب کچھ اُس کی منشا کے مطابق ہو رہا ہے۔

اُونٹ جونہی اُس گھر کے پاس پہنچا جو کبھی اُس کا اپنا گھر بھی تھا تو عاشی کو اُسے پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگی۔ اونٹ جب اچھی طرح بیٹھ گیا تو وہ کجاوے سے اُتری۔ اس نے کچھ رقم شتربان کی طرف بڑھائی مگر وہ کہنے لگا:

''میں جانتا ہوں آپ اللہ بخشے چاچا نمبردار فقیر محمد کی وہ بیٹی ہیں جو پناہ گیر بیاہ کر لے گئے تھے......وہی ہیں نا آپ؟''

پھر اُس کے جواب کا اِنتظار کیے بغیر کہنے لگا:

''آپ تو ہماری مہمان ہیں جی میں یہ نہیں لوں گا۔''

اس نے اصرار سے مٹھی بڑھائے رکھی مگر شتربان نے ہاتھ کے اِشارے سے روک دیا اور اس کا سامان اتارنے میں مصروف ہو گیا۔

عاشی گھر کی سمت بڑھی۔ اس کا دل مدت ہوئی ایک ہی رفتار سے دھڑکنے کی عادت میں مبتلا ہو چکا تھا مگر اَب کے اس زور سے دھڑکا کہ اُچھل کر حلق تک آ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور دروازے پر دِھیرے دِھیرے اَپنی ہتھیلی کا بوجھ بڑھا گیا۔ دروازہ چرچراہٹ پیدا کرتا کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ شتربان نے بھی ہاتھ بڑھا کر سامان اندر صحن میں رکھ دیا تھا۔ اُس نے گھوم کا چاروں طرف دیکھا؛ یوں لگتا تھا' جیسے یہاں وقت کی نبضیں بہت ٹھہر ٹھہر کر چل رہی تھیں۔ وہ اَپنے قدموں پر جھکی اور جوتیاں اُتارنے لگی کہ اگلا فاصلہ اُسے پنجوں کے بل طے کرنا تھا۔ مگر جب اس نے کمر سیدھی کی تو حیرت اور دُکھ کی ایک نئی لہر سے اُس کی آنکھیں چوپٹ ہو گئی تھیں۔ ایک اِنتہائی بوڑھی عورت پسار کی دِیوار کے ساتھ پڑی لاٹھی ٹٹول ٹٹول کر تلاش کر رہی تھی۔ اُسے جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ یہ اُس کی اَپنی بہن صفو تھی۔

ملنے' رونے اور رو رو کر ملنے کا طوفان تھما تو صفو کُرید کُرید کر پوچھنے لگی۔ اُس کے بارے میں۔ اُس کے بچوں کے بارے میں۔ علیم کے بارے میں۔ اور جب عاشی نے بتایا کہ علیم ایک مدّت سے ملک سے باہر ہی' خوب پیسہ بھیجتا رہا ہے' دونوں بیٹے کارخانوں کے مالک ہیں' اپنے اپنے گھروں میں خُوش ہیں تو صفو نے خدا کا شکر ادا کیا تھا اور اس کی خُوش بختی پر ناز کیا تھا۔

تاہم عاشی نے جان بوجھ کر نہ بتایا تھا کہ علیم نے شہریت کے حصول کے لیے وہاں ایک اور شادی کر لی تھی اور مستقل طور پر وہیں سیٹل ہو گیا تھا۔ بیٹے جب بھی اُسے ملنا چاہتے تھے جا کر مل آتے تھے۔ اور یہ کہ بچے اَپنی اَپنی زِندگی سے اس قدر مطمئن ہو گئے تھے کہ اِس اطمینان کے بیچ ماں کو اپنا وجود بے مصرف لگنے لگا تھا۔ اور یہ بھی کہ بیٹوں کی یہی وہ بے اعتنائی کی ریت تھی جس نے اس کے اندر کے بہتے پانیوں کا رُخ موڑ دیا تھا۔ اور اب وہ گاؤں میں تھی۔ اَپنی بہن صفو کے پاس۔

مگر صفو کہاں تھی' اس نے دُکھ سے سوچا اور اُس کی آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔

وہ دونوں پساری میں بیٹھ گئی تھیں۔ اندر سے لرزتی آواز آئی:

''صفو کس سے باتیں کر رہی ہو۔''

صفو چونک کر اُٹھی' لاٹھی کا سہارا لیا پھر اُس کا ہاتھ تھام کر لاٹھی ٹیکتی اندر داخل ہو گئی۔ یوں کہ عاشی اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اندر قدرے تاریکی تھی اُسے دیکھنے کے لیے آنکھوں کو پورا کھولنا پڑا۔ چارپائی پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچ پڑا تھا جس سے صفو مخاطب تھی۔

''یہ بہن ہے میری عاشی۔ ابھی ابھی آئی ہے۔ دیکھو تو کیسی لگ رہی ہے؟
میری آنکھیں تو اس کی راہ دیکھتے دیکھتے پھوٹ گئیں۔ تم ہی بتاؤ نا کیسی ہے؟''

ہڈیوں کے ڈھانچ میں حرکت ہوئی' چہرے کے دانت اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ کچھ ہمت کر کے وہ بیٹھنے میں کام یاب ہو گیا دو چار سانسوں کو اوپر نیچے کر کے ہاتھ عاشی کی سمت بڑھایا اور کہنے لگا:

''مجھے مل تو لینے دے بھلیئے۔ بتاتا ہوں' ابھی بتاتا ہوں' کیسی لگ رہی ہے ہماری بہن۔

جی آیاں نوں۔ بیٹھو جی۔ کتنی بڑی ہو گئی......ہیں......آپ۔''

اس کا لہجہ بات کرتے کرتے بیچ ہی میں مؤدب ہو گیا تھا۔ وہ پائنتانے بیٹھ گئی۔ صفو اپنے شوہر کی پشت پر ہاتھ پھیرتے وہیں ٹک گئی اور اصرار کر کے پوچھنے لگی۔

''بتاؤ نا! کیسی لگ رہی ہے میری بہن۔''

وہ ہنسا' یوں کہ ہنسی کھانسی کی کھائی میں پھسل گئی۔ سنبھلا اور کہنے لگا:

''جھلیئے' کیسے بتاؤں؟ کیا بتاؤں؟ بالکل تمہارے جیسی ہیں یہ بھی۔ بس اتنا فرق ہے

کہ جو روشن چراغ تمہارے اندر ہیں' وہی ان کے چہرے پر سجے ہوئے ہیں۔''

صفو نے اس کی پشت پر سر رکھ دیا۔ کہا:

''کتنے اچھے ہیں آپ۔''

اور اطمینان کی ایک لہر اُس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ سر اُٹھا کر چہرہ اُس کے قریب لائی اور کہا:

''آپ کی ان ہی باتوں نے تو مجھ بے اولادن کو عمر بھر نہال کیے رکھا ہے۔''

صفو کی بات سن کر وہ زور سے ہنسا۔ اِتنی زور سے کہ اُس کی کھانسی ایک دفعہ پھر اُچٹ کر باہر گرنے لگی۔

کتنی تکلیف سے ہنسا تھا وہ' مگر کتنی خالص اور بے ریا ہنسی تھی۔ عاشی نے سوچا تھا۔

پھر وہ جھوٹ موٹ ڈانٹنے لگا۔

’’بکواس نہ کر،ہاں بکواس نہ کر۔‘‘

عاشی کو لگا' اس ڈانٹ میں بھی بے پناہ اپنائیت تھی۔ اب صفو کے ہنسنے کی باری تھی۔ وہ ہنسی کے فوارے کو روک کر کہنے لگی:

’’میں بکواس نہیں کر رہی' اولاد ہوتی تو تمہارا سہارا بنتی۔‘‘

بات مکمل کرنے سے پہلے ہی ہنسی کا فوارہ رُک چکا تھا۔ سلطان کا چہرہ تن گیا۔ کہنے لگا:

’’خدا' اور تمہارے سہارے کے بعد مجھے کسی اور سہارے کی تمنا کبھی نہیں ہوئی۔

اُس کا شکر ادا کرو کہ ایک دوسرے کے لیے ہم ہیں۔ اگر اولاد ہوتی اور ہمیں نہ پوچھتی یا پھر ہم دونوں کے بیچ دیوار بن جاتی تو کیا یہ حیاتی موت سے بھی بدتر نہ ہو جاتی۔‘‘

صفو کی بے نور آنکھیں چھلک کر بہنے لگیں۔ عاشی کو اَپنی زِندگی کے گُمبھر کی کڑواہٹ اور تلخی اپنے حلق میں محسوس ہوئی۔ اُسے یوں لگنے لگا تھا جیسے محبت سے چھلکتے اِن دو وجودوں کے بیچ وہ خود بھی لگ بھگ اتنی ہی اضافی ہو گئی تھی جتنی کہ وہ اپنے بیٹوں کی مصروفیتوں کے بیچ اِضافی تھی۔

کِکلی کلیر دِی

قلم کِکلی ؟...... یہ کیا عنوان ہوا؟؟

اُسے اِعتراض تھا۔ وہ میری تحریروں کی پہلی قاری تھی اور ناقد بھی۔

میں نے کہا:

تمہارے نزدیک قابل اِعتراض لفظ "قلم" ہے یا "کِکلی"؟

وہ اَپنی گہری بھوری آنکھیں میرے چہرے پر جما کر کہنے لگی:

قلم بھی......اور......کِکلی بھی۔

دونوں؟......مگر کیوں ں ں ں؟

میں نے سٹ پٹا کر کیوں کو خوب کھینچ کر لمبا کیا۔ وضاحت چاہنے کے لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اضافہ کیا:

"دیکھو! قلم تو ہمارے پاس ایک مقدس امانت ہے۔"

وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ شوخی اُس کے گورے گالوں پر ناچنے لگی۔ کہا:

''اپنے جملے میں سے 'ہے' کو 'تھا' سے بدل لو۔''

پھر جھوم جھوم کر اور آنکھیں نچاتے ہوئے گنگنانے لگی:

''تھا کا مطلب تو تمہیں آتا ہوگا؟''

میں نے اُلجھ کر اُسے دیکھا تو وہ سنجیدہ ہو چکی تھی۔ اس نے کندھے اچکائے اور کہہ دیا:

''اب قلم جو کچھ لکھتا ہے اس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔''

میں نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی شرارت پکڑ لی ہو۔ کہنے لگی:

''اَب یہ تھیوری چل نکلی ہے کہ لکھنے والا جب لکھتا ہے تو موضوع غائب اور مفہوم ملتوی ہو جاتا ہے۔''

میرے چہرے کی کھڈی پر حیرت کا لٹھا تن گیا۔ اُس نے وضاحت کرنے کی بہ جائے میری کم علمی پر طنز کرتے ہوئے کہا:

''حیرت ہے تم لکھنے والے ہو اور نہیں جانتے کہ لکھنے والا لکھتے ہی مر مرا جایا کرتا ہے۔''

مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اُس نے وضاحت کی:

''یوں منھ کھول کر حیرت سے مجھے نہ دیکھو۔ میں تو اس تنقیدی فلسفے کا ذکر کر رہی ہوں جس میں لکھنے والے کی حیثیت ایک محرر سے زیادہ نہیں رہتی۔ اور ہاں اے میرے محرر، تم کسی مقدس امانت کا ذکر کر رہے تھے؟

اُس نے اچانک سوال لڑھکا کر مجھے بوکھلا دیا۔ میں نے اِسی بوکھلاہٹ میں رٹا رٹایا جملہ دہرایا:

''قلم مقدس امانت ہے''

''مقدس امانت؟''

اُس نے منھ اوپر کر کے میرے لفظ اُچھالے اور قہقہہ لگا کر کہا:

''اب تو یہ امانت بکتی ہے کہ یہ بازاری جنس ہوگئی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اب ہر متن کے معنی معطل اور ہر تحریر سے وابستہ تقدس متروک ہو جاتا ہے۔ اب تو تمہارے قلم سے نکلے ہوے لفظ طوائف جیسے ہو گئے ہیں۔ یہ جس کے ہاتھ چڑھتے ہیں اسی کے ہو جاتے ہیں۔''

کیا کہتی ہو؟ میں نے برہم ہو کر کہا۔ اس نے مجھے ٹوک دیا:

''میں نہیں کہتی' ایسا تمہاری تھیوری کہتی ہے۔ اب لکھنے والا سچ نہیں لکھتا کہ اسے ایک مبہم' مخلوط اور خط مستقیم سے گریزاں وسعت مکانی میں یوں لڑھکنا ہوتا ہے جیسے کوئی شرابی گھپ اندھیرے میں اوبڑ کھابڑ راستوں پر لڑکھڑاتا آگے بڑھتا ہے۔''

میں نے سر جھٹک کر کہا:

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔''

اُس نے اپنے سرخ ہونٹوں کو ایک دوسرے پر جما کر پٹاخہ بجایا:

''ایسا ہی تو ہو رہا ہے۔ اب تحریر سے وابستہ تقدس اور معنی بھی اس ٹشو پیپر کی طرح ہو گئے ہیں جسے اِستعمال کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔''

میں نے ایک ایک کر کے ان ادیبوں کو یاد کرنا چاہا جو لفظ کے معنی اور معنی کے تقدس سے وابستہ ہو سکتے تھے۔ میں سوچتا چلا گیا حتٰی کہ میں اندر سے لرزنے لگا۔ میں نے اُس کے سامنے شکست کی ہتک سے بچنے کا حیلہ کرنا چاہا:

''مگر میں تو......''

''قلم کی عظمت کا قائل ہوں''

اُس نے میرے منھ سے جملہ اُچک کر مکمل کیا اور طیش میں آتے ہوے کہا:

''قلم کا تقدس...... قلم کی عظمت...... قلم کی حرمت...... اور اب صارفیت کے فروغ کے لیے بازاری تھیوریاں یا پھر اینٹی تھیوریاں...... تم ادیبوں کے پاس بانجھ لفظوں

کا کتنا ذخیرہ ہوتا ہے' بے دریغ اِستعمال کرتے ہوا نہیں' سوچے سمجھے بغیر۔''

اس کی آواز معمول سے کہیں زیادہ بلند ہوگئی تھی۔ میں جھینپ گیا۔ موضوع بدل دینا چاہا۔

اور...... ککلی پر کیا اعتراض ہے تمہارا؟

اس کی آنکھیں ماضی کی یادوں تلے بند ہونے لگیں اور ہونٹ میٹھے لفظوں کی لذت کو چاٹنے لگے:

''ککلی کلیر دِی

پگ میرے وِیر دِی......''

میں اُسے خواب کے برزخ سے حقیقت کی سنگلاخ زمین پر کھینچ لایا:

''میں نے تو ککلی پر تمہارا اعتراض جاننا چاہا تھا اور تم بچی بن کر ککلی گانے لگی ہو۔''

''ہاں! یہی تو اِس لفظ کی خوبی تھی کہ بچھڑے بچپن کی اُنگلی تھما دیتا تھا۔''

اُس نے اپنا جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ میں نے بدلا اتار دِینا چاہا:

''اب تم ''تھا'' کو ''ہے'' سے بدل کر اپنا جملہ درست کرلو۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دِی اور پھر ہنسے چلی گئی۔ حتّٰی کہ اس کا بدن دہرا ہوگیا اور آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ پھر وہ یکلخت یوں چپ ہوگئی' یوں کہ سارے میں سناٹا قہقہے لگانے لگا۔ میں اُس کے چہرے پر بدلتے رنگوں کو حیرت سے تک رہا تھا۔ اور جب سنجیدگی اس کے چہرے پر ککلی کھیل رہی تھی تو اس نے کہا:

''تم نے اپنے بچوں کے چہروں کبھی غور سے دیکھا ہے؟''

میں اس غیر متوقع سوال پر بھونچکا ہوکر اسے بٹر بٹر دیکھنے لگا۔ میں بہ ظاہر اسے دیکھ رہا تھا مگر بہت سُرعت سے یہ سوچنے کی جانب رَاغب بھی ہوگیا تھا کہ میں نے اپنے بچوں کے چہرے کب غور سے دیکھے تھے۔ جب میرے حیرت زدہ چہرے پر سوچ کی مکڑی نے جالا بُن دیا تو وہ

کہنے لگی:

''تمہیں کب فرصت ہے اس کی؟ تمہارا دفتر ہے' کمپیوٹر ہے' انٹرنیٹ ہے' بزنس میٹنگز ہیں' پارٹیاں اور آؤٹنگ ہے۔ اور لکھنا لکھانا بھی تو ہے' ہونہہ۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تمہارے اپنے معمولات ہیں۔ ایسے میں تمہارے پاس وقت کہاں کہ بچوں کے چہرے غور سے دیکھ سکو۔ تمہاری نظریں تو میرا چہرہ بھی ڈھنگ سے دیکھنا بھول گئی ہیں۔''

میں شرمندہ ہو گیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی تھی کہ ایک مدّت سے میں اُس کا چہرہ حیرت سے دیکھتا تھا یا بوکھلاہٹ میں۔ محبت سے دیکھنا نہ جانے کب سے چھوٹ گیا تھا۔

مجھے جھینپتے پا کر وہ ماضی کے ان لمحات میں اُتر گئی جب میری نظروں کی آنچ سے اُس کے گورے گال تمتما کر سرخ ہو جایا کرتے تھے۔ وہ ماضی سے جلد ہی لوٹ آئی اور میرے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگی:

''شرمندگی کے بیج بو کر ہم نے پچھتاوے کی فصل کے سوا اپنی آئندہ کی جنریشن کو برداشت کے لیے اور دِیا ہی کیا ہے؟''

اب میں جس کیفیت میں تھا' اسے کوئی نام نہ دیا جا سکتا تھا۔ وہ میرے چہرے کے بدلتے رنگوں سے بے نیاز ہو کر کہنے لگی:

''جب سے آزاد تجارت اور منڈی کی معیشت نے اِخلاقی اقدار کے تہذیبی ہونے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اپنی اخلاقیات مادے کے حوالے کر دی ہیں' رشتے بھی بے معنی ہو رہے ہیں۔ پہلے رشتے ضرورتوں کو حد سے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ اب ضرورتیں رشتوں کی حدیں خود قائم کرتی ہیں۔ جب سے صارفیت نے انسانی ضرورتوں کی پیداوار کا ٹھیکہ اپنے ذمہ لیا ہے' میڈیا وہ سبق پڑھ رہا ہے جو سرمایہ کار اسے پڑھا رہا ہے اور جو ہر انسان کے صارف ہونے کے لیے دینیات جیسا لازمی

مضمون ہو گیا ہے۔''
وہ ہنستی ہے اور ہنستے ہنستے اُپنی بات مکمل کرنا چاہتی ہے:
''ہر شے جنس ہو گئی ہے۔ رشتے ناتے۔ میاں بیوی۔ بہن بھائی۔ حتّٰی کہ ماں باپ۔ کس کے پاس وقت ہے کہ اس دوسرے کے دِل میں جھانک کر دیکھ سکے۔ اب سب کو مل بیٹھ کر دُکھ سکھ نہیں بانٹنے کہ سب آسانیوں کی طلب میں پاگل ہوے جاتے ہیں۔''
میں نے اسے ٹوکا:
''ہمارے ہاں ابھی تک صورت حال اتنی بھی گھمبیر نہیں ہوئی ......اور مشرق میں ابھی تک خاندانی نظام باقی ہے۔''
اُس نے سانس کا لمبا دھاگا کھینچا اور کہا:
ہاں، مگر اے میرے دانش ور، ہمارے ٹیکنوکریٹس، ہمارے سیاستدان، ہمارے ادیب اور پڑھے لکھے لوگ، ہمارا مقتدر طبقہ اور ہمارا میڈیا ہمیں زبردستی کس جانب دھکیل رہا ہے۔
میں نے وضاحت کرنا چاہی:
''دیکھو وقت بدل رہا ہے۔ ادیب اور دانش ور کا یہ منصب ہے کہ اپنے لوگوں کو زمانے کی ہوا سے آگاہ کرے۔''
وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ کہا:
''آگہی اور چیز ہے اور دوسروں کے فرسودہ نظریات کے لیے کچرے کے ٹرک بن جانا اور بات۔ افسوس کہ ہم اپنا سب کچھ تج دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُپنے آپ پر اِعتماد نہیں اور ہمیں آنے والے لمحوں کا خوف کھائے جاتا ہے۔ ہمارا ماضی ہے نہ حال۔ مستقل کا کوئی بھروسہ نہیں۔ لہذا ہم اُن کی طرف دیکھتے ہیں جنھوں نے علم

اور تہذیبی مظاہر کی جگہ اِنفارمیشن گاربیج کو دے دی ہے۔"

"انفارمیشن گاربیج؟"

میں نے اُسے ٹوک کر پوچھا:

"ہاں اِنفارمیشن گاربیج۔ ایک ڈھیر ہے معلومات کا جو انٹرنیٹ کے ذریعے بہا چلا آتا ہے۔ اسی میں ننگی عورتیں بھی ہیں اور سائنسی فامولے بھی۔ یہاں بے ہودہ مرد اور جنسی لذتیں بھی ہیں اور شعروادب کے چسکے کا سامان بھی۔ چلتے فیشن کی چڈی، نئے ڈیزائن کی نائیٹی، چٹ پٹے لطیفے، بش کی دھمکیاں، تیل کی چڑھتی ہوئی قیمتیں جسے جو کچھ جاننا ہوتا یہیں سے اُچک لیتا ہے۔ یہ ساری معلومات ہم اپنے بچوں کو بھی دینا چاہتے ہیں۔"

"م......م......مگر"

میں نے اسے روکنا چاہا۔ وہ خود ہی رُک گئی تھی۔ اُس کی آواز اب جیسے بہت دور سے آ رہی تھی:

"ٹیوشن، ہوم ورک، ٹی وی ڈرامے، فلمیں، انٹرنیٹ اور لمبے دِن کی بے پناہ تھکن۔ معصوم چہروں کو بے ڈھب معلومات کے اس عفریت نے نچوڑ کر بوڑھا کر دِیا ہے۔ اتنے تیزی سے گزرتے ہوے طویل دن کی کوئی شام ان کھیلوں کے لیے نہیں ہے جو ساری عمر انگلی تھامے رکھ سکتے ہیں۔ لکن میٹی نہ کانچ کی گولیاں۔ اینگن مینگن تلی تلینگن نہ کٹم کاٹا۔ گڑیا پٹولے نہ کھوکھو......اور......نہ کِکلی۔ جب بچوں کے پاس بچپن ہی نہیں رہا تو کِکلی کیسی؟"

میں نے اُسے دیکھا۔ اُسے بھی اور اس کی آنکھوں میں اُمنڈتے آنسوؤں کو بھی۔ اُس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ میں نے تب قریب آتے بچوں کو دیکھا اور یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا کہ اُن کے چہروں سے بچپنا رُخصت ہو چکا تھا۔ تب میں نے ذہن پر زور ڈالا مگر مجھے یاد نہ آ رہا تھا

کہ میرے بچوں نے یہ کھیل کبھی کھیلے بھی تھے یا نہیں۔

اس نے مجھے چھو کر اُپنی جانب متوجہ کیا اور کہا:

’’اسی لیے تو میں نے ’’ککلی‘‘ کے ساتھ ’’تھا‘‘ کا لفظ لگایا تھا۔ ککلی میں میری تیری نسل کے لیے اپنے ماضی کے حوالے سے شاید کچھ کشش باقی ہے مگر آنے والے نسل......‘‘

میرے دِل میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ اُسے کچھ اور کہنے سے روکتے ہوئے کہا:

’’پھر تو میں اس تحریر کا عنوان ’’قلم ککلی‘‘ ضرور رکھوں گا۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

اس نے پوچھا۔

’’اس لیے کہ مجھے اپنے بچوں سے نہ تو اُن کا تہذیبی ماضی چھیننا ہے نہ اُن کو مستقبل میں روبوٹ یا محض صارف بنانا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ مجھے اپنے قلم کو‘ اپنی تحریر کو اور اَپنی اولاد کو جنس ہونے سے بچانا ہے۔‘‘

جب میں یہ کہہ رہا تھا تو میرا سینہ زور زور سے بج رہا تھا۔ اس نے میری کیفیت بھانپتے ہوئے کہا: ’’تم جذباتی ہو رہے ہو!‘‘

’’ہاں......شاید۔‘‘

میں نے تُرت کہا اور اضافہ کیا: ’’کیا کچھ امور میں جذباتی ہونا درست نہیں ہوتا؟‘‘

اس سوال میں عجب طرح کا یقین تھا جس نے اس کی آنکھوں میں ایک مدت بعد پھر چمک بھر دی تھی۔ یہ میرے لیے تصدیق کی چمک تھی کہ اس سے دور دور تک راستہ روشن ہو گیا تھا۔ وہ یکبارگی مسکرائی اور سارے میں مہک بھر گئی۔ میں نے اس کی خُوشبو سے اَپنی سانسوں کو معطر کیا‘ اپنے لفظوں کو اسی خُوشبو سے غسل دِیا اور قلم کو محبت سے کاغذ پر سجدہ ریز ہونے دیا۔

قلم میں ایک مستی تھی کہ وہ ککلی ڈالنے لگا تھا۔

گانٹھ

عَصبی رِیشوں کے وسط میں کچھ اِضافی گانٹھیں پڑ گئیں۔

یا پھر شاید' پہلے سے پڑی گرہیں ڈھیلی ہو گئی تھیں کہ اِضمحلال اُس پر چڑھ دوڑا تھا۔ بدن ٹوٹنے اور دِل ڈوبنے کا مستقل اِحساس ایسا تھا کہ ٹلتا ہی نہ تھا۔

کوئی بھی معالج جب خود ایسی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے' تو یہی مناسب خیال کرتا ہے کہ وہ سیکنڈ اوپینین لے لے۔ ڈاکٹر توصیف کو بھی اِس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مگر وہ اِسے ٹالتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ خود سے مسلسل اُلجھنے اور لڑنے بھڑنے لگا اور اُن لمحوں کو کوسنے لگا تھا جب وہ اس ملک سے اپنے شعبے میں سپیشلائزیشن کے لیے گیا تھا۔

اِنہی لمحات میں وہ لمحات بھی خلط ملط ہو گئے تھے جب اُسے ایک انوسٹی گیشن سنٹر سے نکال کر ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔

اُس پر شبہ کیا گیا تھا۔

مگر کیوں؟؟ آخر کیوں؟؟؟......وہ جتنا سوچتا' اُتنا ہی اُلجھے جاتا۔

ممکن ہے ایک ایشیائی ہونا اس کا سبب ہو۔ نہیں' شاید ایک پاکستانی ہونا۔ یا پھر ہو سکتا ہے مسلمان ہونا ہی شک کی بنیاد بن گیا ہو۔

مگر؟......مگر؟

اور یہ 'مگر' ایسا تھا کہ اس کا سینہ جھنجھنانے لگا تھا۔ وہ اُٹھا اور آئینے میں اپنا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کی صورت میں ایسے شک کے لیے کیا کوئی پرانی لکیر باقی رہ گئی تھی۔ پلک جھپکنے کے مختصر ترین وقفے میں طنز کا کوندا آئینے کی شفاف سطح سے پھسل کر معدوم ہو گیا۔

اُس نے نگاہ سامنے جمائے رکھی۔ چہرے کی لکیروں' اُبھاروں اور ڈھلوانوں پر تن جانے والے تناؤ کا جالا پورے آئینے سے جھلک دینے لگا تھا۔ وہ گھبرا کر اُس تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوا' جو اُس نے اِنٹر کا اِمتحان دِے چکنے کے بعد فراغت کے ایسے لمحات میں بنائی تھی جب مصوری کا جنوں اُس کے سر میں سمایا ہوا تھا۔ یہ اُس کی اَپنی تصویر تھی' جو اَدھوری رِہ گئی تھی۔

کچے پن کی چغلی کھانے والی اِس اَدھوری تصویر میں کیا کشش ہو سکتی تھی کہ اسے ابھی تک سنبھال کر رکھا گیا تھا۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ شاید' بل کہ یقیناً کوئی خوبی بھی ایسی نہ تھی کہ اُس تصویر کو یوں سنبھال کر رکھا جاتا۔ اُسے یاد آیا' جب وہ یہ تصویر بنا رہا تھا تو اُس نے اَپنے باپ سے کہا تھا؛ کاش کبھی وہ دُنیا کی حسین ترین تصویر بنا پائے۔ اُس کے باپ نے اُس کی سمت محبت سے دِیکھ کر کہا تھا:

''تم بنا رہے ہونا' اِس لیے میرے نزدیک تو یہی دُنیا کی خوبصورت ترین تصویر ہے''

وہ ہنس دِیا تھا' تصویر دِیکھ کر' اور وہ جملہ سن کر۔

یہ جو اپنے اپنائیت میں فیصلے کرتے ہیں' اُن کی منطق محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

تصویر نامکمل رہ گئی کہ اُس کا دِل اُوب گیا تھا۔ تاہم اُس کے باپ کو اپنا کہا یاد رہا تھا۔

اس نے اِس اَدھوری تصویر کو اس دیوار پر سجا دِیا تھا۔ بہن نے اسے یوں رہنے دیا ہوگا کہ اُس کے مرحوم باپ نے یہاں اپنے ہاتھوں سے سجائی تھی۔

یہ سوچ کر ذرا سا وہ مسکرایا اور وہاں سے ہٹنا چاہا کہ نظر آنکھوں پر ٹھہر گئی۔ واٹر کلر سے بنائی گئی اس تصویر میں اگرچہ دائیں آنکھ کے نیچے ہاتھ لرز جانے کے باعث براؤن رنگ میں ڈوبا برش کچھ زیادہ ہی دَب کر بنانے والے کے اَناڑی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ مگر مدہم آبی رنگوں میں تیرتی معصومیت نے آنکھوں میں عجب طلسم بھر دیا تھا۔ ایسا کہ نظر ہٹانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تصویر ادھوری تھی۔ چہرے میں رنگ بھرتے بھرتے چھوڑ دِیے گئے تھے۔ یہ اَدھورا پن اُس کے اندر اتر گیا۔ اُس کے اعصاب تن گئے اور وہ اُوندھے منھ بستر پر جا پڑا۔

”کیوں؟......آخر کیوں؟؟“

ایک ہی تکرار سے اُس کا سینہ کناروں تک بھر گیا۔ اُس نے اَپنے جسم کو دو تین بار دائیں بائیں لڑھکا کر جھٹکے دِیے۔ قدرے سانسوں کی آمد ورفت میں سہولت محسوس ہوئی تو ایک بڑا سا 'ہونہہ' اُس کے ہونٹوں سے پھسل پڑا۔ یوں' جیسے اُس کے تیرتے ڈوبتے بدن کو کسی نے لمحہ بھر کے لیے تھام سا لیا ہو۔

تھامنے والے ہاتھ گوگول کے تھے۔ گوگول کے نہیں' اُس تصویر کے' جو گوگول کے ہاں پہلے مرحلے میں نامکمل رہ گئی تھی۔

شیطانی آنکھوں والی اَدھوری تصویر۔

مگر یہ بھی وہ تصویر نہ تھی جس نے اُسے تھاما تھا کہ اس کا چہرہ تو معصومیت لیے ہوے تھا۔ فرشتوں جیسا ملائم اور اُجلا۔

یہ اِسی تصویر کا دوسرا مرحلہ تھا جب کہ وہ مکمل ہوگئی تھی۔

تصور ایک جگہ ٹھہر گیا تو اُسے گوگول کے اَفسانے کا وہ پادری یاد آیا جس نے سب کا دِھیان

شیطانی تاثرات والی آنکھوں کی جانب موڑ دیا تھا۔ اُسے اُبکائی آنے لگی تو اُس نے اَپنے دِھیان سے اُس تصویر کو بھی کُھرچ دِیا' اور کالج کا وہ دور یاد کرنے لگا جب ترقی پسندی اُس کے خلیے خلیے سے خُوشبو بن کر ٹپکنے لگی تھی۔

تب ایک نئی تصویر تھی جو بن رہی تھی۔

ابھی یہ تصویر نامکمل تھی کہ اُس پر اِنسان دوستی اور روشن خیالی کے زاویوں سے کرنیں پڑنے لگیں۔ روشن خیالی کی للک میں سب کچھ روند کر آگے بڑھنے والوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جلد ہی مذہبی فرائض کی بجا آوری کو قیمتی وقت کے ناحق تلف کرنے کے مترادف سمجھنے لگا تھا۔ اُس کا خیال تھا؛ ان فرائض میں صرف ہونے والا وقت کسی بھی اِنسان کو تسکین پہنچا کر اَمر بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے مذہبی طرزِ احساس فقط رَجعت پسندی' جہالت اور ذِہنی پس ماندگی کا شاخسانہ تھا۔ لہذا وہ مذہب اور اس کے متعلقات کو ایک لایعنی گورکھ دھندا یا پھر افیون قرار دیتا اور خود کو ہمیشہ اس سے دُور رَکھا۔ اَپنے شعبے سے کامل وابستگی نے اُسے عجب طرح کا دِلی سکون عطا کیا تھا۔ اور وہ اس سے نہال تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ جس شہر میں نام' مقام اور سکونِ قلب کا سرمایہ کما چکا تھا اور مسلسل کما رہا تھا اُسی کا مستقل باسی ہو گیا تھا۔ ایک پس ماندہ ملک کے بے وسیلہ' غیر مہذب اور جاہل لوگوں کے بے ہنگم اور بے اَصول معاشرے میں رہنے سے بدرجہا مناسب اُسے یہ لگا کہ وہ یہیں اِنسانیت کی خدمت میں جُتا رِہے۔ وہ اَپنے آپ کو بھول بھال کر اِس خدمت میں مگن بھی رہا۔ مگر ایک روز یوں ہوا کہ وہ شہر دھماکوں سے گونج اُٹھا اور سب کچھ اُتھل پتھل ہو گیا۔

جب وہ حادثے میں اعصابی جنگ ہارنے والوں کو زِندگی کی طرف لا رہا تھا' اُسے سماجی خدمت جان کر' کسی معاوضے اور صلے سے بے نیاز ہو کر' تو اُسے اس خلیج کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا جسے بہت سال پہلے پاٹنے کے لیے اس نے اپنے وجود سے وابستہ آخری نشانی' اپنے

نام 'توصیف' کو بدل کر 'طاؤ ژ' ہو جانا بہ خُوشی قبول کر لیا تھا۔ اُنہی دِنوں ڈاکٹر طاؤ ژ کی ملاقات کیتھرائن سے ہوئی تھی جو اَپنے پہلے شوہر کے چھوڑ کر چلے جانے کے باعث شدید نفسیاتی دباؤ سے گزر رہی تھی۔ اس نہایت روشن خیال اور سلجھی ہوئی خاتون نے ایک روز اُسے پروپوز کر دیا۔ وہ اپنے طور پر اس قدر مگن تھا کہ اِس رشتے کو بھی اضافی سمجھتا رہا تھا۔ کچھ اچھی لڑکیاں اُس کی زِندگی میں آئی ضرور تھیں مگر اِتنی دیر کے لیے' جتنی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو ضرورت ہو سکتی تھی۔ لہذا جب ضرورت پوری ہو رہی تھی تو شادی کے پاکھنڈ کا کیا جواز ہو سکتا تھا۔

مگر عجب یہ ہوا کہ کیتھرائن کی پروپوزل کو اس نے بلا جواز قبول کر لیا تھا۔

کسی کو چاہنے لگنا اور کسی سے دور ہو جانا عجب طرح کے فیصلے ہوتے ہیں۔ عین آغاز میں دلیلیں نہیں مانگتے' فیصلے مانگتے ہیں۔ فیصلہ ہو جائے تو سو طرح کی دلیلیں نہ جانے کہاں سے آ کر دَست بستہ سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔

فیصلہ ہوا تو شادی بھی ہو گئی۔ پھر اُن کے ہاں اُوپر تلے دو بیٹے ہوئے۔ دونوں ہو بہو اَپنی مام جیسے تھے۔ راجر اور ڈیوڈ۔ دونوں کے نام کیتھی نے رَکھے۔ کیتھرائن کو وہ پہلے روز ہی سے کیتھی کہنے لگا تھا کہ اُس کی صورت ہالی ووڈ کی دِلوں میں بس جانے والی اداکارہ کیتھرائن ہیپبرن سے بہت ملتی تھی اور سب اُس خُوب صورت فنکارہ کو کیتھی کہتے تھے۔

وہ مکمل طور پر اُس سوسائٹی کا حصہ ہو کر مطمئن ہو گیا تھا۔ اِس قدر مطمئن کہ حادثے کے بعد بھی ناموافق ردِعمل کے باوصف وہ اس فریضے کو اِنسانیت کی خدمت کا تقاضہ سمجھ کر ادا کرتا رہا۔ حتّٰی کہ خفیہ والوں نے اُسے دھر لیا۔

کئی روز تک اُس سے پوچھا پاچھی ہوتی رہی۔ پھر وقفے پڑنے لگے۔ طویل وقفے۔ اِتنے طویل کہ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اُسے فالتو کاٹھ کباڑ جان کر اس سیل میں پھینک دینے کے بعد وہ سب بھول گئے تھے۔ نہ صرف اُسے اس سیل میں پھینکنے والے بھول چکے تھے'

کیتھی، راجر اور ڈیوڈ کو بھی وہ یاد نہ رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ سب اچانک یوں آ گئے، جیسے بھولی ہوئی کوئی یاد آیا کرتی ہے۔

پہلے اُسے یہ بتانے والے آئے کہ اگلے چار روز میں کسی بھی وقت اُسے اُس کے اَپنے وطن کے لیے ڈی پورٹ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے لہجے کو قطعاً مہذب نہیں کیا تھا جیسا کہ امریکن اکثر کر لیا کرتے ہیں۔ اُس نے انگریزی کے اس مختصر مگر کھردرے جملے سے 'اَون کنٹری' کے الفاظ چن کر اُنہیں غرارہ کیے جانے سے ملتی جلتی آواز کے ساتھ دہرایا۔

ایک تلخ سی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی جس کے باعث اُس کے عصبی رِیشوں کی گانٹھوں کی تانت بڑھ گئی اور اسے پژمردگی رَگیدنے لگی۔

جب وہ پوری طرح نڈھال ہو چکا تو کیتھی، راجر اور ڈیوڈ آ گئے۔ وہ آتے ہی اُسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ پھر اُسے یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی اور کہہ نہیں پا رہی تھی۔ جب وہ کچھ کہے بغیر ایک فیصلہ کر کے چپ چاپ بیٹھ گئی تو سناٹا سارے میں گونجنے لگا۔ وہ بچوں کی طرف متوجہ ہوا۔ بچے کبھی اُس کے قریب نہیں رہے تھے۔ اُس کا خیال تھا' ایسا اس کی مصروفیات کے سبب تھا۔ تاہم اب جو وہ منہ موڑے کھڑے تھے تو یوں کہ صدیوں کا فاصلہ پوری شدّت سے محسوس ہونے لگا تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ خود نہ آئے تھے' اُنہیں لایا گیا تھا۔ اُنہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے اندر سے باہر چھلکتی اُکتاہٹ نہیں چھپائی تھی۔ اُنہیں دِیکھتے ہی اُس نے اَفسوس کے ساتھ سوچا تھا؛ کاش کیتھی انہیں نہ لاتی۔ اور جب ملاقات کا وقت ختم ہو گیا تو وہ اسی دُکھ کی شدّت کے ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا؛ کاش کیتھی کبھی نہ آتی۔ نہ دِیکھنے کی خواہش کے ساتھ وہ جب آخری بار اُسے دِیکھ رہی تھی تو وہ کیتھی کے یوں چلے آنے کا مدعا سمجھ چکا تھا۔

اُن کا فیملی لائر کچھ پیپرز اگلے روز شام تک بنا لایا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈِی پورٹ ہونے سے پہلے پہلے وہ اُن پر دَست خط کر دِے۔ اُس نے ساری بات توجہ سے سنی۔ شاید وہ دست خط کر

ہی دیتا کہ اس پر ذہنی دباؤ کا شدید دورہ پڑا۔ اس قدر شدید کہ وہ لائر پر برس پڑا۔ جب وہ چلا گیا تو اُسے خیال آیا کہ سارے پیپرز چاک کر کے اُس کے منہ پر دے مارتا تو اُس کے اندر کا اُبلتا غصہ کچھ مدھم پڑ سکتا تھا۔ اس نے اگلی ملاقات پر ایسا ہی کرنے کے لیے سارے پیپرز سنبھال کر رکھ لیے۔ لیکن اس کے بعد اسے ملنے کوئی نہ آیا۔ یہاں تک کہ اسے ائرپورٹ لے جایا گیا۔ جہاز میں سوار ہوتے ہوئے اس پر کھلا کہ ایک سو پچیس دوسرے پاکستانی بھی ڈی پورٹ کیے جا رہے تھے۔

دُنیا بھر کے میڈیا والے سب کی تصویریں اور ٹیلی رپورٹس بنا رہے تھے۔ وہ سب مجرم ثابت نہیں ہوئے تھے مگر اُنہیں امریکہ سے نکالا جا رہا تھا۔ یوں، کہ جیسے وہی مجرم تھے۔ ساری رپورٹس براہ راست چلائی گئیں۔ اخبارات کی زینت بنیں۔ ٹیلی ویژن کے مختلف چینلز انہیں کئی روز تک وقفے وقفے سے چلاتے رہے کہ یہ ساری کارروائی دہشت گردی کے خلاف عالمی سطح پر مہم جوئی کا حصہ تھی۔ وہ یہ سارا تماشا نہ دیکھ سکا کہ اُسے ائیرپورٹ ہی سے سرکار نے حفاظت میں لے لیا تھا۔ ایک بار پھر بے ہودہ سوالات کا ناقابل برداشت سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ یہاں والے اُن سوالات میں زیادہ دِل چسپی رکھتے تھے جو دورانِ تفتیش وہاں پوچھے جاتے رہے تھے۔ اُس نے اُنہیں صاف صاف بتا دیا کہ انہیں علی شامی نامی ایک ایسے عربی النسل شخص میں دِل چسپی تھی جو اُس کے وہاں قیام کے آغاز کے عرصے میں جیمس بلڈنگ کے اُس فلیٹ میں رہتا تھا جس کا دروازہ عین اس کے فلیٹ کے سامنے تھا۔ علی شامی بعد ازاں سکونت بدل گیا تھا۔ اُس کا طرزِ عمل اُسے کبھی گوارا نہ لگا تھا کہ اُس کے اندر عجب طرح کی تنگ نظری ہلکورے لیتی رہتی تھی۔ پھر یہ کہ وہ اکثر اس کے نام کے توصیف سے طاؤ ٹ ہو جانے پر شدید طنز کیا کرتا تھا۔ بقول اُس کے وہ ہوپ لیس کیس تھا۔ جب کہ اسے علی شامی کا یوں طنز کیے چلے جانا بہت کھلتا تھا۔ لہذا ابھی وہ کہیں اور شفٹ نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں ممکنہ حد تک دُور ہو چکے

تھے۔ بعد میں رابطے کی ضرورت تھی' نہ کوئی صورت نکلی۔ جب وہ اُسے تیز روشنیوں کے سامنے بیٹھا کر مسلسل جگائے رکھنے پر بھی اِس سے زیادہ کچھ نہ اُگلوا پائے تو انہوں نے سوالات روک دِیے تھے۔مگر تذلیل کا سلسلہ ایسا تھا کہ رُکتا ہی نہیں تھا۔تاہم اُدھر جو ختم ہو گیا تھا تو یہ اِدھر بھی آخر کار انجام کو پہنچا۔

جب یہ تکلیف دِہ سلسلہ تمام ہوا' اور اسے جانے کی اجازت مل گئی تو وہ خلوص نیت سے چاہنے لگا تھا کہ کاش یہ سلسلہ یونہی دراز ہوے چلا جاتا۔ ذلیل ہوتے رہنے کی عجب خواہش اب معمول کی زِندگی میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ یہاں معمول کی زِندگی تھی بھی کہاں؟ اس کے یتیم بھانجوں کا کہنا تھا کہ جب ہر طرف بھوک' بے روزگاری اور جہالت ننگا ناچ رہی ہو تو وہاں جیو اور جینے دو کی تمنا سے دہشت اُگ ہی آیا کرتی ہے۔

اَپنی بیوہ اکلوتی بہن کے ہاں پڑے پڑے اُسے ایک ماہ ہو گیا تو اُس نے اَپنی بنائی ہوئی نامکمل تصویر کی آبی آنکھوں میں تیرتی معصومیت دِیکھی جن پر گوگول کے افسانے کی تصویر کی شیطانی آنکھیں حاوی ہو گئیں تھیں۔ اس قدر حاوی کہ فرشتوں جیسا معصوم چہرہ کہیں تحلیل ہو چکا تھا۔ اُس نے ان دونوں تصویروں کا خیال جھٹک دِیا تو ایک تیسری تصویر خود بخود اُس کے تصور میں اُبھرنے لگی۔ آسکر وائلڈ کے ڈورئن گرے کی وہ تصویر جو اس نے ایسے کمرے میں رَکھ دِی تھی جو مقفل تھا۔ عجب تصویر تھی کہ ڈورئن کی ساری خباثتوں کو کشید کر کے خود مکروہ ہو رہی تھی مگر ڈورئن کو ویسے ہی جواں اور خوبصورت رَکھے ہوے تھی جیسا کہ مصور ہال ورڈ نے تصویر بناتے ہوے اُسے دِیکھا تھا۔ اس تصویر کو سوچتے ہی ساری گرہیں کُھل گئیں۔

اُس روز پہلی بار اُس نے اَپنے بھانجوں کو غور سے دِیکھا تھا جو اَبھی اَبھی نماز پڑھ کر پلٹے تھے۔ پھر وہ دِیر تک اُنہیں آنکھیں چوپٹ کیے خالی دِیدوں سے دِیکھتا رہا۔ حتّٰی کہ اُس کی نظریں دُور خلا میں کٹی پتنگ کی طرح ڈولنے لگیں۔ اُس کی بہن نے اُس کے چہرے پر کم ہوتے

تناؤ کو غنیمت جانا اور اُس کے سر کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے وہ بات کہ دینا چاہی جو پہلے روز ہی وہ کہ دینا چاہتی تھی، مگر مناسب وقت تک اُسے ٹالنے پر مجبور ہوتی رہی تھی۔ اپنی آواز کو دھیمار کھتے ہوئے اور رُک رُک کر اُس نے پوچھا:

''توصیف بھائی، ایک بات کہوں؟''

بہن کے ملائم لہجے نے اُس کے دِل میں گداز بھر دیا تھا۔ اُس نے بہن کو دیکھا، محبت کی عجب پھوار تھی کہ اُس کا چہرہ کھلے گلاب کی طرح مہکنے لگا تھا۔ کہا:

''کہو''

اور اُس نے ایک ہی سانس میں کہ دیا:

''بھائی، اَب بھابی اور بچوں کو بھی یہاں بلا ہی لیں۔''

یہ سنتے ہی جیسے اُس کے اَندر سب کچھ تلپٹ ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر شدید دورے کی زَد پر تھا۔ اور اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے اُس کی ساری نسیں پھٹ جائیں گی۔ وہ اپنے آپ میں نہ رہا اور ایک گنوار کی طرح چیخ کر کہا:

''اُن ذلیلوں کو یہاں بلوالوں؟ جارح قوم کی ذِلیل کتیا کے ذِلیل پلوں کو؟''

پھر نہ جانے وہ کیا کیا ہزیان بکتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ وہ نڈھال ہو کر اوندھا گر گیا۔

آنے والے روز وہ کچھ بتائے بغیر کہیں نکل گیا۔ اُس کے ہاتھ میں وہی پیپرز تھے جو اُسے لائر کے منھ پر دے مارنا تھے۔ یہ پہلا روز تھا کہ وہ اَپنی خواہش سے باہر نکلا تھا۔ جب وہ واپس پلٹا تو بہت ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ اُس کے پاس سوچنے اور کرنے کو کچھ نہ رہا تو آرٹسٹ ہال ورڈ کی بنائی ہوئی وہ تصویر دھیان میں آ گئی جو بہ ظاہر خوبصورت نظر آنے والے کی ساری خباثتیں چوس کر خود مکروہ ہو گئی تھی۔ اِس تصویر کا خیال آتے ہی اُسے اِردگرد کا سارا منظر حسین دِکھنے لگا، مہکتا ہوا اور رنگ برساتا ہوا۔ اَگلے روز وہ عین اُس وقت اُٹھا جس وقت اُس کے بھانجے اُٹھا کرتے

تھے۔ بہن اَپنے بھائی کے اَندر اِس تبدیلی کو دِیکھ کر خُوش ہو رہی تھی ۔ مگر جب اُنہیں واپسی میں دیر ہونے لگی تو اُسے ہول آنے لگے۔ اِس ہولا جولی میں وہ مسجد کے بھی کئی پھیرے لگا آئی۔ وہ تینوں وہاں نہیں تھے۔ جب وہ پلٹے تو اُس کا کلیجہ پھٹنے کو تھا۔ مگر وہ اس سے بے نیاز اَپنے بدنوں سے بے طرح پھوٹ بہنے والے مرغوب مشقت کے پسینے کو پونچھے جاتے تھے اور آپس میں مسلسل چہلیں کر رہے تھے۔

یوں ہی اٹکھیلیاں کرتے کرتے وہ تینوں جب اس نامکمل تصویر تک پہنچے جس کی آنکھوں میں آبی معصومیت تیرتی تھی تو ڈاکٹر توصیف یہ دیکھ کر دَنگ رہ گیا تھا کہ وہ تو ایک مکمل تصویر تھی۔ بالکل ویسی ہی، جس کے ساتھ آسکر کے کردار ڈوریَن نے اَپنی روح کا سودا کر لیا تھا۔ معاشرے کی ساری خباثتیں چوس لینے کا وصف رَکھنے والی مکمل تصویر۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ اُس کے عصبی ریشوں کی ساری فالتو گانٹھیں کُھل گئیں اور جہاں جہاں ان گرہوں کو ہونا چاہیے تھا' سلیقے سے سج گئیں۔ ساری کسلمندی فاصلے پر ڈھیر پڑی تھی۔ اور وہ بھانجوں کے بازؤوں پر مچلتی مچھلیوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا' جو تیرتی گانٹھوں جیسی لگ رہی تھیں۔

موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ

وہ مر گیا۔

جب نخوت کا مارا' امریکا اپنے پالتو اِتحادیوں کے ساتھ ساری اِنسانیت پر چڑھ دوڑا اور اعلا ترین ٹیکنالوجی کے بوتے پر سب کو بدترین اجتماعی موت کی باڑھ پر رَکھے ہوے تھا' وہ اِسلام آباد کے ایک ہسپتال میں چپکے سے اکیلا ہی مر گیا۔

مجھ تک اُس کے مرنے کی خبر پہنچی تو میں سٹ پٹا گیا:

''ہائیں وہ مر گیا۔ نہیں' نہیں۔ مگر کیسے؟''

یہ سب بے معنی الفاظ تھے جو میری زبان سے بے اِرادہ نکلے تھے۔ اُسے سرطان تھا' یہ میں جانتا تھا۔ ایک پھوڑا' اس کی رانوں کے عین وسط میں نکل آیا تھا' جسے کاٹ پھینکنے کے لیے دو آپریشن بھی ہو چکے تھے مگر اُس کی جڑیں پوری طرح کُھرچی نہ جاسکیں۔

''میں کسی بھی وقت مر سکتا ہوں''

یہ اُس نے خود مجھے بتایا تھا مگر یوں کہ مجھے اُس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

ہم دونوں کے بیچ عجب رشتہ رہا ہے۔ میں جو بھی بات کہتا رہا' چاہے محض اُس کا دِل رکھنے ہی کو کہی' اُس نے فوراً یقین کر لیا۔ مگر وہ سچ بات بھی کچھ اِس ڈھب سے کرتا رہا کہ مسلسل دہرائے ہوئے جملے محض اس کی فرسٹریشن کا شاخسانہ لگنے لگتے۔ وہ اَپنی بیماری کی باتیں بھی یوں کرتا تھا جیسے بس یوں ہی کوئی بات کہنے کو ایک بات کر رہا ہو۔ مرنے والی بات بھی اُس نے کچھ ایسے بے روح لفظوں میں کہی تھی کہ اُس کی طرف بڑھتی موت کی چاپ مجھے سنائی نہ دی تھی۔ اُس سارے عرصے میں' کہ جب موت اُسے پچھاڑ رہی تھی' وہ میری گرم جوش اور جذباتی توجہ حاصل نہ کر پایا تھا۔ میں اُس کی بیماری کو ایسا عارضہ سمجھنے لگا تھا' جو اَگر اُسے لاحق تھا تو اُس کی شخصیت کا حصہ ہو گیا تھا اور یہ عارضہ' میرے خیال میں' اتنا ہی بے ضرر تھا جتنا کہ مجھے لاحق رہنے والا آلکسی کا روگ اور اس روگ کی لذّت دینے والی کساوٹ۔

طالب علمی کے زَمانے تک الگ الگ تعلیمی اداروں میں ہونے کے باوصف ہم میں رابطہ رہا تو اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک' لکھنے کی للک اور دوسرا' لیڈری کا خبط۔ ہم دونوں کی پہلی کتاب طالب علمی کے اسی دورانیے میں آئی تھی۔ یہ پہلی کتاب ہی اُس کی آخری کتاب بن گئی۔ ہم دونوں نے ایک برس الیکشن لڑا۔ وہ اَپنے کالج میں یونین کا صدر بن گیا اور میں یونیورسٹی میں ہار کر طلبہ سیاست سے الگ ہو گیا۔ تاہم ایک طویل وقفے کے بعد جب اس شہر میں ہم دوبارہ ملے' جو اُس کا شہر تھا نہ میرا' تو طالب علمی کے اُس عرصے کو بہت یاد کرتے تھے۔ اُس نے بتایا تھا کہ اِس درمیانی مدّت میں بھی اُس نے مجھے یاد رَکھا تھا۔ اُس نے یہ بات بالکل اُسی غیر جذباتی انداز میں بتائی تھی جیسا کہ بعد ازاں اَپنے مر جانے کے خدشے کا اِظہار کیا تھا۔ لہذا مجھے قطعاً یقین نہ آیا۔لیکن جونہی میں نے اُسے سچ سچ بتا دِیا کہ میں تو اُسے بالکل بھول چکا تھا' تو اُس نے

ہونٹ چٹخا کر مجھے یوں گالی دِی کہ میری سماعت اس کی لذّت سے بھر گئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دِیکھا‘ یقین کرلیا کہ وہ ہمیشہ کی طرح میری بات کا یقین کر چکا تھا۔

دوبارہ ملنے تک میں پانچ بچوں کا باپ ہوگیا تھا۔ اور وہ مرنے تک کنوارہ ہی رہا۔ حالاں کہ وہ مجھ سے کم از کم پانچ برس بڑا تھا۔ اَب ملا تو وہ عورتوں کی طرح اَپنی عمر چھپانے لگا تھا۔ مجھ سے نہیں‘ دوسروں سے۔ مجھ سے کیسے چھپا پاتا؟ کہ میں تو اُسے اُس وقت سے جانتا تھا جب وہ دھوبی گھاٹ والے کالج میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ میں اس کے شہر کی یونیورسٹی میں ان دنوں گریجویشن کر رہا تھا۔ وقت پر شادی نہ ہوتو جیسے کچھ ڈھلتی عمر کی لڑکیوں پر ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگتے ہیں‘ ایسے مرد بھی ہوتے ہیں جو ڈپریشن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ پہلے پہل‘ میرا خیال ہے‘ اُس پر پڑنے والے ڈپریشن کے دوروں کا یہی سبب تھا۔اِس میں بعدازاں کوئی بہت عمدہ اور منفرد کام نہ کرسکنے کی جھینپ بھی شامل ہوگئی تھی۔

اُس کے مرنے کی خبر سنتے ہی میں نے اَپنے آپ کو بہت کوسا۔ خود پر خوب برَسا اور تادِیر اُلجھتا رہا۔ اِس خجلت زدگی اور اُلجھاوے کا سبب وہ پچھتاوا تھا جو آخری دِنوں میں ڈھنگ سے اُس کی تیمارداری نہ کرسکنے کے باعث میرے وجود میں اُتر گیا تھا۔ مجھ تک جب خبر پہنچی اُس کی نعش ہسپتال سے اُس کے شہر کو روانہ ہوئے پندرہ گھنٹے گزر چکے تھے۔میں فوراً نکل کھڑا ہوتا تو بھی جنازے میں نہ پہنچ پاتا۔ لہذا اُس کے شہر نہ جانے کے لیے دِل کو سمجھا لیا۔ تاہم ایک کسک مسلسل کسمساہٹ میں رَکھنے لگی تھی کہ آخر کیوں اس کے آخری بار ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کی خبر نہ پاسکا۔ حیف میری اِتنی بے خبری پر کہ وہ اِس دورانیے میں کئی روز اَذِیّت میں مبتلا رہنے کے بعد چپکے سے مر گیا۔

قدرے کم معروف اور ایک ضرر لکھنے والے کے حصے میں جتنی تعزیتی قراردادیں آ سکتی تھیں‘ اُس کے حصے میں بھی آئیں۔ اُس کام کا تذکرہ بھی ہوا‘ جو اگر چھپ جاتا تو اُس کا نام زیادہ اہم ہو

سکتا تھا۔ مگر فوراً بعد اُس بارود کی بارش کا تذکرہ ہونے لگا جو افغانیوں کے بعد اَب مسلسل عراقیوں پر برس رہی تھی کہ یہ بارش جہاں برستی تھی وہاں سے موت کھمبیوں کی طرح اُگ آتی تھی۔ اِتنے بے پناہ مرنے والوں کے دَرمیان اُس کی موت اکیلی ہوگئی۔ الگ...... بالکل اکیلی۔

موت کے اِس اَپادِھی موسم میں سفاک امریکا سارے اصول اور سارے ضابطے چھوڑ کر اِنتہائی بے حیائی سے یہ کہہ رہا تھا:

''جو ہماری بات نہیں مانے گا' اُسے الگ تھلگ کر کے رکھ دِیں گے۔''

الگ تھلگ ہو جانے والے مارے جا رہے تھے۔ وہ اِنتہائی ڈھٹائی سے لفظ چبا چبا کر کہتا تھا:

''اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں' تو آپ ہمارے خلاف ہیں''

ایک سہم ہر کہیں سنسنا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا' پوری دُنیا زَنخوں کی ٹانگوں میں پڑی ہوئی تھی اور ان زنخوں کے اوپر ایک ہی تلنگا مرد تھا جو اُن کے چوتڑوں پر اَپنی شہوت بھری مردانگی کے دُرّے برسا رہا تھا۔ وہ اِنتہائی گھمنڈ بھرے لہجے بار بار دہرائے جاتا تھا:

''ہم اِس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ دُنیا کا بدترین اسلحہ دُنیا کے بدترین حکمرانوں کے پاس رہے۔''

دُنیا بھر کے عام لوگ اُسے آئینہ دِکھانے اور اُس کے مکروہ چہرے پر تھوکنے کے لیے گلیوں میں نکل آئے تھے۔ مگر حکومتوں کے سربراہوں نے اَپنی اَپنی مصلحتوں کے اَسیر ہو کر ساری دنیا کو اپنے جیسا زنخا بنا لیا تھا۔ کچھ نہ کر سکنے اور فقط ہاتھ نچانے یا فحش اِشارے کرنے والا زنخا۔

پھر یوں ہوا کہ اُس کے شہر جانے کا موقع نکل آیا۔ میرے ساتھ منشا' فریدہ اور خلیق بھی تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں اُن میں پہلے دو افسانہ نگار ہیں اور تیسرا شاعر۔ جس تقریب کے

لیے ہم آئے تھے اُس سے فارغ ہو کر اُس کے گھر کو نکل کھڑے ہوئے۔ ہم چاروں میں سے کوئی بھی اُس کے گھر والوں سے پہلے نہ ملا تھا لہذا اپنے تئیں اندازہ لگائے بیٹھے تھے کہ اجنبیوں کی طرح دُعا کو ہاتھ اٹھائیں گے اور پلٹ آئیں گے۔ میں اُس کی قبر پر بھی جانا چاہتا تھا کہ مجھے بہت ساری معذرتیں کرنا تھیں اور اس کی قبر کا پتا اس کے گھر والوں ہی سے مل سکتا تھا۔

جیسے ہی ہم اُس کے گھر پہنچے' جو سوچ کر گئے تھے' وہ سب بھول گیا۔ عجب کہرام مچا تھا کہ ہم بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائے۔

پہلے اُس کے بھائی ہماری چھاتیوں سے لگے اور یوں دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ایسا لگتا تھا 'جیسے محض ہم وہاں نہیں آئے تھے' اُس کی نعش بھی ساتھ لائے تھے۔ پھر اُس کی بہنیں روتی کرلاتی بھاگ کر آئیں اور بھائیوں کی پیٹھوں سے لگ کر ضبط کرتے ہوئے سسکنے لگیں۔ ضبط نہ رہا تو پچھاڑیں کھانے لگیں۔ یوں کہ جلد ہی اپنے وجودوں سے بے نیاز ہو گئیں۔ آخر میں بھاری جثے اور بڑی عمر والی نڈھال سی عورت بوکھلائے ہوئے داخل ہوئی۔ یہ اُس کی ماں تھی اور لگتا تھا رو رو کر اس کی آنکھیں بہہ چکی تھیں۔ وہ دِیوار کا سہارا لیتے ہوئے ''کون؟ کون؟ کیا آ گیا میرا بیٹا؟' کی تکرار کرتے آئی۔ آتے ہی ہم سب کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ میں جو اُس کے پاس کھڑا تھا میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

''کہاں ہے میرا بیٹا؟ لاؤ نا' بہنیں اُسے سہرا باندھیں''

پھر اُس نے دو ہتڑ سے اَپنی چھاتی کو پیٹا اور حلقوم کو چیر کر نکلتی چیخ کو اوپر اُچھالتے ہوئے کہا

:

''ہائے او میرا اڈا ہڈا رباّ''

یہ کہتے ہوئے وہ یوں چکرا کر گری کہ سب کے کلیجے دہل گئے۔ بیٹے بیٹیاں اُسے سنبھالنے میں لگ گئے تھے۔

واپس پلٹتے ہوے ہم سب چپ تھے‘ فریدہ نے کہا:

’’ماں کا دُکھ تو سنبھالے نہیں سنبھلتا۔‘‘

منشا نے تائید کی:

’’ہاں ماں کا دُکھ‘ تو یوں لگتا ہے‘ ہماری ہڈیوں کے گودے میں اُتر گیا ہے۔‘‘

میں چپ تھا۔ چپ ہی رہا کہ مجھ میں اَپنے دُکھ کے بیان کا سلیقہ نہیں ہے۔ تاہم خلیق بولا:

’’ہمیں اِس درد کو اَپنی تخلیق کا حصہ بنانا چاہیئے۔‘‘

فریدہ‘ جواَب تک بہت سنبھل چکی تھی‘ کہنے لگی:

’’میں تو اِس پر کہانی لکھوں گی۔ آپ دونوں بھی لکھیں نا‘‘

پھر وہ خلیق کی طرف مڑی اور کہا:

’’تم اِس پر نظم لکھنا۔‘‘

واپس آئے ہمیں کئی روز بیت گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے منشا اور فریدہ نے کہانیاں‘ جب کہ خلیق نے نظم بھی لکھ لی ہوگی۔ مگر میرا معاملہ یہ ہے کہ میں پھر اُن اِجتماعی اَموات میں اُلجھ گیا ہوں جو کوفہ‘ کربلا اور بغداد والوں کا مقدّر ہو گئی تھیں۔ دُنیا کے بدترین حکمران نے اَپنے مہلک ترین اسلحے کے بھرپور اِستعمال سے سقوط بغداد کا مقصد حاصل کر لیا۔ جن مردوں‘ عورتوں‘ بوڑھوں اور بچوں کو اس ہلے میں مرنا تھا‘ مر چکے۔ خود کو اِنصاف پسند کہلوانے والی مکار دُنیا اَپنے اَپنے مفادات کے تحفظ سے مشروط ہو کر اس ساری درندگی کا جواز بھی فراہم کرنے میں جت گئی ہے۔ اِقتدار والے اَپنا اقتدار بچانے کے لیے کہتے ہیں:

’’ہماری باری نہیں آئے گی۔‘‘

اور پھر اس رذیلیل کے تلوے سہلانے میں لگ جاتے ہیں جو سب کی باریاں باندھ رہا ہے۔

ہمیں 'سب سے پہلے اپنا آپ' کا نعرہ دِے کر وہ جو سمجھانا چاہتے ہیں اگر وہ میں سمجھ بھی جاؤں تو بھی تھُوک میں مرتے اِنسانوں کے خُون کی باڑھ مجھے اَپنی جانب آتی صاف نظر آتی ہے۔ اور اِس آگ کی باڑھ بھی جو بغداد کی ایک قدیم لائبریری میں اُٹھی اور اب سارے سچے لفظوں کو جلانے کے لیے چاروں اور بڑھ رہی ہے۔ ایسے میں اِجتماعی اموات پر لکھی گئی کوئی ایسی کہانی جسے ابھی میں نے لکھنا ہے' بے حسی یا درندگی کی آگ سے مرنے والوں کو بچا پائے گی؟ اور کیا وہ خود بھی جل جانے سے محفوظ رہ پائے گی؟

یہ ایسا سوال ہے جس نے مجھے کہانی اور اُمید' دونوں سے دور کر دیا ہے۔ تاہم گھٹی میں پڑی ہوئی اُمید اور عادت بن چکی کہانی نے ورغلا کر مجھے پھر لفظوں کی اشتہا کا اسیر کر دِیا ہے۔

میں نے پکا ارادہ باندھ لیا ہے کہ میں کہانی ضرور لکھوں گا۔

پہلے اِجتماعی اموات پر اور پھر اکیلے میں مرجانے والے کی کہانی۔

مگر ہو یہ رہا ہے کہ ہر بار کاغذ کورے کا کورا رہ جاتا ہے اور جب کئی کئی گھنٹے کہانی کا ابتدائیہ سوچنے میں گزار کر نا کام اٹھتا ہوں تو نہ لکھے جانے والی کہانی' کسی نامرد پر ایک فاحشہ کی طرح ہنسنے والی کی طرح' مجھ پر ہنستی ہے اور میں قلم کو کاغذ پر یوں نچاتا ہوں جیسے زنخا ہوا میں ہاتھ نچاتا ہے۔ میں کھسیانا ہو کر اَپنے اَندر دِیکھتا ہوں۔ کچھ کھسیان پت ماند پڑتا ہے کہ میرے اندر ابھی تک' ہر کہیں رواج پا گئی بہیمت اور ناانصافی کے خلاف نفرت اور احتجاج کے شعلے اُٹھ رہے ہیں۔ گمان گزرتا ہے کہ شاید میں جلد ہی اِجتماعی اموات پر کہانی کہنے کی قوت پالوں گا۔ اِسی موہوم اُمید کے سہارے اکیلی موت پر لکھنے کو معرض التوا میں ڈال دیتا ہوں۔

اگلے کئی روز کئی اموات پر ایک کہانی لکھنے کی تڑپ میں لد گئے مگر ہو یہ رہا تھا کہ ہر بار کاغذ کورے کا کورا رہ جاتا۔ جب میں کئی کئی گھنٹے کہانی کا ابتدائیہ سوچنے میں گزار کر نا کام اُٹھتا تو نہ لکھے جانے والی کہانی' کسی نامرد پر ایک فاحشہ کی طرح ہنسنے والی کی طرح' مجھ پر ہنستی اور ہنسے چلی

جاتی۔

جن ادیبوں اور شاعروں نے اُس کے لیے تعزیتی قرار دادیں، سوانحی مضامین اور نظمیں لکھنا تھیں لکھ لیں تو میں نے بھی اِجتماعی اموات کی کہانی لکھنے کا ارادہ موقوف کر دیا اور دوسروں کی طرح اُس کے درد میں ڈوبی ہوئی ایک بے ضرر کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ مگر یوں لگتا ہے کہ میرے قلم سے لکھنے کی قوت یوں بہہ گئی ہے جیسے دُنیا بھر کے مقتدر لوگوں کی رانوں کے بیچ سے وہ مردانگی جو حوصلہ دیتی تھی بہہ چکی ہے۔

منجھلی

اَب سوچتا ہوں کہ میں نے اِتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا تھا' تو حیرت ہوتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اِتنا بڑا فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا' خود بخود ہو گیا تھا۔

دراصل بھائی اور بھابی دونوں اِتنی محبت کرنے والے اور خیال رکھنے والے ہیں کہ اُن کے لیے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔

بیگم نے بھی مخالفت نہ کی تھی۔

بس ہکا بکا مجھے دیکھتی رہی تھی۔

اگرچہ وہ کچھ نہ بولی تھی مگر اس کی آنکھیں نمی سے بھر گئی تھیں۔

اور اَب جب کہ میرے اَندر بھیگی آنکھوں کی فصل اُگ آئی ہے' سوچتا ہوں؛ میں نے اَپنا فیصلہ بدل کیوں نہ دیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ اس نے میرا فیصلہ اَپنا فیصلہ بنا لیا۔

سب کو کہتی پھرتی۔

''دیکھو جی گڑیا ابھی دودھ پیتی ہے اور بڑی بھی تو ناسمجھ ہے' بات بے بات ضد کر بیٹھتی ہے تو سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ میں منجھلی کو کیسے سنبھالوں گی؟ اَپنی دادی اور پھوپھی سے بہت مانوس ہے' بھابی اور بھائی بھی تو ماں باپ جیسے ہیں' پیچھے رہ لے گی۔''

اور وہ پیچھے رہ گئی۔

پہلی رات میں سو نہیں سکا تھا۔

ننھی منی معصوم منجھلی آنکھوں کے سامنے گھومتی رہی۔

میں نے بیگم کو دِیکھا' وہ بھی پہلو بدل رہی تھی۔ پوچھا:

''نیند نہیں آ رہی؟''

''جی' نئی جگہ ہے نا!''

پھر نئی جگہ پرانی ہو گئی۔ مگر' وہ حوصلہ نہ ہاری۔

اور منجھلی بھائی اور بھابی کی بیٹی بن کر ان کے پاس رہتی رہی۔

وہ اُنہیں ابو اور امی کہتی ہے جب کہ ہمیں بابا اور ماما۔

شروع شروع میں جب ہم جاتے تھے تو وہ ہمارے ساتھ آنے کے لیے ضد کرتی۔ رو رو کر بے حال ہو جاتی مگر رَفتہ رَفتہ وہ چُپ چاپ ہمیں دِیکھتی رہتی۔

اور جب حسرت سے یوں دِیکھتی تو میرا دِل کرتا' کاش وہ کُھل کر رو لے۔

بیگم کا خیال تھا: اُس کے آنسو اُس کے اَندر پڑ رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بیگم کو گاؤں سے واپسی پر چپ سی لگ جاتی۔

بات یہ نہیں ہے کہ اُوپر تلے ہماری تین بچیاں ہوئی اور ایک بھائی بھابی کو دِے دِی۔ نہ ہی یہ درست ہے کہ ہمارا تبادلہ ہو گیا اور دوسرے شہر میں ان تینوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا کہ اَپنی اولاد

کے لیے مشکلات سہنا ہی تو زِندگی کو پُرلطف بناتا ہے۔

اصل واقعہ یوں ہے کہ

جب گڑیا پیدا ہوئی تھی تو بھابی اُسے گود میں اُٹھا کر دِیر تک دِیکھتی رہی تھی۔

پھر اُس نے ہونٹوں سے گڑیا کے گال چوم لیے تھے اور اُس کے گالوں سے اَپنے گال رگڑتی رہی تھی۔

ایسا کرتے ہوئے اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

اُس نے اپنے آنسوؤں کو بہہ جانے دِیا اور انگلی سے ہونٹوں کو سہلایا تھا؛ یوں جیسے محبت کے اِس لمس کو پوروں پر محسوس کرنا چاہتی ہو۔

پھر بے اختیار اُسے اَپنے سینے سے لگا لیا اور کہا:

''اوہ میری بچی''۔

میں یہ سب کچھ دِیکھ رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ کہا:

''بھابی یہ آپ ہی کی بچی ہے۔''

اس نے میری جانب دیکھا:

''میری بچی۔ کہیے نا؟ یہ میری ہی بچی ہے نا؟''

اُس کے چہرے پر عجب سی کیفیت تھی۔ حیرانی؛ محض حیرانی ہی نہیں۔ محبت؛ صرف محبت کا جذبہ ہی نہیں۔ حسرت؛ شاید وہ بھی پوری طرح نہیں۔

بے قراری' چاہت' بے یقینی' طلب مجھے نہیں معلوم' اُس کے چہرے پر آئی کیفیت کو کِس لفظ سے بیان کروں۔

میں وہ آنکھیں دِیکھ رہا تھا' جو آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

اور وہ ہونٹ دِیکھ رہا تھا جو جذبوں کی شدّت سے کپکپا رہے تھے۔

''دیکھو! تم اَب اِسے دودھ نہیں پلاؤ گی۔''

اُس نے میری بیگم کی طرف منہ کر کے کہا اور فیصلہ دِے دِیا:

''یہ میرے ساتھ رہے گی۔ میری بیٹی بن کر۔''

پھر وہ اُسے اُپنے کمرے میں لے گئی۔

اَمّی جان یہ سارا منظر دِیکھ رہی تھیں۔ کبھی ہنستیں' کبھی رو دِیتیں۔ جب ذرا سنبھلیں تو گڑیا کی چیزیں سمیٹ کر کمرے سے نکل گئیں۔ چند لمحوں بعد بھابی کے کمرے کے دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ گویا امی سیدھی وہاں گئی تھیں۔

ہمارے کمرے میں سناٹا گونج رہا تھا۔

میں نے بیگم کو دِیکھا وہ اَبھی تک بند دروازے کو دِیکھ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اس جگہ کو سہلا رہا تھا' جہاں تھوڑی دیر پہلے تک گڑیا لیتی ہوئی تھی۔

میں نے اُس جگہ کو چھوا' گڑیا کے بدن کی گرم گرم لپٹیں ابھی تک اُٹھ رہی تھیں۔

پتا نہیں کتنا وقت یوں ہی گزر گیا۔

نہ اُس نے کچھ کہا' نہ مجھے بولنے کی ہمت ہوئی۔

میری ساری حسیات دوسرے کمرے کی سمت مرتکز تھیں۔ یوں کہ مجھے وہاں کی ہلکی ہلکی آواز تک سنائی دے جاتی تھی۔

ایسا عام حالات میں ممکن نہ تھا۔

مگر حیرت ہے میں اَندازہ کر سکتا تھا کہ کون کمرے میں اِدھر اُدھر چل رہا ہے۔ اور کون اَب گڑیا پر جُھکا ہے۔ اور کون اُس کے پوتڑے درست کر کے رکھ رہا ہے۔ اور کون اس کے لیے فیڈر صاف کر رہا ہے۔

دفعتاً گڑیا کے رونے کی آواز سنائی دِی۔ بیگم نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ وہ بھی غالباً ساری ساری وہیں تھی۔

''سنیں''

''ہوں''

''گڑیا رو رہی ہے''

''ہاں، مگر وہ چپ ہو جائے گی''

''دیکھیں''

میں نے اُسے دیکھا۔

''وہ یوں چپ نہیں ہو گی''

''کیوں؟''

''اُسے بھوک لگی ہوئی ہے۔''

اُس نے آنکھیں بند کر کے یوں سر جھکا لیا جیسے اَپنے اَندر مچلتی دودھ کی دَھاروں کو محسوس کر رہی ہو۔

''امی فیڈر لے گئی ہیں، فیڈ بنا دیں گی۔''

''سنیں''

''ہوں''

''وہ ابھی تک رو رہی ہے''

''ہاں، مگر نہ جانے کیوں رو رہی ہے؟''

تشویش میرے اندر اُترنے لگی۔

''جا کر پتا کر لیں نا!''

''امی ہیں نا!......سنبھال لیں گی''

وہ چپ ہو گئی۔ مطمئن نہ ہو پائی تو چپ نہ رہ سکی۔

''آپ خود دیکھ آتے۔''

تشویش میرے چہرے پر آ گئی مگر میں اَپنی جگہ سے اُٹھ نہ سکا۔

''اس کے پیٹ میں درد ہے شاید''۔

''ہاں۔شاید''

''جنم گھٹی پڑی ہے یہاں۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''پیٹ درد کے لیے اچھی ہوتی ہے۔''

''امی ہیں نا! ضرورت ہوگی تو لے جائیں گی؟''

''مگر گڑیا ابھی تک رو......''

اُس نے اَپنی بات اَدھوری چھوڑ دی۔ قدموں کی مدہم چاپ ہماری سمت تھی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ امی آرہی ہیں۔ دروازہ کھلا۔ بیگم نے امی کو دیکھا اور بے تابی سے کہا:

''گڑیا رو رہی ہے' کیوں رو رہی ہے میری بچی؟''

امی نے وہیں رُک کر بہو کو دیکھا' پھر میری طرف نگاہ کی۔ کہا:

''شاید پیٹ میں تکلیف ہے۔ گھٹی رکھی تھی' اِدھر؟''

''یہ رہی''

میں نے جنم گھٹی اُٹھا کر امی کو تھما دِی۔

امی نے ایک نظر ہم دونوں کو دیکھا اور کمرے سے نکل گئیں۔

ہمارا دھیان پہلے کی طرح دوسرے کمرے میں جا پہنچا۔

تھوڑی دیر کے لیے گڑیا چپ ہوگئی۔

بھابی کی مدہم آواز آتی رہی۔ وہ گڑیا سے لاڈ کر رہی تھی۔

ہم دونوں خاموش تھے۔

خاموش رہے۔

خدا جانے کتنے ہی لمحے اسی خاموشی میں گزر گئے۔

گڑیا پھر رونے لگی۔

''سنیں''

''ہوں''

''گڑیا پھر رو رہی ہے۔''

''ہاں''

''وہ اُن سے چپ نہیں ہو گی۔''

''ہو جائے گی۔''

وہ چپ ہو گئی، مگر گڑیا روتی رہی۔ حتٰی کہ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنا شروع ہو گیا۔

''وہ چپ نہیں ہو گی''

اُس نے دہرایا۔ تشویش میرے لبوں تک آ گئی۔

''ہاں......شاید''

اُس نے میری تشویش سے حوصلہ پکڑا اور واضح بے قراری سے بولی۔

''وہ اُسے چپ نہیں کرا سکیں گے۔''

میں چڑ گیا۔

''ارے بابا امی ہیں نا!''

وہ میرے لہجے کی پروا کیے بغیر بولتی چلی گئی۔

''امی ہیں تو مگر......''

میں تقریباً چیخ پڑا۔

''مگر کیا؟''

میرے لہجے کی کاٹ دیکھ کر اَب کے وہ چپ ہو گئی۔

گڑیا کے رونے کی آواز آتی رہی۔

مجھے بھی یقین ہو گیا وہ اُن سے چپ نہیں ہو گی۔ میں نے اُسے دیکھا وہ اب کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں جل تھل تھیں۔

مجھے اپنے لہجے پر افسوس ہونے لگا۔

''سنو''

''ہوں''

''جب بھابی نے گڑیا کو اَپنی بچی بنالیا ہے تو ہماری مداخلت یہ تاثر دے گی کہ شاید ہم اَپنے فیصلے پر پچھتا رہے ہیں۔''

اِتنا کہتے کہتے میرا گلا رندھنے لگی۔

وہ چپ رہی۔

میرے پاس کہنے کو اور کچھ نہ تھا۔

گڑیا کے رونے بھابھی کے بہلانے اور امی کے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔

اِس کمرے کی خاموشی دوسرے کمرے کی ساری آوازوں کو جذب کرتی رہی۔

اِسی کیفیت میں جانے کتنی رات گزر گئی تھی، مجھے ٹھیک سے یادنہیں کہ باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں جان گیا، امی اور بھابی دونوں آ رہی تھیں۔

ساتھ ایک مہک تھی، جو دروازے کی درزوں سے گھس کر اندر آ رہی تھی۔

یہ گڑیا کی مہک تھی۔

دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ چوپٹ کھول دیا کہ وہاں تک نہ جانے میں پہلے ہی کیسے پہنچ گیا تھا۔

بھابی کی گود میں گڑیا تھی اور آنکھوں میں آنسو۔

پیچھے امی تھیں۔

میں ایک طرف ہو گیا۔

وہ اندر آ گئی اور میری بیگم کے پہلو میں گڑیا کو لٹا دیا۔

بیگم نے اُچک کر روتی گڑیا کو سینے سے لگا لیا اور قمیض اُٹھا کر اندر گھسیڑ لیا۔

روتی گڑیا چپ ہو گئی۔

مگر بھابی دَھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

کسی میں ہمت نہ تھی کہ اُسے حوصلہ دیتا۔

آٹھ برس ادھر کی بات ہے مگر مجھے ذرا ذرا سب یاد ہے۔

بھولتا تو کیسے' کہ ایک ایک لمحہ میرے اندر منجمد ہوتا رہا ہے۔

ہمیں بچوں کے ساتھ دوسرے شہر منتقل ہونا پڑا تھا کہ میرا تبادلہ وہاں ہو گیا تھا۔

بڑی اور چھوٹی ہم ساتھ لے آئے مگر منجھلی کو وہیں چھوڑ دیا۔

بھابی اور بھائی نے اُسے ڈھیروں محبت دی؛ اتنی کہ شاید ہم بھی اَپنی بچیوں کو نہ دے پائے ہوں گے۔

ہم مطمئن ہو گئے۔

جب کبھی ہم جاتے تو شروع شروع میں وہ ہمارے ساتھ چلنے کی ضد کرتی۔ بھابی نے بتایا' جونہی ہم نظروں سے اوجھل ہوتے تھے' وہ بہل جاتی اور کھلونوں سے کھیلنے لگتی تھی۔

بیگم اکثر کہتی:

''بڑے حوصلے والی ہے ہماری بچی''

سچ تو یہ ہے کہ بیگم کا بھی بڑا حوصلہ ہے۔ اُس نے اِن آٹھ برسوں میں کوئی دِن ایسا نہیں

گزارا کہ منجھلی کو یاد نہ کیا ہو اور اپنی آنکھیں نہ بھگوئی ہوں مگر مجھ سے شکوہ نہیں کیا کہ اُسے کیوں دِے دِیا۔ جب کہ میں اندر ہی اندر سے کبھی کبھار پچھتا جاتا ہوں۔

جب جب منجھلی مجھے یاد آتی ہے میرے اُندر ہی اُندر سے کچھ کٹنے سا لگتا ہے۔

مگر میں نے کہا نا! بھابھی اور بھائی نے اُسے اِتنی محبت دِی ہے کہ......

بھائی اور بھابھی محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ جب سے ابا جی فوت ہوے ہیں ان دو ہی نے نہ صرف سارے بھائی بہنوں کو' بل کہ سب عزیز رشتہ داروں کو بھی محبت کی ڈوری میں تسبیح کے موتیوں کی طرح پرو رَکھا ہے؛ ورنہ خالی حویلی اب تک بھائیں بھائیں کر رہی ہوتی۔

ملازمت' بچوں کے سکول' دوست احباب' یہ کام' وہ کام۔ میرے پاس مصروفیت کے سو بہانے ہیں۔ میں ان میں الجھ جاتا ہوں اور الجھا ہی رہتا ہوں۔

خود کو اس دلدل سے نکالنا چاہوں بھی تو نہیں نکال پاتا۔

ایسے میں وہ دونوں آجاتے ہیں' منجھلی کو لے کر۔ ہمیں ملانے۔

پچھلے ہفتے بھی وہ آئے تھے۔ اور یوں لگتا ہے ابھی تک گئے نہیں ہیں۔ اندر ہی اندر میرے دِل میں بس گئے ہیں۔

وہ دونوں بھی اور منجھلی بھی۔

میری بڑی بچی سیانی ہو گئی ہے۔ اِتنی سیانی کہ منجھلی کو بتا سکے:

''اصل میں تم ہماری بہن ہو''

گڑیا بھی اس کی پڑھائی ہوئی پٹی پڑھنے لگی ہے۔

''جب تم ہماری بہن ہو تو ہمارے پاس کیوں نہیں ہو؟''

منجھلی کہتی ہے۔

''مجھے معلوم ہے کہ ہم بہنیں ہیں۔ میرا دِل کرتا ہے' میں تم دونوں کے پاس رہوں مگر دیکھو نا! امی ابو کی کوئی اولاد نہیں ہے نا۔ پھر ان کے پاس کون رہے گا؟ وہ کیسے

بیٹی بنائیں گے؟ اور کسے اِتنا ڈھیر سارا پیار کریں گے؟''

میری سسکاری نکل جاتی ہے۔

وہ باتیں کرتی رہتی ہیں۔ میں اَپنی سماعتیں بند کر کے دوسری سمت دیکھنے لگتا ہوں۔ اُدھر بھابھی اور بیگم نے بھی شاید کچھ سن لیا ہے' تبھی تو وہ دونوں اپنے دوپٹوں سے آنکھیں صاف کر رہی ہیں۔

ناہنجار

میں سارے بے مصرف اور اُکتا دینے والے کام کرسکتا ہوں مگر مجھے یہ عمل شدید اُکتا دینے والا لگتا ہے کہ جمعے کے جمعے تھیلا اُٹھاؤں اور پشاور موڑ سے ادھر لگنے والے ہفتہ وار ستے بازار سے روپے دو روپے کے ٹینڈوں، مرچوں، توریوں، بینگنوں اور شلجموں کے لیے بس یوں ہی بکتا جھکتا پھروں۔ 'بس یوں ہی' کے الفاظ میں نے بس یوں ہی اِستعمال نہیں اِستعمال کر لیے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اَپنی جانب سے پوری احتیاط اور کوشش کر دیکھی مگر سودا دینے والے نے کوئی نہ کوئی باسی، پلپلا یا پھر داغی دانہ ضرور ڈال دِینا ہوتا ہے۔ اَب اگر وہ ایسا نہ کرے تو اگلی بار چھابہ کیسے لگائے اور کہاں سے لگائے؟

ایک اور بات جس پر مجھے بہت اُلجھن ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ بندہ آگے کو جھکا بھاؤ تاؤ کر رہا ہوتا ہے اور عقب سے گزرنے والے، بہ جائے اس کے کہ اس کے سیدھا ہونے کا انتظار کر لیں، خوب رَگڑا لگا کر گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اس زور کا رگڑا لگتا ہے کہ جس کا بھاؤ بنایا جا رہا ہوتا ہے

بندہ منھ کے بل اُسی پر جا گرتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ بھیڑ بھاڑ والی ایسی جگھوں پر تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہوتا رہتا ہوگا۔ مجھے تو ایسے بازاروں میں خریداری کی ایسی مشقت کی سمجھ آ سکی نہ اِس قدر بھیڑ کی۔ گھر پہنچ کر باسی اور پلپلی سبزیوں کا ایک طرف ڈھیر لگایا جائے اور کھانے پکانے کے لیے باقی بچ رہنے والی ترکاری الگ کر کے جمع تفریق کی جائے تو ایسے سستے بازاروں کی اضافی دین یا تو وہ دھکے رہ جاتے ہیں جو آپ کو اَب تک لگ چکے ہوتے ہیں یا پھر وہ خواری جو بچوں کی ماں کی طرف سے آپ کے مقدّر کا حصہ ہونے والی ہوتی ہے۔

میں جب بھی تھیلے اُٹھائے، پسینے میں شرابور اور پھولے سانسوں کے ساتھ گھر پہنچتا رہا ہوں تو منے کی ماں کا پہلا اور چبھتا ہوا یہ جملہ سننے کو ملتا رہا ہے:

''خیر سے فوجیں پلٹ آئیں، میں تو سمجھی تھی، حضرت کسی اور ہی مہم پر تشریف لے جا چکے ہوں گے۔''

ایسی جلی کٹی سن کر ایک دفعہ تو تلووں میں بھڑکتی آگ کے شعلے مغز کو چاٹنے لگتے ہیں۔ مگر وہ شخصیانی میری جانب دیکھے بغیر، تھیلا ہاتھوں سے چھین کر فرش پر اوندھا دیتی ہے اور ڈھیر میں سے ایک ایک دانہ اُٹھا اُٹھا کر یوں دیکھنے لگتی ہے جیسے اُن کا طبی معائنہ کر رہی ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا، اُس نے بھولے سے ہی کہہ دیا ہو' آپ نے کمال کیا اتنی اچھی ترکاری لے آئے' یا پھر کم از کم اتنا ہی کہا ہو' مناسب ہیں کام چل جائے گا' کہ لائی جانے والی سبزی کبھی مناسب نہ نکلتی۔ اس لیے کہ سبزیوں اور لڑکیوں کو بہت قریب سے دیکھیں تو اُن میں کوئی نہ کوئی عیب نکل ہی آتا ہے۔

جس وقت وہ سبزیوں کے ڈھیر کا بغور معائنہ کر رہی ہوتی ہے، میں بھی سانس روکے ایک ڈھیر سا ہو جاتا ہوں۔ شرمندہ شرمندہ۔ یوں کہ جیسے ادھر بازار میں وہ گندی مندی سبزیاں جو ڈھیر پر پھینک دِی گئی تھیں، اُنہیں میں چپکے سے اُٹھا لایا ہوں۔ دِل ہی دِل میں دُعا مانگے جاتا

ہوں کہ اللہ کرے اُس کا دھیان کہیں اور بٹ جائے۔ اُس کی آنکھیں دُھندلا جائیں۔ اُسے کچھ نظر نہ آئے۔ مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ میری یہ دعائیں قبول ہوگئی ہوں۔ میں اِمتحاں میں کام یاب ٹھہرتا' نہ اُسے نظریں دھوکا دیتیں۔ ہاں یہ اکثر ہوتا رہا کہ اُس نے میری نظروں پر طنز کیا' میری آنکھوں کے گول سیاہ حصوں کو شفاف کالے کن ڈوڈوں سے تشبیہہ دی اور یہاں تک پوچھ ڈالا کہ کیا ترکاری لیتے ہوئے میں کسی سے نظربازی کے مشغلے میں مگن تھا؟

نظربازی میرا مشغلہ نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ میں کسی عورت کے جسم کو جان بوجھ کر مَس کرکے گزرا ہوں۔ حالاں کہ جب سے یہ بازار لگ رہے ہیں کئی شوقین تو اِن میں جاتے ہی اِس مقصد کے لیے ہیں۔ تاہم یہ تسلیم کر لینے میں کیا حرج ہے کہ جب بھی کوئی مختلف سا' نیا سا' دِل کش اور چمکتا ہوا چہرہ نظروں میں آجاتا ہے' نظر بچانا مشکل ہوجاتا ہے۔ جی کرتا ہے اُسے اُس وقت تک دیکھتے چلے چلو جب تک کہ وہ چہرہ عمومی بل کہ بے ہودہ سے چہروں کے پیچھے چھپ نہ جائے۔ ایسے بے ہودہ چہروں کے پیچھے کہ جنہیں دیکھنے سے یہ بہتر لگے کہ آدمی گوبھی' تَر'لوکی' کریلے یا پھر بینگن کو دیکھنے لگ جائے۔ یا پھر عقب سے گزرتے ہوئے کوئی اِس زور سے ہچکا لگادے کہ بندہ ادھر دیکھتے دیکھتے منھ کے بل ٹماٹروں کے ٹوکرے میں گر کر ٹماٹر ہوجائے۔

اِتنی طوالانی تمہید کا سبب وہ لڑکی ہے جس کے ایک ہاتھ میں کناروں تک بھرا ہوا تھیلا تھا اور دوسری طرف بغل میں ایک تربوز۔ تربوز نہ تو بہت بڑا تھا اور نہ ہی بہت چھوٹا۔ لڑکی کا دوپٹہ اکٹھا ہوکر گردن کے ساتھ رگڑ کھاتا کاندھوں کے پیچھے یوں لٹک رہا تھا کہ اُس کا ایک پلو زمین کو چھو رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ دودھ کی طرح اُجلے نہ تھے۔ بس یوں سمجھ لیں جیسے ملائی میں تھوڑا سا شنگرف ملا ہو۔ میں نے جلدی سے اُس کا چہرہ دیکھنے کے لیے نظریں اُوپر اُٹھائیں لیکن اِس سے پہلے ہی میری آنکھوں کی سکت جواب دِے گئی اور وہ اَپنی منزل کے آدھے راستے ہی میں ڈھیر ہو گئیں۔ نظریں جہاں ڈھیر ہوئی تھیں' وہیں دو ڈھیریاں تھیں جن میں اُس کے چلنے کی اَدا' اور

سانسوں کے ردھم نے اُودھم مچایا ہوا تھا۔ اگرچہ بغل میں دبے تربوز کا سبز چھلکا دمک رہا تھا مگر اُس میں اُس زِندگی کی ذرہ برابر رمق نہ تھی جس نے اُس کی ہمسائیگی میں محشر بپا کر رکھا تھا۔

اُس لمحے تک میرے اندر اُس کا چہرہ دیکھنے کی معمولی سی خواہش بھی نہ جاگی تھی۔

ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ جس قیامت کے الاؤ میں میری نظریں گر چکی تھیں اُس سے سنبھل ہی نہ سکی تھیں۔ سنبھلتیں اور نکلتیں تو کچھ اوپر دیکھ پاتیں نا۔ دوسری وجہ وہ واقعہ ہے جو آن کی آن میں کچھ یوں ہو گیا تھا کہ میں سب کچھ بھول کر اُس کی سبز آنکھیں دِیکھ رہا تھا جو آنسوؤں سے جل تھل ہو گئی تھیں۔

اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ میں جان بوجھ کر اُس کی آنکھوں اور آنسوؤں کا تذکرہ اِس لیے لے بیٹھا ہوں کہ کہیں آپ کو اُس کے خال وخد ہی نہ بتانا پڑ جائیں۔ میرا یقین کیجئے کہ میں اُس کا چہرہ پوری طرح دِیکھ ہی نہ سکا تھا۔ دیکھتا بھی کیسے؟ کہ اُس کے آنسوؤں نے میرے جیسے حوصلے والے آدمی کو بھی منھ زور سیلابی لہروں کی صورت دِے دِی تھی۔ میں نے اپنا تھیلا وہیں پھینکا اور لپک کر اُس بدبخت کو جا پکڑا جو اُس لڑکی کے پاس سے یوں گزرا تھا کہ اُس کا کندھا وہ سارا احاطہ بُری طرح روندتا چلا گیا تھا جس میں قیامت کی سی اُتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔

پہلے پہل اُس نے اپنا بازو چھڑوانے کے لیے خوب زور لگایا' دھمکیاں دیں اور آخر کار منتوں پر اُتر آیا۔ میں نے اُس کا بازو چھوڑنا تھا' نہ چھوڑا۔ کیسے چھوڑ دیتا؟ وہ جو دیکھ رہی تھی۔ وہ رونی صورت بنا کر کہنے لگا:

''باؤجی' مجھے جانے دیں۔ میں نے جان بوجھ کر تو کندھا نہیں مارا''

میں اور بھی بھڑک اُٹھا۔ اِس لیے کہ وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا یا پھر شاید میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ جھوٹ بک رہا تھا۔ میں نے منھ بھر کر ماں بہن کی دو تین گالیاں اُس کی جانب لڑھکا دیں۔ اُڑنگا لگایا' اُسے منھ کے بل گرایا اور اوپر سے دو چار شدید ٹھوکریں بھی رسید کر دیں۔

یوں لگتا تھا لوگ بھی اِسی لمحے کے منتظر تھے۔ ایک بھیڑ آگے بڑھی اور خود ہی اُس کی ٹھکائی شروع کر دی۔

اَب ادھر میری ضرورت نہ تھی۔ لوگوں نے اپنا کام ذِمہ داری سے سنبھال لیا تھا۔ میں اُس لڑکی کی جانب مڑا جس کے لیے میں اِتنا زِیادہ بہادر بن گیا تھا۔ نظروں نے اِس بار بھی اُتنا ہی فاصلہ طے کیا' جتنا کہ وہ پہلے کر سکی تھیں۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے کندھے پر کوئی گداز سا لمس تھا۔

میں نے اپنا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھا اور اس ناہنجار کی جانب دِیکھا جسے لوگ ابھی تک بُری طرح پیٹ رہے تھے۔

میری آنکھیں ٹھہر سی گئیں اور مجھے شدید دھچکا لگا۔ یقین نہ آیا۔ سمجھ بھی نہ آ رہا تھا لیکن جب میں نے آنکھیں مل مل کر دیکھا تو ہوش اُڑ گئے' اِس لیے کہ مار کھانے والا کوئی اور نہیں میں خود تھا۔

(یہ کہانی پہلے پنجابی میں لکھی گئی تھی)

ماسٹر پیس

میں جانتا ہوں، میرے اَفسانوں نے ادبی دُنیا میں تہلکہ مچائے رکھا ہے۔ افسانوں نے مجھے جو مقام بخشا، تنقید اُس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رَکھتی۔ اب بھی اگر کسی ادبی مجلّے، اخبار یا رسالے میں مجھ پر کوئی مضمون لکھا جاتا ہے یا میرے متعلق کوئی خبر شائع ہوتی ہے تو میرے نام کے ساتھ ''ممتاز اور منفرد افسانہ نگار'' ضرور لکھا ہوتا ہے، حالاں کہ میں نے دو سال سے افسانے لکھنے چھوڑ دِیے ہیں اور اس وقت سے مسلسل تنقید لکھ رہا ہوں۔

تنقید لکھنا میرے لیے مہنگا ثابت ہوا ہے۔ ہر ماہ نئی کتابوں میں اچھا خاصا اِضافہ ہو جاتا ہے۔ میرے اَفسانہ نگار دوست مجھے اپنے ہی میدان کا فرد جان کر اَپنی کتابیں بھیج دیتے ہیں۔ لیکن کئی دوسرے احباب مجھے افسانہ نگار سمجھ کر کتابیں کسی اور ناقد کے پاس تبصرے اور تنقید کے لیے بھیجنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ چناں چہ مجھے اَپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ کتابوں کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جونہی میں کوئی کتاب تھامے گھر پہنچتا ہوں، بیگم کا سوئچ آن ہو جاتا

ہے۔

’’جان نہیں چھوڑیں گی یہ کم بخت کتابیں۔ میں نصیبوں جلی کا ہے کو بیاہی گئی تھی تمہارے ساتھ۔ روتی ہوں اُس روز کو، جس روز میں تمہارے دامن سے بندھی تھی۔ نہ میرے سر پر سالم آنچل، نہ گڈو کے ڈھنگ کے جوتے، نہ منّے کی وردی سلامت، اور صاحب ہیں کہ ہر ماہ بغل میں نگوڑی کتابوں کو دابے چلے آتے ہیں۔‘‘

میں اپنے لہجے میں دنیا بھر کی ملائمت اور پیار گھول کر کہتا:

’’جانی! یہ کتابیں میں خرید کر تھوڑی لایا ہوں، وہ ہیں نا فاروق صاحب! ان سے عاریتاً پڑھنے کے لیے لایا تھا۔‘‘

’’ہاں ہاں میں جانتی ہوں تمہارے یار فاروق کو، اور تمہیں بھی۔ گھر میں کھانے کے لیے ہے نہیں اور کتابیں خرید خرید کر تمہیں پڑھنے کو دے دیتا ہے۔ سارا دِن گھر بیٹھتا ہے نکما کہیں کا۔ بس کاغذ کالے کرنے کے سوا کیا کام ہے اس کا؟ تبھی تو کہتی ہوں چھوڑ ان نکمے دوستوں کو۔ کتابوں کے یار کم بخت۔‘‘

میں سمجھتا۔ بس اب لیکچر ختم۔ لیکن جوں ہی محترمہ کی نظر پھر کتابوں پر پڑتی آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ کھل جاتا:

’’اے ہے، مجھے بتاؤ تو، یہ تمہارے سسرے دوست، حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر تمہیں کتابیں دیتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے بھول جاتے ہیں کیا؟ اب تک جو کتابیں آئی ہیں، واپس تو نہیں گئی ایک بھی!۔ جدھر دیکھو کتابیں ہی کتابیں ہیں۔‘‘

اِدھر بیگم کا دھواں دھار وعظ جاری ہوتا اُدھر منا اور گڈو ’’پم پم‘‘ کرتے سکول سے چھٹی کر کے گھر آ پہنچتے اور مجھے بھولے وعدے یاد کرانے لگتے۔

’’ابو آپ نے کہا تھا نا کہ تمہیں اگلے ماہ اونچی ایڑھی والے سینڈل لا دوں گا۔ لا دیں نا ابو!‘‘

''ابو جی، اِس مرتبہ تو میں ضرور لوں گا نکر کے لیے کپڑا اور کینوس کے سفید جوتے، روز پی ٹی ماسٹر صاحب طعنے دیتے ہیں۔ کہتے ہیں، اِتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو اور پی ٹی کی وردی کی حالت دیکھو۔''

اس سے قبل، میں کچھ کہتا، ہم تینوں بیگم کی گولہ باری کی زد میں آ جاتے۔

''ہاں ہاں لا دیں گے تمہیں سینڈل اور وردی، نگوڑی کتابوں سے تو جان چھوٹے۔''

پھر نہ جانے کہاں سے ہمدردی کا جذبہ عود کر آتا کہ ایکا ایکی گڈو اور منے کو جھڑک کر چپ کرا دیتی:

''کیا لگا رکھی ہیں فرمائشیں، ابھی تو آئے ہیں گھر۔ ذرا سکون سے سانس تو لے لینے دو۔''

کئی مرتبہ میں نے سوچا، بیوی اور کتابیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ ایک کو ''سلام'' کہ دینا چاہیے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے، دونوں زندگی کا لازمہ ہیں۔ پھر بیوی کی برہمی بھی کتنی دیر؟ چند لمحوں کی گھن گرج اور مطلع صاف۔ اور ہر ماہ کی سات تاریخ کو چند لمحوں کے لیے بادل کی یہ گھن گرج اور بجلی کی چمک برداشت کرنے کا میں نے اپنے اندر حوصلہ پیدا کر لیا۔ یوں ہر تنخواہ ملنے کے بعد کتابوں کی خریداری، گھر پہنچ کر چند لمحوں کی خواری میرا معمول بن گئے۔ بیگم ہر بار یہ سمجھتی کہ اب میرا رویہ بدل جائے گا۔ جب کہ میں ہر ماہ گاؤں جانے سے قبل کتابیں خریدنا نہ بھولتا۔ اور جب چھٹی پوری ہو چکتی تو مجھے رخصت کرتے وقت بیگم کی آنکھیں بھیگی ہوتیں اور مجھے اس بات کا اندازہ نہ ہو سکتا کہ محترمہ میری جدائی پر رو رہی ہیں یا میری ثابت قدمی پر۔

ہاں تو میں نے بتایا تھا کہ میں نے افسانے لکھنا چھوڑ دیئے ہیں، تنقید لکھتا ہوں۔ لیکن وہ جو اپنا یار عباسی ہے نا، اس کی فرمائش بڑھتی جا رہی ہے کہ افسانہ لکھ دو۔ اچھا آدمی ہے۔ برے بھلے وقت کام آ جاتا ہے۔ بجا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجھ سے افسانے لکھوانے لگے لیکن کیا کیا جائے کہ اس نے ایک ادبی پرچہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخباروں کے ذریعے اُسے خوب مشتہر کیا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ اس نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ بھی مشتہر کر دیا ہے

کہ میں بھی اس میں افسانہ لکھوں گا۔ اس کا خیال ہے‘ یوں پرچے کی اہمیت بڑھ جائے گی۔

میں نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ میں نے افسانے لکھنا چھوڑ دِیے ہیں‘ لیکن یہ بات اس کی کھوپڑی میں بیٹھتی ہی نہیں۔ کہتا ہے:

’’افسانے تمہارے منکوحہ تھوڑی تھے کہ طلاق کے بعد منہ نہیں لگا سکتے۔ تم ہی نے لکھنا چھوڑے تھے‘ تم ہی لکھنا شروع کردو‘‘

شاید اُسے خبر نہیں کہ افسانے لکھنے کے لیے خُون جگر جلانا پڑتا ہے۔ دو سال قبل جب میں افسانے لکھا کرتا تھا تو میرا ہر افسانہ شاہ کار ہوا کرتا تھا۔ لوگ میرے افسانوں کے انتظار میں رہتے۔ ادبی جریدوں کے مدیر کئی کئی مرتبہ مجھ سے رابطہ قائم کرتے منتیں کرتے۔ یاددِہانی کراتے‘ اور جونہی میرا کوئی افسانہ شائع ہوتا تو تعریفی خطوط مجھے ملنا شروع ہو جاتے۔ میری معمولی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ معاوضہ ہوتا جو مجھے ان افسانوں کے عوض ملتا۔

لیکن میں نے افسانے لکھنا چھوڑ دیے۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میں وہ معیار برقرار نہ رکھ سکوں گا‘ جواب ہے۔ یہ میرا خدشہ تھا۔ ہوسکتا ہے یہ خدشہ ٹھیک نہ ہو۔ لیکن یہ خوف بری طرح مجھے اپنی گرفت میں لے چکا تھا کہ آخر خُون جگر کب تک جلاتا رہوں گا؟ چراغ میں تیل ہوگا تو روشنی ہوگی۔ اس سے قبل کہ تیل ختم ہوجائے مجھے چراغ بجھا دینا چاہیے۔

اور میں نے خُون جگر جلانا بند کردیا۔ چراغ بجھا دیا۔

اِس کے لیے مجھے بڑی اَذیّت اُٹھانا پڑی۔ کئی مرتبہ تو یوں ہوتا کہ کسی افسانے کا مواد میرے ذِہن میں گردش کرنے لگتا۔ قلم اُٹھا کر رقم کرنا چاہتا تو اپنا فیصلہ یاد آجاتا اور یوں وہ مواد میرے ذہن کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر جان دِے دِیتا۔

میں نے چاہا‘ تنقید نگاری کے ذریعے افسانے کے شوق کو قتل کرڈالوں۔ میں نے تنقید کی کٹاری ہاتھ میں لے لی اور پوری یکسوئی سے اِدھر اُدھر وار کرنا شروع کردِیے۔ افسانوں کے

ذریعہ جو آمدنی ہوتی تھی، وہ ختم ہو گئی۔ تنقید کا معاوضہ بھلا کون دیتا ہے؟ تنقیدی مضمون وصول کر کے مدیر صاحبان مجھے یوں خط لکھتے' جیسے وہ اسے شائع کر کے مجھ پر احسان کرنے والے تھے۔ مجھے اپنے فیصلے پر کوئی پشیمانی نہیں تھی۔

عباسی ہم پیالہ وہم نوالہ بھی ہے اور لنگوٹیا بھی۔ اُس نے اَپنا پرچہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور مجھ سے افسانہ مانگا ہے تو مجھے یہ قسم توڑ دینی چاہیے۔ اور پھر گڈو کے لیے اونچی ایڑھی کے سینڈل اور منے کے لیے وردی۔ بیگم کے لیے خوبصورت ساڑھی۔ بس خُوش ہی تو ہو جائے گی ایک دم۔

''میں افسانہ لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا''

میں نے جوں ہی عباسی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا وہ ''زندہ باد'' کا نعرہ لگا کر میرے ساتھ چمٹ گیا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ جی بھر آگیا اور میرے سینے میں ہنڈیا سی ابلنے لگی۔ عباسی بھی گھبرا گیا۔

''کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ تم تو رو رہے ہو؟ خیریت تو ہے نا؟''

میں زور زور سے رونے لگا۔ یوں' جیسے اُس نے مجھے کہہ دیا ہو' رونا ہے تو خوب کھل کر رو' یوں اوں اوں کرنے سے کیا فائدہ؟''

اسی آن مجھے اَپنی حرکت پر تعجب ہوا۔ کیوں رویا ہوں میں؟ مجھے رونا نہیں چاہیے۔ شاید مجھے اپنا عہد توڑنے پر رونا آیا تھا۔ شاید۔ لیکن مجھے رونا نہیں چاہیے۔ خواہ مخواہ عباسی کو پریشان کیا۔ کیا سوچتا ہو گا یہ بھی؟

ہاں ہاں مجھے مسکرا دینا چاہئے۔ اور میں مسکرا دیا۔ عباسی ایک مرتبہ پھر حیران ہوا۔ کہنے لگا:

''عجب آدمی ہو' کبھی روتے ہو' کبھی ہنستے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں؟''

اور میں اَپنی اِس حرکت پر جھینپ گیا۔ نہ مجھے رونا چاہیے' نہ ہی ہنسنا۔ مجھے تو باتیں کرنا

ہیں۔ اور میں نے اس سے ادبی پرچے کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔

''کب نکال رہے ہو پرچہ؟...... کتنا سرمایہ لگا رہے ہو؟...... کتنا مواد جمع ہو گیا ہے؟......''

مجھے خُوشی ہے کہ میں نے افسانے کا خوبصورت پلاٹ اَپنے ذِہن میں تیار کر لیا ہے۔ ایسا افسانہ تو میں نے پہلے کبھی نہیں لکھا تھا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے' میں نے افسانے لکھنا کیوں چھوڑ دِیے تھے۔ میں تو اب بھی شاہ کار افسانے تخلیق کر سکتا ہوں۔ میں حیراں ہوں کہ ایسا پلاٹ اس سے قبل میرے ذہن میں کیوں نہ آیا تھا؟

میری عادت ہے کہ میں پہلے افسانے کا پلاٹ ذہن میں تیار کرتا ہوں۔ پھر اس کی جزیات پر غور کرتا ہوں۔ تب جا کر ایک ہی نشست میں کاغذ پر منتقل کر دیتا ہوں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی دودھ کا پورا گلاس ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل دے۔

اور میں نے گلاس حلق میں انڈیل دیا۔

افسانے کا آخری پیراگراف ہی اس افسانے کی جان تھا۔ میں نے سوچا میں اس افسانے کو اپنا نمائندہ افسانہ کہوں گا۔ ایسا اِختتام میرے کسی افسانے کا نہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا' کہانی آخری پیراگراف سے قبل ہی ختم ہو چکی ہے' لیکن دوسرے ہی لمحہ جب آگے چند فقرے قاری پڑھے گا' تو تڑپ اٹھے گا۔ افسانے کا اِختتام ایسے ہی تھا کہ جیسے دور سے بند نظر آنے والی گلی اپنے پہلو میں ایک ایسا دریچہ رَکھتی ہو' جو گلشن پُر بہار میں جا کھلے۔ یا پھر جیسے بدلیوں کی گود میں آرام کرنے والا چاند مچل کر برہنہ ہو جائے تو تارے شرم سے آنکھیں جھپکنے لگیں۔

مجھے اس پورے افسانے میں اس کا انجام بہت اچھا لگا۔ میں اس افسانے کو بلا جھجک ''ماسٹر پیس'' کہہ سکتا ہوں۔ میں تصور ہی تصور میں سینکڑوں خطوط پڑھ رہا ہوں' جو مجھے اس قدر خوبصورت افسانہ لکھنے پر مبارکباد دینے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ خصوصاً لوگوں نے اس کے آخری پیراگراف پر خوب داد دِی ہے۔ اب میرے ذِہن میں بیوی کا مسکراتا ہوا چہرہ آ گیا ہے۔

میں اس کے ہاتھ میں خوبصورت ساڑھی تھما رہا ہوں۔ میں گڈو اور منے کے چہکتے چہرے بھی دیکھ رہا ہوں۔ گڈو سینڈل پہنے بڑی اُدا سے ایک ایک قدم یوں رکھ رہی ہے، جیسے شیشے کے فرش پر چل رہی ہو اور تیز چلے گی تو شیشہ چکنا چور ہو جائے گا۔ منا وردی وردی پہنے فوجیوں کی طرح پریڈ کرتا کبھی اِدھر جاتا ہے، کبھی اُدھر۔ میں خُوش ہو کر اپنے افسانے کو دیکھتا ہوں۔ یہ سب خُوشیاں اس افسانے ہی کی بدولت مجھے مل رہی ہیں۔ یہ مکمل اَفسانہ میرے بیوی بچوں کی خُوشی ہے اور اس کے اختتامی فقرات میرا سرمایۂ مُسرّت۔

میں بھاگم بھاگ عباسی کے ہاں پہنچا۔

وہ منہ پھلائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا:

''دیکھو یار میں نے تمہاری کتنی منتیں کی ہیں کہ افسانہ لکھ دو۔ تم نے نہیں لکھا اور پرچہ مکمل ہو چکا ہے۔ میں اسے مقررہ تاریخ سے لیٹ نہیں کرنا چاہتا مگر تم ہو کہ ابھی تک افسانہ نہیں لکھ رہے۔ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں یہ افسانہ نگار بھی۔''

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نے افسانہ لکھ دیا ہے۔ لیکن ایک ہی سانس میں کہنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ بہ ہر حال میں نے اس کے سامنے افسانہ رکھ دیا۔ تو وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ میرے سینے میں ہنڈیا کھولنے لگی۔ میں رونا چاہتا تھا لیکن ضبط کر گیا۔ بھلا یہ کوئی رونے کا موقع تھا۔

''بس یار اب پرچہ تیار سمجھو۔ ایک ہفتے کے اندر تمہاری کاپی تمہیں بھیج دوں گا۔''

پھر اُس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ نوٹوں کی گڈی باہر نکالی اور پانچ سرخ سرخ نوٹ اس میں سے کھینچ کر میری جانب بڑھا دیے۔ میری آنکھوں کے سامنے بیوی بچوں کے مسکراتے چہرے گھوم گئے۔ میں نے وہ نوٹ اَپنی مٹھی میں دبا لیے اور اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا۔

ابھی اس ماہ کی ستائیس تاریخ تھی۔ مجھے اگلے ماہ کی سات تاریخ کو گھر جانا تھا۔ یوں گھر

جانے میں دس روز پڑے تھے۔ چناں چہ میں نے روپے سنبھال کر ٹیبل کی دراز میں رکھ دِیے۔

پرچے کی اِشاعت تک مجھ پر عجیب کیفیت طاری رہی۔ دو سال قبل جب میں اَفسانے لکھا کرتا تھا تو کبھی ایسی ہیجانی کیفیت سے دو چار نہ ہوا کرتا تھا' جیسی کیفیت سے اب کی بار ہوا ہوں۔ بار بار آنکھوں کے سامنے لوگوں کے خطوط آجاتے' کسی میں لکھا ہوتا ہے:

''آپ نے اس افسانے کو ایسا لافانی انجام دیا ہے کہ مُدتوں یاد رہے گا''

کسی میں شکایت ہوتی:

''آپ نے افسانے لکھنا چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اس افسانے نے تو ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔''

کوئی مطالبہ کرتا:

''اِس افسانے نے مجھے اس نتیجے پر پہنچا دیا ہے کہ آپ نے افسانہ نویسی ترک کر کے اُردو اَدب پر ظلم کیا ہے۔ فوراً اپنا فیصلہ واپس لیجئے اور دوبارہ افسانے لکھئے۔''

میں جھوم جھوم گیا۔ پورا ہفتہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہا اور جب پرچہ شائع ہو گیا تو عباسی میری کاپی دینے خود میرے پاس آیا۔ اُس نے آتے ہی کہا:

''یار تمہارے نام نے تو کمال کر دیا۔ سارے پرچے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں''

میں خُوشی سے پھول گیا۔ اُس نے شمارہ مجھے تھما دِیا اور کہنے لگا:

''میں تم سے ایک معذرت بھی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے افسانے کے بعد ایک بھاری معاوضے کا اِشتہار آ گیا تھا۔ چناں چہ یہ سوچتے ہوے کہ افسانہ تو آخری پیراگراف کے بغیر بھی مکمل ہی لگتا ہے' میں نے آخری پیراگراف شاملِ اِشاعت نہیں کیا۔ تم تو اپنے دوست ہو نا یار' سوچا تم سے معذرت کر لوں گا' کسی اور کی تحریر چھیڑتا تو اجازت لینا پڑتی۔''

میرے اندر سے کوئی چیز اُٹھی اور حلقوم میں آ پھنسی۔ جلدی جلدی ورق اُلٹے۔ آخری پیراگراف غائب تھا اور اس کی جگہ ٹیکسٹائل ملز کا اِشتہار میرا منھ چڑا رہا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ ہنڈیا کھولنے لگی۔ میں نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹیبل کی دراز کھولی' پانچوں سرخ نوٹ نکالے' پھر عباسی سے کہا:

''ذرا اُٹھو''

وہ کھڑا ہو گیا۔ میں دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ کہا:

''یہاں آؤ''

وہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے باہر اِشارہ کرتے ہوئے کہا:

''ذرا باہر دیکھو''

اُس نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور پھر باہر دیکھنے لگا۔ اِتنی دیر میں' میں اُس کے عقب میں پہنچ گیا۔ دونوں ہاتھ اُس کی پشت پر جما کر زور سے دھکا دے دیا۔

وُہ لڑھک کر باہر برآمدے میں جا پڑا۔

میں نے سرخ نوٹ اور پرچہ اُس کے منہ پر دے مارا اور چیخ پڑا:

''دفع ہو جاؤ میرے دوست' میری آنکھوں کے سامنے سے''

وہ میرا دوست تھا اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر جھٹ سے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ چارپائی تک پہنچا اور بستر پر گر کر تکیہ سینے سے لگا لیا۔ ہنڈیا پھر کھولنے لگی تھی۔

میرے اردگرد تعریفی خطوط کی اُڑتی بکھرتی راکھ میرے نتھنوں کو بند کیے دے رہی تھی۔

ادارہ اور آدمی

(......جب کوئی ادارہ یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ دوسو نوکریاں چھانٹ رہا ہے تو اس کے حصص کی قیمت جست لگا کر بڑھ جاتی ہے۔ یہ دیوانگی ہے.............گنتر گراث)

جب بھی مسٹر کے ایم رضوانی چھوٹی صنعتوں کے اِس بڑے اَدارے کو ماں کی مثل قرار دِیتے' ریاض کو زمین کے بارے میں اَپنی ماں کی کہی ہوئی بات یاد آ جایا کرتی کہ:

''بیٹا زمین بھی ماں کی طرح ہوتی ہے۔ اپنے بیٹوں کی رگوں میں دودھ کے نور جیسا پاک رزق اُتارنے والی''۔

اُس کی ماں نے یہ بات تب کہی تھی جب اُس نے اَپنے باپ دادا سے وراثت میں ملی ہوئی زمین کا وہ اکلوتا ٹکڑا بیچنے کا فیصلہ کیا تھا جو اُنہیں رزق دِیتا تھا۔ اِتنا رزق' کہ گزر بسر ہو ہی جاتی

تھی۔ تب ریاض کی بہن جوان تھی اور اُس کی جوانی دِیکھ دِیکھ کراُسے وحشت ہونے لگی تھی۔ اُس کی ماں کو بھی ہول آتے تھے، تبھی تو زمین بیچنے کی بات آخر کار اُس نے مان لی تھی۔

مسٹر رضوانی، ریاض کے باس تھے۔ اُن کے منہ سے ''لائک مدر'' والی بات نکلا کرتی تو اُس کی رَگوں کے اَندر لہو کی گردش تیز ہو جایا کرتی تھی۔ مگر اب یہ بات قدرے پرانی ہو چکی تھی۔ پرانی بھی اور بوسیدہ بھی۔ اِتنی بوسیدہ کہ مُدت ہوئی مسٹر رضوانی یہ بات دُہرانا بھول چکے تھے۔ شاید اِس کی وجہ وہ بوکھلاہٹ تھی جو اُنہیں سنبھلنے اور کچھ اور سوچنے ہی نہ دِیتی تھی۔

یہ بُوکھلاہٹ اُنہیں اُوپر سے ملتی تھی۔

اُوپر سے مراد ایم ڈی صاحب ہیں۔ جب بھی مسٹر رضوانی ادھر سے ہو کر آتے، بوکھلاہٹ ان کی سانسیں برابر نہ ہونے دیتی۔ ہوں ہوں کرتے آدھی بات چھاتی میں دباتے اور آدھی باہر پھینکتے۔ رِیاض بھی کئی طرح کی اَسائین منٹس پا کر بوکھلا جایا کرتا۔ اور اُس سب پر مستزاد یہ کہ باس کی طرف سے خود ہی اَندازے لگانے کا حکم صادر ہو جاتا:

''یہ کرلو۔ اِسے یوں کرلو۔ یا...... یا کوئی اور صورت نکالو۔ بھئی خود بھی دِماغ لڑاؤ نا۔''

ریاض کُند ذِہن نہیں تھا۔ تاہم اِیسا بھی نہیں تھا کہ فوری فیصلہ کر پاتا۔ اس کا ذِہن رَفتہ رَفتہ کُھلتا تھا، بیس پچیس مِنٹ مِل جاتے تو یقینی طور پر قابلِ عمل پروپوزل بنا لیا کرتا۔ اُس کے باس کو اکثر فوری فیصلے کی طلب ہوتی اور جب اُنہیں کچھ نہ سوجھ رہا ہوتا کہ کیا اور کیسے کرنا ہے؟ تو بات بے بات اُلجھنے لگتے۔ اُوپر کی طرف دیکھتے اور سر جھٹک کر تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہتے:

''کامپلی کیٹیڈ ڈاٹا ایم ڈی صاحب کو سمجھ ہی نہیں آتا۔ بیک گراونڈ نہیں ہے نا۔ یہ ڈیپارٹمنٹ والے تو ہر ایک کو ''علامہ'' سمجھتے ہیں، تم یوں بنالاؤ کہ ساری پکچر واضح ہو، سارا معاملہ اُنہیں بھی سمجھ آ جائے۔''

اُوپر والے صاحب کیسے سمجھ پائیں گے؟ متعلقہ ڈیپارٹمنٹس والوں کو پتا چلا' نہ کبھی ریاض جان پایا تھا۔ تاہم وہ اَپنے طور پر کوشش کرتا رہا اور ہر معاملے کو یوں ایکسپلین کرنے کی صورت نکال لیا کرتا تھا کہ اُس سارے سسٹم سے ناواقف شخص کو بھی زیرِ تصفیہ معاملہ سمجھ آ جاتا۔

شروع میں مسٹر رضوانی' رِیاض کی رِیاضت پر خُوش ہو جایا کرتے' ایک ایک ٹیبل کو دیکھتے' تو اُن کے منھ سے ''واہ واہ'' کی آوازیں نکلتیں' کبھی مکا میز پر مارتے اور کبھی اُس کے کندھے کو تھپتھپا کر کہتے:

''یہ ڈاٹا تو اب جاہل سے جاہل کو بھی سمجھ آ جائے گا' اُسے ضرور سمجھ آ جانا چاہیے۔''

ساتھ ہی وہ ماتھے کو اپنی اُنگلیوں کی گرفت میں لے کر ہاتھ زور سے جھٹک کر الگ کرتے ہوئے کہتے:

''چلیں کوئی اِشو تو سیٹل ہوگا۔''

مگر واقعہ یہ تھا کہ اوپر والا جاہل نہ تھا لہذا جاہلوں کے لیے کی گئی محنت اُس پر کچھ اثر نہ کرتی تھی۔ جب ایم ڈی صاحب نئے نئے اس اَہم ادارے میں آئے تھے تو اُن کا زبردست سی وی بھی سرکولیٹ ہوا تھا۔ اس سی وی کے مطابق موصوف کئی بین الاقوامی اداروں میں کام کر چکے تھے۔ اسی سرکلر سے ان فیملی کے جو کوائف نمایاں کیے گئے وہ بھی دل چسپ تھے۔ مثلاً یہی کہ وہ شادی شدہ تھے۔ دو بیٹوں ایک بیٹی کے علاوہ دو درجن مختلف نسل کے کتے بھی رَکھتے تھے۔ سی وی میں اس طرح کی معلومات دینے کی میرے باس کے پاس یہ توجیہہ تھی کہ اُدھر باہر کتوں کا الاؤنس بھی مل جاتا ہوگا۔ تاہم اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر کوئی بات ڈھنگ سے ان کے پلے کیوں نہ پڑتی تھی۔

کوئی وجہ تو ہوگی؟ مسٹر رضوانی سوچتے مگر اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ ایک بار اُنہوں نے اپنے تئیں تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس طرح کے بڑے ادارے کا ذمہ دار ہو کر فیصلے دینا ایک الگ ماحول میں کام کرتے آنے والے کے لیے واقعی بہت کٹھن بات تھی۔ انہی

کٹھن مرحلوں کو آسان کرنے کے لیے وہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے اور ایسی حکمت عملی کو وظیفہ بنا لیا کہ بڑے صاحب کانفیڈنس سے فیصلے کر سکیں۔ مگر جب ایم ڈی صاحب نہایت اِعتماد سے اور اپنے دستخطوں سے بڑے بڑے فیصلے کر کے بھیجنے لگے تو پہلے پہل تو مسٹر رضوانی چکرا سے گئے اور آخرکار اُنھیں بھی سارا معاملہ سمجھ آ گیا۔

لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

وہ اُفسوس سے ہاتھ ملا کرتے کہ پہلے روز ہی معاملات اُن کی سمجھ میں کیوں نہ آئے تھے۔ کم از کم تب ہی اَندازہ لگا لیا ہوتا جب مختلف ایجنسیوں کی طرف سے ملکی ترقی میں قابل قدر حصہ ڈالنے والی اس آرگنائزیشن کو 'ناکام ادارہ' کہا جا رہا تھا اور اس گھناؤنے الزام کو سچ ثابت کرنے کے لیے جھوٹی اور گمراہ کُن فگرز دِی جا رہی تھیں جس کی وجہ سے ساری سکسیس سٹوری نااہلیوں کی داستان ہو کر رہ گئی تھی۔

اِس سارے پروپیگنڈے کے لیے اخبارات کو خوب خوب اِستعمال کیا جا رہا تھا۔ جب چٹ پٹی خبریں کوٹے سے دُگنے رنگین اِشتہارات کے ساتھ میسر آ رہی تھیں تو وہ یہ سب کچھ کیوں نہ چھاپتے۔ اگر بروقت اصل صورتِ احوال میڈیا کو جاری کر دِی جاتی تو یہ پروپیگنڈا دم توڑ سکتا تھا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ایسا ہونے ہی نہیں دِیا گیا حالاں کہ رِیاض ساری فگرز کو اینالائیز کر کے ایک مؤثر وضاحت نامے کا ڈرافٹ بنا کر اپنے باس کے پاس لے گیا تھا۔ مسٹر رضوانی اس ڈرافٹ کی عبارت سے نہ صرف پوری طرح مطمئن تھے' خُوش بھی تھے کہ اس وضاحت نامہ سے اِلزامات کا سارا ملبہ صاف ہو جائے گا۔ وہ اُسے لے کر اُوپر گئے مگر منھ لٹکا کر واپس آ گئے۔ ایم ڈی صاحب کو یہ ڈرافٹ پسند نہیں آیا تھا۔ رِیاض نے اُسلوب بدل بدل کر مزید تین ڈرافٹس بنائے۔ جب تک ڈرافٹنگ ہوتی رہی مسٹر رضوانی اُس کے سر پر سوار رہے۔ کچھ وقت کے لیے اپنے روم میں گئے بھی تو انٹرکوم بجا بجا کر اُسے ہری اَپ کے کاشن دِیتے رہے۔ اِس دوران اُنھوں نے ایک بار تو رِیاض کو پرفیکشنسٹ ہونے جب کہ دوسری بار ڈیڈ سلو لائیک ٹورٹائز ہونے

کے طعنے بھی دیئے۔ جب وہ تینوں پروپوزلز فر کر کے لے گیا تو وہ مطمئن ہو گئے۔ اُنہیں یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی ڈرافٹ فائنل ہو جائے گا۔

مسٹر رضوانی اُوپر جاتے ہوئے بہت پُر جوش تھے مگر کھوٹے سکّے کی طرح پلٹ آئے۔ اَپنی ریوالنگ چیئر پر ڈھیر ہونے کے اَنداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سارا جوش اُوپر ہی کہیں بھول آئے تھے۔ ریاض کو حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ کچھ پوچھے' تاہم میں اِس بارے میں متجسس تھا اور رہا بھی۔ حتّٰی کہ اُس کے باس چیئر آگے پیچھے جھولانے سے اُکتا کر اُسے دائیں بائیں گھمانے لگے اور خود پر ضبط نہ پا کر ہاتھ ہوا میں نچاتے ہوئے کہنے لگے:

''حضرت کہتے ہیں' چھوڑ جائیں' میں ذرا سکون سے دیکھوں گا' میڈیا کا معاملہ ہے۔''

اُنہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اُوپر' جس معاملے کو لاء یا لاجک سے رد نہیں کیا جا سکتا تھا اور اُسے کرنا مقصود بھی نہیں ہوتا تھا تو یوں معرضِ اِلتوا میں ڈال دیا جاتا تھا۔ تاہم ادارے کے امیج کا سوال تھا اور مسٹر رضوانی نیک نیتی سے چاہتے تھے کہ اس کی نیک نامی پر اُچھالے گئے گند کو وضاحت کے اجراء سے صاف کیا جا سکتا تھا۔ لہذا اُنہوں نے اُس وقت تک اَپنی سیٹ نہ چھوڑی جب تک اوپر ایم ڈی صاحب بیٹھے رہے۔ ریاض کو کہا:

''پی آر والوں کو بھی بٹھائے رکھو' شاید کوئی ڈرافٹ او کے ہو کے آجائے' پریس اسٹیٹمنٹ ریلیز کرانے کے لیے پی آر والوں کو کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔''

جب ایم ڈی صاحب اُٹھ کر چلے گئے اور یہ بھی تسلی ہو گئی کہ فائل بغیر کسی فیصلے کے اَندر ہی پڑی ہوئی ہے تو وہ بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے اور باہر نکل گئے۔

اگلے دو روز تک مسٹر رضوانی یاد دہانی کے لیے کسی نہ کسی اور اِشو کے بہانے اُوپر جاتے رہے۔ چوتھے روز وہ کسی بھی فیصلے کے بغیر فائل اٹھائے واپس آگئے۔ مسٹر رضوانی کے نتھنوں سے دُھواں نکل رہا تھا۔ اَپنی نشست پر بیٹھتے بیٹھتے فائل ریاض کی طرف اُچھالی اور کہا:

''دیر...... ہونہہ...... 'دیر ہو گئی ہے۔ حضرت کہتے ہیں' اب اِس کی ضرورت نہیں

رہی، بہت دیر ہو چکی ہے۔''

ایم ڈی صاحب کوئی بھی اِشو سیٹل نہ کر رہے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر رضوانی بات بے بات اُلجھنا شروع ہو گئے۔ وہ اس قدر مایوس ہو گئے تھے کہ اُنہوں نے ریاض کو ڈاٹا سہل بنانے کی اسائنمنٹس دینا چھوڑ دی تھیں۔ متعلقہ ڈیپارٹمنٹس والے جو بھی اور جیسا بھی پُٹ اَپ کرتے' وہ اسے بعینہ اِن ڈورس کر کے اُوپر بھجوا دیتے۔ اُوپر والے نے فائلز نہ نکالنے کی قسم اُٹھا رَکھی تھی لہذا معاملات لٹکتے چلے گئے۔ اَچھے بھلے رَواں دَواں ادارے کو بریکیں لگ گئی تھیں۔

یہی جبری فراغت کے وہ دِن تھے جب مسٹر رضوانی کو چھاتی میں عین دِل کے مقام پر شدید چبھن ہوئی۔ رِیاض اُنہیں کارڈیالوجسٹ کے پاس لے گیا تھا۔ یہیں اُس نے اُن کی دونوں بیٹیوں کو دیکھا تھا جن میں سے ایک بالکل مُنّی جیسی تھی۔

مُنّی' ریاض کی وہ بہن تھی جو مایوس ہو کر یوں بھا گی تھی کہ وہ اُسے پھر نہ دِیکھ پایا تھا۔

مکمل چیک اَپ کے بعد مسٹر رضوانی کو پہلی بار پتا چلا کہ اُن کے دِل کے دو والو بند تھے۔ ڈاکٹروں نے فوری آپریشن سجیسٹ کیا۔ اُنہیں اپنے دِل سے کہیں زیادہ اِدارے کی فکر لاحق تھی۔ کہتے' اِدھر معاملات سدھریں تو آپریشن کی ڈیٹ لوں۔

مگر معاملات تھے کہ بگڑتے ہی جا رہے تھے۔

جب بہت ہی بنیادی نوعیت کی فائلز بھی اُوپر ڈمپ ہونے لگیں تو اُن کی پارٹ فائلز کُھل گئیں اور اُن پر نیچے سے 'ارجنٹ' اور 'امپارٹنٹ' کے فلیگ لگ کر آنے لگے۔ اوپر اِس کا بھی توڑ تھا۔ ہر ارجنٹ فائل 'سپیک' لکھ کر واپس کر دی جاتی۔ وہ سپیک کر کے آتے تو اُنہیں سمجھ ہی نہ آتا کہ فائل کا کیا کِیا جائے۔ جب کمپیٹنٹ اَتھارٹی نے اُوپر کچھ لکھا ہی نہیں تھا تو اس کی ڈسپوزل کیسے ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اوپر سے آتے ہی مسٹر رضوانی پہلے تو ریاض پر برہم ہوتے' کِسی بھی وجہ سے۔ ریاض اُن کا اِنتظار کر رہا ہوتا' تو جھڑک کر اُسے کمرے سے نکال دیتے کہ وہ شاید اُس کا تماشا دیکھنے کا منتظر تھا...... اور وہ اَپنی سیٹ پر بیٹھ کر کوئی

اور اسائین منٹ مکمل کر رہا ہوتا تو اُسے بلا کر سوالیہ لہجے میں طعنہ زَن ہوتے کہ اُسے اپنی سیٹ پر بھاگنے کی کیا جلدی ہوتی تھی؟......اور بعد ازاں کئی کئی گھنٹوں کے لیے گم صُم ہو جاتے۔

ریاض سبجیکٹ سپیشلسٹ ہوتے ہوئے بھی گزشتہ کئی برسوں سے پرسنل سٹاف کی طرح اُن کے ساتھ تھا۔ اس کا کہیں بھی تبادلہ ہوا' باس نے رُکوا لیا۔ مسٹر رضوانی اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اس نے بھی حتی الوسع کوشش کی کہ اُن کے اِعتماد کو ٹھیس نہ لگنے دِے۔ دو تین مزید افسران ایسے تھے جنہیں اُنہوں نے اپنے ساتھ رکھ کر ایک ٹیم سی بنالی تھی۔ یہ سارے محنتی اور پروفیشنل لوگ تھے لہذا سب کو ٹیم ورک میں بڑا مزا آتا تھا۔ مشکل سے مشکل معاملات وہ مل جُل کر سُلجھا لیا کرتے۔

مگر کچھ عرصے سے جیسے کِسی کو کِسی پر اِعتماد نہ رہا تھا۔

اُنہوں نے اَپنے ادارے کو پھلتے پھولتے دیکھا تھا۔ ابھی دو چار برس پہلے تک انہیں اِس پرسٹی جیئس اِدارے سے منسلک ہونے پر فخر کا احساس بھی ہوتا تھا۔ مگر اَب تو جیسے سب کچھ جھوٹ تھا۔ ان کا اِخلاص' ان کی محنت' ان کی اچیومنٹس۔ سب کچھ۔ ایسے میں تو اپنی صلاحیتوں پر بھی شک ہونے لگتا ہے......اور......سچ تو یہ ہے کہ وہ واقعی اپنا کانفیڈنس لُوز کر چکے تھے۔

ریاض کے باس کو وہ وقت بہت یاد آتا تھا' جب سرکاری اداروں کی ملازمت عزت اور وقار کی بات تھی۔ تب کلرکی کی بھی ایک دَھج ہوا کرتی تھی جب کہ اُنہیں سولہویں سکیل کا افسر لیا گیا تھا۔ اس نے خوب محنت کی۔ ان دنوں محنت اور خدمت ایمان کے ہم پلہ لگتے تھے۔ ڈیوٹی اور فرض کے ایک سے معنی تھے۔ اس کا اُنہیں یہ انعام ملا کہ انہوں نے نہ صرف خوب عزت کمائی' مسلسل ترقی پاتے پاتے موجودہ عہدے تک پہنچ گئے۔ ریاض اُن سے دَس بارہ برس بعد اِس ادارے میں آیا اور مختلف شعبوں میں کام کرنے کے بعد براہِ راست اُن کی ماتحتی میں آ گیا تھا۔ حتّٰی کہ وہ زمانہ آ پڑا جب ایک منصوبے کے تحت سرکاری ملازمت کو گالی بنا دیا گیا۔

اچانک سب سے اوپر تبدیلی آئی تھی۔

تبدیلی چوں کہ غیر جمہوری تھی لہذا اُس کو باہر والوں سے تسلیم کروانے کے لیے بہت کچھ تسلیم کرلیا گیا۔ یوں سب اداروں پر ایسے صاحبان آ کر بیٹھ گئے کہ ان اداروں میں کام کرنے والوں کی خود اِعتمادی بھی ٹھس کر کے بیٹھ گئی۔ ہر کہیں معاملات پینڈنگ ہونے لگے۔ اخبارات جھوٹی سچی خبریں مصالحے لگا لگا کر چھاپنے لگے۔ چہ مگوئیوں اور افواہوں نے زور پکڑا تو اچھا بھلا کام کرنے والے بھی بیٹھ گئے۔ لگن سے کام کرنے والے ہمت ہار بیٹھے تو وہ ادارہ خود بخود بیٹھنے لگا جس میں ریاض کام کرتا تھا' یہاں تک کہ ایم ڈی صاحب نے بھی کہنا شروع کردیا:

''میں نہ کہتا تھا یہ ادارہ دیمک زدہ ہے' باہر سے ٹھیک ٹھاک مگر اندر سے کھوکھلا۔ لمبی گڑبڑ ہے۔ تب ہی تو خبریں چھپتی رہتی ہیں۔''

عین ایسے عالم میں' عالمی مالیاتی اداروں کے نمائندے' پرائیویٹائزیشن کے پراسس کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے مسلسل دوروں پر آنے لگے۔ اُن کے ساتھ انویسٹرز بھی آ رہے تھے لہذا سرکاری اداروں کی یوں منڈی سی لگی کہ جو بھی آتا وہ ایسٹس اور لائیبیلٹیز کی سٹیٹ مِنٹس اور بیلنس شیٹس کو کچھ ایسے ٹٹولتا تھا جیسے منڈی میں قصاب بکروں اور دُنبوں کی پسلیاں ٹوہ ٹوہ کر دیکھتے ہیں۔ اخبارات میں سرکاری اَداروں کی بد اِنتظامیوں' انتظامیہ کی نا اہلیوں' پالیسیز کی خامیوں' حتیٰ کہ خود اسٹیٹ کی ناکامی کی بارے میں ایسی ایسی خبریں چھپنے لگیں کہ سب کچھ دُھندلا گیا۔

ایسے میں جو کچھ کہا جا رہا تھا وہ بہت جلد سچ لگنے لگا۔

ایسی ہی افواہوں سے لبالب بھرے ہوے دنوں میں سے ایک دِن تھا جب مسٹر رضوانی نے ایم ڈی کی ڈائریکشن پر ریاض سے ایس ایس سی یعنی ''سبجیکٹ سپیلسٹ کور'' کی اِنڈکشن کے لیے پروپوزل بنوائی۔ رِیاض نے دَبے دَبے لفظوں میں کہا:

''ادارے کے پاس ایسے ایکسپرٹس کی کمی تو نہیں ہے سر۔''

باس اس سے متفق تھے مگر اُن کا خیال تھا کہ اِسی بہانے لوئر سٹاف کی جو کمی ہے' اُسے بھی

نوٹس میں لے آتے ہیں۔ لہذا نوٹ بناتے ہوئے ریاض نے اَفرادی قوت کا چارٹ بنایا‘ ریکوائرمنٹس کا تخمینہ لگایا اور ”ایس ایس سی“ کے ساتھ اُسے نتھی کر کے فائل کے اُوپر چڑھا دیا۔ فائل پر اُسی روز فیصلہ ہو گیا۔ صرف نوٹ کے پہلے حصے کی اَپروول ہوئی تھی جب کہ دوسرے کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اُسے الگ سے پُٹ اَپ کیا جائے۔ وہ اِشو الگ سے موو ہوا بھی‘ مگر فائل اوپر ہی کہیں ڈمپ ہو گئی۔

جب ایس ایس سی کے نام پر اناڑی مگر ڈِگنا ٹیز سے کلوز کانٹیکٹ رکھنے والے لوگ یکے بعد دیگرے مراعات کے خصوصی پیکج پر رکھے جانے لگے تو مسٹر رضوانی پر مایوسی کے شدید دورے پڑے۔ ذِہنی دباؤ کے اِسی دورانئے میں اُنہیں شدّت سے یہ فکر دامن گیر ہونے لگی تھی کہ اُن کی دونوں بیٹیاں تو کب کی شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں۔ اُن کے پاس اِس سے پہلے اپنے بارے میں‘ اَپنی صحت کے بارے میں‘ اَپنی وائف اور بے بیز کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہ صبح آتے تھے تو رات گئے پلٹتے تھے۔ مسٹر رضوانی اَب بھی لیٹ سٹنگ کرتے تھے مگر اب اُن کے پاس سوچتے رہنے اور فکر مندی سے ہلکان ہونے کی فرصت ہی فرصت تھی۔ بیچ بیچ میں ایسے وقفے ضرور آتے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالا دیتے اور ادارے کے پوٹینشل کی وجہ سے اُمید بھری باتیں کرتے ہوئے کہتے:

”یہ ٹائی ٹے نِک ان سے ڈوبتے ڈوبتے ہی ڈوبے گا۔“

مسٹر رضوانی سنیئر موسٹ تھے مگر ”ایس سی سی“ ایسے آئی کہ اس نے پہلے والوں کی ایسی کی تیسی کر دِی۔ اُنہیں کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا۔ مسٹر رضوانی اُوپر سے نہ آنے والے بلاوے کا اِنتظار کرتے رہتے۔ اِس عرصے میں کچھ فیصلے ایسے بھی ہوئے جن کے‘ بہ قول مسٹر رضوانی‘ ادارے پر منفی اثرات پڑ سکتے تھے۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ انہیں کانسلٹ کر لیا جاتا تو درست سمت میں سٹیپ لیا جا سکتا تھا۔ اِسی طرح کے مختلف فیصلوں کی خبریں جب تسلسل سے آنے لگیں تو اُنہیں یوں اِگنور کیا جانا نڈھال کرنے لگا۔ اس ادارے کو بنانے میں‘ مسٹر رضوانی کا خیال تھا‘

کہ ان کا بڑا حصہ تھا۔ اور یہ بہت حد تک ٹھیک بھی تھا۔ یہ بھی درست تھا کہ وہ کبھی بھی اتنا غیر اہم نہیں رہے تھے، جتنا کہ اب ہو گئے تھے۔

جب اُنہیں بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا تو انہوں نے ایسے معاملات تلاش کیے جن سے ایم ڈی صاحب کو دِل چسپی ہو سکتی تھی۔ اُن پر رِیاض سے مائیلڈسی پروپوزلز بنوائی گئیں۔ ایم ڈی صاحب کے پی ایس کو معاملے کے اِمپارٹنٹ اور اَرجنٹ ہونے کی یقین دِہانی کرائی گئی اور موقع ملتے ہی ملاقات کر آئے۔

اُن دنوں ریاض کو پہلی بار محسوس ہوا کہ اُس کے باس کو ایم ڈی کی نظروں میں رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اِس ملاقات سے پہلے وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ ملاقات میں نہ جانے اُن پر کیا جادو ہوا کہ وہ سارے اشوز جو پہلے ادارے کے حوالے سے اَرجنٹ نیچر کے تھے، سکینڈری ہو گئے۔ اَب سب سے اَہم مسئلہ یہ تھا کہ اوورسٹافنگ کے کرانک معاملے سے کیسے نمٹا جائے؟ اُوپر پچیس/ پچاس کی تجویز چل رہی تھی یعنی جس نے سروس کے پچیس برس مکمل کر لیے یا اُس کی عمر پچاس برس ہو چکی، اُسے پری میچور ریٹائرمنٹ پر بھیج دِیا جائے۔ وہ نیچے آئے اور آتے ہی ریاض کو کال کر لیا۔

بعد کے کئی گھنٹے وہ پریشان ہو کر کمرے میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور ریاض اِس تناؤ کے ماحول میں مسلسل سوچ کر ایک پروپوزل بناتا رہا۔ مسٹر رضوانی پچیس میں آتے تھے اور پچاس میں بھی۔ فوری طور پر گولڈن ہینڈ شیک سکیم کی چالو سکیم اُس کے ذِہن میں آئی کہ یہی نسخہ ہر ادارے میں آزمایا جا رہا تھا۔ وہ کوئی نئی تجویز نہ دے پانے کی وجہ سے ریاض پر بہت برہم ہوے۔ مگر اسے کچھ اور سوجھ ہی نہ رہا تھا۔ ریاض کو چپ پا کر کہنے لگے:

''چلو اسی کو موو کرتے ہیں مگر اس کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟''

پھر خود ہی اُن کا دھیان ایمپلائیز کے بی ایف کی صرف چلا گیا۔ ریاض نے ڈرتے ڈرتے کہا:

''یہ توسب ایمپلائیز کی امانت ہوتا ہے۔''

کہنے لگے:

''اِس سے صرف برج فنانسنگ ہوگی' بعد میں ڈونرایجنسیز سے معاملات طے پا سکتے ہیں اور بنکوں سے اُدھار بھی تو لیا جا سکتا ہے۔''

اِدھر سے مطمئن ہوکر ریاض کے باس نے پچیس/ پچاس والی متوقع سکیم کی زد میں آنے والے افراد کی ڈیٹیلز منگوائیں۔ کل مین پاور کا نئے سرے سے یوں تخمینہ لگوایا کہ سرپلس سٹاف پہلے سے بھی دُگنا نظر آئے۔ اِس طرح وہ یہ ثابت کرنے کی پوزیشن میں ہوگئے کہ پچیس/ پچاس والی سکیم سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے تھے۔ نوٹ کے آخر میں گولڈن ہینڈ شیک سکیم کو مناسب ثابت کرنے کے پرزور دلائل تھے۔مسٹر رضوانی اوپر گئے اور خُوشی خُوشی پلٹے کہ ایم ڈی صاحب نے اِس سکیم کو بہت پسند کیا تھا۔اس کے باس کا کہنا تھا کہ صاحب تو اِس تجویز کو ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ بوجھ اُتارنے کی سبیل قرار دے رہے تھے۔کل تک جو افرادی قوت اثاثہ تھی' وہ بوجھ بن گئی۔ گولڈن ہینڈ شیک کی تجویز کو مفید قرار دیتے ہوئے اپروول دے دی گئی۔ مسٹر رضوانی ایک بار پھر اَہم ہو گئے تھے کہ ساری سکیم کی امپلی منٹیشن انہیں سونپ دی گئی تھی۔

سکیم اگرچہ اختیاری تھی تاہم اِمپلی منٹیشن کے دورانئے میں ریاض کے باس کی حتیّ الوسع کوشش رہی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اِس سکیم کو آپٹ کرلیں۔جن کے خلاف جھوٹی سچی کمپلینٹس تھیں انہیں دھمکیاں دی گئیں کہ جو کچھ مل رہا ہے لے لو' کہیں اُس سے بھی ہاتھ نہ دھونا پڑیں۔ کچھ کے ذہنوں پر دور دراز تبادلوں کی تلوار لٹکا دِی گئی۔کام سے لگن رَکھنے والے افراد ادارے کے جمود کی وجہ سے مایوس ہو گئے تھے۔ لہذا ہوا یوں کہ اندازے سے زیادہ لوگ چلے گئے۔ سکیم کام یابی سے اِمپلی منٹ ہوگئی تو ریاض کے باس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ خُوش کیوں نہ ہوتے کہ جو اَسائین منٹ اُنہیں دی گئی تھی' وہ بڑی خوبی سے نبھ گئی تھی۔ اور یوں اُنہیں

پھر سے ادارے میں اہم رہے چلے جانے کا قوی یقین ہو چلا تھا۔

ریاض کے نوٹس میں تھا کہ جب مسٹر رضوانی پری میچور ریٹائرمنٹ سے بچنے کے لیے یہ سکیم بنوا رہے تھے تو دراصل یہ سب کچھ وہ اپنے لیے کر رہے تھے۔ اُنہوں نے واضح لفظوں میں کہا تھا:

"سکیم تھرو ہو گئی تو وہ بھی چلے جائیں گے۔"

مسٹر رضوانی سکیم آپٹ کر لیتے تو اُنہیں ٹھیک ٹھاک مالی فائدہ بھی ہوتا۔ مگر اس سکیم کو اِمپلی منٹ کرانے کے عرصے میں اُنہیں ایک مرتبہ پھر اہمیت مل گئی تو وہ گزشتہ کچھ عرصے کے لیے غیر اہم ہو جانے والے اَذِیّت ناک دورانیے کو بھول گئے تھے۔ اِس سکیم کے لانچ ہونے پر ریاض نے بھی ادارے سے الگ ہونے میں عافیت جانی تھی کہ اس کی ماں کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے خیال کے مطابق اسے اس سکیم کے تحت جو کچھ مل رہا تھا وہ اتنا کافی تھا کہ وہ گھر کی بیٹھک میں منیاری کی دُکان کھول سکتا تھا اور جب بھی اسے ماں بلاتی وہ اُس تک پہنچ جاتا۔ جب کہ اَب تو وہ اُس کے لیے نہ ہونے کے برابر تھا۔ ریاض کو مسٹر رضوانی نے روک لیا۔ اس نے آپشن پیپرز اپنے باس کے سامنے رکھے۔ باس نے اُسے سنے بغیر پیپرز چاک کر کے ٹوکری میں پھینک دِیے۔ اُن کا خیال تھا کہ ریاض جیسے لوگوں کو اِس اِدارے میں ضرور رہنا چاہیے۔

اُسے اپنے باس کے اِس طرزِ عمل پر حیرت ہوئی تھی کیوں کہ اب تک وہ بہت بدل چکے تھے۔ نہ صرف بدل چکے تھے ان کا دِل بھی بہت مضبوط ہو گیا تھا۔ مضبوط نہیں کٹھور۔ وہ ریاض کو ایسے عرصے میں روک رہے تھے جس میں انہیں ایم ڈی صاحب کی خوشنودی کے حصول کے سوا سب کچھ بھول گیا تھا۔ ادارہ' ادارے کے لوگ' حتّٰی کہ اَپنی گزشتہ عبادت کی ادائیگی کی طرح سرانجام دی گئی خدمات اور اپنے ذاتی مفادات پر ادارے کو ترجیح دینے کا وتیرہ بھی ...... سب کچھ ...... سب ہی کچھ۔

جب وہ ریاض کے اَہم ہونے کی بات کر رہے تھے تو اگر چہ وہ خود کو بہت ایلی ویٹڈ محسوس کر

رہا تھا مگر یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اَب کوئی بھی کسی ادارے میں اہم ہو سکتا تھا۔ اَب تو ادارے اہم ہو گئے تھے' لوگ اہم نہیں رہے تھے۔ نہیں' یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا' ہائر ڈگنا ٹیز سے تعلق کے سبب اہمیت اختیار کر جانے والی ایس ایس سی بھی تو آدمیوں ہی کی تھی۔ خود ایم ڈی صاحب بھی تو آدمی ہی تھے' جو حکم دیتے یا پھر کوئی بھی حکم نہ دینے کا فیصلہ کرتے' پورا اِدارہ دیمک لگے درخت کی طرح کھوکھلا ہونے لگتا تھا۔

کیا یہ لوگ ادارے سے کہیں زیادہ اہم نہیں ہو گئے تھے؟

جب ریاض کے باس کے بہ جائے خود اسے اوپر بلا لیا گیا تو اُسے تعجب ہوا تھا۔ تاہم تعجب کا مرحلہ جلد ہی گزر کر اُسے ایک نئی آزمائش میں ڈال چکا تھا۔ اُسے بتایا گیا کہ ادارے کی بیٹر منٹ کے لیے ایک مشکل مگر ضروری فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس فیصلے کی روشنی میں اُسے مسٹر رضوانی کو فوراً ریلیو کرنا تھا۔ ریاض کی مجبوری دیکھیے کہ جس طرح اسے مسٹر رضوانی نے روکا تھا' وہ انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ سیکنڈ فیز کے طور پر پچیس/ پچاس والوں کے لیے کمپلسری سیپریشن سکیم متعارف ہو چکی تھی۔ اور اسے صاف صاف بتا دیا گیا تھا کہ کوئی بھی ہمیشہ کے لیے ناگزیر نہیں ہوتا۔

اور ہاں یہ بات تو رہ جاتی ہے کہ ریاض پینتالیس کے پیٹے میں تھا۔

اُس کی ماں سولہویں میں تھی کہ بیاہی گئی تھی۔ اٹھارویں میں وہ پیدا ہوا۔ ساڑھے تین برس کا ہونے تک وہ دو بہنوں کا بھائی ہو چکا تھا۔ اگلے ہی سال یہ بھائی بہنوں سمیت یتیم اور ان کی ماں بیوہ ہو چکی تھی۔ ریاض نے ہوش سنبھالا تو اُس نے ماں کو مشقت ہی کرتے پایا۔ جتنی ماں کی برداشت تھی' ریاض اُتنا پڑھ گیا۔ بڑی جوان ہو گئی تو اُس کی ہمت جواب دے گئی۔ ابھی نوکری نہ ملی تھی کہ بڑی کو رخصت کرنا پڑا۔ پھر ریاض کو نوکری بھی مل گئی مگر اس کی جمع پونجی اتنی نہ تھی کہ منّی کو بیاہ پاتا۔ ماں کڑھتی تھی کہ اُس کی عمر نکلی جا رہی تھی۔ اور جب منّی اس گھر سے مایوس ہو کر خود ہی نکل بھاگی تو ماں ایک اور روگ لے کر مکمل طور پر بستر کی ہو رہی۔ ڈاکٹروں اور

لیبارٹریوں کے پھیرے لگے تو پتہ چلا کہ اُسے تو ملٹی پل مائیلوما ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا' اس کا علاج اس ایڈوانس سٹیج پر ممکن نہیں' بس اِس کی اِذیت کم کی جا سکتی تھی۔

اوہ' میں ریاض کے ذِکر کو کیوں طول دِے بیٹھا کہ یہ کہانی تو ریاض کی ہے ہی نہیں۔ یہ کہانی ریاض جیسے غیراَہم آدمی کی ہو ہی نہیں سکتی۔ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ شاید یہ اس کی ماں کی کہانی ہو گی۔ جب ریاض غیر ضروری آدمی ٹھہرا تو اس کی ماں کیسے اَہم ہو سکتی ہے۔ رہی وہ زمین جو کبھی ماں جیسی ہوتی تھی اب پیسے اور آسائش کے عوض بکنے لگی ہے تو پھر اس کہانی کو اس کا کیسے کہا جا سکتا ہے؟ نہ اس کی' نہ اس جیسا ظرف رکھنے والے کسی ادارے کی۔ میں نہیں جانتا یہ کہانی کس کی ہے؟ اور شاید مجھے اس الجھیڑے میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔ میں تو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اگر ریاض مسٹر رضوانی کو ریلیو کر دِیتا تو اُسے یقینی طور پر دِل کا دورہ پڑ سکتا تھا۔ اور وہ مر بھی سکتا تھا۔ مر جاتا تو ممکن تھا کہ اُس کی شادی کی عمر کو پہنچی بیٹیاں ...... منّی بھی تو ......

آہ کیا اس کی ماں کی اَذیت مرے بغیر کم ہو سکتی تھی؟

ریاض کو سوچتے سوچتے آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اگلے دَس پندرہ منٹ ایک فائل بنانے میں لگے۔ وہ اَپنی نشست سے اُٹھا تو مسٹر رضوانی اُٹھ کر اوپر چلے گئے۔ لگ بھگ تین گھنٹوں کے بعد وہ واپس پلٹے تو ایک لیگل لکونا کے باعث ساری سکیم ڈراپ ہو چکی تھی اور وہ اس لیگل لکونا کے آفٹر افیکٹس سے ادارے کو محفوظ رکھنے کی اسائین منٹ بھی لے چکے تھے جو ریاض کی نااہلی کے سبب اس اکلوتے ڈاکومنٹ میں رہ گیا تھا جس پر ایم ڈی صاحب کے دَست خط تھے۔ اس ڈاکومنٹ کو عدالت میں لے جایا جاتا یا اِسے میڈیا ہی کے حوالے کر دِیا جاتا تو ایم ڈی صاحب بلاوجہ کئی ماہ تک رُسوا ہو سکتے تھے۔

ایم ڈی صاحب کو یقین تھا کہ دَست خط اُن کے نہ تھے مگر ہو بہو اُن ہی کے لگتے تھے۔ وہ شک میں پڑ گئے۔ اُنہیں یاد نہیں آتا تھا کہ کبھی اُنہوں نے اِس ڈاکومنٹ پر دَست خط کیے تھے۔ مگر حیران کُن حد تک اُنہی کے لگتے تھے۔ اور خدشہ تھا کہ وہ آسانی سے ثابت نہیں کر

سکیں گے کہ یہ دست خط انہوں نے نہیں کیے تھے۔ پھر فائل موومنٹ کا ریکارڈ بھی ایسا تھا کہ اس نے انکار کے سارے راستے مسدود کر دیے تھے۔ اسی بند راستے کی نشاندہی کر کے مسٹر رضوانی نے اپنے بچاؤ کا راستہ نکال لیا تھا۔ خود کو بھی اور پچیس/ پچاس والوں کو بھی۔ تاہم ایم ڈی صاحب کا وثوق تھا کہ مسٹر رضوانی نے ادارے سے وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ یوں وہ ادارے کے لیے پھر ناگزیر ہو گئے تھے۔ اور فوراً بعد اہم ہو جانے والے ریاض کے باس نے اس کی نا اہلی پر اسے ٹرمینیٹ کر دیا۔ اپنی ٹرمینیشن کے بعد ریاض باس کو ملنے گیا تو وہ سارا وقت اس سے بھیگی نظریں چھپاتے رہے۔ وقت تھا بھی کتنا؟ وہ بہ مشکل ایک آدھ منٹ ہی تو وہاں کھڑا رہ پایا تھا۔

کئی دِن اُس پر سکتہ سا طاری رہا۔ وُہ کیا کر سکتا تھا؟ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ جو جمع پونجی تھی، ماں کی مہنگی دواؤں کی نذر ہو گئی تھی۔ حتٰی کہ دوائیں بھی ختم ہو گئیں اور وہ مرنے کی بہ جائے سارا سارا دِن اور ساری ساری رات چیخیں مارنے لگی۔

آہ، مرے بغیر کیا اس کی ماں کی اذِیّت کم ہو سکتی تھی؟

وہ سوچتا تھا۔ اور ہر بار ایک نتیجے پر پہنچتا تھا۔ شاید نہیں۔ بل کہ یقیناً نہیں۔ مگر حیلہ تو کیا جا سکتا تھا۔

بس یہ ایک حیلہ ہی تھا کہ وہ مسٹر رضوانی کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ اُسے اتنی مدد چاہیے تھی کہ اذِیّت کم کرنے والی کچھ دوائیں لے آتا۔ وہ رات اُن کے گھر گیا تھا مگر کچھ مانگے بغیر ہی پلٹ آیا کہ ان کا گھر تو برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔

اس نے اپنی ماں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ رات کہاں گیا تھا۔ اور ظاہر ہے یہ بتانے کا بھی اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا کہ رات اس کے سابق باس کی دونوں بیٹیوں کی ڈولی دھوم دَھام سے اُٹھی تھی۔ یہ بات وہ ماں کو بتاتا تو اُسے تکلیف ہوتی۔ تکلیف میں تو وہ پہلے سے تھی مگر اُس کی

تکلیف......بس اُس نے نہیں بتایا۔ ایسا اُس نے شاید قصداً نہیں کیا تھا۔ وہ تو مسٹر رضوانی کی دو بیٹیوں کی باراتیں دِیکھ کر اَپنی ماں کی اَذِیّت بھول گیا تھا۔ اگر چہ وہ باہر گلی ہی سے پلٹ آیا تھا مگر اس کے اَندر قمقموں کی روشنیوں کے سارے رنگ بھر گئے تھے۔

اوراب جب کہ اُس کی ماں درد سے کچھ زیادہ ہی چیخنے لگی ہے تو نہ جانے کیوں اسے یوں لگتا ہے جیسے کوئی آتش بازی کے پٹاخے اوراَنار چھوڑ رہا ہو۔ ماں کی ہر چیخ پرایک اور قمقمہ روشن ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ صاف صاف دیکھنے لگا ہے کہ باہر دروازے پر ایک بارات پہنچ چکی ہے۔ اس کی ماں موت کے شکنجے میں کراہتی ہے۔ وہ ماں کو دیکھتا ہے۔ دیکھتا رہتا ہے۔ پہلے وہ اُس کی اَذِیّت پر کڑھتا تھا مگر اَب اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ وہ خالی الذہن ہو جاتا ہے۔ کوئی ادارہ، کوئی ماں جیسی زمین، بھاگ جانے والی مٹّی، چیختی چلاتی ماں۔ کچھ بھی تو اس کے ذہن میں نہیں رہا۔ وہ سب چیخیں سن سکتا ہے۔سن رہا ہے۔ مگراس کے بدن کے اندر عین دِل کے بیچ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ماں کی آواز بدل رہی ہے۔ یوں، جیسے قوی الجثہ موت اُس کے نحیف بدن پر چڑھ بیٹھی ہو۔ مگر وہ بڑی سہولت سے اَپنا منہ پھیر لیتا ہے کہ اَب اُس کا وجود اس سارے ماحول سے ہم آہنگ ہو گیا ہے اوراُسے موت کے بوجھ تلے ماں کی چٹختی ہڈیوں کی آوازیں چلتی سانسوں کی سی لگنے لگی ہیں۔

بُھر کَس کہانیوں کا اَندوختہ آدمی

اِدھر' یہاں میں ایک ایسے ریٹائرڈ شخص کے بارے میں گمان باندھنا چاہوں جسے اَپنے بیوی بچوں سے محبت ہو' جسے وہ بھی چاہتے ہوں مگر وہ اُن سے اِس خیال سے الگ رہے کہ یوں زیادہ سہولت سے رہا جا سکتا ہے اور خُوش بھی۔ یقین جانیے' مجھ سے ایسا گمان باندھنا ممکن نہیں رہتا۔ جس ماحول میں' مَیں پلا بڑھا ہوں اور جس ماحول میں میری نفسیات مرتب ہوئی ہیں' اُن میں بس ایسے گھر کا ہی تصور موجود ہے؛ جو محبت بھری آوازوں اور چہکار سے لبالب بھرا رہتا ہے۔

جس میں خوب کھینچا تانی اور تُو تکار ممکن ہے۔ جس میں دوسروں پر اپنا اپنا حق جتلایا جاتا ہے' حق دِیا جاتا ہے اور لیا جاتا ہے۔ میرے گمان میں ایک کام یاب ریٹائرڈ آدمی وہی ہے جو بعد میں ایک بادشاہ کی طرح گھر کا سربراہ رہے' چاہے علامتی طور پر سہی۔

اور جو ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی بیوی سے اور بچوں سے الگ ہو رہتا ہے' اِس خیال سے کہ یوں خُوش رہا جا سکتا ہے' اِسے میری نفسیات کی کجی کہیے کہ میں ایسے بوڑھے شخص کو خبطی سمجھنے لگتا ہوں۔ سترا بہترا۔ یا اس کے بیوی بچوں میں نافرمانی اور ناخلفی کے آثار تلاش کر کے اُنہیں دوزخ کا ایندھن باندھنے والا گردانے لگتا ہوں۔

مگر یوں ہے کہ چالیس' بیالیس سال پہلے' اُدھر سات سمندر پار جانے والا ایک شخص ایسا بھی ہے جس نے اِسی چلن کو وتیرہ کر لیا ہے اور میری نفسیات کو تہ و بالا کر کے مجھے یقین بھی دِلا دِیا ہے کہ یوں خُوش رہا جا سکتا ہے۔

جی' میں کسی اور شخص کی بات نہیں کر رہا' اُس کی بات کر رہا ہوں جو کہیں اَب آ کر مجھ پر رَفتہ رَفتہ کُھل رہا ہے' یوں جیسے آپ ایک ایسی خوب صورت مجلد کتاب کو دِیکھتے ہوں جس کے سارے ہی اوراق سادہ رہ گئے تھے یا اس میں کہیں کوئی تحریر ہے بھی تو اِتنی بے ضرر کہ آپ اُسے پڑھتے ہیں تو آپ کے اَندر کوئی اُتھل پُتھل نہیں ہوتی۔ دِل جہاں ہوتا ہے' عین وہیں رہتا ہے۔ نگاہیں سطروں کے عقب میں جھانکنے کو بے قابو نہیں ہوتیں کہ جو کچھ ہے سامنے دَھرا ہے' اُس منظر کی طرح جسے آپ روز دیکھتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ کل رَات تک میں اُسے یوں ہی بے ضرر اور سیدھا سادا آدمی دیکھتا اور سمجھتا رہا ہوں۔ کچھ سال پہلے اُس نے جب مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ اُدھر باہر اکیلا رہتا ہے' اور خُوش رہتا ہے۔ نہ صرف مطمئن ہے' اُس کی بیوی اور بچے بھی یوں رہنے پر خُوش ہیں' تو یوں ہے کہ پہلے پہل میں بوکھلا ہی گیا تھا۔ مگر جب وہ اَپنی بات کہہ کر اُٹھا تھا اور میں نے پلٹ کر صوفے کے اُس خالی حصے کو دیکھا تھا' جہاں کچھ دِیر پہلے وہ بیٹھا ہوا تھا تو مجھے وہاں سے ایک مستغنی اور مطمئن

شخص کی مہکار اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

وہ اِس عرصے میں لکھنے لگا تھا۔ جاتے جاتے مجھے اپنی دونئی کتابیں تھماتا گیا۔ ایک میں بقول اس کے کہانیاں تھیں اور دوسری میں ہائیڈ پارک کی دُنیا بسی ہوئی تھی۔

پہلے میں نے اُس کی یادداشتوں کی کتاب پڑھی اور پھر دوسری کتاب کی چند اِبتدائی کہانیاں۔ مجھے دونوں کا ذائقہ ایک سا لگا۔ یادداشتوں کو کہانی کی طرح بنادِیا گیا تھا جب کہ کہانیوں کے متن سے یادداشتیں جھلک دے رہی تھیں۔ میں نے ان تحریروں سے اُسے سمجھنا چاہا تو وہ ویسے کا ویسا ہی رہا' جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ ایئر پورٹ کے قریب' اپنی بیوی سے الگ اور اپنے بیٹے اور بیٹی سے دور' چھوٹے سے گھر میں اکیلا' مگر خُوش رہنے والا۔ اپنی کتابوں کے ساتھ' بل کہ ان کے نشے اور ترنگ میں یا پھر چیزوں پر' دیواروں اور دروازوں پر یہاں وہاں سے گرد کے ذرّے ڈُھونڈ ڈُھونڈ کر انہیں جھاڑنے اور اِس مصروفیت سے اُوب کر کچن میں گھس جانے والا اور وہاں پہروں وہیں گزار دینے والا۔

پہلی کتاب میں دوسری کتاب کا متن ملانے کے بعد میں جان گیا ہوں کہ وہ ہیز مڈل سیکس سے ہائیڈ پارک کی طرف تواتر سے نکلتا رہتا ہے۔ وہ لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر' کچھ بس میں اور کچھ ٹیوب میں کرتا ہے۔ اور یہ سفر محض اس لیے کرتا ہے کہ اُسے وہاں سرپن ٹائن جھیل تک جانا ہوتا ہے۔ اپنی مخصوص جگہ ڈیک چیئر پر اپنے طریقے سے بیٹھنے کے لیے۔ وہ اِدھر اُدھر چائے کے تھرمس اور کھانے پینے کی اشیا کو سلیقے سے رکھ کر اپنے بیگ سے رائٹنگ پیڈ' قلم اور کیمرے کو نکال کر یوں بیٹھ جاتا ہے جیسے مچھلیوں کا کوئی شکاری پانی میں کانٹا ڈال کر بیٹھ جایا کرتا ہے۔

یہ جو میں نے کانٹا لگا کر بیٹھنے کی بات کی ہے تو یوں ہے کہ اُسے وہاں اجنبی اور سیاح لوگوں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ بل کہ مجھے صاف صاف کہنا چاہیے کہ فی الاصل اُسے بات نوجوان سیاح لڑکیوں ہی سے کرنا ہوتی ہے۔ افریقی لڑکیاں ہوں یا فلپینو' ایرانی ہوں یا چینی' سویڈیش' پولش' عراقی' اٹالین یا کویتی لڑکیاں اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' کہ وہ سب سے ملتا ہے۔ کوئی

دُبلی پتلی اور اُونچے قد والی ہوتی ہے تو کوئی بھرے ہوے جسم اور چمکتی تنی ہوئی جلد والی' کسی کو اُنگریزی نہیں آتی' کسی کو ملازمت نہیں مل رہی' کسی کو اس کا چاہنے والا چھوڑ گیا ہے؛ وہ سب سے ملتا۔ لگ بھگ ہر بار یوں ہوتا کہ اُسے ہی بات کو آغاز دِینا ہوتا ہے۔

اِس معاملے میں عمر بھر کا تجربہ اس کے پاس ہے۔وہ یہ گر بھی سیکھ چکا ہے کہ اُسے کسی کی توجہ کیسے حاصل کرنا ہوتی ہے۔ ایک بار بات شروع ہو جاتی تو وہ چاہتا ہے کہ اس ملاقات میں سے ایک اور ملاقات کو نکالا جائے۔ اِس کا حیلہ اُس نے پہلے سے کر رکھا ہوتا ہے۔ اُس کے پاس ایک کیمرہ ہوتا ہے' بقول اُس کے ڈسپوزایبل کیمرہ۔ وہ چاہتا ہے کہ دوسرا زوم لینز والا اور اعلیٰ کوالٹی کا کیمرہ رکھے مگر اس نے اس سستے کیمرہ کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ کوئی تصویر بنانے پر برہم ہو جائے اور کیمرہ چھین لے تو نقصان پی جانے کی حد میں رہے۔

جب اِتنے جتن سے ایک بار بات شروع ہو جاتی ہے تو وہ ہمت کر کے اُن کی تصویریں بھی لے ہی لیتا ہے۔ جو اسے پتا لکھوا دیتی ہیں انہیں ان کی تصویریں پوسٹ کر دی جاتیں اور جس سے یہ ایک بار پھر ملنا چاہتا ہے' اسے ٹیلی فون کر کے بتاتا ہے؛ وہ اُس کی تصویریں لے کر فلاں دِن اور فلاں وقت پر ہائیڈ پارک پہنچے گا۔ آؤ' ملو اور لے جاؤ۔

یہ لڑکیاں' یہ جوان لڑکیاں' یہ یہودی' عیسائی' لادین لڑکیاں سب تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا وقت بانٹ لیتی ہیں۔

ان میں سے ایک تو ایسی ہے جس نے لگتا ہے اس کا دِل ہی اُچک لیا ہے۔

اگر میں اُس کی تحریروں کو اس کے کیمرے سے لی گئی تصویروں سے جوڑنے میں کوئی غلطی نہیں کر رہا تو دِل مٹھی میں لینے والی ہائیڈ پارک میں اُسے ملنے والی یہ وہی چینی شہزادی ہے جس کی تصویر دکھاتے ہوے اس کے گالوں میں تھرتھری سی دوڑ گئی تھی۔اس نے اس تصویر کو اَپنی کتاب کے فلیپ کی زینت بھی بنا دیا ہے۔

جب تک تصویر میرے ہاتھ میں رہی' وہ ایک الگ سی کیفیت میں رہا۔ایک لطف کے

اِحساس کے ساتھ وہ مجھے اِطلاع دے رہا تھا کہ اسے ڈھنگ سے انگریزی نہیں آتی تھی۔ یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی اور نہ ہی اس خبر میں اس لطف کو تلاش کر پایا تھا جس کے مطابق ناقص انگریزی کی وجہ سے اسے وہاں نوکری نہیں مل رہی تھی۔ جس لڑکی کا قصہ سنایا جا رہا تھا وہ دل برداشتہ تھی مگر کہانی سنانے والا اُس کے دُکھ سے کہیں زیادہ ایک لڑکی کی تصویر سے اُٹھتی اُس عجب سی مہک سے جڑا ہوا تھا' جس کا بہ ظاہر کوئی وجود نہ تھا مگر وہ وہاں سارے میں تھی۔ کچھ اس طرح جیسے وہاں اس لڑکی کی تصویر نہ تھی اس کا زندہ وجود تھا' مہکتا ہوا۔

مجھے اس لڑکی سے ایک دل چسپی سی ہو چلی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے اس کی کتاب میں اس لڑکی کا ذِکر تلاش کر لیا۔ اور ایسا جملہ بھی جس کے مطابق وہ دُنیا کی حسین ترین لڑکی تھی۔ میں نے کتاب کے فلیپ والی تصویر کو ایک بار پھر دیکھا۔ پھینی ناک' قدرے چوڑی پیشانی' اُبھرے ہوئے گال' جو آنکھوں تک اچھل کر انہیں دبا رہے تھے۔ یقیناً اس لڑکی کا رنگ گورا ہو گا مگر کیا اسے حسین لڑکی کہا جا سکتا تھا؟

میں بہت دیر تصویر دیکھتا رہا حتّٰی کہ مخمصے میں پڑ گیا۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ اس کی کہانیاں اور یادداشتیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں اور دونوں اسے ایک بے ضرر انسان کی صورت دیتی ہیں' سوائے اس مقام کے' جہاں وہ پھینی ناک اور اچھلتے گالوں والی دنیا کی حسین ترین لڑکی بن جاتی ہے۔

میں نے اس کی چند ابتدائی کہانیوں کو پڑھ کر کتاب ایک طرف رکھ دی تھی۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ میری بیوی کہانیوں کی یہ کتاب اُٹھائے اُٹھائے میرے پاس آئی اور ایک شوخ سی ہنسی کے فوارے کو بہ مشکل ہونٹوں پر روکتے ہوئے کتاب کے دو تہائی اوراق دائیں ہاتھ پر اُلٹاتے ہوئے پوچھا:

''کیا تم نے یہ کہانی پڑھی ہے؟''

میں نے کتاب کی طرف دیکھے بغیر اُس سے پوچھا:

''کون سی کہانی؟''

''ارے بابا یہ۔''

اُس نے کتاب میری آنکھوں کے سامنے اُچھال کر سامنے رکھ دی۔ میرے سامنے اس کا افسانہ ''سہاگ رات'' پڑا ہوا تھا۔ اس افسانے تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے اُوب کر کتاب بند کر دی تھی۔ میں نے اُس کی جتنی بھی کہانیاں پڑھیں' لگ بھگ ہر کہانی میں وہ واقعات کو ایک شریف آدمی کی طرح ایک عام سی ترتیب میں بیان کرتا نظر آیا۔ میں نے اس کہانی پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے انتہائی بے ضرر آدمی قرار دے ڈالا تھا۔ ایسا بے ضرر آدمی' جو واقعات تو لکھ سکتا تھا اور شریفانہ کہانیاں بھی' مگر وہ انہیں تخلیق پارے نہیں بنا سکتا تھا۔ شریفانہ کہانیوں میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ پڑھتے ہی کُھل جاتی ہیں۔ اِس قبیل کی ایک سی کہانیوں کو پڑھتے چلے جانا' بتاشوں کے بعد کھانڈ کھانے کے مترادف تھا۔ تاہم میری بیوی کے پیٹ سے ہنسی کا فوارا چھوٹا تو میں اس کہانی کو پڑھنے کی طرف مائل ہو گیا۔

کہانی کے آغاز ہی میں بتا دیا گیا کہ یہ ایک ایسے خان کی کہانی ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ جو بہت شریف تھا اتنا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اسے اچھے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِسے میری محسوسات کا شاخسانہ سمجھئے یا پھر کہانی کے اسلوب کا معاملہ کہ میں کہانی کے خان کو کہانی کے مُصنف کے وجود کا حصہ سمجھنے لگا تھا۔ اس افسانے میں خان کی جوانی کا قصہ ایک راوی کی زبانی بیان کیا گیا تھا۔ کہانی کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ راوی نے خان کو طیش اور ترنگ میں لا کر یہ قصہ کہہ ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا تاہم خان نے اَپنی کہانی سنانے سے پہلے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ لوگ اگرچہ یہ سمجھتے رہے ہیں کہ وہ اَپنی مردانہ کمزوری کی وجہ سے شادی نہیں کر رہا مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ لوگ غلط قیاس لگاتے تھے۔ مصنف نے یہ جملہ اس اہتمام اور ایسے ڈھنگ سے لکھا تھا کہ پڑھتے ہوئے ذہن نشین رہتا تھا۔

اس کے بعد کہانی طوائف کے کوٹھے تک پہنچنے میں دو دن لگاتی ہے۔ وہاں پہنچ کر رُکتی نہیں

کہ اسے خان جی کو مرد ثابت کرنے کے لیے بقول افسانہ نگار ''وہ کام'' بھی کرنا پڑتا ہے۔ کہانی میں کئی ایسے موڑ آئے جن کو اِختصار کے پردے میں چھپایا جا سکتا تھا مگر طول نویسی کی ہوس میں مبتلا یہ لکھنے والا سب کچھ کھول کھول کر بیان کرتا چلا گیا ہے۔

اب مجھے اَپنی بیوی کے ہنسے چلے جانے کی وجہ سمجھ آ گئی ہے۔

جب یہ کہانی لکھنے والا مجھے ملنے آیا تھا تو وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر اُس سے اُس کی زِندگی کے دل چسپ قصے سنتی رہی تھی۔ اسی نشست میں اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اُس کی پہلی شادی یہاں اپنے وطن میں ہوئی تھی۔ جب دلہن کو لے کر بارات واپس آ رہی تھی تو اُسے برقعے میں سر سے ٹخنوں تک لپٹی دلہن کی سرخ جوتیوں سے جھلکتے گورے گورے پاؤں دیکھ کر یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ باقی لوگ بھی اس کے پاؤں دیکھ رہے ہوں گے۔ میری بیوی نے یہ سنا تو ہنس کر کہا تھا:

''ہماری مائیں بھی کچھ اسی طرح دلہن بنی تھیں۔''

میری بیوی کی بات سن کر وہ ہنس پڑا تھا اور بتایا:

''اب میری دوسری بیوی جاب کرتی ہے۔ میری بیٹی بھی خود کفیل ہے۔ پہلے پہل وہ رات دیر سے آیا کرتی تھی تو میں پریشان ہو جایا کرتا تھا' مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ اُن کی اَپنی زِندگی ہے اور میری اَپنی۔''

لگتا ہے میری بیوی بھی میری طرح اُسے بے ضرر آدمی سمجھتی رہی ہے۔ تبدیل ہوتی دنیا کے ساتھ بدل جانے والا آدمی۔ بدل جانے والے اپنوں کے لیے اَپنی محبت اور اپنے جذبے سرنڈر کرنے والا۔ تو یوں ہے کہ اس کوٹھے والی کہانی کے بعد ہم دونوں کے لیے وہ آدمی جو بے ضرر تھا' بے ضرر اور ٹھس نہ رہا تھا۔

اسے میری محسوسات کا شاخسانہ کہیے کہ اس میں موجود تبدیل ہو چکے آدمی کے ساتھ ہی اس کی کہانیوں اور یادداشتوں نے بھی اَپنی جون بدل لی ہے۔ اب ہائیڈ پارک کی لڑکیاں صرف وقت گزاری کا حیلہ نہیں ہیں۔ اس کی ایک کہانی' جس کا عنوان ''رانی'' رکھا گیا ہے' مجھے بتا رہی

ہے کہ میاں بیوی کی محبت کا تقاضا کیا ہوتا ہے۔ یہی کہ وہ ایک دوسرے کو محسوس کریں اور پاس پاس رہیں۔ ایک اور کہانی میں بیٹی کو ایسی زنجیر بنی رہنے کا مشورہ دِیا گیا ہے جو ماں باپ کو جوڑنے کا کام سرانجام دیتی رہے۔ کچھ کہانیاں چھوڑ کر ایک ایسی کہانی آتی ہے جس میں منھ پھٹ اور تلخ لڑکیوں کو سمجھایا گیا ہے کہ کوئی بزرگ اَپنی تنہائی بانٹنے کے لیے اُن کے پاس آئے تو انہیں اَپنی تلخیوں کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے۔ خاندانی ڈھانچے' نامی کہانی میں اس خاندانی نظام کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس میں ایک دوسرے کو خُوش رکھنے کے لیے قربانیاں دے چلے جانے کی روایت ملتی ہے۔

لیجئے' میری بیوی نے مجھے ایک ایسی کہانی پڑھادِی ہے کہ اَپنی بیوی بچوں کی خُوشی کے لیے ان سے الگ رہنے والا آدمی کہیں پیچھے رہ گیا ہے اور ایک ایسا شخص میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہے جو زِندگی اور اپنوں سے مل بیٹھنے کی تاہنگ سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ بالکل ویسا ہی' جیسا کہ' میری اَپنی حسی تربیت نے بالعموم رشتوں میں بہت اندر تک جڑے ہوے تہذیبی آدمی کا ہیولا بنا رکھا ہے۔

تو پھر وہ بااعتماد اور آزاد آدمی کہاں ہے جو ادھر ہائیڈ پارک میں تھا۔ رنگ رنگ کی جواں سال لڑکیوں سے چُہلیں کرنے والا اور اُن کے بدنوں کی خُوشبو سے اَپنی سانسوں میں مہکار بھرنے والا۔ اس پر تو وہ آدمی حاوی ہو گیا ہے جس کی برقعے میں لپٹی دُلہن کی جوتیوں سے جھلکتی جلد اُسے بے چین کرتی تھی۔ قدم قدم پر رشتے تلاش کرنے والا قدیم اور متروک آدمی۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ آدمی ایک مدت سے وہاں تھا۔ چوں کہ یہ کوئی کہانی نہیں ہے لہذا اس میں قباحت نہیں ہے کہ آخر میں ایک سوال رکھ دِیا جائے اور وہ سوال یہ ہے کہ اگر آج کا آدمی مکمل طور پر ان رشتوں سے اندر سے بھی کٹ گیا جنہیں وہ باہر تلاش کرتا پھر رہا ہے تو پھر کہانی کا چلن کیسا ہو جائے گا؟

جنریشن گیپ

☆ اُٹھنی سوہنیے
تیرا ویر ویاہیا

== اَری چھوڑ، کھیل لینے دِے ان بچوں کو، تو ڈال پٹھے مشین میں۔ میں مشین گیڑ رہا ہوں اور تو بچوں میں گم ہے۔ بڈھی گھوڑی لال لگام۔ جی چاہتا ہوگا اُن میں گھمن گھیری ڈالو۔ اَری چھوڑ بھی۔ خالی مشین کے ٹوکے گھرڑ گھرڑ کر رہے ہیں۔ دِے پٹھّے مشین میں۔ کُترا نہ ہوگا تو بارہ بے جان جی ہمارے کھونٹوں سے بندھے بندھے بے جان ہوجائیں گے۔

:×: اے ہے، بس بس، یوں ہی بولے جا رہے ہو۔ مشین کم اور زبان زیادہ گیڑتے ہو تم بھی۔ میں تو بچیوں کے اکھروں پر سوچ رہی تھی۔

اُٹھ نی سوہنیے، تیرا ویر ویاہیا

دیکھو تو سہی، سوہنی کس پھُرتی سے اُٹھی ہے۔ اور کیسے مزے میں مسکرا رہی ہے۔

== اری چھوڑ چھوڑ۔ وہ تو بچیاں ہیں۔ کھیل کھیل میں خُوش نہ ہوں گی تو اور کیا کریں گی؟ تو ڈال پٹھّے مشین میں۔

:×: پوری بات تو سن لیا کرو۔ میں سوچتی ہوں اب بیٹے کا گھر بسانا چاہیے۔ میری ہڈیاں تو کھوکھلی ہو چلیں۔ کمر میں روز روز کا درد اور اُوپر نامراد کھانسی۔ بسا لے بیٹے کا گھر۔ اَرے لے آ بہو۔ میں بھی تو کچھ روز سکھ کا سانس لوں۔

☆ وڈّے لاہوروں آیا تتر

تترے کیتی بھیڑ لڑائی

چم چڑی چھڑاون آئی

چم چڑی نوں لگا ڈنڈا

نکل وے توں رام چندا

== اری اوُ سن رہی ہے اب تو بھی بچیوں کو؟

:×: ہاں سن رہی ہوں۔

== سکھ کے تانے میں دُکھ کا بانا مت ڈال۔

:×: تو کب سنے گا میری۔ بس اَپنی کہے گا۔

== اَچھا اَچھا سن لیا۔

:×: پھر مان بھی لے نا۔

== اچھا مان لیا۔

:×: تو کرو گے بات بیٹے سے؟

== ہاں ہاں کروں گا۔ اب ڈال پٹھے مشین میں۔

:×: یہ لے۔ ہمت کر۔ زور سے گیڑ۔ اور لے۔

== بس کر' بس کر۔ اب بس بھی کر۔ سمیٹ کُترا' رکھ چھپر تلے اور چل ڈیرے۔ ڈال مدہانی ڈولے میں۔ بلو ایسی لسّی کہ تھکن دور ہو۔

:×: تو پھر میں چلی۔ آ جانا تم بھی۔ اللہ بیلی!

== اللہ بیلی!

X

== ارے او حرام خور' کہاں ہے تو؟

++ حاضر ہوں سرکار۔

== حقہ لا اِدھر۔

++ ابھی لایا سرکار۔

== ارے لے بھی آ' خوب تازہ کرنا اُسے۔

++ آ......آ......آ......آے یہ لیں سرکار۔ ابھی تازہ کیا ہے چو بچے میں۔

== ارے بک تو نہیں رہا؟

++ نہیں سرکار...... بگّی جوڑی ابھی باندھی ہے رہٹ میں' محض حقہ تازہ کرنے کو۔ ماہل کی ٹینڈوں کا جب باسی پانی پڑچھے سے ہوتا' چو بچے سے بہہ چکا' تب رَکھا تھا حقہ پانی کی دھار تلے۔

== اچھا کیا۔

++ یہ لیں سرکار' خود دیکھ لیں۔ تمبا کو بھرا ہوا ہے ہِو یچے میں اور تیلی بھی دکھا دی ہے میں نے۔

== ارے او کم ذات' تازہ چلم کو پہلے منہ مت مارا کر۔

++ کیوں کر جوٹھا کرنے لگا سرکار کی چلم؟۔ وہ......تو......جی' میں نے سوچا' ذرا پانی کا سوداہی چکھ لوں' سرکار کے موافق ہے بھی یا......

== رہنے دے' رہنے دے۔ بڑا آیا ہم درد۔

جا سوہے کو چھپّر تلے باندھ' دھوپ میں بیٹھا ہونک رہا ہے۔ بگّی جوڑی کھول' تھک گئی ہوگی۔ چٹے متھے والے کے ساتھ ڈبے کو باندھ رہٹ میں' دونوں کھا کھا کر پھیل رہے ہیں۔ ذرا دھوپ ڈھلے تو اس پیلی میں ہل چلا دینا۔ لم سنگھا اور بھورا سوہنا قدم اُٹھاتے ہیں ہل کے آگے۔ اِدھر سے فارغ ہو کر ساتھ والی پیلی میں سہاگہ پھیر دینا اور......

X

(حد ہو گئی بابا' اُدھر ماں ہے کہ چھنّے میں چھاچھ ڈالے سو پھیرے ڈال چکی ہے دروازے تک۔ آنکھوں پر ہاتھ کی چھاؤں کر کے بار بار ٹٹولتی ہے راستے کو۔ اور ادھر آپ ابھی تک اپنے دھندے میں پھنسے ہوئے ہیں۔

== اوہ' ابھی جاتا ہوں بیٹا

مگر تمہارے کندھے پر یہ بیگ؟

(میں شہر جا رہا ہوں بابا۔ ماں کہتی تھی بابا کے ساتھ کھانا کھا کے شہر جانا لیکن مجھے پتا تھا آپ اُپنی زمینوں اور بیلوں میں الجھے ہوئے ہوں گے'اس لیے کھانا کھا کے آیا ہوں۔ اور اب اِدھر سے ہی سیدھا شہر جا رہا ہوں۔

== مگر بیٹے؟

(اچھا میں چلا۔

== خدا حافظ' مگر بات تو سن لیتے؟

تم پر اُٹھتی جوانی ہے۔ برسات میں سیلاب کے پانی اور اُٹھتی جوانی کے پاس ٹھہراؤ کہاں؟ تم تو میرے ساوے سے بھی زیادہ اُتھرے ہو۔

ٹھہر جاتے تو میرے سینے پر تمہاری ماں کے ساتھ کیے گئے وعدے کا ایک بوجھ تھا' اُتار دیتا......مگر تم تو جا بھی چکے۔

++ سرکار۔

== ہونہہ؟

++ مَا شاءَ اللہ اکلوتی اولاد ہے آپ کی۔ لائق ہے۔ ولایت سے بھی آیا ہے پڑھ کے۔ سات کلے لگا دیے آپ نے اس کی پڑھائی پر۔ اور اب سنا ہے افسری بھی مل گئی ہے چھوٹے سرکار کو۔ جب دفتر جانے لگیں گے تو خوب ٹھاٹھ ہوں گے۔ بنگلہ' گاڑی' نوکر چاکر اور پنڈ جتنے لوگ حکم کے پابند۔ پھر کیوں دُکھی ہو جاتے ہیں آپ چھوٹے سرکار کو دیکھ کر؟ خُوش ہوا کریں جی خُوش۔

== خُوش کون نہیں ہونا چاہتا پگلے؟ لیکن خُوشی کوئی چولا تو نہیں ہوتا نا' جب چاہا پہن لیا۔ یہ تو بس اندر سے پھوٹے تو پھوٹے۔ اور میرے اندر کہیں نہ کہیں گڑ بڑ ہے۔ کوئی گھپلا ہو گیا ہے کہیں۔ تار ڈِھیلے ہوں تو لاکھ مشاق اُنگلیاں مہمیز کریں' من بھایا سُر نہیں چھڑتا۔

++ مگر سرکار' آپ کو کاہے کا غم؟ آپ سب کے لیے اچھا سوچتے ہیں' اس لیے سب ہی آپ کے لیے اچھا سوچتے ہیں۔ دانہ کپڑا چوکھا۔ سونا اگلتی زمین۔ اور سوہنے بیلوں کی چھ جوڑیاں۔ اپنا گھر۔ اور گھرہستن ایسی کہ سرکار پرواری واری۔ گھبرو پُتّر۔ وہ بھی چنگا بھلا لکھا پڑھا۔

اور پھر ایسا افسر لگنے والا کہ پنڈ جتنے لوکی اِشارے کے منتظر۔

== تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ اصولاً مجھے کوئی دُکھ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن میں نے کہا نا' کوئی نہ کوئی تار ڈھیلا ہے۔ اور جب میرا بیٹا سامنے آتا ہے تب تو یہ احساس کچھ اور گہرا ہو جاتا ہے۔

++ نہ سوچا کریں ایسا سرکار۔ نئی نسل تھوڑی سی بے فکری ضرور ہے مگر ہے بہت با سمجھ' عقل والی۔ بڑے بڑے فیصلے کرنے والی۔

ایسے فیصلے جو حیرت کی خیرات بانٹتے ہیں۔

== اسی بات کا خوف ہے نا' اسی بات کا۔ آج تک اُس نے مجھے موقع نہ دیا کہ میں یہ جان سکوں' اس کے دِل میں کیا ہے؟ نہ اس نے کوشش کی' مجھے اندر سے ٹٹول سکے۔ وہ بند مٹھی کی طرح ہے اور میں بند کمرے کی طرح۔ وہ کسی آن کھلتا ہی نہیں اور میرا در کوئی کھولتا ہی نہیں۔ بگولے کی طرح آتا ہے میرے سامنے......اور......پھر یہ جا وہ جا۔ میں تو لفظوں کو تولتا ہی رہ جاتا ہوں یوں ہی بس۔

++ نہ سوچیں سرکار۔ دِل چھوٹا مت کریں۔ سب وہم ہے جی سب وہم۔

== اللہ کرے ایسا ہو۔ اچھا میں چلا۔ ذرا دھیان سے رہنا' تگڑے ہو کر۔ کالے تھم والے کی پیٹھ مل دینا اور تیل دے دینا چکلی جوڑے کو' گھیں گھیں کر رہی ہے کب سے۔ لے میں چلا۔ ہوشیار ہو جا۔

X

== لے آ نیک بختے لسی روٹی۔

:×: آ گئے؟ کتنی دیر لگا دی۔ کب سے دیکھ رہی ہوں راہ۔ اور......ر......بات کی بیٹے سے؟

== ....

:×: ارے چپ کیوں ہو؟ بولو تو۔ مگر تم کیوں کرو گے بات۔ تمہیں کاہے کی فکر؟ دیواروں سے باتیں کر کے میں باؤلی ہو رہی ہوں تو تمہیں کیا؟ میرا دِل کرتا ہے' اس آنگن میں بہو آئے۔ میرے پاس بیٹھے۔ میرے سر میں تیل ڈالے' کنگھی کرے اور میٹھی باتوں کا مرہم رکھے۔ صحن میں بچوں کی کلکاریاں گونجیں۔ وہ دوڑیں' چیخیں' شور مچائیں' شرارتیں کریں۔ میں اُنہیں روکوں' جھڑکوں' پیار کروں' دِلا سے دوں۔ مگر تم؟ تم تو درجن بھر بیلوں کے ساتھ خُوش ہو۔ جی گھبراتا ہے تو بیل ہانک کر کبھی اس پنڈ اور کبھی اُس پنڈ۔ کہ روز بیلوں کے جلسے اور میلے ہوتے ہیں چاروں طرف۔ مقابلے میں بھاگتے بیلوں میں تمہاری خُوشی چھپی ہوئی ہے۔ اور جو میں چاہتی ہوں تم احساس کی اس سطح کو چھونا بھی نہیں چاہتے۔

== چپ ہو جا نیک بخت۔ چپ ہو جا۔

:×: جب پورے پندرہ ورہے گزر گئے تھے ہماری شادی کو۔ اور میرے کوکھ بنجر زمین کی طرح بے آباد تھی۔ تم بات بات پر جھنجھنا اٹھتے تھے۔ تب بھی میں چپ تھی۔ پھر جب اُمید بندھی تھی تو ایک سرشاری سی میرے پہلو میں سرسرائی تھی۔ جیون کی لذّت کا ایسا بھرا ہوا چھتا میں نے پہلے نہ پیا تھا۔ وقت کو جیسے کونج کے پر لگ گئے تھے۔ جب وہ شہر پڑھنے گیا تھا تو مجھے لگا تھا' میرے ہاتھوں سے جیون کا لذّت بھرا چھتا پھسل گیا ہے۔ پھر وہ وہاں سے ولایت گیا پڑھنے کو۔ اور جب واپس آیا تو خبر سنائی کہ شہر میں اچھی نوکری مل گئی ہے۔ انتظار کے تتے توے پر میری ایک ایک بوٹی دھری ہوئی ہے۔ کی ہوتی نا...... بات اس سے۔

== چپ کر نیک بختے' چپ کر۔ اپنا من نہ کھول۔ آنے والے وقت کی چاپ سن۔

:×: مگر حرج کیا ہے بات کرنے میں؟ اس سے پہلے کہ وہ شہر کے دھندوں میں ایسے پھنس جائے جیسے تم اپنے بیلوں میں پھنسے ہوئے ہو' میرے پاس میرے بہو چھوڑ جائے۔ میں اس میں اس کی مہک تلاش کروں گی۔

== دِیکھ آس کا دامن اتنا مت پھیلا۔ خواہش کی ڈور اتنی دراز نہ کر۔ ٹوٹی آس اور ڈوبی خواہش پر رونا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ مٹی کی باس جس کے قدم نہ تھامے' تیرے میرے لہو کی خُوشبو جس کے نتھنوں میں گھسے' مگر چہرہ کھڈی پر چڑھی کھدر کی طرح تنا رہے۔ جو کچی دیواروں کے سائے میں ٹک کر نہ بیٹھ سکے اور پکے بنگلوں' لمبی لمبی گاڑیوں کے سپنوں میں ایسا گم ہو جائے کہ اسے ماں باپ کے من کی پوٹ کھولنے کا خیال تک نہ رہے' اس کے کھونٹے سے امید کا بیل مت باندھ۔

:×: ہاں تم سچ کہتے ہو۔ پر...... پر اپنا من تو نہ مانے نا۔ من کا علاج کر۔ لے آ۔ ہاں لے آ بہو۔

== اچھا پھر آ لینے دے اسے۔

X

:::: ریئلی میں نے بہت مس کیا ہے تمہیں۔

):(مگر میں نے سنا تھا تمہاری اس سے خوب نبھ رہی ہے۔ ارے بھئی کیا نام تھا اس کا؟ و......وہی' جو پہلو والی نشست پر بیٹھا کرتا تھا کلاس روم میں۔ وہی جو تمہارے گریئش روزی گالوں اور ٹرمنڈ بالوں کی جا بے جا تعریف کیا کرتا تھا۔

اور......

:::: ایک دم باسٹرڈ ہے۔ ال مینرڈ مین۔ میری اس سے ویڈ بھی ہو گئی تھی۔ مگر مجھے بعد میں ایکسپلور ہوا کہ آدمی اپنے سٹریٹنڈ آرب سے نہ نکلے گا۔ وہ مجھے ویڈ ڈبلیس نہ دے سکتا تھا۔ چناں چہ مزری سے بچنے کے لیے ڈسیژن لے لیا ڈائیورس کا میں نے اس سے۔ فولش کہتا تھا' مجھے نور کے دائرے سے مت نکالو' سکھ کا پھول چیٹنگ' ڈیسپشن اور چالاکی کے تپتے صحرا میں نہیں اُگ سکتا۔ لوسپرٹیڈ۔ ڈرپوک۔ سلی۔

):(لیکن شاید میں۔ میں بھی اسی جتنا ڈرپوک ہوں۔

:::: اوہ نو تم۔ تم تو ریئلی اُس سٹوپیڈ سے بالکل ڈفرنٹ ہو۔ میں تم میں حوصلے کی خُوشبو سمیل کر رہی ہوں۔ اور پھر تمہیں جس اٹریکٹو جاب کی اَپرچونٹی ملی ہے اس میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی تمہارا اسٹیٹس اُس سے کہیں بلند ہو گیا ہے۔

):(کب لی ڈائیورس تم نے اس سے؟

:::: کل صبح ہی۔ جب مجھے تمہارا پیغام ملا کہ تم مجھے ملنے آؤ گے اور یہ بھی کہ تمہیں کال لیٹر جاری ہو چکا ہے اس کی پوسٹ کا۔ تب میں نے فیصلہ کیا وہ باسٹرڈ میرے قابل نہیں ہے۔ میرا ساتھی تو تمہیں ہونا چاہیے۔

):(مگر؟

:::: مگر وگر کچھ نہیں۔ آئی لو یو ڈارلنگ۔

):(　میں بھی تم سے لَو کرتا تھا۔ اور شاید اب بھی کرتا ہوں۔ مگر میں سب کچھ اس امید پر کرتا رہا کہ تم میری منتظر ہو گی۔ لیکن......

::::　اوہ ڈونٹ بی سلی۔ میں تمہاری منتظر ہوں۔ ایک غلط ڈسیژن ہوا تھا مجھ سے، محض یہ جان کر کہ تم بہت دور جا رہے ہو' ایسا نہ ہو کہ پھسل جاؤ' اور میں راہ دیکھتی رہوں۔ بہ ہر حال میں نے تلافی کر دی ہے۔ آؤ کلب چلیں' وہیں باتیں کریں گے باقی۔ چلو بھی نا۔ لٹ اُس موو۔

):(　چلو۔

X

:×:　سن رہے ہیں آپ؟......کیا کہہ رہا ہے یہ۔

==　میں تو یہ سننے کے لیے بہت پہلے سے تیار تھا۔

):(　آپ دونوں حیران کس بات پر ہو رہے ہیں؟ آپ دونوں بھی آ جانا۔ شریک ہو جانا نکاح میں۔ اور ولیمہ لنچ میں بھی۔ اسی ماہ کی پچیس کو ہے۔ کل فرسٹ ہے اور مجھے لازماً آفس جوائن کرنا ہے۔ کوٹھی بھی مل رہی ہے مجھے وہیں۔ پھر شاید نہ آ سکوں یہاں۔ پتا بھجوا دوں گا۔ ہم تو ادھر ہی رہیں گے دونوں۔ آپ بھی کبھی کبھی آ جایا کیجیے گا۔ کچھ ماحول بدل جایا کرے گا۔ اچھا میں چلا۔ میرے کچھ کاغذات رہ گئے تھے یہاں' وہ لینے آیا تھا۔

X

++　سرکار۔ چھوٹے سرکار کو روکیے نا۔

==　جانے دے......جانے دِے اسے۔

++　بی بی جی آپ ہی روک لیں نا' چھوٹے سرکار کو۔

:×:　ٹھہر جاؤ نا بیٹا۔ مجھے ذرا سکون سے بتاؤ تو میری بہو کیسی ہے؟

:(مجھے جلدی ہے ماں۔ بابا کے ساتھ جب شادی والے دِن آؤ گی تب دیکھ لینا۔ اچھا میں چلا۔

ہار جیت

جب اُن کا باپ مر گیا تھا تو ساری اُونچ نیچ کو بڑے نے سنبھال لیا۔ چھوٹا پہلے بھی لاڈلا تھا اب بھی رہا۔ گویا بڑا بھائی نہ تھا' باپ تھا۔ مگر وہ ایسا باپ تھا کہ اُس کی اَپنی کوئی اولاد نہ تھی۔

اور اماں روشاں کا خیال تھا بڑے کو ایک اور شادی کر لینی چاہیے۔

اماں روشاں کو شیر خان کی بیوی سے ہم دردی تھی۔ وہ اُس کی اَپنی سگی تھی۔ اُسے بڑے چاہوں سے بیاہ کر لائی تھی۔ مگر صرف ہم دردی سے آنگن میں بچوں کی چہکاریں تو نہیں گونج سکتیں نا! وہ چاہتی تھی' شیر خان اُس کی بات مان لے اور دوسری شادی کر لے شاید نئی کے بھاگوں گھر کا سونا آنگن بھر جائے اور وہ سکون سے مر سکے۔

وہ سکون سے یوں ہی مر جاتی مگر گاؤں والے اُسے سکھ سے جینے ہی نہ دِیتے تھے اور بیٹے کو دوسری شادی کرا دِینے کا مشورہ دِیتے رہتے تھے۔

وہ بڑی شاکر و صابر تھی مگر عمر کے ساتھ ساتھ صبر بھی اُس کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

شیر خان اور فیروز خان' دو ہی اُس کے بیٹے تھے۔ جب وہ شیر خان کے فرض سے سبک دوش ہوئی تب اُس کے سر کا تاج سلامت تھا۔ اُس کے لیے اَپنی مرحومہ بہن کی بیٹی ملکانی لے آئی تو فیروز خان کے لیے سوہنی سی کڑی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ ممکن ہے وہ فیروز خان کے لیے گوہرِ مقصود پا لیتی مگر بیوگی کے دُکھ نے اُسے آ لیا تھا۔ اس دُکھ سے سنبھلنے تک چار پانچ سال گزر چکے تھے۔ گزر چکے وقت نے اُسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اُسے فی الحال فیروز خان کی بہ جائے شیر خان کے لیے ایک اور رشتہ تلاش کرنا چاہیے۔

یہ بات نہ تھی کہ فیروز خان کو کوئی اَپنی لڑکی دینے کو تیار نہ تھا۔ بل کہ یوں ہے کہ وہ ابھی

لنگوٹ کَسے رَکھنا چاہتا تھا کہ اُسے ابھی بڑے بڑے پڑ مارنے تھے۔

شاید فیروز خان مان ہی جاتا اگر اُس کی ماں زیبو کے گھر جاتی اور اُسے اُس کے لیے مانگ لیتی۔ ایک زیبو ہی تھی جس کے اَندر صلاحیت تھی کہ وہ اس کے کسے ہوئے لنگوٹ کے بند ڈِھیلے کروا سکے اور اُسے اَکھاڑے سے باہر کھینچ لائے۔

ابھی اماں زیبو کے گھر نہ گئی تھی اور فیروز خان میں بھی اتنی ہمت نہ پیدا ہوئی تھی کہ وہ اماں کو زیبو کے گھر چلنے کا مشورہ دے سکے۔ پھر اماں بھی اب اس کی بہ جائے شیر خان کے بارے میں فکرمند رہنے لگی تھی۔ لہٰذا اپنے لیے اماں کو بھیجنا اُس کے دِھیان کو اَپنی طرف موڑنا تھا جب کہ وہ خود بھی چاہتا تھا کہ اس کے بھائی کو دُنیا کی تمام نعمتیں مل جاتیں کہ وہ اس کا بھائی نہ تھا باپ تھا۔

وہ جو بھائی نہ تھا باپ تھا' اُس نے سارے حق اَدا کرنے کا گویا تہیہ کر رکھا تھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال' فصلوں کی کاشت برداشت' مقدموں کی پیروی وکیلوں کی فیس' برادری کے جھگڑے اور گھر کے بکھیڑے' اِن سب سے فیروز خان کا کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو بس صبح وشام اَکھاڑے میں رہتا' اُسی کی بابت سوچتا تھا۔

شیر خان بھی یہی چاہتا تھا وہ ہر اکھاڑا جیتے کہ اُسے ایک آخری معرکہ سر کرنا تھا۔

وہ آخری معرکہ خانو تھا کہ جسے اُسے پچھاڑنا تھا۔

خانو کڑیل جوان تھا۔ گزشتہ کئی سالوں سے جیتتا چلا آرہا تھا اور اب تو کچھ یوں لگنے لگا تھا جیسے جیت اس کی تلاش میں رہتی تھی۔

شیر خان چاہتا تھا فیروز خان کو اُسے شکست دے۔

جو شیر خان چاہتا تھا وہی کچھ زیبو بھی چاہتی تھی۔

فیروز خان کو یہ بات تب پتہ چلی جب وہ گھبرائی ہوئی آئی اُس کی راہ روکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب وہ خوب رو چکی اور اُس کی سسکیوں میں لفظوں کی گنجائش پیدا ہو گئی تو اس نے کہا تھا:

’’فیروزے میرا اَبا مجھے مار ڈالے گا۔‘‘

’’مار ڈالے گا‘ آخر کیوں؟‘‘

’’وہ مجھے خانو کے پلے باندھنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا‘ تو...... تو میں مر ہی جاؤں گی نا!‘‘

فیروز خان کے لیے یہ اطلاع بھی موت کے فرشتے سے کم نہ تھی۔ وہ زیبو کو دیکھتا رہا اور اس کا دِل بیٹھتا چلا گیا۔ روتی ہوئی زیبو یک دَم بپھر گئی‘ اُسے گریبان سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑ ڈالا۔

’’فیروزے اگر تم ہمت ہار بیٹھے تو میں سچ مچ مر جاؤں گی۔ خود کو مار ڈالوں گی‘ کنویں میں چھلانگ لگا کر‘ چھت سے کود کر‘ یا پھر نہر میں ڈوب کر‘‘

فیروز خان کے لیے زیبو کے یہ جملے گویا حوصلے کے لبالب چھنٹے تھے۔ اُس کے حواس درست ہوئے اور اُس نے ہمت سے کہا۔

’’ایسا نہیں ہوگا۔‘‘

زیبو نے اُسے بازو سے پکڑا‘ کھینچتے ہوئے کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گئی اور یوں بولنے لگی جیسے اس کی آواز بہت دور سے آ رہی ہو:

’’فیروزے‘ تم خوب جانتے ہو میرا ابا اکھاڑے میں پلا بڑھا ہے اور ساری حیاتی اکھاڑا اُس کے حواس پر سوار رہا ہے۔ ابا کہتا ہے خانو اِس پنڈ کی عزت ہے‘ اُس جیسا کڑیل جوان اِردگرد کے کسی بھی گاؤں میں نہیں۔ ہونہہ‘ کیا سمجھتا ہے خانو کو؟ جب سے چوہدری فتح علی کے گاؤں جا کر شرفو کو پچھاڑا ہے اس نے‘ بس اسی روز سے ابا کی زُبان پر صبح و شام خانو ہی کا نام ہے۔ کل رات پچھلے پہر اتفاقاً میری آنکھ کھل گئی۔ ابا اور اماں سرگوشیوں میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی دَم سادھے سننے لگی۔ پتا ہے ابا کیا کہ رہا تھا اماں کو؟‘‘

فیروز خان نے زِیبو کو دِیکھا اور چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ زِیبو نے اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر دُور خلا میں گھورتے ہوئے کہا:

''ابا کہہ رہا تھا' خانو اس پنڈ کی عزت ہے اور یہ کہ میری اور اُس کی جوڑی خوب جچے گی ہونہہ۔ ہائے اللہ میں تو مر ہی جاؤں گی اگر ایسا ہو گیا تو۔''

فیروز خان اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور اس نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا:

''زیبو نہ تم مرو گی نہ میں۔ میں خانو کو ہی مار ڈالوں گا''

''تم اُسے مار ڈالو گے؟''

زیبو نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں' ہاں۔ میں اُسے قتل کر ڈالوں گا''

زیبو اُس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ اس کی ننھی مُنّی ناک کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شہابی رخسار خُون کی حدت سے تمتمانے لگے اور جھیل جیسی گہری آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔

''تم اُسے مار ڈالو گے خوب! خود پھانسی چڑھ جاؤ گے' اور میں؟''

وہ اَپنی سسکیوں پر ضبط کا بند نہ باندھ سکی اور گاؤں کی جانب تقریباً بھاگتی ہوئی چل پڑی۔

فیروز خان کے دِماغ میں بھونچال اُٹھ رہے تھے۔ زیبو اور خانو۔ یعنی زیبو اس کی زِندگی اور خانو۔ وہ اِس کے آگے سوچ نہ سکتا تھا۔ وہ بڑبڑایا:

''ایسا نہیں ہوگا''

''ایسا ہو جائے گا؟''

اُسے اَپنی عقب میں زِیبو کی آواز سنائی دی۔ وہ جانے کب واپس آئی تھی اور کہہ رہی تھی:

''تمہارے یوں کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میرا اَبا اَپنی دُھن کا پکا ہے۔ اُدھر گندم کی فصل اُٹھے گی اور اِدھر۔ ہاں یہی کہہ رہا تھا ابا۔''

اِتنا کہہ کر وہ پھر سسک پڑی اور پہلے ہی کی طرح دوڑتی ہوئی اپنے گاؤں کی راہ ہولی۔

فیروز خان اُسے جاتے دِیکھتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ پلٹ آئے مگر وہ اس بار پلٹ کر نہیں آئی۔

''اُدھر گندم کی فصل اُٹھے گی اور اِدھر۔''

یہ جملہ مسلسل اُس کے ذِہن میں گونج رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ اُسے اَپنا وجود نمک کی طرح گھلتا محسوس ہوا۔ وہ وجود جو اُس نے بڑی ریاضت اور محنت سے بنایا تھا۔

''ایسا ہو جائے گا۔''

اُسے اَپنے عقب سے زیبو کی آواز سنائی دِی۔ وہ جلدی سے مڑا مگر وہاں زیبو نہ تھی فقط اُس کے خدشوں کی گونج تھی۔ اِس گونج نے اُس کے خُون کی حدّت بڑھا دی۔ وہ دانت چبا کر بڑبڑایا:

''ایسا نہیں ہو گا۔ میں اس کتّے کے پِلّے کو قتل کر دوں گا۔''

وہ بے شک جی دار تھا۔ بڑے سے بڑے جوان کو پِڑ میں پچھاڑ دِینے کا حوصلہ رَکھتا تھا مگر کسی کو قتل کرنے کا خیال اُس کے دِل میں پہلی مرتبہ اُترا تھا۔

''قتل؟''

اُس کے اندر یہ لفظ زور سے گونجنے لگا۔

اُس نے اَندر کی گونج پر بڑبڑاہٹ کا پتھر پھینکا:

''ہاں ہاں قتل''

وہ اَپنے تئیں بڑبڑایا تھا مگر اُسے یوں لگا' جیسے اُس کی بڑبڑاہٹ چیخ کی طرح فضا میں چاروں طرف گونجنے لگی تھی۔ اُس نے اَپنے کانوں پر ہاتھ رَکھ لیے۔ گونج اُس کے اَندر وجود کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ دفعتاً ایک ایسا جملہ جو وہ بچپن سے سنتا چلا آیا تھا' سرگوشی کی طرح اُس کے اندر سرسرایا:

''ایک بے گناہ شخص کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے۔''

''بے گناہ؛ اَخ تھو۔''

اُس نے زمین پر تھوک دیا اور گیلی ہو جانے والی مونچھوں کو ہتھیلی کی پشت سے کلائی تک رگڑ کر صاف کرتے ہوئے یوں مطمئن ہو گیا جیسے اس نے زمین پر نہیں خانو کے منہ پر تھوک دیا ہو۔

''زیبو؛ میری زیبو کو مجھ سے چھیننے والا بھلا بے گناہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس مردُود کا قتل تو عین واجب ہے۔''

وہ بڑبڑایا۔ اس کی بڑبڑاہٹ میں اِشتعال بھی تھا اور جھنجھلاہٹ بھی۔ اور اس نے جانا اُس کی بڑبڑاہٹ مکمل ہو گئی تھی۔ مگر آخری جملہ انجانے میں اُس کے ہونٹوں پر ایک مرتبہ پھر پھسلنے لگا۔ کچھ رُک رُک کر:

''عین واجب ہے؟''

اب وہ اپنے آپ سے کشتی لڑ رہا تھا۔

''زیبو کو اُس کے باپ سے مانگ لینے پر خانو گناہ گار اور واجب القتل کیسے ہو گیا؟''

''زیبو تو میری تھی۔''

''تمہاری تھی مگر کیسے؟ کیا اُس کا رشتہ تم سے طے ہو گیا تھا۔''

''رشتہ؟ نہیں......مگر''

وہ بے بسی سے تڑپا۔

''کچھ بھی ہو میں زیبو کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

خانو بھی قتل نہ ہو اور زیبو بھی نہ چھوٹے۔ وہ اِس اِمکان پر سوچنے لگا اور بے بسی کے جال میں الجھتا چلا گیا۔

زیبو اور خانو۔

خانو اور زیبو۔

فقط دو نام تھے' جو اُس کے ذِہن میں گونج رہے تھے۔ اور بے بسی تھی جو اسے اپنے شکنجے میں کسے ہوئے تھی۔

وہ رو پڑا۔ بلک بلک کر' بالکل بچوں کی طرح۔

اُس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے شک گزرا تھا کہ شاید کوئی ہے' مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ پھر اَپنی بے بسی کے اَکھاڑے میں چت لیٹ گیا۔ اس نے رہی سہی ہمت یکجا کی۔ دِل کو سنبھالا دِیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ پیپل کے تنے کا سہارا لیا۔ اُس کی نظر گندم کی اَنگڑائی لیتی فصل پر پڑی اور اس کے چاروں جانب زیبو کی آواز گونجنے لگی:

''اُدھر گندم کی فصل اٹھے گی اور اِدھر''

وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ ہاتھ بڑھا کر گندم کے ایک خُوشے کو توڑا اور دونوں ہتھیلیوں کے بیچ مسل ڈالا۔ دودھ بھرے کچے دانے اس کی ہتھیلی میں چمکنے لگے۔ اُس نے غور سے دانوں کو دیکھا اور اسے جھرجھری آ گئی۔ اس نے زور سے مٹھی بھینچ لی۔ اُسے لگا' جیسے دانے اُس کی ہتھیلی کے اَندر اُس کی جلد میں چبھتے چلے جا رہے تھے۔ اس نے بند مٹھی کو فضا میں گھماتے ہوئے دانوں کو دور اُچھال دِیا اور بے بسی سے اَپنی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگا۔ ہتھیلیوں کی لکیریں گڈمڈ ہونے لگیں۔ آنکھیں آنسوؤں سے ایک بار پھر بھر گئیں۔ اُس نے اوپر آسمان کی طرف دِیکھا اور گڑگڑا کر دُعا کرنے لگا:

''اے خدا' خود ہی کوئی صورت پیدا کر۔ یا پھر یوں کر' کہ فصل کٹنے کو پہنچے تو خوب خوب بارشیں ہوں' ژالہ باری ہو' جھکڑ چلیں' آندھیاں اندھیر مچائیں اور ساری فصل تباہ و برباد ہو جائے۔

اے خدا' اس دفعہ گندم کو بیماری لگ جائے' آگ جلا کر راکھ کر ڈالے۔

اے خدا' پکھیرو بھیج کہ ساری فصل چگ لیں یا پھر فصل کٹ چکے تو سیلاب بھیج دے جو ساری گندم بہا لے جائے۔''

نہ جانے وہ کیا کچھ دعاؤں میں مانگتا رہا حتیٰ کہ چپکے سے شرمندگی اُس کی دعاؤں پر غالب آنے لگی اور وہ اپنی دعاؤں پر پچھتانے لگا۔

''میں کتنا خود غرض ہوں دوسروں کے لیے عذاب طلب کر رہا ہوں......توبہ توبہ''

اُس نے سنا تھا کسی کو بد دُعا دینے سے اپنے دِل کی زرخیز زمین بنجر ہو جاتی ہے اور دِل کی زمین بنجر ہو تو محبت کی فصل نہیں اُگ سکتی۔ اس نے اپنے دِل کو ٹٹولا۔

اُس کا دِل تو محبتوں کا خزینہ تھا۔

خانو کے لیے وہ پہلی نفرت تھی جس نے اُسے تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

''خدا نہ کرے کہ دِل سے محبتیں رخصت ہو جائیں۔''

وہ بڑبڑایا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے دل کو ٹٹولا۔ اُس کا دِل اَب بھی محبت سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

وہ اِس خیال سے ہی لرز گیا تھا کہ اُس کے دِل سے زیبو کی اس محبت کی فصل اُجڑ جائے جو اس کے دِل میں لہلہا رہی تھی یا اس کی ماں کی محبت باقی نہ رہے جو اُس کے لیے پل پل دُعائیں مانگتی تھی یا پھر وہ بھائی کے لیے محبت سے محروم ہو جائے جس نے اُسے تمام بکھیڑوں سے آزاد کر رکھا تھا۔ اسے یاد آیا خانو کی مات تو بھائی کی بھی خواہش تھی۔ گزشتہ کچھ عرصے سے جب بھی وہ کوئی کشتی جیت کر آتا تھا تو شیر خان یہی کہتا تھا:

''فیروز خان اب تمہارا اگلا پڑ خانو سے پڑنا چاہیے''

مگر شاید ابھی اس کا مرحلہ نہیں آیا تھا۔ ابھی اُسے اور تیاری کرنا تھی۔

اور وہ تیاری کرتا رہا۔ منھ اندھیرے اُٹھتا' گھنٹوں ڈنٹر پیلتا' سرسوں کے تیل کی مالش کراتا' کئی کئی میل دوڑتا' اکھاڑے میں دوسروں سے زور آزمائی کرتا۔ وہ چاہتا تھا خانو کے مقابل آئے تو اس کے بڑے بھائی کو مایوسی نہ ہو۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے بھائی کو ذرا سا بھی دُکھ پہنچے۔ وہ اپنے اس بھائی کے لیے جان

تک قربان کر سکتا تھا جس کی شفقتوں کی گھنی چھاؤں اُسے ملی تھی۔ لہٰذا وہ تیاری کرتا رہا۔

مگر خانو عجیب انداز سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ خانو کو اُٹھا کر پرے پٹخ دے اور اس کی چھاتی کو قدموں تلے روندتا ہوا اس پار زیبو کے پاس پہنچ جائے۔ اگرچہ اس کی تیاری مکمل نہ تھی مگر گندم کے خوشوں میں دودھ بھرے دانے اپنا رنگ بدل رہے تھے اور اس کے پاس وقت بہت ہی کم تھا۔

وقت کتنی تیزی سے گزر گیا تھا

زیبو جو کبھی انار کے اَدھ کھلے پھول کی طرح تھی، گلیوں میں سُرخ سا فراک پہنے گھومتی رہتی تھی، اُس کی نظروں کے سامنے بڑھتی بڑھتی سروقد ہو گئی تھی۔ وہ اُسے ہمیشہ اَدھ کھلے اَنار کے پھول جیسا سمجھتا رہتا کہ اک روز جب وہ پانی کے دو گھڑے بھر کر، ایک بغل میں اور دوسرا سر پر رکھے، گاؤں کی طرف جا رہی تھی کہ بے دِھیانی میں فیروز خان سے ٹکرا گئی۔ گھڑے زیبو کی گرفت سے نکل گئے اور دونوں کے بدن بھگوتے زمین پر چکنا چور ہو گئے۔ زیبو بوکھلا گئی، شرم سے گال مزید سرخ ہو گئے۔ اُس نے فیروز خان کو دیکھا تو وہ پلک جھپکائے بغیر اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی نظروں کا سامنا نہ کر پائی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

وہ اُسے بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اسے تب پتا چلا تھا کہ جوانی کیا ہوتی ہے۔

اس نے پہلی مرتبہ اپنے اندر بھی جوانی کو محسوس کیا۔

فیروز خان عجب مخمصے میں تھا۔

اِس سے پہلے اُسے اِحساس کیوں نہیں ہوا کہ زیبو اس قدر حسین تھی۔ اِتنی حسین کہ خود اس کے اندر سوئی جوانی کو انگڑائیاں لے کر جاگنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ تب اُسے سمجھ آیا کہ بھائی شیر خان اُسے بھولا بادشاہ کیوں کہتا تھا۔ اماں بھی کبھی کبھار بھولا بادشاہ کہہ کر چوٹ کر لیا کرتی تھیں اور عموماً یہ اُس وقت ہوتا، جب اماں اس کی شادی کے لیے گاؤں کی کسی لڑکی کا نام لیتیں اور وہ اٹھ کر

وہاں سے چل دیتا۔

اُس کا خیال تھا ابھی اُسے بھائی کی خُوشی کی خاطر خانو کو پچھاڑنا تھا۔ عورت بیچ میں آ گئی تو بھائی کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔

جب کہ وہ نہیں چاہتا تھا' بھائی کا خواب ٹوٹے کہ اس نے تو اس کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔

شیر خان اگر فیروز خان کی طرح اونچا لمبا اور تگڑا ہوتا تو شاید وہ خود اکھاڑے میں اترتا مگر ایک تو اس کی ایک ٹانگ قدرے چھوٹی تھی اور دوسرے اس کی کاٹھی ہی ایسی تھی کہ اس پر دائمی بیمار ہونے کا گماں ہوتا تھا۔ حالاں کہ وہ بلا کا پھرتیلا اور ذہین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر' زمینوں' ڈھور ڈنگر اور برادری کے سارے جھنجھٹ اس نے خود سنبھال رکھے تھے۔ جب کہ فیروز خان کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ اکھاڑے میں اپنا نام کمائے۔

وہ بھی خوب محنت کر کے نام کماتا رہا۔ اب وہ خانو کے مقابل ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ چراغ دین کی بیٹی زیبو کے گھڑوں نے ٹوٹ کر اسے جوانی کے پانی میں بھگو دیا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ اسے اپنے جوان ہونے کی خبر نہ تھی۔ وہ لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اترتا تھا اور لوگوں کی نظریں اپنے پنڈے پر پڑتی محسوس کرتا تھا تو اسے اپنے جوان ہونے کی بابت یقین سے بھی آگے کی حد تک خبر ہو جاتی تھی۔ جب وہ بڑے بڑے جوانوں کو اکھاڑے میں چت کرتا تھا اور لوگ بڑکیں لگاتے تھے تو جوانی کا نشہ اُسے مست کر دیتا تھا۔ مگر اب وہ جوانی' کہ جس کے پانی سے وہ بھیگا تھا' اس کا ڈھنگ ہی کچھ اور تھا۔ ایک لذت تھی' جو پورے بدن میں تیر رہی تھی۔ اک سرور تھا جو اَنگ اَنگ پر چھا رہا تھا۔ اسی کیف میں کئی دِن گزر گئے۔ وہ سوتے میں مسکرانے لگتا' باتیں کرتے کرتے گم ہو جاتا پہروں کنویں کے چوبچے میں ٹانگیں لٹکائے پڑ چھے سے گرتے پانی کو دیکھتا رہتا اور خیال ہی خیال میں بھیگتا رہتا۔

یوں تو زیبو ہر لمحے اُس کے سامنے تھی۔ وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔ باتیں کر سکتا تھا۔ اس کے

بدن سے اُٹھتی مہک کو سونگھ سکتا تھا۔ اُس کے چہرے پر کھلتے سرخ رنگ سے اپنے لہو کی حدّت بڑھا سکتا تھا۔ مگر اس وقت وہ بے بس سا ہو گیا جب اس نے سوچا کہ اگر وہ زیبو کو چھو لیتا تو کیسا لگتا۔

اُسے افسوس ہوا کہ اس روز اس نے زیبو کو چھو کر کیوں نہیں دیکھا تھا۔

اور جب چھو لینے کی خواہش ضبط کا رَسا تڑانے لگی تو وہ پنڈ سرگاں کی طرف چل دیا۔

پھر ہوا یوں کہ راہ میں چراغ دِین سے ملاقات ہو گئی۔

ایک وقت تھا چراغ دین اَکھاڑے میں اُترتا تھا تو لوگوں کی سانسیں رُک رُک جاتی تھیں مگر اب وہ دَمے کا مریض ہو گیا تھا۔ اور خود اس کی اَپنی سانسیں بسا اوقات رُک رُک کر چلتی تھیں۔ دَمے کے بعد جوڑوں کے درد کا عارضہ ایسا تھا جس نے اُسے محض اَکھاڑے کے کنارے پر لا بٹھایا تھا۔

اُس نے فیروز خان کو دیکھا تو کھِل اُٹھا۔ کہا:

''میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا۔''

فیروز خان کی باچھیں بھی قابو میں نہ آ رہی تھیں۔ پوچھا:

''کیوں چاچا خیریت تو ہے نا۔''

کہنے لگا:

''فیروز بیٹا اس چاند کی بارہ کو اپنا شوکا ہے نا! پہلی بار اَکھاڑے میں اُتر رہا ہے' ایک جوڑ شرفو سے کرے گا' ایک تمہارے ساتھ ہو جاتا تو اُسے کھیل کے کچھ داؤ پیچ کا پتا چل جاتا''

''ہاں چاچا کیوں نہیں؟''

وہ فوراً بول اٹھا۔

''جیتے رہو بیٹے۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ جانتا ہوں شوکا ابھی بچہ ہے تمہارا اور

اس کا جوڑ نہیں مگر جب تک وہ اُن سے زور نہیں کرے گا جن سے اُکھاڑا سج جاتا ہے وہ بچے کا بچہ ہی رہے گا۔''

''ہاں چاچا یہ تو ہے''

اُس نے بات آگے بڑھائی۔

''اکھاڑا تو ہمارے لیے مقدس ہے چاچا۔ جو بھی اس میں اترتا ہے اس کو اس کے داؤ پیچ سکھانا ہم پر فرض ہو جاتا ہے۔''

''یہ ہوئی نا بات''

چراغ دین نے خُوش ہو کر اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ پھر کہا:

''تمہارے یہ خیالات ہیں اور اُدھر خانو ہے کہ صاف مکر گیا' کہنے لگا' یہ جوڑ اس کے برابر کا نہیں۔ تم تو بہت اچھے ہو فیروز بیٹے۔''

فیروز خان خُوشی سے پھول کر کُپا ہو گیا۔ چراغ دِین اُسے بہت اچھا کہ رہا تھا۔ اور وہ اتنا اچھا بن گیا کہ اگلے روز صبح ہی صبح پنڈ سُرگاں چل دیا۔ سیدھا چراغ دِین کے گھر پہنچا اور چاچا' چاچا کی آوازیں دِینے لگا۔ چراغ دین کی بہ جائے زیبو صحن میں نمودار ہوئی۔ اُسے یوں لگا وہ وہاں صحن میں نہ تھی عین اُس کے دِل میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''جی ابا تو گھر پر نہیں ہے''

آواز تھی یا پائیل کی چھنکار۔ فضا میں دیر تک چھن چھن ہوتی رہی اور وہ مست اسے دیکھتا رہا۔ اور گم صم کھڑا رہا۔

وہ جھینپ گئی۔ سنبھلی تو کہا:

''وہ جی ابا گئے ہیں باہر کھیتوں کی طرف''

اب کے آواز کچھ تیز تھی۔ پائیل نہ تھی گھنگھروؤں کی جھنکار تھی مگر اس کی گونج بھی فضا میں معلق ہو گئی وہ اُسے سنتا رہا۔ سنتا رہا اور دیکھتا رہا۔ پھر جب اُس نے مزید سرخ ہوتے ہوئے منھ

پھیر لیا اور دوپٹے میں خود کو لپیٹتے ہوئے کہنے لگی:

''اندر آ جائیں جی چارپائی دھری ہے ادھر صحن میں، بیٹھیں۔ ابھی ابا آ جائے گا''

تب وہ بیدار ہوا۔ جلدی سے صحن میں بچھی چارپائی تک پہنچا اور اس پر دھڑام سے جا گرا۔

زیبو ہنس دی۔ ہنس کیا دِی پورا صحن جگمگا اُٹھا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔

وہ جلدی سے گئی، پیتل کا بھرا ہوا لسی کا چھنا اُٹھا لائی اور اُس کی جانب بڑھایا۔

اُس نے چھنا نہیں تھاما' زیبو کے ہاتھ کو تھام لیا۔ چھنا ہاتھوں سے پھسلتا دور جا گرا اور وہ ہاتھ چھڑا کر زمین سے چھنا اُٹھانے کو جھکی تو چراغ دین کے کھنکورے نے اسے مزید بوکھلا دیا:

''خیر ہے پتر لسی گر گئی دوسرا چھنا بھر لا' بڑا ایسا مہمان آیا ہے ہمارے گھر۔''

وہ بھی بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''سلام چاچا۔''

اور پھر سانس لیے بغیر کہنے لگا:

''چاچا کون سی تاریخ بتائی تھی تم نے جوڑ کی''

چراغ دین اوپر نیچے ہوتے سانسوں کے بیچ کچھ کہنے ہی کو تھا کہ شوکی جو اپنے باپ کے پیچھے پیچھے آ پہنچا تھا' جھٹ بولا:

''چاند کی بارہ بھائی فیروزے''

پھر وہ فیروز خان کے گلے جا لگا اور ہنس کر کہنے لگا:

''اپنا ابا بھی عجیب ہے' تمہیں یہ تو بتا آیا کہ جوڑ ہوگا' یہ نہیں بتایا کہ کب ہوگا؟''

چراغ دین کھسیانی ہنسی ہنس دِیا۔ اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے تاریخ بتائی بھی تھی یا نہیں۔ یہ پہلا بہانہ تھا جو اس نے زیبو سے ملنے اور اُسے چھونے کے لیے گھڑا تھا اور جب چاند کی بارہ گزر گئی تو بھی اُس نے بہانے بہانے سے پنڈ سرگاں جانے اور زیبو سے ملنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر جینے کا سوچنے کو بھی گناہ تصور کرنے لگے۔

پھر یوں ہوا کہ خانو بیچ میں آ گیا۔

خانو شاید پہلے ہی بیچ میں تھا مگر نہ تو زیبو کو اُس کی خبر تھی نہ فیروز خان کو۔

اب کیا ہو گا؟ اک سوال سامنے تھا۔

وہ نئے حوصلے کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں خانو کو گندم کی کٹائی سے پہلی ہی پچھاڑ دوں گا۔ پھر میں دیکھوں گا چراغ دین مجھے کیسے نظر انداز کرتا ہے؟''

اس نے اپنے گاؤں پہنچتے ہی خانو کو پیغام دِے بھیجا۔

جوں ہی یہ خبر شیر خان کو پہنچی وہ بھاگتے ہوے اکھاڑے میں آیا۔ خُوشی سے فیروز خان کو اَپنی بانہوں میں بھر کراس کا ماتھا چوم لیا

''خدا تمہیں کام یاب کرے''

پھر اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اور کہا:

''میں تو مدّت سے تمہارے منہ سے یہ سننے کو ترس رہا تھا' مجھے یقین ہے خانو ضرور شکست کھائے گا۔ ہاں وہ بڑی بُری طرح مار کھائے گا۔''

فیروز خان نے ڈنٹر پیلنے کی تعداد اور رفتار بڑھا دی۔ کئی کئی میل دوڑنا' پھر شاگردوں سے زور آزمائی' تیل کی مالش' مرغن غذائیں اور پہلے سے کہیں زیادہ زور کی مشق؛ یہ اُس کے روز کے معمول کا حصہ تھے۔

جس روز دونوں شہتیر جیسے جوان اَکھاڑے میں اُترے' یوں لگتا تھا ارد گرد کسی بھی گاؤں میں ایک بھی مرد ایسا نہ بچا تھا جو پیچھے رہ گیا ہو۔ کس انہماک سے سب دونوں کے چکنے جثوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اندازہ ہی نہ کر پا رہے تھے کہ کون پچھاڑے گا؟ خانو اتراتا ہوا آگے بڑھا۔ فیروزے نے اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں اکڑاتے ہوے اس کی ہتھیلیوں پر ٹکا دِیں اور پورے بدن کا زور ہتھیلیوں پر منتقل کر دیا۔ پھر انگلیوں کی کنگھی سے اس کی انگلیاں جکڑ لیں۔ خانو ایک جھٹکے

سے پیچھے ہٹا۔ یوں کہ فیروز خان کا پورا بدن ڈگمگا گیا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ خانو پھرتی سے اپنے قدموں پر گھوما۔ وہ چاہتا تھا کہ قینچی کا داؤ لگاتے ہوئے لڑکھڑاتے فیروز کی ٹانگیں قابو کر کے مروڑ ڈالے۔ مگر فیروز خان سنبھل گیا۔ اپنے ہی قدموں پر اُچھلا اور دونوں پاؤں اُس کی جانب اُچھال دیئے۔ پاؤں اگرچہ چھاتی پر نہیں پڑے تھے لیکن یوں لگا تھا کہ جیسے اس کے کندھوں پر فیروزے کے پاؤں جم سے گئے تھے۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھا اور پرے جا پڑا۔ دونوں پھرتی سے اُٹھے اور پھر پنجوں میں پنجے پھنسا لیے۔ اب کے فیروز خان نے اَپنے ہاتھوں کو اُوپر سے نیچے کچھ یوں جھٹکا دیا کہ وہ لڑکھڑا کر اُس کے بدن سے آلگا۔ اُس کے بازو گھمائے' گردن سے دبوچا' پٹخنی دی اور نیچے گرا لیا۔ پورا مجمع چیخ اُٹھا۔

خانو نے گردن چھڑانے کے لیے ٹانگوں کو اُوپر اُٹھا کر جھٹکا دینا چاہا مگر فیروزے نے دونوں ٹانگوں کے بیچ ٹانگیں پھنسا لی تھیں۔ اب وہ دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ جکڑ کر اسے چت زمین پر لٹا سکتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ خانو نے اپنے طور پر بہت کوشش کی مگر فیروز خان کا شکنجہ سخت ہوتا چلا گیا۔ پھر اس نے گھٹنوں کو سمیٹا' جھٹکے سے اپنے نچلے بدن کو اُچھالا اور گھٹنے خانو کی چھاتی پر جما دِیے۔ ساتھ ہی اپنے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور زور کی بڑھک لگائی۔

پورا مجمع للکاروں اور بڑھکوں سے گونج اٹھا۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی نے اُسے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ ڈھول بج اٹھے۔ بھنگڑے نے عجب سماں باندھ دیا تھا۔

ان سب کے بیچ فیروز خان نے دیکھا چراغ دین ایک ایک روپے کے نوٹ اُس کی جانب اُچھال رہا تھا اور خُوشی سے چیخ رہا تھا۔ اُسے اُس کی آواز اسے سارے مجمعے پر بھاری لگی تھی۔ الگ' سب سے جدا' وہ مطمئن ہو گیا۔

اور جب اس نے مطمئن ہو کر اپنے بڑے بھائی شیر خان کو دیکھا تو اور زیادہ نہال ہو گیا کہ وہ بھی خُوشی میں اُچھل رہا تھا۔ شام پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی گئی۔ چاول کی دیگیں تقسیم ہوئیں۔ جب ذرا ہنگامہ تھما تو فیروز خان نے پنڈ سُرگاں جانے کا فیصلہ کیا۔ چراغ دین سے بات

کرنے کے لیے کہ اب بیچ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اُس نے مناسب جانا بڑے بھائی کی بھی ساتھ لیتا جائے۔ وہ اسے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا۔

''بھائی جی آپ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ آج میں جس عزّت کا حق دار ٹھہرا ہوں وہ آپ ہی کی بدولت ہے۔ میں آپ کو پنڈ سُرگاں لے جانا چاہتا ہوں۔ چراغ دین کے پاس......وہ......''

شیر خان نے بات مکمل ہونے کا اِنتظار نہ کیا اور کہا:

''ہاں ٹھیک ہے مگر تم اکیلے پنڈ سرگاں جاؤ اور ایک نہایت اُہم بات میں تم سے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ چراغ دین اکھاڑے میں جیتنے والوں کی بہت قدر کرتا ہے۔ تم میرے لیے زیبو کے رشتے کی بات ضرور کرنا' میں چاہتا ہوں مجھے اولاد کے لیے اب دوسری شادی کر ہی لینی چاہیے۔''

فیروز خان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ بڑبڑایا:''زیبو''

شیر خان نے کہا:''ہاں بھئی زیبو'چراغ دین کی بیٹی۔ میری تو کب سے خواہش تھی' تم اکھاڑے میں خانو کو مات دو کہ ماسٹر چراغ دین پیروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیتا۔''

فیروز خان چکرا کر گرا۔ اُسے لگا جیسے وہ چاروں شانے چت اُکھاڑے میں پڑا تھا اور کوئی اُس کی چھاتی پر گھٹنے گاڑے للکرے مار رہا تھا۔

کہانی کیسے بنتی ہے

وہ میرے پاس آئی اور مجھے کُرید کُرید کر پوچھنے لگی:

''کہانی کیسے بنتی ہے؟''

مجھے کوئی جواب نہ سوجھ رہا تھا کہ میرا سیل میری مدد کو آیا۔ دوسری جانب گاؤں سے فون تھا:

''سیموں مرگئی۔''

''کون سیموں؟''

میں نے اپنے وسوسے اوندھانے کے لیے خواہ مخواہ سوال جڑ دیا۔ حالاں کہ ادھر ہمارے خاندان میں ایک ہی سیموں تھی۔

''جی بالے کی بیوی۔''

اِطلاع دِینے والے کی ہچکی بندھ گئی۔

ابھی تک مجھے بھی یقین نہ آیا تھا۔ اُس کے مرنے کے دِن تو نہ تھے۔ چھوٹے چھوٹے چار بچے تھے۔ اِتنے چھوٹے کہ جنہیں ممتا کے گھنے سایے کی اشد ضرورت تھی۔

''وہ کیسے مرگئی؟''

میری آواز بھی رندھا گئی۔ اطلاع دِینے والے کی سانسیں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

آج دوسرا دِن تھا کہ ایسی جگر چیرنے والی خبریں آئے چلے جاتی تھیں۔ کل صبح میں ابھی

گھر سے دفتر لے لیے نکلا ہی تھا کہ سامنے رہنے والی نائلہ کے منّے سے پیارے بیٹے ارباز کو ایک نو دولتیے کی نابالغ اولاد نے ویلنگ کرتے ہوئے ٹکر مار دی تھی۔ میں اُسے بچانے آگے بڑھا۔ وہ میرے بازوؤں میں مچھلی کی طرح تڑپا اور دم توڑ گیا تھا۔ جب میں اُس کی لاش اُس کی ماں کی گود میں ڈال رہا تھا تو میں اس کی طرف دیکھنے کی ہمت اپنے دِل میں نہ پاتا تھا حالاں کہ جب سے اس کا شوہر اسے چھوڑ گیا تھا اسے چوری چھپے دِیکھنا مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔

کل ہی دفتر میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر محبت سے باتیں کرنے اور اپنے کام سے کام رَکھنے والے طاہر خان کو ویگن نے کچل ڈالا تھا۔ وہ سڑک پر دِیر تک تڑپتا رہا۔ گاڑیاں اُس کے پاس سے گزرتی رہیں۔ تھانہ کچہری کے چکروں سے بچنے کے لیے کوئی مدد کے لیے آگے نہ بڑھا۔ یہ تو اِتفاق تھا کہ ہمارے دفتر کے نفیس کی نظر اُس کے کچلے ہوئے بدن پر پڑی۔ نفیس اُسے ہسپتال لے گیا۔ مگر بہت دیر ہو گئی تھی۔ رگوں سے سارا خُون نچڑ چکا تھا۔

سب دعا کرتے رہے مگر وہ مر گیا۔

ایک نوخیز شاعرہ شرمین کچھ دِنوں سے ہی ہمارے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا شروع ہوئی تھی۔ ابھی تک اس نے بے ریا محبت کی کچی نظمیں ہی لکھنا سیکھی تھیں۔ کل شام اُس نے محبت کی ایک اُداس کر دینے والی ایک نظم ہمیں سنائی تھی۔ یوں کہ ہم دیر تک کچھ کَہ نہ پائے تھے۔ اس نے اَپنی ساری نظمیں سمیٹ کر پرس میں ڈال لیں اور چپکے سے باہر گلی میں قدم رکھ دیا۔ باہر موت تاک میں بیٹھی تھی۔ دو موٹر سائیکل سوار نوجوانوں نے اِدھر اُدھر آ کر اُس سے پرس چھننا چاہا۔ وہی پرس جس میں اس کی نظمیں تھیں۔ اُس نے مزاحمت کی اور اُسے گولی مار دی گئی۔

زخمی حالت میں ہم اُسے ہسپتال لے گئے۔ بہت ساری دعائیں کیں مگر وہ بھی مر گئی۔

مجھے اَپنی دعاؤں کے قبول نہ کیے جانے کا دُکھ تھا۔ رات سونے سے پہلے میں نے موت کے تین چہرے کا عنوان جما کر ایک نظم لکھ ڈالی تھی:

''یہ کیسی پت جھڑ ہے کہ اے مالک، کسی دعا کی شاخ پر قبولیت کی کوئی کونپل نہیں

پھوٹتی۔

اے جہانوں کو پالنے والے! ایک ننھی مُنّی جان کے لیے آخر کتنا رزق درکار ہوتا ہے۔

اے دلوں کو محبت کے نور سے منور رکھنے والے' ایک محبت کے چراغ کو روشن رکھنے کے لیے زِندگی کے کتنے ایندھن کی ضرورت پڑسکتی ہے۔

اے حرف میں معنی اور معنی میں تاثیر رکھنے والے' نازک جذبوں کو کومل لفظوں میں ڈھالنے والی کی کل کائنات تمہاری اِتنی بڑی کائنات سے بڑی تو نہ ہوسکتی تھی۔''

میں لکھتا رہا...... حتیٰ کہ یہ تین اموات کا دُکھ اس نظم میں سما گیا۔ اتنا بڑا دُکھ جو تین گھروں میں نہ سما رہا تھا' میری اکلوتی نظم ڈکار گئی تھی اور میں صبح معمول سے جاگا تھا۔

مگر آج صبح ہی صبح مجھے اندر سے ایک بار پھر یوں اُدھڑنا تھا کہ کئی نظمیں لکھ ڈالتا تو بھی دِل کو واپس ٹھکانے پر نہ لاسکتا تھا۔

بات کرنے والا سسکیاں لے کر خاموش ہو گیا۔ پھر سیل کا روشن ڈسپلے بھی بجھ گیا مگر میں مسلسل اُسے دِیکھ رہا تھا۔ جتنی دِیر تک میں سیل کو دِیکھتا رہا' وہ مجھے دیکھتی رہی۔ یوں جیسے اَپنے سامنے کہانی کو بنتا دِیکھ رہی ہو۔

جب میں گاؤں جا رہا تھا تو میں اُس کا سوال بھول چکا تھا۔

بالے کے گھر کے باہر لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ سب ہی دُکھ میں ڈوبے ہوے تھے۔ گھر کے اندر سے عورتوں کے رونے اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں دُکھ میں ڈوبے لوگوں کو چیرتا دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ اندر سے آنے والی چیخوں سے میں نے ایک مانوس آواز کو صاف الگ کرلیا۔ یہ مرنے والی کی ماں تھی:

''سوجھا نی مینڈ ھیے دِھیے توں تاں لمے پینڈے پے گئی ایں

اِنج نہیں کریدا۔''

(دھیان' اے میری بیٹی کہ تم نے تو طویل مسافت اختیار کر لی ہے۔ ایسا تو نہیں کرتے۔)

جوں ہی بین کا ایک ٹکڑا مکمل ہوتا' عورتوں کی چیخیں نکل جاتیں۔

جب میت اُٹھا کر باہر لائی گئی تو مردوں کی چیخیں بھی نکل گئیں۔

میت والی چارپائی کو ایک طرف سے سیموں کے سسر شیفے نے کندھا دِے رکھا تھا اور دوسری طرف اس کا شوہر بالا تھا۔

بالے نے شیفے سے جوئے میں بھینس جیتی تھی لیکن اسے بدلے میں پیاری سی لڑکی مل گئی تھی۔ یہ اُس کی دوسری بیوی تھی۔ مگر گھر میں گھستے ہی بالے کو پہلی سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ اب تو اُس کا گھر اِس ہی کے نصیبوں سے محبت کا گہوارہ تھا۔

جب دونوں کندھا دے کر چارپائی گھر سے نکال رہے تھے تو سیموں کی ماں کے بینوں اور عورتوں کی چیخوں میں کوئی آہنگ نہیں رہا تھا۔

جب میں کندھا دِینے کے لیے چارپائی کی دائیں جانب گھوم کر بالے کے قریب ہو گیا تو مجھے یوں لگا جیسے مرنے والی کی ماں کے بین یک لخت تھم سے گئے تھے۔ میں نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ یکا یک اس نے عارضی خاموشی توڑ دی اور پہلے سے کہیں زیادہ درد بھری آواز میں بین کرتے ہوئے اُپنی بھاری چھاتیاں تھپا تھپ پیٹ ڈالیں:

''توں دِل لائیا سی حیاتی نال چپ چپیتے۔

لمیاں چپاں تینوں موت جیۓ روگ دِتے۔

سو جھانی مینڈ ھیے دِھیے تینوں کندھا دِین اپنے آ گئے نیں۔

انج نئیں کریدا۔''

(تم نے چپکے چپکے زِندگی کے ساتھ دِل لگایا تھا۔ لمبی چپ نے تمہیں موت جیسے روگ دِیے دِھیان' اے میری بیٹی کہ تمہاری میت کو کندھا دینے والے تمہارے اپنے آ پہنچے ہیں۔

ایسا تو نہیں کیا جاتا۔)

کہتے ہیں بالا اَب پہلے جیسا اکھڑ اور بد مزاج نہیں رہا تھا۔ سیموں نے اُسے بدل کر رکھ دیا۔ بدلے ہوئے بالے نے رو رو کر اپنی آنکھیں سرخ بیر ابنالی تھیں۔

گاؤں کا ہر شخص میت کو کندھا دینے کے لیے یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے یہ بالے کی سیموں کا نہیں اس کی اپنی بیٹی کا جنازہ تھا۔

جب میں اپنا کندھا کھسکاتے کھسکاتے چار پائی کے پچھلے پائے سے ٹکرا کر جنازے کے عقب میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مرحومہ کے بچے گم صم پیچھے پیچھے یوں چل رہے تھے جیسے اس اچانک صدمے نے انہیں کچھ سمجھنے ہی نہ دیا ہو۔ بچوں کی نانی کے بین تعاقب میں تھے:

''تتیاں دُھپّاں وِچ اَپنے بالاں تے ٹھنڈی چھاں ہوں والیے مینڈ ھیے دِھیے۔

کس دِے آسرے اِنہاں نوں چھوڑ چلی ایں توں۔

انج نئیں کریدا۔''

(تپتی دھوپوں میں اپنے بچوں پر ٹھنڈی چھاؤں ہو جانے والی اے میری بیٹی

اب کس کے سہارے انہیں چھوڑ کر تم چل پڑیں۔

یوں تو نہیں کیا جاتا)

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جنازے کے پیچھے گلی میں آ گئی تھی۔ اُس کے بال کُھلے ہوئے تھے اور سر کی چادر پیچھے گر کر گھسٹ رہی تھی۔

''ایہہ کچے کولے معصوم ہن کہدی چنّی وِچ سر لکان گے مینڈ ھیے دھیے

انج نئیں کریدا''

(یہ نرم و نازک معصوم بچے اب کس کے آنچل کی اوٹ لیں گے اے میری بیٹی

یوں تو نہیں کیا جاتا)

بین اتنے درد یلے تھے کہ دُکھ میرے پورے وجود کے اندر بھر گیا تھا۔

میت جنازہ گاہ پہنچی۔ صفیں ترتیب دی گئیں۔ جنازہ بالے کے دادا نے پڑھایا تھا۔ جب وہ تکبیر کہتا تو اُس کی آواز لڑکھڑا جاتی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب دُکھ کے شدید حملے کی وجہ سے تھا۔

دُعا کے بعد میت وہاں لائی گئی جہاں گھدی ہوئی قبر اُسے اَپنی آغوش میں لینے کو تیار تھی۔ میت قبر میں اُتار دی گئی۔ قبر کی بغل میں چیر ویں کھدائی اس طرح کی گئی تھی کہ اس کا جسم پوری طرح اس میں سما گیا تھا۔ اُوپر پتھروں کی ترشی ہوئی سلیں پہلو بہ پہلو رَکھ کر چیر ویں کھپّے کو پاٹ دِیا گیا۔

بالا آگے بڑھا۔ اس نے بھر بھری مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر پہلے تو قبر پر ڈالیں اور پھر اُپنے سر پر ڈال کر پاگلوں کی طرح سر پیٹنے اور چیخنے لگا۔ وہ جنازہ اُٹھنے سے لے کر میت کے قبر میں اُترنے تک یوں چپ تھا' جیسے اُس نے جتنا رونا تھا' رو چکا تھا۔ اس کا یوں اچانک پھٹ پڑنا سب کو رُلا گیا تھا۔

اُس کے باپ نے ''حوصلہ' حوصلہ'' کہہ کر اُسے اپنے بوڑھے بازوؤں میں جکڑ لینا چاہا اور پھر اَپنی ہی بات کو دہراتے دہراتے رو رو کر دوہرا ہو گیا۔

مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ جا رہا تھا۔ میرے بھائی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

''مرنے والی کا جتنا غم کیا جائے اتنا ہی کم ہے کہ اُس نے اس گھر کو مکمل تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ اور جو بچا لیتا ہے اُس کا جنازہ اَپنے کندھوں پر اُٹھانا اور اَپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔''

میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے سوچا کیا میں چاہتا تو سیموں کے نصیب بدل سکتا تھا؟

مگر' اَب جب کہ وہ زمین میں دَبا دی گئی تھی' میں نے ایسا کیوں سوچا تھا؟

میں نے اَپنا سر جھٹکا۔ یوں جیسے اپنا دامن جھٹک کر تب الگ ہو گیا تھا جب سب کچھ ہو سکتا

تھا۔

سیموں کے مرنے کی وجہ مجھے معلوم ہوگئی تھی۔ اُسے بجلی کا شاک لگا تھا۔ قبرستان سے پلٹنے کے بعد جب میں اندر زنان خانے گیا تھا تو مجھے بجلی کے وہ تار دِکھائے گئے جو صحن کے اوپر سے گزارے گئے تھے۔

یہی تار ٹوٹ کر سیماں کی موت کا سبب بن گئے تھے۔

صحن میں سٹیل کا ایک تار دُھلے ہوئے کپڑے پھیلانے کے لیے شمال اور جنوب کی دِیواروں کے درمیان بندھا ہوا تھا۔ سیموں اُس پر گیلا کھیس ڈال رہی تھی کہ ایک جانب سے یہی تار کھل کر اُچھلا اور اُوپر سے گزرتے بجلی کے تاروں میں اُلجھ گیا۔

پورا کھیس بجلی سے بھر گیا تھا۔

کھیس بھی اور گیلی سیموں بھی ۔

پھر وہ اُچھلی اور دِیوار کی سمت سر کے بل گئی یوں کہ اُس کا سر ٹکرا کر کھل گیا تھا۔

اور اب جب کہ میں واپس شہر آ گیا ہوں۔ اور مجھے اُس کا اِنتظار ہے جو یہ جاننا چاہتی تھی کہ کہانی کیسے لکھی جاتی ہے؟ تو سوچ رہا ہوں کہ وہ آئے گی تو بتاؤں گا کہ حادثات کس طرح کہانی کا مواد بن جایا کرتے ہیں۔

لو وہ آ گئی ہے اور میری آنکھوں میں یوں جھانک رہی ہے کہ میں کہانی کا گُر اُسے بتانا بھول گیا ہوں۔ وہ میرے چہرے پر نظریں ٹکائے ٹکائے دھیرے سے کہتی ہے:

''میں جان گئی ہوں جی' کہ کہانی دُکھ سہے بغیر نہیں لکھی جاتی۔ محبت میں دُکھ۔''

وہ یہ ڈیڑھ آدھا جملہ میری لڑھکا کر خاموش ہو گئی ہے۔ میں کھسیانا ہو رہا ہوں۔ وہ مستقل چپ رہتی ہے۔ یوں کہ مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب وہ کچھ بھی نہ کہے گی۔

مگر اس نے سوال جیسا جملہ لڑھکا کر مجھے بوکھلا دیا ہے:

''آپ کی کہانیوں میں ایک لڑکی بار بار آتی رہی ہے

محبت کی علامت بن کر
کہیں وہ مرنے والی ہی تو نہیں ہے؟''

کہانی اور کرچیاں

واصف تو بس مجھے اُپنی نئی کہانی سنانے آیا کرتا تھا۔

مگر اب کے ملا تو یوں کہ اس کے ہاتھ میں کسی نئی کہانی کا مسودہ نہیں تھا۔

کہانی لکھ چکنے کے بعد اُس کے چہرے پر جو آسودگی ہوتی تھی، وہ بھی نہ تھی۔

وہ آیا اور چپ چاپ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کیا:

''لگتا ہے کہانی ازبر کرتے کرتے اِتنے دِن لگا دِیے''

وُہ چپ رہا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔

''خیریت تو ہے نا یار''

میں نے اُسے تھام کر کہا۔ اُس کا جسم تپ رہا تھا۔ مجھے دیکھا۔ نگہہ میں وہ چمک بھی نہ تھی۔ تشویش کی سنسنی میرے بدن میں تیرنے لگی۔ وُہ گم سُم رہا۔ بدن میں دوڑتی سنسنی جھنجھلاہٹ میں ڈھل گئی۔

''ارے بابا' کچھ بولو بھی۔کون سی نئی کہانی لکھی ہے تم نے؟''

ایک ثانیے کے لیے اس کے ہونٹ پھیلے پھر سکڑ گئے۔ چہرہ یوں ہی تنا رہا۔ پھر اس کی آواز کہیں دور سے آئی۔

''کہانی؟۔کیسی کہانی یار؟ مَیں اَب تک کہانیاں اِدھر اُدھر سے کشید کرتا رہا مگر''

''مگر کیا؟''

وہ چپ رہا' مَیں چڑ گیا۔

''تم اَپنی کہانی سنانے کے لیے کیسی پہیلیاں بجھوانا چاہتے ہو؟''

''پہیلی؟ پہیلی تو میری اَپنی زِندگی بن گئی ہے یار''

وہ خواب آلود لہجے میں بولا' سر جھٹک کر کہنے لگا:

''تم شانوں کو تو جانتے ہونا؟''

میں نے اُس بات کاٹی:

''تمھیں یاد ہے جب تم اور تمہاری بیگم اُس کے یتیم ہونے پر اَپنے گھر کے کام کاج کے لیے اُسے رَکھنا چاہتے تھے تو مَیں نے تم لوگوں سے کہا تھا؛ ایسا نہ کرو' مت رکھو اُسے اپنے گھر۔ جوان جہان ہے' کہیں اِدھر اُدھر منھ مار لیا تو''

واصف غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا' کہنے لگا:

''تم سے بات کرنا بھی کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ میری بھی سنو گے یا اَپنی ہی بکے جاؤ گے۔''

میں ٹک کر بیٹھ رہا۔ کہا:

''ہاں میں چپ ہوں' اب تم کہو؟''

وہ بیٹھ گیا' ساتھ ہی اُس کا لہجہ بھی دِھیما ہو گیا۔

''کیا کہوں دوست۔ میں جو کہنا چاہتا ہوں' لفظوں کے رحم ان کا مفہوم نہیں سہار سکتے''

میں نے اُسے ٹوکا:

''واصف' تم ایک مرتبہ پھر بہک رہے ہو۔''

''میں بہک گیا تھا''

اس نے کہا تو میں چونک اٹھا:

''تم بہک گئے تھے؟''

''ہاں' ہاں میں۔''

یوں لگتا تھا گویا واصف خواب میں بول رہا ہو۔ میں نے پوچھا:

''کیسے بہکے تھے تم؟''

اَب کے وہ سنبھل گیا۔ میرا سوال اَن سُنا کرتے ہوئے کہنے لگا:

''وہ، میرا مطلب ہے، شانوں پچھلے ہفتے آئی تھی' اُس کی گود میں نومولود بچہ تھا؟''

میں نے لعاب منہ میں اکٹھا کر کے یوں تھوکا گویا کوئی کڑوی شے چکھ لی ہو:

''حرامزادی! میں نے کہا تھا نا' وہ ضرور ایسا ویسا گُل کھلائے گی۔ وہی ہوا نا' جس کا ڈر تھا۔''

واصف نے میری بات کاٹی اور غصے سے مجھ پر پل پڑا:

''مت بولتے جایا کرو یونہی۔ تمہارے اَندازے ہمیشہ غلط اور بے ہودہ ہوتے ہیں''

''تو کیا اُس نے شادی کر لی تھی؟''

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ وُہ پھر برسا:

''میں نے کہا نا' مت بولا کرو بیچ میں۔ چپ رہو اور پہلے مجھے بات مکمل کر لینے دو۔''

میں چپ بیٹھ رہا تو اُس کے سانس بحال ہوئے۔ کہنے لگا:

''اُس کی گود میں نومولود بچہ تھا' جب کہ خود اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ میں نے اسے دیکھا تو سہم گیا۔ لفظ میرے ہونٹوں کی چوکھٹ سے پرے بارش میں بھیگی بلی کی طرح دبکے بیٹھے رہے۔ دروازے پر کھڑے چپ چاپ کئی لمحے بیت گئے۔ ''کون ہے؟ کون ہے؟'' کہتے ہوئے میری بیوی فاخرہ دروازے پر پہنچی۔ مجھے دیکھا تو باہر جھانکا؛ شانوں بچہ گود میں اُٹھائے ٹک ٹک' دِیدم دَم نہ کشیدم مجھے تک رہی تھی۔ فاخرہ ٹھٹکی۔ پوچھا:

''کس کا بچہ اٹھالائی ہو شانوں؟''

شانوں چُپ سہمی کھڑی رہی۔ فاخرہ نے مجھے ایک جانب دھکیلا' اُسے گھسیٹ کر آنگن میں لے آئی۔ کہا:

''اری نگ بھی' کس کا بچہ ہے یہ؟ اور کہاں رہی اتنا عرصہ؟

''شانوں بدستور چپ رہی۔ پوچھا''

''شادی کرلی؟''

اُس نے صرف نفی میں سر کو جنبش دی۔ فاخرہ چڑ کر بولی:

''کس کا بچہ اُٹھالائی ہو مردود؟''

اُس نے سسکاری بھری اور رُک رُک کر بہ مشکل روتے ہوئے کہا:

''نہیں بی بی جی نہیں۔''

''تو پھر حرام کا ہوانا!''

فاخرہ نے فیصلہ دِے دِیا۔

''توبہ توبہ' خدا کا قہر نازل ہو تم پر۔ ذِلیل کمینی آخر کم ذات ہی نکلی نا تم۔''

اب فاخرہ کا مخاطب میں تھا۔

''اِس کی شکل دیکھو اور اِس کے لچھن' منھ مومناں کرتوت کافراں۔ اللہ میری توبہ!''

اپنے کانوں کو چھونے کے بعد پھر اُس پر برس پڑی۔

''اب اِس حرام زادے کو میرے دروازے پر کیوں لائی ہو حرام خور؟ جس سے منھ کالا کیا ہے' اُسی کے پاس چل مر۔''

فاخرہ غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ شانوں کو دھکے دِے کر بچے سمیت باہر نکال دیا اور اندر سے کنڈی چڑھالی۔ اُس روز سے مجھے نیند نہیں آئی یار''

''تمھیں نیند نہیں آئی؟ آخر کیوں؟ کہیں تم گوئٹے کی طرح اسے

Marinanne-Von-Willemer تو نہیں سمجھ بیٹھے تھے۔''

میں نے ہنس کر کہا' تو واصف کہنے لگا:

''نہیں یار نہیں۔ میرینا نے کہاں اور شانوں کہاں۔ میرینا نے تو خوب صورتی کا شاہ کار تھی اور شانوں؟ شانوں تو بس واجبی سی صورت والی معصوم سی لڑکی ہے۔ فرینکفرٹ کے اُدھیڑ عمر مہاجن کی آسٹرین منکوحہ رقاصہ میرینا نے کا شانوں سے کیا مقابلہ' کہ اُس کی گفتگو بھی اس قدر پُر اثر اور شاعرانہ تھی' کہ گوئٹے کے لہو میں لفظ لفظ محبت کی گرمی بن کر دوڑنے لگتا تھا۔ اور شانوں' وہ تو بس ضرورت کے چند لفظ بول سکتی ہے۔''

مجھے محض اپنے مزاح کے اِس قدر سنجیدہ جواب کی توقع نہ تھی۔ گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے کہا:

''تو' تمہیں پھر نیند کیوں نہیں آتی؟''

واصف کہنے لگا:

''مجھے نیند کیسے آتی میرے دوست؟ نیند تو خدا کا عطیہ ہے' انعام ہے' جو وہ خُوش ہو کر آسمانوں سے نازل کرتا ہے۔ میں اَب اُس کی اِس نعمت کا حق دار کہاں تھا''

واصف حساس تھا' میں یہ جانتا تھا۔ جس کرب سے وہ گزر رہا تھا' میں اُسے شانوں کی خطا کاریوں کا فطری ردِعمل سمجھ رہا تھا۔ بات پھر شانوں کی جانب موڑنا چاہی:

''وہ کہاں گئی؟''

''کہاں جاتی؟''

اُس نے دِھیرے سے کہا اور پھر دِھیمے لہجے میں ہی کہنے لگا:

''رات بھر باہر دیوار سے لگ کر بچے کو لپٹائے رہی۔''

''رات بھر؟ میرا مطلب ہے' باہر گلی میں؟''

''ہاں' اور مجھ میں اِتنا حوصلہ نہ تھا کہ فاخرہ سے کہتا' انہیں اندر آنے دے اور......''

میں نے بے صبری سے اس کی بات کاٹی اور پوچھا:

''صبح جب تم اُٹھے' تو' تو کیا وہ باہر تھی؟''

''صبح اٹھا؟''

اُس نے حیرت سے میری جانب دیکھا' پھر کہا:

''ارے بابا کہا نا! کہ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ گو میں فاخرہ کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا مگر مجھے محسوس ہوتا تھا' بالکل ایسے' جیسے میں اُپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا' کہ شانوں وہیں دیوار سے لگی بیٹھی تھی' بچے کو گود میں سمیٹے۔ فاخرہ بڑبڑاتے بڑبڑاتے کب کی سو چکی تھی اور مجھے لگ رہا تھا' میری آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ گزرتے وقت کی ساعتیں میں گن سکتا تھا۔ گنتا رہا۔ مگر حوصلہ نہ تھا کہ قدم بستر سے نیچے دھرتا۔ صبح جب فاخرہ بستر سے اُٹھی اور مجھے کہا:

''کب تک یونہی بے سُدھ پڑے رہو گے؟''

تو میں جبر کر کے اُٹھا۔ باہر نکلا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔''

میں نے بے دھیانی سے جملہ لڑھکا دیا:

''چلی گئی ہو گی؟''

وہ خوابیدہ سا بولتا رہا۔

''چلی گئی؟ ہاں چلی گئی تھی۔ میں نے اُسے بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملی۔''

میں نے حیرت سے واصف کو دیکھا اور کہا:

''مگر تم؟ تم کیوں اُسے تلاش کرتے رہے؟''

''و......و......ہ بے آسرا تھی۔ اور مجھے اندیشہ تھا وہ کسی اور حادثے کا شکار نہ ہو جائے''

واصف کا اندیشہ بجا تھا' میں نے رائے ظاہر کی:

''وہ یقیناً وہاں چلی گئی ہو گی جہاں تمہارے ہاں سے بھاگ کر اتنا عرصہ رہی۔''

واصف بول پڑا:

''وہ وہاں نہیں گئی تھی''

میں چونکا:

''مگر تم یہ کیسے وثوق سے کہہ سکتے ہو؟''

وہ گڑبڑا گیا۔ کہنے لگا:

''م......م......میرا مطلب ہے وہ وہاں کیسے جا سکتی تھی؟ اُن لوگوں نے نکال دِیا ہو گا تب ہی تو ہمارے ہاں آئی ہو گی''

واصف کی رائے میں وزن تھا۔

''ہاں ایسا ممکن ہے''

میں نے اتفاق کیا۔ ایک بے آسرا لڑکی کے لیے جواب کنواری ماں بن چکی تھی' واصف کی اتنی بے چینی' میرے لیے خلاف توقع نہ تھی کہ اس کی بیشتر کہانیاں عورت کی مجبوریوں اور مظلومیت کے گھر گھومتی تھیں۔ شانوں کو نہلا پھسلا کر کسی نے بے آبرُو کیا تھا اور اب وہ ایک نومولود بچے کے ہمراہ بے آسرا ہو گئی تھی' اس واقعے کے زیر اثر واصف کا اپنی نیند کھو دینا اور اس قدر بے چین ہو جانا اس کی فطرت کے عین مطابق تھا۔

آئی بات' گزر گئی۔

وہ پہلے کی طرح کہانیاں لکھنے لگا اور وقفے وقفے کے بعد مجھے سنانے آنے لگا۔

پھر یوں ہوا کہ شانوں اور اس کا تین سالہ بچہ اچانک مجھے مل گئے۔

میں دارالامان کی عمارت میں توسیع کے منصوبے کی نگرانی پر تھا کہ وہ مجھے وہاں نظر آ گئی۔ میں نے چپکے سے اُسے جا لیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھونچکی رہ گئی۔ میں نے پوچھا:

''تم شانوں ہی ہو نا؟''

اس نے اَثبات میں سر ہلایا۔ میں نے بچے کی جانب اشارہ کیا:

''اور یہ؟''

''یہ امجد ہے میرا بیٹا۔''

''تم دارالامان کب آئیں؟''

میں نے بات بڑھانے کو کہا تو وہ جھوٹ بولتے ہوئے کہنے لگی۔

''و......وہ......میرا شوہر مر گیا تھا......نا......اس لیے۔''

اُس کی زُبان لڑکھڑا رہی تھی۔ میں نے کہا:

''تم نے یہ جھوٹ یقیناً دارالامان میں داخلے کے لیے بولا ہوگا؟''

''جھوٹ؟''

اس نے بوکھلا کر دُہرایا:

''ہاں۔کیا یہ بن باپ کا بچہ نہیں ہے؟''

میں ایک مرتبہ پھر امجد کی جانب اِشارہ کر رہا تھا۔

وہ سسک پڑی۔ چہرہ پلو میں چھپا لیا پھر لفظوں کو سمیٹا اور ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگی۔

''خدا کے لیے واصف صاحب کو نہ بتایئے گا کہ......''

''مگر کیوں؟''

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا:

''وہ تو تمہارے لیے بہت بے چین رہا ہے۔تمہیں تلاش کرتا رہا ہے۔''

''تلاش؟''

اس نے سسکاری بھری۔ خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر قہقہہ مار کر دیوانوں کی طرح ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ اُس کی ہنسی رُکی تو خوف سے چہرہ ایک مرتبہ پھر کانپنے لگا۔وہ بچے کی طرف بڑھی اور اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔کہنے لگی:

''میں خود اس کی حفاظت کروں گی اور اُنہیں اِس تک نہ پہنچنے دوں گی۔''

میں شانوں کے پاس بیٹھ گیا۔ پوچھا:

''بھلا تمھارے بیٹے کو اُس سے کیا خطرہ ہے؟''

شانوں کی ایک مرتبہ پھر گھگی بندھ گئی۔ رندھائی ہوئی آواز میں کہنے لگی:

''بچے کی پیدائش کے بعد غربی محلے والوں نے مجھے اُس گھر سے نکال دیا تھا جہاں میں کئی ماہ سے اکیلے رہ رہی تھی۔ اب صاحب جی کی چوکھٹ ہی میری آخری امید تھی مگر بیگم صاحبہ نے مجھے گھر سے ذلیل کر کے نکال دیا اور صاحب جی بس منہ دیکھتے رہے۔''

مجھے کچھ کھٹکا۔ میں نے بات کی وضاحت چاہی:

''تم بتا رہی تھیں کہ تم غربی محلے کے مکان میں رہتی تھیں۔''

''جی۔''

''وہ مکان کس نے لے کر دیا تھا تمہیں؟''

''جی وہ صاحب جی نے کرائے پر لے کر دیا تھا مجھے' میں اُن کے گھر سے سیدھا وہیں گئی تھی''

مجھے واصف کی عظمت پر رشک آنے لگا۔ ایک ادنیٰ سی ملازمہ کی غلطی کو چھپانے اور اُسے دوسروں کی نظروں سے گرنے سے بچانے کے لیے اُس نے اسے علیحدہ مکان تک لے دیا تھا۔
میں نے اسے بات جاری رکھنے کو کہا تو وہ کہنے لگی:

''رات کے پچھلے پہر صاحب جی گلی میں نمودار ہوئے۔ میں اپنے بچے کو لپیٹے وہیں دبکی بیٹھی تھی۔ کہنے لگے:

''لاؤ بچہ مجھے دو' میں اس کا قصہ یہیں ختم کر دوں۔''

میں نے بچہ دینے سے اِنکار کر دیا۔ اُنہوں نے چھیننا چاہا تو میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور کچھ نہ پوچھیں جی' یہاں تک پہنچتے پہنچتے میں کن کن مرحلوں سے گزری

ہوں۔ دیکھیں نا جی‘ بچہ تو بچہ ہوتا ہے نا۔ گورا کالا‘ خوب صورت بدصورت‘ صحت مند معذور یا پھر حلالی حرامی کچھ نہیں ہوتا۔ اور ممتا بھی تو جی ممتا ہوتی ہے نا! اس میں بھی اور کوئی کھوٹ نہیں ہوتا جی۔ گناہ گار تھی تو میں تھی۔ میری ممتا یا بچہ تو گناہ گار نہ تھے۔ پھر میں اَپنی ممتا کیوں مارتی‘ بچہ اُن کے حوالے کیوں کرتی؟‘‘

یک دَم اُس کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑے اور کہنے لگی:

’’آپ خدا کے لیے صاحب جی کو مت بتایئے گا ورنہ......ورنہ......وہ میرے بچے کو مار ڈالیں گے۔‘‘

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر بچہ اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ میں نے اُس کا حوصلہ بحال کرنے لے لیے کہا:

’’نہیں نہیں اب بھلا وہ تمہارا بچہ کیوں مارے گا؟ اُس روز تو اُس نے محض یہ سوچا ہوگا کہ بن باپ کے بچے کے ساتھ تمہاری زِندگی کٹھن تر ہو جائے گی۔ وہ شخص کہ جس نے ساری عمر عورت کی مظلومیت کو اَپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ عملی طور پر بھی تمہارے ساتھ بہت ہم دردانہ سلوک کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ تم بن باپ بچے کی ماں بن رہی ہو‘ تمہیں معاشرے کے ظلم سے بچانے کے لیے علیحدہ مکان تک لے کر دیا۔ تمہیں تلاش کرتا رہا اِدھر اُدھر۔ وہ بھلا تمہارا بچہ اب کیوں مارے گا؟‘‘

’’بھولے ہیں صاحب جی آپ بھی۔‘‘

اُس نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ پھر اُس کا چہرہ پہلے کی طرح متفکر ہو گیا۔ کہنے لگی:

’’اب بھی میرا امجد اُنہیں نظر آ گیا تو وہ ضرور اُسے مار ڈالیں گے۔ ہاں ضرور۔‘‘

میں نے جھنجھلا کر کہا:

’’مگر کیوں؟‘‘

اُس نے لمبی سانس بھری، بیٹے کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور کہا:

''اِس لیے کہ امجد صرف میرا ہی نہیں، صاحب جی کا بھی بیٹا ہے اور ایسا بیٹا جسے وہ اپنا نہیں کہہ سکتے۔''

ایکا ایکی حیرت انگیز خامشی اور اضطراب میرے اندر جا گھسا۔ میری نظر پھسلتے پھسلتے بچے پر جا پڑی۔ یہ واصف کی کیسی کہانی تھی، جو اُس کے نجیب بت کو سفاکیت سے کرچی کرچی کر کے میرے قدموں میں ڈھیر کر رہی تھی۔

واپسی

محض ایک ہفتہ باقی تھا اور وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھا تھا۔

حالاں کہ اُس کے بارے میں اُس کے ماتحت کام کرنے والے اور اعلیٰ افسران دونوں رائے رَکھتے تھے کہ وہ لاتعلق ہو کر بیٹھنے والا یا مشکل سے مشکل حالات میں بھی حوصلہ ہارنے والا فرد نہیں' آخری لمحے تک جدوجہد کرتا تھا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ دوسرا روز ہونے کو تھا اور وہ دفتر سے نہ نکلا تھا۔

اُن دو دنوں میں وہ ایک خط بار بار پڑھ چکا تھا۔

یہ وہ خط تھا' جو بہت دِن پہلے اُسے موصول ہوا تھا اور اُسے کھولے بغیر خط کا مضمون جان گیا تھا۔ یہی کہ اُس کے اَبّا نے اُسے گاؤں آنے کو کہا ہوگا اور یہ کہ اُن کی آنکھیں اُسے دِیکھنے کو ترس گئی ہوں گی۔

اُس کا اِرادہ تھا کہ وہ کلوزنگ کے بعد ہی جائے گا۔ لہٰذا کئی روز سے بند لفافہ یونہی اُس کے ٹیبل پر پڑا رہا۔

مگر کل اُسے صبح ہی صبح کھولا اور تب سے اَب تک کئی بار پڑھ چکا تھا۔

اس نے اپنے اِمی جیٹ باس کو فون کر کے شارٹ لیو اور اسٹیشن لیو لے لی اور یوں آج اَڑھائی بجے والی بس سے وہ گاؤں جا رہا تھا۔

اُس کا اِرادہ تھا وہ ویک اِنڈ اَپنے والدین کے ساتھ گزارے گا' حالاں کہ قبل ازیں وہ چھٹیوں والے دن بھی سرکل افسران کے ساتھ مسلسل دورے کرتا رہا تھا جس کے نتیجے میں ٹارگٹ تک پہنچنے کی امید بندھ چلی تھی۔ جب پہلے روز اُس نے انٹر کام پر متعلقہ سرکل افسر کو بتایا کہ وہ

ٹور پر ساتھ نہیں جارہا تو وہ حیران ہوا تھا اور خود اُسے دیکھنے آیا تھا۔

وہ بجھا بجھا سا تھا اور سرکل اَفسر سے کُرید کُرید کر فضل احمد کے بارے میں پوچھتا رہا۔

اُسے بتایا گیا کہ بوڑھے فضل احمد کی حالت سنبھل گئی تھی۔ دِل کا معمولی دورہ تھا اور اب اس کی زِندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

مگر نہ جانے اُسے کیوں یقین نہ آرہا تھا۔

یقین نہ کرنے کی بہ ظاہر کوئی وجہ نہ تھی لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو ایک لمحے میں مقید کر لیتا ہے۔

وہ بھی ایک ایسے ہی لمحے میں قید تھا۔

وہ لمحہ کہ جب بوڑھا فضل احمد عین دروازے کے بیچ لڑکھڑا کر گر پڑا تھا۔

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب مالی سال ختم ہونے میں دو اڑھائی ماہ باقی تھے۔ وہ اپنی سی کوششیں کر بیٹھا تھا مگر یوں لگتا تھا' مطلوبہ نتائج اس کی دسترس سے پرے تھے۔

اُس نے میٹنگ کال کی' تمام متعلقہ اَفسروں کی سرزنش کی تو ہر ایک یہ ثابت کرنے پر تُلا بیٹھا تھا کہ کوتاہی اُس کی جانب سے نہیں ہو رہی۔

اس نے نئی حکمت عملی تیار کرنے سے پہلے متعلقہ سرکل افسروں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے اپنے حلقوں کے ایسے کیسز کی فہرست بنائیں جن کی وصولیاں اِس سال کسی صورت ممکن نہ تھیں۔

فہرستیں دوسرے ہی روز اُس کے میز پر تھیں۔

اُس نے اعلیٰ حکام سے رابطہ کیا اور کچھ غیر معمولی اِختیارات حاصل کیے جن میں بہ وقت ضرورت پولیس کے تعاون کا حصول بھی شامل تھا۔

اُس کا اِرادہ تھا ان مشکل کیسز کے آپریشن کی خود نگرانی کرے گا۔

ایک مرتبہ پھر سرکل افسروں کو طلب کیا' ہر باقی دار کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں اور خدا کا نام لے کر چھاپے مار کر مہم کا آغاز کر دیا۔

اُسے باہر نکلتے دیکھ کر سرکل افسروں کے حوصلے بڑھ گئے اور پہلے سے کہیں زیادہ جاں فشانی سے کام کرنے لگے یوں وصولیوں کی شرح بڑھنے لگی مگر وہ ابھی تک مطمئن نہ تھا کہ بڑھوتری کی یہ شرح بہت معمولی تھی۔

اُس کے لیے اصل رکاوٹ بااثر اَفراد تھے یا پھر وہ لوگ جو ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ کچھ کیسز خواتین کے نام پر تھے اور کچھ باقی دار انتہائی ضعیف' معذور یا پھر لاچار تھے۔ ایسے تمام کیسز میں نہ تو اس کے پاس وقت تھا کہ رہن شدہ جائیدادوں کی ڈگری کے لیے طویل قانونی جنگ لڑی جائے اور نہ ہی وہ براہ راست ان لوگوں پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔

اِن حوصلہ شکن حالات میں اُسے ایک باقی دار فضل احمد کے گھر لے جایا گیا۔ اس کیس میں فضل احمد اور اُس کے بیٹے ڈاکٹر شہباز فضل نے مشترکہ طور پر ایک ہیچری لگانے کے لیے قرض لیا تھا۔ ڈاکٹر شہباز فضل کچھ ہی عرصے کے بعد اِنتہائی خاموشی سے ہیچری کی مشینری بیچ کر اور عمارت کو طویل مُدت کے ٹھیکے پر دینے کے عوض ایک معقول رقم اینٹھ کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ جب کہ فضل احمد نہ صرف ضعیف العمر تھا' بل کہ فالج زدہ بھی تھا۔

اُس نے سرکل افسر سے پوچھا:

''فضل احمد کا بیٹا جو رقم باہر سے بھیجتا ہے' یہ اسے اپنے واجبات کی مد میں کیوں جمع نہیں کراتا؟''

جواب ملا:

''وہ کچھ نہیں بھیجتا۔''

اُس نے حیرت سے سرکل افسر کو دیکھا اور کہا:

''تعجب ہے۔''

فضل احمد کا گھر اَندرون شہر تھا۔ گاڑی بڑے چوک تک جاتی تھی۔ وہیں کھڑی کر دی گئی۔ وہ دونوں ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں سے پیدل ہی آگے گزرنے لگے۔

’’سر، یہ رہا فضل احمد کا گھر۔‘‘
چلتے چلتے اچانک سرکل افسر نے ایک دو منزلہ عمارت کی جانب انگلی اٹھائی۔
’’گھر تو شاندار ہے‘‘
اُس نے دیکھا تو تبصرہ کیا۔
’’جی ہاں! مگر نچلا حصہ کرائے پر ہے اور فضل احمد کا واحد ذریعہ آمدن بھی یہی ہے۔‘‘
مکان کے پہلو میں تنگ سی لوہے کی سیڑھی بل کھاتی اوپر جاتی تھی۔
وہ دروازے پر تھے۔ کال بیل کے پش بٹن پر اُس نے انگلی رکھ دی۔ سرکل افسر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا:
’’بٹن دبا کر اِنتظار کرنا بے کار ہے سر۔ گھنٹی خراب ہے‘‘
’’اوہ‘‘
’’میں جب سے آ رہا ہوں سر' تب سے ایسے ہی ہے' سر‘‘
دوسری طرف پہلے کوئی کھانستا ہی چلا گیا پھر کھانسنے کی آواز وہیں ٹکی رہی اور لاٹھی کے گھسٹنے اور ٹک ٹک کرنے کی آواز دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ دروازے کے پاس آ کر آواز رُک گئی اور یوں لگا جیسے کوئی سانس بحال کر رہا ہو۔ تیسری آواز جو اندر سے آئی وہ دروازے پر لگی زنجیر کی تھی جو جھولنے اور رگڑ کھانے سے پیدا ہو رہی تھی۔ دروازہ بھی ’’چوں اوں‘‘ کرتا ہوا کھلا۔ سامنے اِنتہائی ضعیف العمر خاتون لاٹھی کے سہارے بہ مشکل کھڑی تھی۔ سارے چہرے پر یا جھریاں تھیں یا پھر موٹے شیشوں اور ٹوٹی ہوئی کمانی کی میلی کچیلی عینک' جسے ڈوری باندھ کر ناک پر ٹکایا گیا تھا۔ بال روئی کے گالوں جیسے سفید اور کمر ضعیفی نے دوہری کر دی تھی۔
اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے عینک کے اوپر اوٹ بنائی' چہرے کو اوپر کیا تو عینک کے شیشوں سے موٹی موٹی آنکھوں نے اُسے پہچاننے کی کوشش کی۔
’’جی‘‘

اُپنی کوشش میں ناکام ہو کر اس نے مختصر سوال کیا۔

''اماں جی ہمیں فضل احمد سے ملنا ہے اُن کے ذمہ حکومت کا کچھ قرضہ باقی ہے۔''

بڑھیا نے ایک مرتبہ پھر اُسے دیکھنے کی کوشش کی۔ اب کے اس کے چہرے پر تجسس کی بہ جائے پریشانی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

اس لڑکھڑاہٹ میں بڑھاپے اور پریشانی دونوں کا دخل تھا۔ کہنے لگی۔

''اندر آجاؤ بچے' وہ سامنے کمرے میں پڑا ہے۔''

وہ اندر داخل ہو گئے۔ بڑھیا نے دروازے کو بند کیا۔ ٹٹول کر زنجیر تلاش کی اور دروازے پر ڈال دی۔ پھر لاٹھی ٹیکتی کمرے کی طرف چل پڑی۔

اندر کا ماحول عجب آسیب زدہ تھا۔ ہر چیز بکھری ہوئی۔ روشنی بھی معقول نہ تھی۔ ایک خاص قسم کی باس بھی چاروں طرف پھیل رہی تھی' کچی کچی اور ناگوار۔ سامنے چارپائی پر ہڈیوں کا ایک پنجر پڑا تھا۔ یقیناً وہی فضل احمد تھا۔ اُسے کھانستے ہوئے بھی دِقت ہو رہی تھی۔ ہمارے گھر میں داخل ہونے کے بعد کھانسنے کے علاوہ اس نے تین مرتبہ اپنی بیوی کو بلایا تھا۔

''مل لی آں''

اس نے اندازہ لگایا۔ وہ مریم یا مریاں کہہ رہا تھا۔ فالج نے ایک پہلو ناکارہ کرنے کے علاوہ اس کی زبان بھی لکنت زدہ کر دی تھی۔

وہ دونوں اس کے قریب پہنچ گئے۔ بوڑھا بے قراری سے بستر پر اُوپر ہی اوپر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جوں ہی اس نے اُس کے پیچھے سرکل افسر کا چہرہ دیکھا' دھچکے سے بستر میں دھنس کر بے سدھ ہو گیا۔ وہ ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں مزید گہرا سکوت چھا گیا۔

''یہ ہمارے بڑے افسر ہیں۔''

سرکل افسر نے اُس کا تعارف فضل احمد سے کرایا۔ بوڑھے نے بجھی بجھی آنکھوں سے اُسے

دیکھا۔اُس نے جواباً فائل کھولی۔ اُس میں فضل احمد اور اُس کے بیٹے کے وارنٹ دیکھے اور بے بسی سے فائل بند کر دی۔ اسے یہاں آنا بے سود لگا۔بوڑھا حواس بحال کر چکا تھا مریل سی آواز میں بڑبڑانے لگا۔ اُس نے یونہی ایک سوال پھینک دیا:

''بزرگو!اب کیا ہوگا؟''

بوڑھے نے اُس کی جانب دیکھا۔ مایوسی کی زردی اُس کے چہرے پر بکھر گئی۔ لکنت زدہ آواز میں کہنے لگا:

''اب کیا ہونا ہے بچے؟ ہو بھی کیا سکتا ہے؟اِس سے بڑھ کر تو میں ذلیل ورسوا نہیں ہو سکتا نا!۔''

ایک مرتبہ پھر بوڑھا چپ ہو گیا۔

ان خاموش لمحوں کی گونج اُسے صاف سنائی دِے رہی تھی۔ اُس نے اُکتاہٹ سے پہلو بدلا۔ بوڑھے کی کھانسی نے خاموشی کو توڑا۔ جب وہ اچھی طرح کھانس چکا تو اَپنی بیوی کو پکارا:

''مل لی آں''

مریاں' جو دروازے کے بیچ ہی چوکھٹ پر بیٹھ گئی تھی' کراہنے کے بعد اُٹھی۔ لاٹھی ٹیکتی بوڑھے کی چارپائی کے پائیتانے ہاتھ ٹیک کر کھڑی ہو گئی:

''بچوں کے لیے چائے بناؤ۔''

اُسے پہلے ہی اُلجھن ہو رہی تھی۔ چائے کا سُن کر وہ بے قراری سے اُٹھا اور سختی سے منع کر دیا۔ بوڑھا دوبارہ بے سُدھ لیٹ گیا۔بڑھیا دائیں کونے میں رَکھے چولہے کے پاس دَھرے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

وہ مزید بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ کہنے لگا:

''اچھا بزرگو' خدا حافظ' اور ہاں بیٹے کو لکھیں کہ وہ بقایا جات جمع کرانے کا بندوبست کرے ورنہ اس مکان سمیت آپ کی ساری جائیداد نیلام ہو جائے گی۔''

بوڑھا زور سے ہنسا۔ اِس قدر زور سے کہ اُس کی آنکھوں میں سے آنسو نکل آئے پھر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سچ مچ رونے لگا۔ دفعتاً رونا موقوف کیا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ اسے تجسس ہوا' نہ جانے بوڑھا کیا کہہ رہا تھا؟ وہ ایک مرتبہ پھر قریب ہو کر بیٹھ گیا اور سماعت بوڑھے کی طرف مبذول کر دی۔ فضل احمد اپنے بیٹے کو گالیاں دیتے ہوئے کہہ رہا تھا:

''کہتا ہے بچوں کو عین دورا ہے میں کیسے چھوڑے' ہم چاہے موت اور زِندگی کے بیچ لٹکتے رہیں''

مغلظات کا ایک اور ریلا اُس کے منہ سے بہہ نکلا۔ مریاں پہلی مرتبہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''نہ دے' نہ دے بددعائیں۔ اپنا خُون ہے' اپنا کلیجہ' دُعا کر' خدا اُسے سُکھی رکھے۔ جہاں رہے اللہ کی امان میں رہے۔ ہمارا کیا ہے۔ ہم قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ آج ہیں تو ہیں۔ کل نہیں ہوں گے''

اُس نے بوڑھے سے پوچھا:

''کوئی خط وغیرہ؟''

کہنے لگا:

''ہاں لکھتا ہے۔ جب ادھر سے دَس بارہ مسلسل لکھ چکتا ہوں تب ایک آدھ سطر میں جواب دے دِیتا ہے۔ کہتا ہے وہاں بہت مصروف ہے۔ ماں کا......''

اُس نے فضل احمد سے کہا:

''آپ اس کا پتا ہی دِے دِیں۔''

''پتا؟ مگر کیوں؟''

''ہم اَپنے طور پر اُس سے رابطہ کریں گے۔''

بوڑھا فضل احمد تڑپ کر اُٹھ بیٹھا:

''نا بیٹا نا۔ تم اُسے کسی مشکل میں ڈال دو گے۔ تم اُسے ستاؤ گے۔ سفارت خانے کو لکھو گے۔ نا بیٹا نا''

بوڑھا پوری طرح حواس میں آ کر چوکس ہو گیا تھا۔ اُسے حیرت ہوئی۔ ابھی ابھی وہ اپنے بیٹے سے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہوئے گالیاں دے رہا تھا اور اب اسے اس کی اتنی فکر تھی کہ وہ ہمیں اس کا پتا تک نہ دینا چاہتا تھا۔

⚔

چند ہی روز بعد اسے بتایا گیا کہ فضل احمد کی بیوی جل مری۔ بچاری کھانا پکاتے پکاتے اُٹھی اور لڑکھڑا کر عین چولہے کے اوپر جا گری۔ اُس کی چیخیں سن کر بوڑھا گرتا پڑتا' اُس کی جانب لپکا' اسے بچانے کی کوشش کی۔ خود جھلس گیا مگر اُسے بچا نہ سکا۔

اس کا دِل چاہا کہ وہ بوڑھے فضل احمد سے افسوس کرنے جائے مگر جا نہ سکا۔

اُس کے لیے ایک ایک دِن قیمتی تھا۔

آخری مہینہ شروع ہو چکا تھا اور منزل تک پہنچنے کی اُمید بھی بندھ چلی تھی۔

ابھی اس واقعے کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سرکل افسر نے بتایا:

''ڈاکٹر شہباز فضل آیا ہوا ہے۔''

یقیناً اُسے ماں کے جل مرنے کی خبر ملی ہوگی۔ اُس نے اندزہ لگایا۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ اس کے دِل میں ڈاکٹر شہباز کے لیے اِنتہائی نفرت جنم لے چکی تھی۔ جذباتی ہو گیا اور سرکل افسر کو ہدایت کی کہ چھاپہ مارنے کے اِنتظامات کیے جائیں۔

مغرب ڈھل چکی تھی۔ اسے یقین تھا وہ گھر میں ہی ہوگا۔

وہ گھر میں ہی تھا۔ دروازہ اُسی نے کھولا اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا'

پوچھا:

''آپ ہی ڈاکٹر شہباز فضل ہیں؟''

''جی''

وہ کچھ اور پیچھے ہٹا۔

''آپ حکومت کے نادہندہ ہونے کے سبب مطلوب ہیں۔ یہ رہے آپ کے وارنٹ۔''

اُس نے اُسے وارنٹ دِکھاتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور کمرے میں گھس گیا۔ اِسی اثنا میں بوڑھا فضل احمد گرتا پڑتا کمرے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

''نہیں بیٹے نہیں۔''

اُس نے دروازے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''تم اِسے گرفتار نہیں کر سکتے۔''

وہ آگے بڑھا اور کہا۔

''دیکھیں بابا جی' آپ کارِ سرکار میں مداخلت نہ کریں۔ آپ ایک طرف ہو جائیں''

اُس نے اُپنا ہاتھ بوڑھے کے ہاتھ پر رکھا۔ بوڑھے کا پورا بدن کپکپانے لگا۔ چہرے کے مسام پسینے سے بھر گئے۔ اس نے بوڑھے کو ایک طرف کرنے کے لیے اُس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالا تو وہ چیخنے لگا:

''مت گرفتار کرو میرے بیٹے کو۔ مجھے لے جاؤ۔ ہاں لے جاؤ مجھے۔ وہ......''

اس کے آگے وہ کچھ نہ بول سکا اور لڑکھڑا کر کٹے ہوئے درخت کی طرح عین دروازے کے بیچ گر گیا۔

اس نے کمرے اندر سہمے ہوئے ڈاکٹر شہباز فضل کو دیکھا پھر اُس کے باپ کے لڑکھڑا کر

گرتے وجود پر ایک نظر ڈالی اور واپس پلٹ آیا۔

اِس واقعے کو دوسرا روز ہو چلا تھا۔

اور اُس نے وہ خط جو کئی دِن سے اُس کے ٹیبل پر بند پڑا تھا' اِن دو دِنوں میں کئی بار پڑھ ڈالا تھا۔ اور جب وہ اڑھائی بجے والی بس سے ایک طویل عرصے بعد اپنے گاؤں ویک اینڈ گزارنے جا رہا تھا تو سب تعجب کا اِظہار کر رہے تھے۔

اپناسکّہ

:×: ''یا حضرت ! بیان جاری ہو''

:=: ''بیان؟ ارے نادانو! میں کیا' میرا بیان کیا۔ میں پہلے خود بہکا تھا۔ پھر اپنی آل کو بہک جانے دیا۔ اور اب لوٹ جانے کو مٹی میں کودے پھرتا ہوں۔ سمجھو تو یہ دنیا بڑی اشتہا انگیز ہے۔ پانیوں میں غوطہ زن نچلی ذات کی ان لڑکیوں کی طرح 'جن کا کبھی بھگوان کرشنا بہت دل دادہ تھا۔ اور جن کو بے لباس دیکھنے کے لیے تالاب کنارے چھپ بیٹھا تھا۔ اور چپکے چپکے اشنان کرتی سب ناریوں کے کپڑے اکھٹے کیے تھے۔ اور جھاڑیوں میں چھپا ڈالے تھے۔

ارے او نادانو! میں بھی تمہاری طرح دیوانہ تھا۔ دُنیا کو ننگی آنکھ سے دیکھنا چاہتا تھا' آخری سرے تک۔ اور میں اُس کا لباس چھپائے مطالبہ کیا کرتا تھا کہ وہ دونوں ہاتھ اُٹھائے آہستہ خرامی سے گہرے پانیوں سے نکلے گی تو ستر ڈھانپنے کو لباس لوٹاؤں گا۔ ورجل نے کہا تھا۔''اگر میں دیوتاؤں سے اپنی نہیں منوا سکتا تو میں جہنم میں ہلچل مچا دوں گا'' اور وہ ناریاں بھی اسی کے کہے پر عمل پیرا تھیں۔ وہ مجھ سے اپنی التجائیں نہ منوا سکی تھیں اور جہنم میں ہلچل مچ چکی تھی۔

تو اے نادانو' اُس کا مجھے بعد میں شعور ہوا کہ دنیا اُپنی چال چل رہی تھی۔ جو وہ چاہتی تھی' وہی مجھ سے مطالبہ کراتی رہی اور میں اسے پانیوں سے نکالتے نکالتے خود گہرے پانیوں میں گر پڑا۔"

xx ''ابا جی' نکلیں نا باہر۔''

:x: ''رہنے دو۔ ارے او لونڈو! یا حضرت کو اپنے حال میں مست رہنے دو۔ مت چھیڑو انہیں۔ اعلیٰ حضرت بیان فرما رہے ہیں۔''

xx ''لوگو! خدا کے لیے اَپنی اَپنی راہ لو۔ یہ بزرگ' ہمارا باپ ہے۔ ذرا من موجی ہے کہ گندھی ہوئی مٹی میں قدم دھرے تم سے عجیب بہکی بہکی باتیں کرتا رہتا ہے۔ ورنہ اس کا تو اپنا گھر ہے۔''

:=: ''گھر؟ ہاہاہا۔ اپنا گھر؟ چپ ہو جاؤ عاقبت نا اندیشو! چپ ہو جاؤ۔ تمہارے دِھیان نے ہی تو مجھے گھر سے نکالا تھا۔ میرے اپنے گھر سے۔ تمہارے دھیان نے۔ ہاں تمہارے دھیان نے۔''

:x: ''ارے صاحبزادو! تم بے شک اعلیٰ حضرت کے چشم و چراغ ہو' مگر اعلیٰ حضرت تو اس وقت جلال میں ہیں۔ دیکھو تو' ان پر مراقبے کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ دیکھو تو' ان کے ہونٹ تھر تھرا رہے ہیں اور لفظ قطرہ قطرہ پھسل رہے ہیں۔ پاس پاس ہو جاؤ۔ تم بھی سنو اور ہمیں بھی سننے دو۔ لو سنو!''

:=: ''وہ ایک ایسا تاریک غار تھا کہ سورج بھی اُس سے آنکھ بچا کر نکل جایا کرتا تھا۔ یہی مناسب جگہ تھی۔ وہ غار میں داخل ہو گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایک کتا بھی چلا آیا تھا' نہ جانے کیوں؟ لاکھ اُسے واپس بھیجا گیا' مگر کتا تھا کہ واپس پلٹنے کا نام نہ لیتا تھا۔ جب وہ غار میں تھے تو کتا اُس کے دَہانے بیٹھا ہوا تھا' یوں کہ جیسے پہرا دے رہا ہو۔''

جانتے ہو کون تھے وہ؟ کیوں چھپے بیٹھے تھے وہاں؟
مگر تم کیا جانو۔"

×× "ابا جی ابا جی خدارا ہوش میں آئیں۔ گھر چلیں"

:=: ہوش؟ ہاہاہا۔ ہوش۔ کیسا ہوش؟ کہ میں تو بدن کی دَلدل میں اَپنی چوٹی تک دَھنسا ہوا ہوں۔ یہ سَت تو بَس ذرا سَت ہے۔ اِس میں چِت کہاں؟ اور چِت بنا آنند پاؤں تو کیسے؟

×× "مگر ابا جی۔"

:×: "صاحبزادو! اعلیٰ حضرت کو مت ستاؤ۔ بیان جاری رہنے دو۔"

:=: "ارے نادانو! یہ چُپ کیسے بیٹھیں گے؟ یہ میرے بیٹے تو دراصل راون کا دوسرا بہروپ ہیں۔ شیطان راون کا دوسرا جنم۔ اور میں بھگوان ہنومان کی منت سماجت کر رہا ہوں۔ وہ میری مدد کو راضی ہو گیا ہے۔ مگر اس شرط پر کہ مجھے اس کے جڑواں بھائی کو ختم کرنے میں مدد دینی ہے۔ بارہ سال لمحہ لمحہ کر کے بیت چکے ہیں اور میں خُوش ہوں کہ ہنومان کے لیے میں پل تعمیر کر چکا ہوں۔ مگر اب یہ خدشہ میرے اندر جڑ پکڑ چکا ہے کہ جب میں ہنومان کی مدد سے سیتا تک پہنچوں گا تو نہ جانے اس پر کیا بیت چکی ہوگی؟ نہ جانے کیا اور کون جانے بیت چکی ہوگی۔"

×× "ابا جی ابا جی ہوش کریں ابا جی دیکھیں ہم آپ کے بیٹے آپ کو لینے آئے ہیں۔"

:×: "رُک جاؤ اعلیٰ حضرت کے جگر پاشو! اعلیٰ حضرت تو مراقبے میں ہیں۔ اُن کے دھیان میں خلل نہ ڈالو۔"

×× "لوگو ہمیں لے جانے دو اپنے ابا جی کو۔ دیکھو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ ہم معاشرے کے عزت داروں میں اَہم مَقام رَکھتے ہیں اور جب عزت دار پوچھتے ہیں کہ تمہارے ابا جی کو کیا ہوا؟ تو ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں"

:=: ''شرم؟ ہاہاہا۔ شرم؟ ارے او نادانو! یہ میرے بیٹے اور شرم؟ جانتے ہو نا دُرگا کو؟ ارے پاروتی کو؟ ارے وہی وہی جسے تم کالی دیوی کہتے ہو۔ ہاں بھئی وہی جو الف ننگے مجسمے کی صورت بھگوان شیوا کے بے جان جسم پر سوار ہے اور جس کی زبان سے خُون کے قطرے ٹپکتے دِکھتے ہیں۔ اور جس کے ایک ہاتھ میں پھندا' نوک دار برچھی' خُون آلودہ تلوار اور کٹا ہوا اِنسانی سر ہے۔ ہاں' اُسی پر میں نے اپنے باطن کے تمام پاکباز بچے قربان کیے تھے' تب یہ ناہنجار میرے ہاں پیدا ہوے تھے' جن

کے سراَب میرے نام پر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ ۔ بے شرم۔ بے شرم۔''

:×: ''صاحبزادو! تھوڑا سا پیچھے ہٹ جاؤ۔ دیکھو تو اعلیٰ حضرت جلال میں ہیں۔''

×× ''مگر' لوگو' ہمیں تو اِنہیں ساتھ لے جانا ہے۔''

:=: ''اَرے او ناہنجارو! تم' تم مجھے لے جانے آئے ہو؟''

×× ''جی' ابا جی ہم آپ کو اَپنے ساتھ اَپنے گھر لے جانے آئے ہیں۔''

مگر بے شرمو! میرا گھر تو یہی گارے کی گھانڑی ہے اور تم جسے اَپنا گھر کہتے ہو نا! وہاں تم نہیں تمہارا خوف رہتا ہے۔ ایسا خوف جو اَسلحہ اُٹھائے دربانوں سے بھی نہیں رکتا۔ میرے سر پر تو فلک جیسی مضبوط اور خوبصورت چھت ہے۔ جب کہ تمہارے خوف نے لوہے اور سیمنٹ سے چھت بنا کر فلک جیسی چھت بنانے والے کے ساتھ شرک کیا ہے۔ تم میرے بیٹے نہیں' خوفزدہ مشرک ہو۔ میں مشرکوں کے ساتھ بھلا کیسے رہ سکتا ہوں؟ کیسے؟ کیسے؟''

:×: ''اللہ''

:×: ''اللہ''

:×: دیکھو صاحبزادو! اب اعلیٰ حضرت پھر مراقبے میں ہیں۔اب اِنہیں مت ستاوٴ۔اور دیکھو تو' ان کے ہونٹوں سے لفظ تسبیح کی طرح دانہ دانہ پھسل رہے ہیں۔ آوٴ سماعتوں کی جھولیاں پھیلائیں۔اور دِلوں پر پڑے قفل کھولیں۔آگے بڑھو' سنو۔

:=: ''وہ اپنے شہر اِفسس کو چھوڑ کر غار میں جا بیٹھے تھے۔ کچھ کہتے ہیں وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا اور کچھ کہتے ہیں' پانچ یا سات تھے اور چھٹا یا پھر آٹھواں اُن کا کتا۔ حالاں کہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کہ صحیح تعداد سوائے اللہ کے' کوئی نہیں جانتا۔ ہاں تو اے نادانو! اُن میں ایک شخص تھا؛ یملیخاہ۔اور میں اس کا ظل ہوں''

×× ''مگر ابا جی! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ چلیں' چلیں بھی نا اپنے گھر۔''

:=: ''دیر؟ ہاہاہا' دیر' وہ تو ہو بھی چکی۔ میں گزرے وقت کے پانی میں غوطے پہ غوطہ لگاتا ہوں' مگر گہری تہہ میں فقط ریت ہی ریت ہے۔ ایسی ریت کہ میں اوپر اٹھتا ہوں تو وہ میری مٹھی سے پھسل کر پھر نیچے جا پڑتی ہے۔ اس کارِزیاں میں وقت گزرتا چلا گیا ہے۔ میری مٹھی خالی ہے اور میرے اعصاب ٹوٹ چکے ہیں۔''

×× ''ابا جی' ابا جی! خدارا گھر چلیں۔''

:=: ''حرام خورو! دفع ہو جاوٴ کہ تمہاری عورتیں مجھے دیکھ کر تمہیں گھر سے نکال دیں گی۔ تم نے ابھی اَپنی بیویوں کو غور سے نہیں دیکھا۔جاوٴ کہ وہ سیتا کی طرح ایک ہاتھ میں ایسے نمائش پنکھے اُٹھائے ہوئے ہیں جن پر راون کی تصاویر بنی ہوئی ہیں اور وہ اُنہیں سینے سے لگائے تمہاری خواب گاہوں میں تمہارے بستروں پر دراز ہیں۔''

×× ''ابا جی' ابا جی! آپ جنوں میں نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہے ہیں''

:=: ‘‘نادانو! جنوں کیا؟ اور خرد کیا؟ ہاہاہا' جنوں؟ کاش یہ دولت مجھے نصیب ہوجاتی۔
کاش' یہ دولت مجھے نصیب ہو۔ کاش' اے کاش۔’’

:x: ‘‘صاحبزادو! آج آپ نے اعلیٰ حضرت کو بہت ستایا۔ دیکھوتو وہ مراقبے میں ہیں۔
اب کچھ مت بولو اور دیکھو تو ان کے ہونٹ تھرتھرا رہے ہیں اور لفظوں کی کلیاں
چٹک رہی ہیں۔ سنو!’’

:=: ‘‘......اور جب اُن کی آنکھ کھلی' تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے: کہو تو کتنی دِیر
سوئے۔ جواب ملا' شاید ایک دِن یا پھر اُس سے بھی کم۔ مگر وہ یقین سے کچھ نہ
کہہ سکتے تھے۔ کہ اللہ ہی بہتر جانتا تھا وہ اِس حال میں کتنی دیر رہے۔
تب یملیخاہ کو چاندی کا ایک سکہ دِیا گیا۔
وہ یملیخاہ کہ جس کا ظل میں ہوں۔
بھوک اُن کے جسموں میں بے قابو ہوئی پھرتی تھی۔’’

xx ‘‘ابا جان' ابا جان' اَب ہمیں بھی بھوک لگی ہوئی ہے اور ہماری بیویاں دسترخوانوں
پر ہماری منتظر ہوں گی۔’’

:=: ''منتظر؟ ہاہاہا۔ ارے او حرام خورو! انتظار کا بیج تو کچی مٹی میں پھوٹتا ہے۔ اس کی سوندھی خُوشبو میں بڑھتا' پھلتا' پھولتا ہے۔ تُم کیا جانو کہ اِنتظار کیا ہے؟ تم نے کبھی بچوں کو ان کے گالوں پر بوسہ دیا ہے؟ اُن کے دہنوں سے اُمنڈتی کچے دُودھ کی مہک کو سونگھا ہے؟ تُم نے کبھی بچیوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا ہے؟ اُن کی آنکھوں میں طلوع ہوتی دَھنک کو دِیکھا ہے؟ تُم نے کبھی اَپنی منکوحہ عورتوں کو محض خلوص اور محبت سے دیکھا ہے؟ اور اس کے نتیجے میں ان کے جسموں پر اُترتے رنگوں کو محسوس کیا ہے؟ نہیں کہ نہ تمہارے پاس وقت تھا' نہ تمہارے ساتھ وقت

ہو سکتا ہے۔ تمہیں بڑی بڑی پارٹیوں سے ڈیل کرنا ہے۔ لنکس بڑھانے ہیں۔ اور کندھے مارتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ اِدھر جو وقت نہیں رہا تو اُدھر بھی احساس جاتا رہا۔ کہ اُدھر اب نام نہاد سوشل ورک ہے۔ کلب ہیں۔ فیشن شوز ہیں۔ اور تم کیا جانو کہ انتظار کیا ہے؟ اور وہ کیا جانیں کہ انتظار کیسا ہوتا ہے؟''

×× ''مگر ابا جی' ہم......''

:=: تم؟ ہاہاہا۔ تم' تو لوگوں کا منہ بند کرنے مجھ تک آئے ہو۔ مگر میں سیمنٹ اور لوہے

کے بنے ہوئے قید خانوں میں خود کو کیوں مقید کروں؟ کہ مجھے تو اس گھر سے ہجرت کرنا پڑی تھی جس کے آنگن سے مٹی کی سوندھی سوندھی مہک اُٹھتی تھی اور روح میں اترتی تھی۔ مگر جب میں نے اپنے باطن کے پاکباز بچے قربان کیے تھے اور تمہارے دِھیان نے میرے شہر کو دقیانوس سے تیذوسس والے شہر میں بدل دِیا تھا تو بیچ میں صدیاں گزر گئی تھیں۔

صدیاں یونہی گزر رہی ہیں۔ اور میرے ہاتھ میں اپنے وقتوں کا سکّہ ہے۔ ایسا سکّہ جو فقط دفینوں میں تو ہو سکتا ہے کسی زندہ فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ اب تم آئے ہو تو میں ساری حقیقت جان گیا ہوں۔ تم میرے بیٹے نہیں' نئے شہر کے کوتوال ہو۔ تم مجھے میرے ساتھیوں کے پاس لے جاؤ گے' جو نہیں جانتے کہ کیا سانحہ بیت چکا ہے تو وہ میری طرح اصل حقیقت جان جائیں گے اور دہشت زدہ میرے ساتھ لپٹ کر نہ صرف ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود سو جائیں گے' مجھے بھی سلا ڈالیں گے۔ مگر ابھی مجھے اس حیرت کدے میں رہنا ہے' اپنے سکّے کے ساتھ۔ لہٰذا چلے جاؤ کہ میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ نہیں چل سکتا۔ نہیں چل سکتا تمہارے ساتھ۔''

مراجعت کا عذاب

زَریاب خان چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ اَن گنت ستارے اُس کے ذِہن کے آکاش پر چمکے اور ٹوٹے تھے، ہمت بڑھی اور دم توڑ گئی تھی، قدم اُٹھے اور لڑکھڑائے تھے۔ اُس کے مقابل اُمیدوں کے لاشے صف دَر صف کفن پہنے لیٹے تھے۔

دفعتاً اُمید کی ایک نئی مشعل جل اُٹھی۔ اُس نے جانا، روشنی دِھیرے دِھیرے بڑھ رہی ہے۔ اُس کے قدموں میں مسافت کی نئی گرمی بھر گئی اور وہ ایک نئی ڈگر پر پاؤں دَھرنے لگا۔ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ وسوسے کا سانپ اُس کی راہ روک کر پھنکارا۔

کہیں اِس ڈگر کے اُس سرے پر ناکامی منھ پھاڑے نہ کھڑی ہو؟

وہ رکا۔ اُس کے قدموں کی چاپ بھی رُک گئی۔ کہیں سے تھکن کا بھارِی پتھر لڑھکا اور اس پر آن گرا۔ اُس نے دِیوار کا سہارا لیا، اِرد گرد نگاہ دوڑائی۔ سب اَپنی دُھن میں مگن گزر رہے تھے۔ تب اُس نے اوپر تلے کئی گہری سانسیں لے کر سینے کو جھنجھوڑا تو ایک موہوم اُمید نے سر اُٹھایا۔ سانپ گھات لگائے پڑا رہا اور اُس نے قدموں کو آگے بڑھنے پر آمادہ کر لیا۔

دریائے سندھ کے بہتے پانیوں کی دوسری جانب منکور تھا اور اس طرف خُوشحال گڑھ

کا خوب صورت ڈاک بنگلہ۔ خوشحال گڑھ کے حسن کے دامن میں فقط دریا کی شور مچاتی لہریں، قدیم پُل اور سُرخ اینٹوں سے بنا ہوا ڈاک بنگلہ کو لیا جا سکتا ہے۔ آگے بڑھیں تو سارا سحر ٹوٹ جاتا ہے کہ آگے بَل کھاتی سڑک کی دونوں اطراف میں محض بانجھ بھوری پہاڑیاں دِکھائی دِیتی ہیں۔

جہاں ان بے لباس بھوری پہاڑیوں کے بدن پر کہیں کہیں سبزے کی دھجی نظر آنا شروع ہوتی ہے، وہاں ایک چیک پوسٹ ہے۔ یہاں سے لگ بھگ پچھتّر کلومیٹر چلنے کے بعد دائیں جانب مزید چار گھنٹوں کی مسافت پر نظر اوپر اُٹھائی جائے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے ننگی پہاڑیوں نے خوب صورت سبز فراک پہن لیا ہے۔ یہیں دائیں طرف بہت نیچے ایک ندی میٹھے سروں میں بہتی ہے۔

اِس طرف آنے والوں کو پہلے پہل ندی نظر نہیں آتی مگر جونہی عمودا اُٹھے اس پہاڑ کا پہلو آتا ہے جس کے قدموں میں زرد اور سرخ جنگلی پھولوں کے گچھے لہکتی بیلوں پر ٹنگے، سبز انگرکھا پہنے، پہلو بہ پہلو لیٹی چٹانوں کے گال چومتے اوپر بڑھتے ہیں، ندی اپنی چھب سے سامنے آجاتی ہے۔ نیچے گہرائی میں بہتی ندی کے بہت اُوپر بالکل وہاں، جہاں سے اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے، وہیں بادل اُڑ اُڑ کر نگاہوں کے آگے مہین سا پردہ تان دِیتے ہیں۔ یوں اَدھ کھلے حُسن کا یہ منظر لہو کی گردش کو تیز کر دِیتا ہے۔

سڑک سیدھی ڈھلوان میں اُترتی ہوئی ندی تک پہنچتی ہے اور ندی کے سنگ سنگ چلتی ہوئی اُس خوب صورت ہٹ تک پہنچ کر دَم توڑ دِیتی ہے جس تک پہنچنے کے لیے یہ سڑک بنائی گئی تھی۔ اس سے آگے محض راستے کا گمان ہوتا ہے۔ ڈھلوانوں پر رینگتا گرتا اُچھلتا یہ راستہ، ان منھ زور گھوڑوں کی ٹھوکروں سے بنا ہے، جن پر زور آور خان گل باز خان اور اس کے کارندے سوار ہوتے ہیں۔ یہ راستہ ان بے بس لولوگوں کا مرہون منت بھی ہے، جن کے قدم اَزل سے اس کی پیشانی چمکانے کی ناکام سعی کر رہے ہیں، اس لیے کہ شاید اس راہ سے اچھے دنوں کی نوید قدم بڑھاتے اُن

تک آ پہنچے۔

زَریاب جب وہاں پہنچتا' جہاں پختہ سڑک دَم توڑتی ہے' ٹھہر جاتا۔ اُس کے ذہن میں اس مَقام' بچپن اور لڑکپن کی کئی حسین ساعتیں محفوظ تھیں۔ وہ وہاں پہنچتے ہی ان یادوں میں محو ہوجاتا اور اس کا چہرہ کھل اُٹھتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے شبنم کی پھوار میں غنچہ پھول بنے اور مسکرا دِے۔ شبنم کے پہلے قطرے اور پھول کے مسکرانے تک کا عمل جا چکی ساعتوں کے ایک ایک جزو کا حاصل تھا۔

زَریاب جب بھی یہاں آتا ستاتا' اَپنے وجود کو منظم کرتا' رُوح میں گرمی بھرتا' خواب بنتا' خوابوں کے اُجلے کینوس پر تعبیر کے خوب صورت پھول بناتا اُس ندی کے سحر میں خود کو گم کر دیتا جو اَپنے نیلگوں پانی سے میٹھے سُر بکھیرتی۔ وہ اِن سُروں کو اَپنے لہو میں رچاتا اور دِھیرے دِھیرے اُس روش قدم بڑھاتا' جو بیضوی محرابوں والے برآمدوں کے دَرمیان گھرے ہٹ سے نکل کر اُسی عموداً اُٹھی پہاڑی کے عقب کی طرف جاتی ہے' جس کے قدموں میں زرد اور سرخ جنگلی پھولوں والی لہکتی بیلیں اوپر اُٹھتی ہیں۔ اس کے دائیں ہاتھ ندی کا شفاف پانی پتھروں سے اٹھکیلیاں کرتے ہوے ٹھنڈے میٹھے چھینٹے اُڑاتا ہے تو بائیں جانب پہاڑی کا پہلو سیدھا آسمان کی سمت یوں اٹھا ہوتا ہے جیسے کسی نے صدیوں کی محنت' ریاضت اور عقیدت سے اسے تراشا ہو۔ اَب جو نظر اُٹھتی تو منظر کچھ اور حسین ہو جاتا۔ ندی کے دوسرے سرے پر' جہاں دو پہاڑیاں باہم مل رہی ہیں' اُنہی کے سنگم سے پانی چادر کی صورت نیچے گر رہا ہوتا۔ اسی آبشار کے مقابل ندی کے اس طرف ذرا ڈھلوان میں اُترکر ترچھی چھتوں والا ایک ننھا مُنا گھر تھا۔ کوئی اجنبی اُس جانب آ نکلتا تو اسے یہ گھر اس حسین منظر میں ذرا نہ جچتا تھا مگر زَریاب کے لیے تو جیسے یہ منظر اس گھر کے بغیر ادھورا تھا۔

زرجان دروازے پر ہی اُس کا استقبال کرتی۔ وہی زرجان جو چنار کی صورت دراز اور جنگلی پھولوں کی طرح سرخ تھی۔ اُس لہجے میں ندی کی مدھر تان اور نگاہ میں بادلوں کی سی ٹھنڈک

ہوتی۔ زَریاب اسے دیکھتا تو روح کی گہرائیوں تک سرشار ہو جاتا۔

لیکن جب وہ آخری مرتبہ یہاں آیا تھا تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے خود کو دُکھ کی گہرائیوں میں اترتے پایا تھا۔ آنکھوں کے پیالے آنسوؤں سے بھر گئے تھے۔ قویٰ مضمحل ہوئے تھے اور سینے میں بھی کچھ ٹوٹا تھا۔

کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ گرتی آبشار' بہتی ندی' جنگلی گھاس' لہراتی بیلوں پر جھولتے پھول' برآمدوں میں گھیراہٹ' ترچھے چھتوں والا ننھا سا مکان اور اس کے دروازے پر کھڑی زرجان۔ مگر جب وہ آخری مرتبہ آیا تھا تو اُسے پہلی مرتبہ یہ اِحساس ہوا تھا کہ اِس سارے منظر میں ایک چیز اضافی تھی۔ اور وہ اضافی وجود خود اس کی اَپنی ذات تھی۔

وہ پھول جو شبنم کی پھوار سے مسکراتا ہے' وہ اِس مسکراہٹ کے بعد ان لمحوں کے بھی قریب ہو جاتا ہے' جب تیز ہواؤں کی زد میں آ کر اس کی پتی پتی کو بکھر جانا ہوتا ہے۔ اس نے سوچا' پھول پر یہ جاں گداز لمحہ کتنا گراں ہوتا ہوگا۔ اس نے تمنا کی کاش اس کی حیات کے عناصر اس ہولناک لمحے کے انکشاف سے قبل ہی منتشر ہو چکے ہوتے۔

آخری مرتبہ وہ یہاں اُس روز سے محض ایک رات قبل آیا تھا' جس روز وہ یہاں سے میلوں دور ایک نئی ڈگر پر چلا تھا اور وسوسے کا سانپ گھات لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے سینے کو جھنجھوڑا تھا اور اپنی چھاتی سے ایک نئی اُمید نچوڑ لی تھی۔ اِسی اُمید کے سہارے اُپنے جھجکتے قدموں کو مہمیز کیا تھا۔

زَریاب سرکلر روڈ پر بڑھ رہا تھا۔ اُس کی نئی منزل گلبرگ تھی۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے اُس کے اعصاب جواب دِے چکے تھے۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنا تھک کیوں گیا تھا۔ پہاڑی راستوں پر پہروں دوڑتے ہوئے بھی اس کی سانسیں نہ پھولتی تھیں مگر آج اس کشادہ ہموار سڑک

کے پہلو میں آہستہ آہستہ چلتے ہوے اسے لگ رہ تھا' سانسوں کا یہ زیر و بم اس کا سینہ پھاڑ دے گا۔ ذَریاب نے اُپنی مضبوط چھاتی کو زور سے دبایا۔ یوں' جیسے وہ اُپنی سانسوں کو وہیں جمار ہا ہو جہاں سے اکھڑی تھیں۔ ۱۴۲۔اے: نیچے نام تھا؛ پیرزادہ اکبر فیروز۔ اس عبارت کی تختی اس کوٹھی کے بڑے گیٹ پر لگی تھی' جہاں ذَریاب کو پہنچنا تھا اور اس کی منزل کے درمیان فقط کچہری بازار' وکیلوں والی گلی اور گلبرگ کی چند کوٹھیاں تھیں۔

پیرزادہ اکبر فیروز کے بیٹے معیز اکبر کو ذَریاب خان نے پہلی مرتبہ یونیورسٹی کے زمانے میں دیکھا تھا۔ گوری چٹی شفاف جلد' نفاست سے ترشے بال' درمیانہ قد اور بھرا بھرا جسم۔ پہلی نظر میں وہ اُسے ساری کلاس سے منفرد لگا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اُس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ ذَریاب پہاڑی روشوں پر چل کر یہاں تک آیا تھا' لہجہ نا ملائم' اکہرا بدن' اٹھتا قد اور ڈھیلا ڈھالا لباس۔ مگر رفتہ رفتہ اس نے معیز کے سائے میں چلنا شروع کر دیا۔ لباس میں نفاست آگئی' لہجے میں ملائمت اور سلجھاؤ آیا' رکھ رکھاؤ' آداب' قرینہ وقت کے ساتھ ساتھ سب میں نکھار آتا چلا گیا۔

یہی وہ دورانیہ بنتا ہے کہ جب معیز کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ وہ اس کے رابطے اس گروہ کے ساتھ ہو گئے تھے جو عارضی سکون کی پڑیا دیتے اور مستقل سکون کے ساتھ ساتھ سب کچھ لوٹ لے جاتے۔ ذَریاب نے معیز کو اس حال میں دیکھا تو تو بہت سمجھایا۔ جب وہ باز نہ آیا تو دکھ کا پیرہن پہن لیا تھا۔

وہ اپریل کی ایک سہانی شام تھی' جب ذَریاب نے فیصلہ کیا کہ وہ معیز کو بچا لینے کی ایک اور کوشش کرے گا۔ شام ڈھلے وہ اس تک پہنچا۔ یونہی گھومنے کے بہانے اُسے لارنس گارڈن لے آیا۔ یہیں ایک گوشے میں دونوں گھاس پر مقابل بیٹھ گئے۔ پورے دنوں کا چاند قدرے اوپر نکل آیا تھا۔ اُس کی نورانی ٹھنڈی کرنیں نیچے اُتر رہی تھیں۔ معیز کے عقب میں پھولوں کی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ گھاس پر اوس کے قطرے چمک رہے تھے۔ اترتی چاندنی اور بہتی ہوا کے سنگ پھولوں کی مہک بھی محوِ خرام تھی۔

وہ دونوں چپ تھے۔

زَریاب نے پہلے چاند کو دیکھا' پھر خُوش رنگ پھولوں کا لمس نگاہوں پر محسوس کیا۔ خُوشبو کے ذائقے کو چکھا اور تب معیز کو دیکھا جس کی ہتھیلی گیلی گھاس پر پھیلی ہوئی تھی۔ پھیلی ہتھیلی کے گرد شبنم کے قطروں نے بہم مل کر روشنی کا ہالہ بنایا ہوا تھا۔ زَریاب نے سکوت توڑا اور لفظوں کی وہ تمام صراحیاں انڈیلیں جو اس کے خیال میں تاثیر کی شراب سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ پھر وہ ٹھہرا اور معیز کو دیکھا تو اسے لگا معیز کا جام خالی تھا۔ اپنے لفظوں کے بانجھ پن پر وہ رو دیا۔ اُس لمحے ان دیکھے چچا اطلس خان کی یاد اس کے دِل میں ترازو ہو گئی۔

※

اَطلس خان' زَبر خان اور رِیشم خان تینوں بھائی تھے' زَبر خان زَرجان کا باپ تھا اور رِیشم خان زَریاب کا' جب کہ اطلس خان اُن دونوں سے چھوٹا تھا مگر تھا بلا کا حسین اور شہہ زور۔ جب زَریاب پیدا ہوا تھا تو اطلس خان کو مرے پورا ایک سال گزر چکا تھا۔ مگر جس طرح وہ مرا تھا دونوں بھائیوں نے نہ صرف اُسے عمر بھر یاد رکھا' بل کہ اُس کی کہانی اَپنی اولادوں کو بھی سنائی۔ زَریاب نے جب اطلس خان کی دِلگداز دَاستان سنی تو سب کچھ دِل پر محسوس کیا' لہو میں اُتارا اور روح میں سمو لیا تھا۔

جہاں پختہ سڑک دَم توڑتی ہے اور موہوم راستہ ڈھلوانوں پر اُچھلتا کودتا آگے بڑھتا ہے' وہیں سے خان گلباز خان کی ملکیت شروع ہوتی ہے۔ جب یہ اُچھلتا کُودتا رَاستہ تھک جاتا ہے اور دَم سادھ کے سیدھا چلنے لگتا ہے تو اُس کے دونوں طرف حدِ نظر تک کھیت پھیل جاتے ہیں۔ جن میں فصل لہلہا رہی ہو تو عجب سی باس چہار سو پھیلی ہوتی ہے۔

کھیت اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان' ڈھور ڈنگر اور وہ گاؤں جو کھیتوں کے بعد آتا

ہے‘اس کے مکان اور مکین‘ چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں اور بچے‘ سب کچھ خان گلباز خان کی ملکیت ہے اور سب کی زِندگیوں کا مطمع نظر فقط بڑے خان کی خُوشنودی ہے۔

جب حکومت کی طرف ہیروئن کی فصل تلف کرنے کا حکم نامہ جاری ہوا تھا تو ہر جانب اُس پر عملدرآمد ہوا‘ مگر جہاں سے سڑک دَم توڑتی ہے اور موہوم رَاستہ سَر اُٹھاتا ہے‘ وہیں حکم نامہ ٹھٹھر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بڑے خان کے کھیت یُونہی لہلہاتے رہے۔ وقت پر فصل کاشت ہوئی اور وقت پر اُس کا معاوضہ بڑے خان کے ہاتھوں میں پہنچا۔

ریشم خان‘ زبر خان اور اطلس خان تینوں اِسی خان گلباز خان کی ملکیت تھے‘ جسے وہ بھی دوسروں کی طرح بڑا خان کہتے تھے۔ اور تینوں دِل و جان سے اُس کے لیے سونا اُگا رہے تھے۔ ہر فصل کی برداشت پر انُہیں اِتنا معاوضہ دِیا جاتا کہ بہ مشکل اگلی فصل تک ساتھ دیتا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوتا کہ انہیں بڑے خان سے قرض لینا پڑتا تھا۔

وقت کی گاڑی یوں ہی آڑی ترچھی چل رِہی تھی۔

سب اِس پر متفق تھے کہ حالات کی زلفوں کو سنوارا نہیں جا سکتا تھا۔ حد تو یہ کہ سب ہی ایک دوسرے سے خوفزدہ تھے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی بڑے خان کی خلاف کوئی لفظ زبان پر نہ لاتے تھے۔

اچانک ایک حادثہ ہوا اور وقت کی جھیل میں ارتعاش پیدا ہوا۔

زبر خان اور رِیشم خان نے یہ دیکھ کر سٹ پٹا گئے کہ اُن کا چھوٹا بھائی اطلس خان اس زہر کا رَسیا ہو چکا تھا‘ جسے وہ بڑے خان کے لیے نسل دَر نسل اُگا تو رہے تھے مگر خود اس دُشمن جان سے دور رہے تھے۔ دونوں بھائیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اطلس خان کو روکنا چاہا مگر اس نے رکنا تھا نہ رکا۔ یہ نشہ نہ تھا ایسی دلدل تھی کہ اطلس خان نے ایک دفعہ اس میں قدم رکھا تو نیچے ہی

نیچے اترتا چلا گیا۔ بہت نیچے موت کی وادی تھی جو اُسے گود لینے کی منتظر تھی۔ سو اُس کا اِنتظار ختم ہوا۔

جب اطلس خان پیوندِ خاک ہو چکا تو زبر خان نے اس کی قبر کی مٹی ہاتھوں میں تھامی اور عہد کیا:

''ہم یہ موت کی فصل پھر نہ اُگائیں گے''

یہ پہلا باغیانہ جملہ تھا جو اُس فضا میں بولا گیا تھا۔

سب چپ تھے اور حیرت سے زبر خان کو دیکھ رہے تھے۔ تب رِیشم خان آگے بڑھا اور اس نے اپنا ہاتھ زبر خان کے منہ پر رکھا کر کہا تھا:

''جانتے ہو تم کیا کہ رہے ہو؟''

زبر خان نے رِیشم خان کا ہاتھ اَپنی مضبوط ہتھیلی میں تھاما اور جواب دیا:

''ہاں جانتا ہوں۔ مجھ میں اِتنا حوصلہ نہیں کہ دُکھ اور جبر کی کٹار پر ننگے پاؤں چلتا چلا جاؤں۔ میں نامعلوم راستوں پر زندگی کے تعاقب میں قدم بڑھاؤں گا۔ چاہے اندیشوں کی کھائیاں مجھے نگل ہی لیں۔''

پھر جوں ہی کچھ اَندھیرا پھیلا' زبر خان نے اَپنی بیوی پلوشے کا بازو تھاما اور رات کی تاریکی میں اُس راستے پر چل پڑا جس کے دوسرے سرے پر پختہ سڑک دَم توڑ دیتی تھی۔ اَگلی صبح بڑے خان کا آدمی رِیشم خان کے دروازے پر تھا۔ جب رِیشم خان بڑے خان کے سامنے پیش ہوا تو اس کا بدن بادبان' طوفانی لفظوں کی زَد میں آ کر لرز رہا تھا۔ بڑے خان کے چہرے پر غصہ سانپ بن کر پھنکارنے لگا اور لفظ تیر بن کر برسنے لگے تھے۔ دفعتاً وہ چپ ہو گیا۔ کُچھ دَم لینے کے بعد' لہجے کا پینترا بدلا اور کہا:

''کاش تم اشراف خان کی طرح ہوتے' میں اس کی وفاداری پر آج بھی فخر کرتا ہوں' میرے ایک اشارے پر اَپنی جان بھی قربان کر سکتا تھا اور جوان ایسا کہ جوانی پہ

رشک آتا۔ فصل اُٹھانے کا وقت ہوتا تو اُس کے بازو فصل کو یوں لیتے جیسے آگ سوکھی لکڑی کو لیتی ہے۔ اور سیانا اتنا کہ زمین ٹٹول کر کہہ دیتا: مٹی سونا اگلے گی یا بیج بھی لے ڈوبے گی۔ تب میں نے خُوش ہو کر اُس کے ذمہ بارہ ایکڑ لگائے تھے اور کہا تھا: تمہیں اسی حساب سے محنتانہ ملے گا۔ میرے کارندوں نے مجھے تعجب سے دیکھا تھا لیکن وقت نے میرے فیصلے کو درست ثابت کیا تھا۔

مگر تم بھائیوں پر تو جیسے تمہارے باپ کا سایہ بھی نہیں پڑا۔"

بڑے خان کا لہجہ ایک مرتبہ پھر بدل چکا تھا:

"زبر خان کو جرأت کیسے ہوئی کہ اس نے گاؤں سے باہر قدم نکالا۔ اطلس خان کو میں نے نہیں مارا۔ اسے مرنا تھا' سو مر گیا۔ کان کھول کر سنو' میں اَپنی زمینوں کو بنجر نہیں ہونے دوں گا۔ اب تم صرف دو ایکڑ زمین کاشت کرو گے اور اِسی کا معاوضہ تمہیں ملے گا......اور یاد رکھو اب کوئی شکایت مجھ تک پہنچی تو وہ سزا دوں گا کہ تمہاری نسلیں بھی نہ بھول پائیں گی۔ میں چاہتا تھا کہ تم سے ساری زمین چھین لوں اور تمہیں بھوکا مرنے دوں' مگر مجھے اشراف خان کی وفاداری کا پاس ہے......"

جس دن وہ بڑے خان سے مل کر آیا تھا اس دِن کے بعد رِیشم خان کو کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

اس واقعہ کے ٹھیک ایک سال بعد رِیشم خان کے گھر زَریاب پیدا ہوا۔ وہ بہت خُوش ہوا اور اس کے اعصاب کا تناؤ ٹوٹ گیا۔ اس کے من میں اس خواہش نے سر اٹھایا کہ یہ خبر کسی بہت ہی پیارے کو سنائے۔ تب وہ بھاگا بھاگا اطلس خان کی قبر پر گیا تھا۔ وہ جونہی وہ وہاں پہنچا تھا' اس کے بدن سے خوشی منہا ہو گئی تھی اور اس کا چہرہ تپتی لو کی زد میں آئے پھول کی طرح لٹک گیا۔ اُس نے دِل پر ہاتھ رکھا اور اَپنی دھڑکنوں کو بے ہنگم ہوتے محسوس کیا۔ وہ قبر کے سرہانے بیٹھ گیا حتی کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ اس موہوم راستے پر ہولیا جس کے دوسرے سرے پر پختہ سڑک دم توڑتی تھی۔ جہاں آبشار ندی میں گرتی اور پہاڑ عموداً اُوپر کو اُٹھتا تھا۔ جہاں پھولوں سے لدی ہوئی جنگلی بیلیں جھوم کر سبز گھاس کا انگھرکھا پہنے محوِ استراحت چٹانوں پر لوٹتی تھیں۔ کہ وہیں ایک خوبصورت ہٹ تھا۔ بیضوی محرابوں والے برآمدوں والے اِس ہٹ میں آنے والے زیادہ تر غیر ملکی ہوتے۔ زبر خان کو ہٹ کی صفائی دیکھ بھال اور سیاحوں کی خدمت کا معقول معاوضہ مل جاتا تھا۔ یہیں عموداً اُٹھی پہاڑی کے عقب میں' ایک چھوٹے سے گھر میں' وہ یوں رہنے لگا تھا کہ یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔

یہاں آنے والوں میں کئی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آتے۔ یہاں کے حسن کو محسوس کرتے۔ تازہ دم ہوتے اور خُوش گوار یادوں کے ساتھ لوٹ جاتے تھے۔ تاہم کچھ ایسے بھی ہوتے جو خالی یادوں کی پوٹلی اُٹھا کر ساتھ نہ لے جانا چاہتے تھے۔ چناں چہ وہ اسی موہوم راستے پر قدم بڑھاتے' پھر دائیں کو پلٹ جاتے کچھ اور آگے بڑھتے ہوئے شمشیر خان کے ڈیرے پر پہنچتے جو بڑے خان کا خاص کارندہ تھا۔ جو کچھ لینا دینا ہوتا' اُس سے لیتے دیتے اور واپس پلٹ جاتے۔ زبر خان نے اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہ رکھا ہوا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ بڑے خان کو اَپنی سرحد پر زبر خان کی موجودگی نہ کھٹکی تھی۔

ریشم خان جب زبر خان اور پلوشے کے ہاں پہنچا تو دونوں کے پاؤں خُوشی سے زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ جب اس نے زَریاب کے پیدا ہونے کی خبر سنائی تو زبر خان کا چہرہ خُوشی سے دَمک اُٹھا اور پلوشے دَھم سے اُس کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور تجسس سے زَریاب کی شکل وصورت اور قد بت کے بارے میں بہت سے سوال کر ڈالے۔ تب رِیشم خان نے بتایا:

''بس یوں سمجھ لو وہ اطلس خان کی طرح لگتا ہے''

یہ سن کر زَبر خان کے چہرے پر پہلے تو خُوشی کی پھوار پڑی۔ دوسرے ہی لمحے تشویش کی کالی گھٹا اُس کے چہرے پر چھا گئی۔ وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑایا:

''اطلس خان''

رَنج کی سولی پر چڑھے اطلس خان کے نام کو رِیشم خان نے سنا تو تشویش کا تیر کمان سے نکلا اور اس نے جانا جیسے اس تیر کا رُخ اس کی سمت تھا۔ تب تینوں نے کئی لمحوں کے لیے چپ کا روزہ رکھا تھا۔ اور جب تینوں نے خامشی کا جالا توڑنا چاہا تو یوں لگتا تھا' لفظوں کی فصل اُجڑ چکی تھی۔ پھر رِیشم خان وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا۔

وہ رات کی تاریکی میں آیا تھا اور رات کی تاریکی میں پلٹ گیا۔

جب رِیشم خان کے گھر گل مکئی پیدا ہوئی تو بھی رِیشم خان یہ خبر زَبر خان کو سنانا چاہتا تھا مگر اپنے گھر کی دہلیز ہی سے کچھ سوچ کر واپس پلٹ گیا۔ اُس دِن کہ جب زَریاب اَپنے ننھے منے قدموں سے چل کر اس کے پاس آیا اور اپنے ننگے پاؤں رِیشم خان کے بھاری بھرکم جوتوں میں ڈال کر خُوشی سے تالیاں بجائیں' تب وہ اچھل کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے اس نے غلطی سے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو۔ اُس رات اُس نے اطلس خان کو پھر یاد کیا۔ خوب رویا اور اگلے روز گھر سے بالکل نہ نکلا۔ پھر جب رات اُتری تو زَریاب کو ساتھ لے کر اَپنی دہلیز کی جانب یوں بڑھا کہ چند ہی لمحوں بعد اُس کے قدم موہوم رَاستے کو روند رہے تھے۔

رِیشم خان کی بیوی زَمُرد جان نے اَپنے شوہر کی باتوں کو غور سے سُنا تھا اور ایک ایک لفظ سے اِتفاق کیا تھا۔ اَپنے کلیجے کو ہاتھوں سے تھاما تھا اور بیٹے پر آنسوؤں کی بارش کی تھی۔ محبت کے لفظ اگلے تھے اور دعاؤں سے رخصت کیا تھا۔

اور جب رِیشم خان اپنے بیٹے کو لے کر زبر خان کے ہاں پہنچا تو وہ بہت خُوش ہوا اور رِیشم خان کے فیصلے کو سراہا۔ پلوشے نے زَریاب کو سینے سے لگایا اور اَپنی دو ماہ کی بچی زَرجان' رِیشم خان کے سامنے کر دی۔ تب رِیشم خان کا دِل بہت زور سے دھڑکا اور آنکھوں کے جام خُوشی کے آنسوؤں سے جل تھل ہو گئے۔ زبر خان اور پلوشے کی شادی کو چھ برس بیت چکے تھے اور یہ ان کے گھر کی پہلی خُوشی تھی۔ رِیشم خان بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ایک مرتبہ پھر لفظوں کی تتلیاں اس کی

گرفت سے نکل گئیں۔ وہ لُکنت زدہ لہجے میں' بڑے بے ڈھنگے پن سے مبارک باد کا لفظ لڑھکا رہا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر زبر خان اور پلوشے سے بہت محظوظ ہوے اور خُوشی سے قہقہے لگا ئے۔ تینوں کے دِلوں سے کچھ وقت کے لیے بوجھ کا پتھر لڑھک گیا تھا۔ رِیشم خان کو یاد آیا؛ اُسے بھی گُل مکئی کی خبر سنانا تھی۔ اُس شب وہ ان کے ہاں رُک گیا اور وہ رات بھر باتیں کرتے رہے۔

ابھی پو نہ پھٹی تھی کہ وہ واپس ہو پڑا۔ گاؤں پہنچتے پہنچتے دھوپ شدّت سے چمکنے لگی۔ رِیشم خان کے گھر پہنچنے سے بہت پہلے زَریاب کو زَبر خان کے حوالے کرنے کی خبر' اُس کی دہلیز سے نکل کر' بڑے خان کی حویلی میں پہنچ چکی تھی۔

بڑا خان اس کا منتظر تھا۔

ابھی گھر داخل ہوا ہی تھا کہ اُسے بڑے خان کا پیغام پہنچا دیا گیا۔ تب اُسے لگا جیسے یہ زمین اس کے لیے تنگ ہو گئی تھی۔ وہ سہا سہا بڑے خان کے سامنے پیش ہوا تو اُسے بڑے خان نے اپنا اٹل فیصلہ سنا دیا۔

''آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے' رِیشم خان' تمہیں یہ گاؤں چھوڑنا پڑے گا۔ ہم نمک حراموں کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔''

اُس نے بہت منتیں کیں۔ اَپنے باپ کی وفاداریوں کا واسطہ دیا مگر بڑے خان کا فیصلہ بدلنا تھا' نہ بدلا۔

جب رِیشم خان' زمرد جان اور گُل مکئی کے ساتھ گاؤں سے نکل رہا تھا تو اس کا دِل بھی ڈوبتے سورج کی طرح ڈوب رہا تھا۔ دور مغرب میں آسمان اور پہاڑوں کے بیچ سرخی اُبل رہی تھی اور ادھر زمرد جان کی سوجی ہوئی سرخ آنکھوں سے آنسو اُمنڈ رہے تھے۔ ننھی گُل مکئی بے خبر تھی اور نہ جان پا رہی تھی کہ کیا ہو رہا تھا۔

جب وہ تینوں زبر خان کے ہاں پہنچے اور جا چکے لمحوں کی راکھ کو حزن کی اُنگلیوں سے کریدا گیا تو سب نے دُکھ کی بُکل اوڑھ لی۔ رِیشم خان نے اَپنی گزر چکی بانجھ عمر کے خشک پیڑ کی ایک

ایک شاخ کو ٹٹولا، جن پر ایک بھی سبز کونپل نہ تھی۔ اُس نے اپنا زَبر خان سے موازنہ بھی کیا اور پہلی دفعہ محسوس کیا کہ اس کے بھائی کے قدموں پر جتنے آبلے تھے، وقت نے اُنہیں مندمل کر دیا تھا۔ ایک چھوٹا سا گھر، جس کے آنگن میں خُوشیوں کے پھول کھلتے تھے۔ اُس کے دَر و دِیوار سے سکون کا ٹھنڈا سا سایہ اُترتا اور جس کی مٹی میں اطمینان کی باس تھی۔ تب اُس نے اِسی پسِ منظر میں زَبر خان اور پلوشے کے چہروں کو دیکھا تو اسے یہ جان کر بڑی طمانیت ہوئی کہ ان کے چہرے پہلے سے بہت نکھر گئے تھے۔

چہرہ تو زِندگی کے باب کا عنوان ہوتا ہے، ایسا عنون، جس میں سارا نفس مضمون نچوڑ کر بھر دیا گیا ہو۔ دُکھ چہرے پر جالا بُن دِیتا ہے اور سکھ اُس کو نکھارتا چلا جاتا ہے۔ اَندیشے لہو پی کر اُس کے ایک ایک خلیے کو زرد کر دیتے ہیں اور اطمینان سے اس میں لہو ہلکورے کھاتا ہے۔ گویا چہرہ جا چکی ساعتوں کی ستم ظریفیوں، لمحہِ موجود کی تلخ حقیقتوں اور مستقبل کے اندیشوں کی باہم گندھی مٹی سے بنے جسم کا لباس ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے لفظ مفہوم کا لباس ہوتے ہیں۔ لفظ سماعت تک پہنچے تو مفہوم تمام رعنائیوں کے ساتھ اَپنی جزیات کو عیاں کر دے اور چہرے پر نگہہ ڈالو تو بصارت کے لمس سے ایک ایک خلیے پر بنی مفہوم کی تصویر ٹٹولتے جاؤ۔

رِیشم خان نے زَبر خان اور پلوشے کے چہروں کے دونوں روپ دیکھے تھے اور اس نئے روپ نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ اس سحر کے زیر اثر اس نے اپنے قدموں میں مسافت بھری زمرد جان، زَریاب خان اور گُل مکئ کو وہیں چھوڑا اور خود شہر کی طرف نکل گیا۔

قسمت نے یاوری کی اور اسے ایک مِل میں ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد ایک کوارٹر حاصل کرنے میں کام یاب ہوا تو بچوں کے ساتھ زمرد جان کو بھی وہیں بلا لیا۔ زِندگی کی اس اَدا سے وہ بہت محظوظ ہوئے۔ زَریاب سکول جانے لگا تو دونوں نے خوابوں کے ایسے جال بُن کر مستقبل کے سمندر میں پھینکے جن کا شکار تعبیر کی سنہری مچھلیاں تھیں۔ یوں زَریاب ماں باپ اور بہن سے بہت دور یونیورسٹی جا پہنچا۔ وہ حالات کی اونچ نیچ سمجھتا تھا لہٰذا خوب دِل لگا کر محنت کی اور کام

یابیوں کی سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگا۔ جب ساتویں سمسٹر میں کام یابی پر اس کے بدن سمندر میں مُسرّتوں کے خُوش رنگ بلبلے تیر رہے تھے تب درد کی ایک ظالم لہر اٹھی تھی اور خُوشی کے سارے رنگ نابود ہو گئے تھے۔ اب کی بار زَریاب حزن کے جال میں بے بس مچھلی کی طرح تڑپا۔ وہ خبر سنتے ہی میلوں کو پاٹ کر باپ کے سرہانے جا کھڑا ہوا۔ اس کا فالج زدہ باپ ہسپتال میں سفید چادر بچھے لوہے کے پلنگ پر لیٹا تھا اور اپنے سرہانے کھڑے زَریاب کو یوں ٹک ٹک دیکھ رہا تھا کہ آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبالب بھرے ہوے تھے۔ ماں جو رِیشم خان کے پاؤں دبا رہی تھی اس نے بیٹے کو دیکھا تو جلدی سے اپنے پاؤں پلنگ سے نیچے سرکائے اور لپک کر بیٹے کے کندھے کو تھاما۔ بیٹا چُپ تھا اور نگاہ باپ کے چہرے پر تھی۔ باپ کے ایک جانب ڈھلکتے چہرے پر ہونٹ کپکپا رہے تھے اور لفظ آواز پیدا کیے بنا مر رہے تھے۔ ماں نے بیٹے کو زور سے جھنجھوڑا۔ اتنی زور سے کہ جیسے اُسے دُکھ نے اندر سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ وہ چاہتی تھی اپنے اندر سرایت کر جانے والے کرب کی ایک ایک ساعت کی روداد بیٹے کو سنا ڈالے۔ مگر جب بیٹے کا چہرہ اُس کے مقابل آیا تو فقط سسکیوں کے اِظہار کا اور کوئی وسیلہ ہاتھ نہ آیا۔ جب تینوں کے سینوں میں اُٹھنے والے طوفان کا زور کچھ تھما تو زَریاب نے سب کو اپنا ایک خواب سنایا۔ رِیشم خان چُپ تھا۔ زمرد جان چپ تھی۔ اور زَریاب کہہ رہا تھا:

"گزشتہ رات خواب میں، مَیں اُس پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا جس کی چوٹی پر ایک خوب صورت دَھنک رَنگ پھول تھا اور جس کے بارے میں میرے دِل میں یقین اُترا تھا کہ اُس کو سونگھنے سے عناصرِ حیات میں مُسرّتوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ میں نے رَسی اُس کی چوٹی کی جانب پھینکی۔ اس وقت آپ دونوں کے علاوہ بہن گل مکئی بھی وہاں موجود تھی۔"

اتنا کہہ کر زَریاب رُک گیا۔ دروازے کے جانب قدموں کی چاپ بڑھ رہی تھی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو گل مکئی باپ کے لیے کھانا لے کر آ رہی تھی۔ ایک مرتبہ پھر چاروں دُکھ کی زد

میں آ کر لرزنے لگے تو ایکا ایکی چاروں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا؛ ان کے یوں رونے سے دوسروں کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا۔ تب چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور طوفان ٹھہر سا گیا۔ جب طوفان تھما تو زَریاب نے اپنا خواب پھر سنانا شروع کر دیا:

''جس وقت میں نے پہاڑ کی چوٹی پر رَسی پھینکی اُس وقت نہ صرف آپ لوگ میری مدد کو وہاں موجود تھے چچا زَبر خان' چچی پلوشے اور زَرجان بھی ہاتھوں کو دُعا کی صورت اُٹھائے مجھے دیکھ رہے تھے۔ تب میں نے سوچا' نہ صرف مجھے چوٹی پر پہنچنا اور دھنک رنگ پھول کی مہک سے مشامِ جان معطر کرنا ہے' مجھے آپ سب کو بھی وہاں لے جانا ہے۔ جب رَسی کا سرا اوپر چوٹی میں اٹک گیا تو سب کے چہروں پر خوشیاں کھیل رہی تھیں اور ہونٹوں سے دعا کے لفظ پھسل رہے تھے۔ میں نے خوب جھٹکے دے کر یہ یقین کر لیا کہ رسی اب اوپر سے نہ کھسکے گی۔ اپنے پاؤں جوتوں سے بے نیاز کیے اور دائیں پاؤں کے انگوٹھے اور انگلیوں کے درمیان رسی کو پھنسا کر دوسرا قدم اوپر بڑھایا۔ جب میں کافی اوپر پہنچا تو پلٹ کر دیکھا۔ تم سب بہت نیچے تھے اور دلدل تمہارے جسموں پر چڑھ دوڑی تھی۔ تمہارے سینوں سے کوئی صدا نہ اُٹھ رہی تھی۔ اگر اُٹھ رہی تھی تو مجھ تک نہ پہنچ پا رہی تھی۔ میں حیرت سے سہم گیا۔ اپنے ذِہن پر خوب زور ڈالا اور اس لمحے کو تمام جزیات کے ساتھ یاد کیا جب میں نے اپنے پاؤں سے جوتوں کو اتارا تھا۔ مجھے یقین تھا اس وقت زمین پتھر کی طرح سخت تھی۔ یہ دلدل کہاں سے آئی تھی؟ مجھ پر طاری حیرت نے بوکھلاہٹ کر رکھ دیا۔ میں نے حسرت سے اس پھول کو دیکھا جو دھنک رنگ تھا اور تمہارے چہروں کو دیکھا' جو کرب کے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ میں نے چیخ کر کہا: اس رسی کو تھام لو۔ تم سب نے اپنے ہاتھ رسی کی طرف اور نظریں میری جانب بڑھائیں۔ میں نے تیز قدموں سے اس مسافت کو پاٹنا

چاہا جو میرے اور دھنک رنگ پھول کے درمیان تھی۔ اور اس وقت کہ جب بات
چند ساعتوں کی رہ گئی تھی، رسی چوٹی سے سرک گئی۔''

ریشم خان، زمرد اور گل مکئی سب سانسیں روکے اُسے دیکھ رہے تھے۔ جب زَریاب خواب سنا چکا تو سب نے یوں محسوس کیا جیسے اُن کے سینوں میں کوئی چیز ڈوب رہی تھی۔

اُس لمحے، کہ جب دُکھ پر پردہ ڈالنے کو، سب نظریں ایک دوسرے سے بچا رہے تھے، زَریاب نے ایک فیصلہ سنایا:

''میں مزید نہیں پڑھوں گا۔ میں باپ کا سہارا بنوں گا''

زَریاب کی زبان سے یہ سنتے ہی رِیشم خان کا جسم زور سے لرزا اور فالج زدہ ہونٹ بے صدا لفظوں سے کانپ اُٹھے۔ تب زمرد جان نے رِیشم خان کے چہرے کو دیکھا اور مفہوم کا ایک ایک لفظ نچوڑا پھر رِیشم خان کے لہجے میں زَریاب کو فیصلہ سنا دیا۔

''تم اپنی تعلیم مکمل کرو گے۔''

یہ کہتے ہوے اِعتماد اُس کے چہرے پر برس پڑا تھا۔ سب کی نگاہیں اس پر عزم چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ رِیشم خان کا چہرہ قدرے پر سکون ہو گیا۔ تاہم ایک سوال نگاہوں میں تیر رہا تھا اور یہی سوال زَریاب کے حیرت زدہ ہونٹوں سے پھسلا:

''کیسے؟''

زمرد جان نے بیٹے کو اطمینان سے دیکھا اور کہا:

''میں اپنی ہمسائن گلنار جان کی طرح مِل افسروں کے گھروں میں کام کروں گی۔
اُن کے برتن مانجھوں گی۔ اُن کے بچوں کو لوریاں سناؤں گی، اور تم پڑھو گے!''

زَریاب یہ سن کر بے قابو ہو گیا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ہونٹ دانتوں تلے جا پہنچے۔ رِیشم خان جو فخر سے اپنی شریک حیات کو دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں کے آگے اندیشوں کی دھند آتی چلی گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ بہت گہری اور تاریک کھائی میں گر گیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب کہ

اس پر یہی خوابیدہ کیفیت طاری تھی اسے اپنا بدن روشنی کی جانب اُٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اُپنی آنکھیں کھول دیں۔ سامنے زبر خان، پلوشے اور زرجان کے ساتھ موجود تھا۔ زبر خان کہہ رہا تھا:

''زَریاب ضرور پڑھے گا۔''

زَریاب پڑھتا رہا۔

رِیشم خان اسپتال سے اپنے کوارٹر اور پھر ایک بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں منتقل ہو گیا۔ زبر خان کے اصرار کے باوجود وہ شہر میں ہی ٹک گئے کہ رِیشم خان کو علاج کی ضرورت تھی۔ دوا وقت پر چاہیے تھی۔

زمرد جان کے ہاتھوں پر کوٹھی والوں کے برتن مانجھتے کپڑے دھوتے اور جھاڑ و دِیتے رعشہ طاری ہو گیا کہ دوا کے لیے پیسوں کی بھی ضرورت تھی۔ زَریاب پڑھتا رہا۔

اور گل مکئی نے چپ چاپ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا۔

ریشم خان کی مٹھی میں اُمید کی تتلیاں تھیں۔

زمرد جان کے رعشہ زدہ ہاتھوں کی اوک دُعا کے پانی سے بھری ہوئی تھی۔

اور گل مکئی کے زرد چہرے پر اِنتظار کی آنکھیں تھیں۔

چچا زَبر خان استقامت سے اس کی مدد کر رہا تھا۔ زرجان کی آنکھوں میں سنہرے سپنے تھے مگر پلوشے کے مَن میں اندیشے تھر تھرا رہے تھے۔ تب پلوشے نے اندیشوں کے ڈھیر سے ایک مٹھی بھر کر زبر خان کی جھولی میں ڈالی تو زبر خان مسکرا دیا اور کہا:

''فکر کیوں کرتی ہو پلوشے؟ جب زَریاب افسر بنے گا تو میری بیٹی زرجان بھی تو راج کرے گی۔''

زرجان کی سماعت میں اس شیریں اُمید کا رَس نچڑا تو بدن پر مُسرّت کی دھنک اُتر آئی اور وہ دوڑ کر ندی کے اس کنارے پہنچی جہاں عموداً اُٹھے پہاڑ کے قدموں سے ندی کی جانب نیچے

پھسلتی سڑک صاف نظر آتی تھی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب زَریاب آخری مرتبہ یہاں آیا۔

آٹھویں سمسٹر تک پہنچتے پہنچتے زَریاب کی سانس پھول چکی تھی۔ اگرچہ چچا زبرخان اس کی ضرورتوں کا بہت خیال رَکھتا تھا مگر اس کی آمدنی تھی ہی کتنی کہ اس کے بھاری بھرکم تعلیمی اخراجات کی متحمل ہو سکتی۔ چناں چہ زَریاب فارغ اوقات میں کبھی ٹیوشن پڑھاتا اور کبھی کوئی اور دھندہ کرتا۔ یوں وقت کا ایک ایک لمحہ اس کے لہو کے جام لنڈھا کر گزرنے لگا۔ اس کا ایک ہی عزیز دوست تھا معیز، مگر دونوں میں فاصلے بڑھتے چلے گئے۔

جس رات پورا چاند نکلا تھا اور گیلی گھاس پر دونوں مقابل بیٹھے تھے' گھاس پر بچھے معیز کے ہاتھ کے گرد اوس کے قطروں نے مل کر چمکدار ہالا بنایا تھا' اُس رات کے بعد بھی وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے تھے' مگر ایک کھچاؤ دونوں کے بیچ ٹھہر گیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ رابطے کی ڈوری بالکل ٹوٹ گئی۔ معیز نے مطالبہ کیا تھا' زَریاب اس کے لیے کام کرے اور اسے وہ لا کر دے جو اس کے باپ دادا نسل در نسل اُگا رہے تھے۔ اس نے معیز کو بتایا تھا کہ اس کے باپ نے موت کی یہ فصل اُس روز اگانا بند کر دی تھی جس روز اس نے اپنے ننھے قدم باپ کی بھاری بھرکم جوتوں میں دھرے تھے مگر معیز اَپنی ضد پر ڈٹا رہا۔ اسی ضد نے ان کے درمیان خلیج وسیع تر کر دی۔

جس روز آخری مرتبہ زَریاب وہاں سے پلٹا تھا جہاں کچا دم توڑتا راستہ عموداً اٹھے پہاڑ کے پہلو سے ندی کی جانب کودتی سڑک کے دہانے میں گم ہوتا ہے' اُس روز اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور سوچا تھا: کاش ابا سے' امی سے یا پھر چچا سے ہی اَپنی ضرورت کہہ سکتا مگر وہ کہتا تو کیوں کر؟

فالج زدہ باپ نے اُمید سے دیکھا تھا اور شاید سوچا ہو گا' لمحۂ موجود کے سوکھے شجر پر جب سبز کونپلیں پھوٹیں گی تو اس کے بے حس ہوتے وجود میں آتے وقتوں کی سرشاری زِندگی کی لہر دوڑا دے گی۔ ماں کے ہونٹوں پر سوال تھا؟ رعشہ زدہ ہاتھوں کو مشقت کا پتھر اور کتنے عرصے تک

دھکیلنا ہوگا؟ اُس نے اُپنی بہن گُل مکئی کے زرد چہرے کو دیکھا اور چپ چاپ وہاں سے نکل آیا۔
وہ چچا زبر خان کے ہاں پہنچا مگر وہاں بھی ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ پھر وہ وہاں تک گیا' جہاں پختہ سڑک دم توڑتی ہے مگر ابھی کچے راستے پر قدم نہ دھرا تھا کہ واپس پلٹ آیا۔

جب وہ پلٹ آیا تو اس کی جیب میں فقط ایک سو نوے روپے تھے اور سینے میں ٹوٹی ہوئی سانسیں۔ وہ اَپنی سانسیں بحال کر کے تیز تیز چلنے لگا تو وہ دونوں جو اس کے آگے چل رہے تھے سراسیمہ ہو کر اور زیادہ تیز چلنے لگے۔ چلتے چلتے لمبی مونچھوں والے نے' کہ جس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس تھا' خشخشی ڈاڑھی والے کے کان میں کچھ کہا۔ خشخشی داڑھی والے کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

وہ کچہری بازار سے وکیلوں والی گلی میں مڑ گئے۔

زَریاب بھی مڑ گیا۔

آگے جانے والوں نے پھر سرگوشی کی۔ چہروں کے تاثرات بدلتے رہے۔ زریاب کو ان کی جانب اس لیے متوجہ ہونا پڑا کہ وہ پلٹ پلٹ کر اُسے دیکھتے اور کھسر پھسر شروع کر دیتے تھے۔ وہ حیران تھا کہ وہ اُسے یوں کیوں دیکھ رہے تھے؟ رفتہ رفتہ زَریاب ان سے بے نیاز اَپنی دنیا میں کھوتا چلا گیا۔ اسے معیز کے گھر پہنچنا تھا۔ قدموں میں تیز آ گئی۔ وہ بھی تیزی سے گلبرگ کی وسیع سڑک پر پہنچ گئے۔ زَریاب بھی چند لمحوں میں اسی سڑک پر تھا۔

اِس مرتبہ خشخشی داڑھی والے نے مونچھوں والے کے کان میں سرگوشی کی اور دونوں کی رفتار سست پڑ گئی۔

معیز کی کوٹھی تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔

زَریاب کے قدموں میں مزید تیزی آ گئی۔

فاصلہ گھٹنے لگا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ خشخشی داڑھی والا فیصلہ کن انداز

میں اپنے قدموں پر گھوما' دوسرے ہی لمحے میں زَریاب اس کی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا۔ زَریاب بھونچکا رہ گیا۔ جب اُس کے حواس بحال ہوئے تو وہ بُری طرح پھنس چکا تھا۔

لمبی مونچھوں والا ''مدد' مدد'' پکار رہا تھا۔ بریف کیس سڑک پر کھلا ہوا پڑا تھا اور سرخ نوٹ اس سے جھانک رہے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر پل بھر میں جمع ہو گیا۔ لمبی مونچھوں والا نوٹ سمیٹے جاتا اور لوگوں کو بتاتا جاتا' کہ کیسے اس نے ان کا پیچھا شروع کیا' اور کیسے وہ انہیں لوٹنا چاہتا تھا۔

زَریاب نے فردِ جرم پر حیرت کا اظہار کیا اور اَپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہا مگر کسی نے کچھ نہ سنا۔ ہر طرف سے گالیاں گھونسے اور لاتیں حرکت میں آ چکی تھیں۔ جب لوگ تسلی کر چکے تو اُسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

مُقدّمہ درج ہوا۔ اور وہ حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اُس نے پہلے اپنے زخموں کو سہلایا' پھر خود کو مجتمع کیا' دُکھ سے فلک کی اُس دھجی کو دیکھا جو کوٹھری سے نظر آ رہی تھی پھر سلاخوں کو تھاما اور اپنے پیاروں کو یاد کیا۔ اُسے لگا اُمید کے سارے دیئے بجھ گئے تھے۔ وہ نڈھال ہو کر فرش پر بیٹھ گیا۔

ایسے میں ایک مانوس آواز نے اسے چونکا دیا۔ اوپر دیکھا۔ خُوشگوار حیرت کی گرمی بدن میں بھر گئی۔ ایک دَم اُٹھا۔ سلاخوں کی اس جانب معیز کھڑا تھا۔ اُمید اَپنی پوری رعنائی سے جاگی۔ اس نے سارا ماجرا معیز کو کہہ سنایا۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو اُمید سے معیز کو دیکھا مگر معیز کہہ رہا تھا:

''زَریاب میں تمہاری مدد کروں گا مگر تم بھی میرے لیے وہ کرو گے جو میں نے کہا تھا۔''

زَریاب نے یہ سنا تو اس کا خُون کھولنے لگا' اِعصاب تن گئے' دانتوں نے ہونٹ کچل ڈالے اور ہتھیلیاں بھنچ گئیں۔ آنکھیں سرخ انگارہ بن گئیں اور زبان شعلے اگلنا چاہتی تھی مگر اُس نے ضبط کو تھامے رکھا اور اپنے من کے گوشے میں' معیز کے لیے جو محض چند نرم لفظ بچے تھے' اُن کو ملا کر

ایک جملہ بہ مشکل کہا:

''تم جو چاہتے ہو وہ میں نہیں کرسکتا۔ دور ہو جاؤ کمینے ورنہ......''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا' کمینہ اُلٹے قدموں پلٹ پڑا۔

جب وہ واپس ہونے لگا تو زریاب نے دیکھا' اس کے بہت پیچھے خشخشی داڑھی اور لمبی مونچھوں والا دونوں موجود تھے۔ تب زریاب کے سینے سے ایک صدا اٹھی اور حلق کی بہ جائے آنکھوں میں جا دھنسی اور آنکھیں چوپٹ دروازے کی طرح کھل گئیں۔ اسے یوں لگنے لگا تھا' نیچے بہت نیچے دلدل میں اس کے اپنوں کے جسم دھنسے جا رہے تھے۔ اور بے بس چہروں پر دھری آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں اور رَسی دَھنک رَنگ پھول کے قدموں سے سرک چکی تھی۔ اور وہ دم بہ دم اپنوں سے ملنے کے لیے تیزی سے دلدل کی سمت بڑھ رہا تھا۔

آئینے سے جھانکتی لکیریں

میں اَپنی نگہ میں سمٹ کر بھدی چھت سے پھسلتی دِیوار تک آ پہنچی تھی۔

میں نیچے آ رہی تھی یا دِیوار اُوپر اُٹھ رہی تھی؟

کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو رہا تھا۔

اور جو کچھ ہو رہا تھا وہ میرے باطن کے کٹورے کو اطمینان کے شیریں پانیوں سے کناروں تک بھر رہا تھا۔

باطن کا شہر بھی عجیب ہوتا ہے۔

بدن کو گھیرتی دیواریں گر جائیں یا ہیچ ہو جائیں۔ تو اندر کے بانجھ پرنالے بھی شرڑ شرڑ بہنے لگتے ہیں اور ساری گلیاں اطمینان کے گدلے پانیوں سے جل تھل ہو جاتی ہیں۔

پھر یوں لگتا ہے کہ وہ شہر جو ابھی پانیوں میں ڈوب رہا تھا' اب وہی اُن پانیوں پر تیر رہا ہے۔

اور جب میں اُوپر ہی اُوپر تیر رہی تھی۔

تو میں نے اَپنی آنکھوں سے نکل کر پھیلنا شروع کر دِیا۔

پھر جب میں بہتے پرنالوں کے پانیوں کی طرح سارے کی ساری اَپنی آنکھوں سے نکل چکی تو وہ تل برابر رہ گئیں۔

تل کے یہی دَانے تیرتے تیرتے اُوپر اُٹھنے لگے اور میرے چہرے پر پہنچ کر پیشانی کے عین نیچے نصب ہو گئے۔

اَب مَیں جسے دیکھ رہی تھی' وہ آئینہ تھا۔

وہ آئینہ تھا یا میں تھی؟

شاید وہ آئینہ بھی تھا اور میں بھی!

اگر میں آئینے کے اُس طرف تھی تو پھر اِدھر کون تھی؟

جستجو قدم بڑھاتے میرے سینے تک آ پہنچی تھی۔

اور وہ' جو آئینے کے باہر تھی' اپنے آپ میں سمٹتی چلی گئی۔

آئینے کے اُس پار والی تصویر بن گئی۔

اور آئینے سے باہر والی' پامال مسافتوں کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔

میں کیوں چل رہی تھی؟

شاید مجھے بھوک لگی تھی۔

مگر میرا پیٹ کہاں گیا؟

میں نے اُس جگہ کو ٹٹولا جہاں شکم ہونا چاہیے تھا لیکن وہاں تو بس شکنیں ہی شکنیں تھیں۔

بھوک تو اُسے ہوتی ہے، جس کا پیٹ ہو۔

تو میں بصارت کی طلب میں ہوں گی تا کہ میں اُسے اپنی آنکھوں میں بسا سکوں!

مگر؟

شاید جس کے چہرے پر تل برابر آنکھیں نصب ہوئی تھیں وہ آئینے سے پار رہ گئی تھی کہ اِدھر تو آنکھوں کے گڑھے بھی موجود نہ تھے۔

شاید مجھے کسی شے کی تلاش نہ تھی۔

اور میں نے بے نام سفر سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

مگر میرے قدم بھی تو نہیں تھے۔

ایک سفر تھا، جو میرے اَندر ہو رہا تھا۔

دَم بہ دَم بڑھتی قدموں کی چاپ غالباً اِسی باطنی سفر کی تھی۔

چاپ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

یا وہ شور بڑھ رہا تھا، جو بالکل چاپ جیسا تھا۔

میرے اندر کا غیر مرئی ''میں''، قدموں کے بغیر بھی چاپ پیدا کر رہا تھا، یوں کہ دھرتی لرز رہی تھی۔

وہ آنکھیں نہ ہونے کے باوجود بصارت کی اُنگلی تھامے، مخصوص سمت بڑھا چلا جا رہا تھا۔

ایسے کہ، منزل اُس کی جانب کھچی چلی آتی تھی،

اور پیٹ نہ رَکھتے ہوئے بھی اپنا وجود تازہ دم رکھے ہوئے تھا، جیسے حیاتِ جاوداں کا اَمرت رس پی رکھا ہو۔

اس کا سفر مسلسل آگے ہی آگے کی جانب تھا۔

اُس غیر مرئی وجود کا لباس میرا کریہہ بدن تھا جو نظر انداز ہو کر بھر بھرا ہو گیا تھا۔

جب ساری بھر بھری مٹی جھڑ گئی تھی تو میرے اندر کا ''میں'' الف ننگا ہو گیا تھا۔

بدن کی بھربھری مٹی یخ بستہ زمین پر بکھری پڑی تھی اور ذرہ ذرہ تھرتھر کانپ رہا تھا۔

زمین ایسے یخ بستہ تھی،

جیسے دسمبر کے آخری کنارے پر رات کی ٹھٹھری ہوئی لاش،

اور غیر مرئی وجود ننگا ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

کبھی تاریکی روشنی میں مدغم ہوتی تھی اور کبھی روشنی تاریکی میں۔

پھر راہ میں خُونی معرکے آپڑے۔

''بول میری مچھلی

کتنا پانی......؟

گوڈے گوڈے پانی۔''

پانی؟...... پانی اور خُون کی پہچان ختم ہو چکی تھی۔

سانس پھولنے لگی تھی۔

اور غیر مرئی وجود (؟) میں تیرتا اپنے چہرے کی جھریوں میں تاریکی اور اُجالے کے نقوش

سمیٹتا چلا جا رہا تھا۔

پھر پھولی سانسیں ٹوٹنے لگی تھیں۔

اور اس ٹوٹ پھوٹ سے ایک سانحہ نمودار ہوا۔

روشنی چہرے سے نچڑتی چلی گئی۔

اور درپیش تاریکیاں جھریوں میں جذب ہونا شروع ہو گئیں۔

یہ عین اس وقت ہوا جب دھیان کی ڈور ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

پھر وہاں، جہاں محض گڑھے تھے۔

وہاں ایسی آنکھیں بھی اُگ آئی تھیں جو فقط باہر کی جانب دیکھ سکتی تھیں۔

اندر تاریکی کا جنگل اُگنے لگا۔

اندھیرے کی غذا پا کر شکم خودرو جھاڑیوں کی طرح بڑھنا شروع ہو گیا۔

اور چاپ قدموں کی زائیدگی کا دُکھ سہہ کر ٹوٹ رہی تھی۔

پھر جو قدم آگے کو دھرے گئے وہ پیچھے پڑ رہے تھے۔

آنکھیں تھیں مگر بصارت لکنت زدہ ہو گئی تھی۔

ہاں پیٹ مسلسل پھولتا چلا جا رہا تھا

حتیٰ کہ غیر مرئی وجود اس میں سمٹتا چلا گیا۔

شفق کی سرخی دھرتی پر اتر آئی۔

وہ سرخی جو فلک کے ماتھا پیٹنے سے پھوٹ پڑی تھی۔

اور وہ دھرتی' جہاں اُپنی ہیئت بدلتے وجود نے' قدم آگے کو دھرے تھے اور الٹے پڑے تھے؛ وہ دولخت ہو گئی تھی۔

اور'اور......

شفق کی ساری سرخی اس دولخت دھرتی میں آ کر پھنس گئی تھی۔

تب سوالوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی۔

''کون؟......کیوں؟......کیسے؟......کس لیے؟''

سوچ قدموں کی زنجیر بننا چاہتی تھی۔

مگر پیٹ نے پھیل کر'ہیئت بدلتے وجود کو'اس کی سوچ اور سوال سمیت' اپنے اندر لے لیا تھا۔

میں لڑھک رہی ہوں'بوسیدہ چیتھڑوں سے بنے کِھدو کی طرح۔

کیا میں واقعی کِھدو ہوں؟

پھر میرا اندر لیر لیر کیوں ہے؟

میں لوگوں کے قدموں کی زد پر کیوں ہوں؟

ایک خاص سمت میں کیوں نہیں بڑھ رہی؟
لمحہ بہ لمحہ میری سمت کیوں بدل رہی ہے؟
اور......اور اس ٹھوکر کو تو بہت شدید ہونا چاہیے تھا کہ جس سے دھرتی دولخت ہوگئی تھی اور شفق کی سرخی اس میں آ پھنسی تھی۔
مگر میرے قدم اُلٹے پڑتے چلے گئے۔
اور اب میں ایک مرتبہ پھر اس بھدی چھت تلے ہوں جہاں سے پھسل کر دیوار تک پہنچی تھی۔
سامنے آئینہ ہے‘ جس میں مَیں کسی اور کو دیکھ رہی ہوں۔
اور جو آئینے کی دوسری جانب ہے‘ مجھے نفرت سے دیکھ رہی ہے‘
مجھ سے کہہ رہی ہے:
’’میں تمھارا چہرہ نہیں ہوں‘‘
میں یقینی اور بے یقینی سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں۔
میرے اندر جو سوچ کی بڑھیا چرخہ رکھے سوت کاتنا چاہتی ہے
اس کی تند کب کی ٹوٹ چکی ہے
جب کہ تکّلا ٹیڑھا ہے۔
آنکھوں کے سرخ ڈورے یوں پھیلے ہوئے ہیں‘ جیسے گاڑی کے نیچے آکر کچلے جانے والے بوڑھے کی انتڑیاں۔
میری آنکھیں ایسی تو نہ تھیں۔
شک اور تشویش نے بے یقینی کے کان میں سرگوشی انڈیل دی ہے۔
مگر آئینے کی دوسری جانب والا چہرہ یقین کی اُنگلی تھامے آگے بڑھتا ہے اور ایسی یخ بستہ ہنسی ہنستا ہے کہ میں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہوں۔

عجب چہرہ ہے، دسمبر کی ٹھٹھری رات کی طرح سرد۔
اکتیسویں سال میں قدم رکھتی یتیم کنواری کے چہرے کی طرح زرد۔
وقت کا سمندر آگے بڑھنے کے لیے عقب سے آنے والی لہروں کو سمیٹنے پیچھے ہٹتا ہے تو میں چہرے کے ساحل پر وقت کے سمندر کی شوخیوں سے پیدا ہونے والی لکیروں کو گننا شروع کر دیتی ہوں۔

اکتیس، بتیس، پینتیس، چالیس، پینتالیس، سینتالس......
لہر در لہر، لکیریں ہی لکیریں
میں دیکھ رہی ہوں،
ہر آخری لکیر کے بطن سے ایک اور لکیر جنم لے رہی ہے۔
میں گن رہی ہوں۔
گنتی جا رہی ہوں۔
حتیٰ کہ ہونٹ بے سکت ہوتے جا رہے ہیں۔
مگر لکیریں، وہ تو مسلسل بڑھ رہی ہیں۔
میری گنتی کا انتظار کیے بغیر،
مجھے روندتی ہوئیں، مجھے کچلتی ہوئیں۔

آخری صفحہ کی تحریر

جب پہلا خُون ہوا تھا تو اُس نے لہو کا ذائقہ چکھا تھا؛ بہت کڑوا کسیلا تھا۔

سارا محلہ صحن میں اُمنڈ آیا تھا۔

نعش کو کندھوں پر اٹھا کر سارے شہر میں پھرایا گیا تھا۔

جب نعش کی خوب نمائش ہو چکی تو چیرویں قبر کھودی گئی۔ سفید کفن میں لپیٹ کر نعش کو قبر کے عین درمیان لٹا دیا گیا۔ پھر پتھروں سے چھت بنائی گئی۔ جب پتھروں سے چھت بنا کر اس کے تمام سوراخوں کو گیلی مٹی سے بند کر دیا گیا' تب بھری بھری مٹی ڈالی گئی تھی۔

اور یہ سب کچھ اس نے خود بچشم ِسر دیکھا تھا۔

جب وہ واپس پلٹا تھا تو ایک بات بھی قبر سے کسی نامعلوم راستے سے نکلی تھی اور اُس کے ساتھ ہولی تھی اور جب یہ بات کچھ آگے بڑھی تو لوگوں کی زبانوں پر ناچ رہی تھی؛ یہی کہ

یہ اُس کا پہلا قتل ہے۔

وہ کہتا تھا؛ یہ خُون اس نے نہیں کیا۔ ہونی شدنی اُس کی بے بسی سے بندھی تھی۔ اور جب

پاؤں مَن بھر کے ہو گئے تھے‘ طے شدہ فاصلے کا بوجھ کمر پر لدا تھا‘ آگے تاریکی تھی اور راستہ اس میں گم تھا۔ اور جب وہ بہت تھک گیا تھا اور کچھ بھی سجھائی نہ دے رہا تھا‘ تو مجبوراً وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ پھر اُس نے تینوں کو دیکھا تھا جن میں سے ایک قتل ہوا تھا۔ اُن کے پیٹ پیٹھوں نے جکڑے ہوے تھے اور زبانیں ٹھوڑی سے بھی نیچے لٹک آئی تھیں۔ اُن کے حلق خشک تھے اور آنکھیں لپک لپک کر اُسے ٹٹول رہی تھیں۔

تب لہو اُس کے کھاتے میں ڈال دِیا گیا تھا۔

اس نے ذائقہ چکھا؛ بہت کڑوا کسیلا تھا۔

سب نے کہا‘ خُون اسی نے کیا ہے۔

مگر وہ کہتا تھا‘ یہ قتل میں نے نہیں کیا۔

یہ وہ پہلا خُون تھا جس سے وہ انکاری تھا اور بعد والے قتل وہ تسلیم کرتا تھا۔

مگر یہ پہلا اور آخری خُون تھا جو لوگ اس کے سر منڈھتے تھے اور کہتے تھے‘ پھر اس سے کوئی قتل نہ ہوا۔

اس نے مَن بھر کے قدموں کو جھاڑ دِیا تھا اور وہاں وہ قدم اُگ آئے تھے جن میں ان چھوئے رستوں کی مسافت تھی۔ پھر وہ اتنی مہارت سے چلا کہ ان تینوں میں سے جو دو قتل ہونے سے رہ گئے تھے‘ ان کی پیٹھوں نے ہاتھ ڈھیلے کر دیے اور پیٹ آگے کو لپک آئے تھے۔

اور اب وہ لہو کے بھرے ہوے پیالے پیتے تھے۔

مگر لوگ کہتے تھے‘ پھر اس نے کوئی قتل نہیں کیا۔

اس نے سارے خُون اَپنی ڈائری میں لکھے ہوے تھے۔

پہلے صفحہ پر جو قتل درج تھا وہ‘ وہ نہیں تھا جو لوگ کہتے تھے۔

اس نے لکھا تھا کہ سب سے پہلے اس نے اَپنی گردن کاٹی تھی اور سارا لہو ہاتھ کے کٹوروں میں بھرا تھا۔ پھر کٹے سر کو بدن پر جوڑا‘ اور لہو کے کٹورے ہونٹوں سے لگا کر غٹا غٹ پی گیا تھا۔

اس روز کے بعد جب بھی وہ واپس پلٹتا تھا لہو کا بھرا مشکیزہ ساتھ لاتا تھا۔

اور وہ دونوں، جو تین میں سے قتل ہونے سے بچ گئے تھے، بھر بھر کے لہو کے پیالے پیتے تھے۔

وہ چاہتا تھا، وہ قتل نہ ہو جو ڈائری کے پہلے صفحے پر لکھا گیا۔

مگر جب اس نے سیاہ گاؤن اتارا تھا، اور رول کیے ہوئے موٹے کاغذ کو کھول کر ایک ایک کے سامنے دَھرا تھا تو سب نے نفی میں سر ہلائے تھے۔

تب اُس کے قدم من من کے ہو گئے اور گزر چکا فاصلہ اس کی پیٹھ کا بوجھ بن گیا تھا۔

آگے اندھیرا تھا اور گھر میں داخل ہونے پر ایک خُون اس کے سر منڈھ دیا گیا تھا۔

وہ بہت رویا۔ رات بھر کانپتا رہا۔ اور صبح اس نے اپنے قتل کا فیصلہ کیا۔

جب وہ اپنا قتل کر چکا تھا تو اس نے اپنی نئی ڈائری کے پہلے پر سارا وقوعہ لکھا اور ایک مرتبہ پھر زور سے رویا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ ڈائری کے ورق ورق سیاہ ہوتے رہے۔

پہلے پہل تو اُسے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے ہونٹ لہو کے عادی ہو گئے۔

شروع میں جو ہچکچاہٹ ہوتی وہ بھی جاتی رہی بعد ازاں اسے اپنا شکار گرانے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی۔

وہ لہو پیتا رہا۔

اور وہ دو بھی اُس کے لائے ہوئے لہو سے کام و دہن آلود کرتے رہے جو تین میں سے قتل ہونے سے بچ گئے تھے۔

روز روز کے تازہ خُون نے اُن کے جسموں کو بہت پھیلا دیا۔

اور تینوں نے محسوس کیا، گھر کی دیواریں جسموں سے ٹکرانے لگی ہیں، حبس بڑھ رہا ہے اور اگر وہ کچھ اور عرصے ان دیواروں کے اندر رہ گئے تو گھُٹ کے مر جائیں گے۔

وہ وہاں سے نکلے اور کھلی فضا میں پہنچے۔ دور دور دِیواریں کھنچوا دیں۔ عظیم شاہ راہ کی طرف صدر دروازہ رکھا۔ اور اس پر نیم پلیٹ لگوا دی۔

اب انہیں ماحول اچھا لگتا تھا۔ فضا بھی صاف ستھری تھی۔ حبس نہ تھا اور نہ ہی چاروں طرف ندیدے لوگ رہتے تھے۔ جوار دگرد رہتے تھے' انہیں اس بات کی پروانہ تھی کہ ساتھ والے گھر میں وہ رہتے ہیں جو خُون پیتے ہیں۔

اور وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے چاروں طرف رہنے والے لہو پیتے ہیں یا......؟

ویسے وہ سب اگر یہ جانتے بھی تھے تو اسے معمول کا عمل سمجھتے تھے۔

......اور وہ لہو پیتے رہے۔

وہ' جس نے ڈائری کے پہلے صفحے پر اپنے قتل کی روداد لکھی تھی' اس نے بعد کے ہر صفحے پر اپنے شکاری کی تفصیل کے آخر میں یہ بھی لکھا کہ اگر وہ صیاد ہے تو سچ یہ ہے کہ اسی لمحے صید بھی ہے۔

پھر یوں ہوا کہ آخری والی سطر سے ایک خیال پھڑک کر اُٹھا اور کہنے لگا:

''تم کچھ نہ کچھ بہت پیچھے بھول آئے ہو''

یہ سنتے ہی وہ پلٹ پڑا۔ دوڑتے دوڑتے وہاں گیا جہاں کے حبس سے ڈر کر کھلی فضا میں دیواریں تعمیر کی تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچا جہاں پر وہ تھی' جسے وہ بھول آیا تھا تو یہ جان کر بہت پریشان ہوا کہ دروازہ دیوار سمیت غائب تھا۔ دروازے اور دیواریں تو اجنبی قدموں میں جھجک بھرنے کے لیے ہوتے ہیں مگر وہ لوگ جو اندر باہر ہو رہے تھے ان کے قدموں میں جھجک نہ تھی' اشتہا تھی ایک مہین سا پردہ' کسی بھی سہارے کے بغیر' معلق تھا جو اشتہا کو مہمیز کر رہا تھا۔

اس نے دیکھا؛ جو لوگ اندر باہر ہو رہے تھے' ان کے ہونٹ اس کے لہو سے تر تھے' جسے وہ پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور وہ پردہ نوچ پھینکا جو قدموں میں اشتہا بھر رہا تھا۔

اندر پہنچا' دیکھا؛ اُس کے بدن میں لہو کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی

تھیں۔ جب وہ کچھ اور آگے بڑھا تو کھلی آنکھوں میں حیرت تھَیا تھَیا ناچ رہی تھی۔ اس نے اسے چھونا چاہا مگر ایک چیخ درمیان میں آ کھڑی ہوئی۔ اس نے چیخ کو پرے پٹخ دیا اور اُسے چھوا۔ تب وہ حیرت اور نفرت کے درمیان بھاگتے بھاگتے مر گئی۔

اس موت نے اسے بوکھلا دیا اور وہ الٹے قدموں کھلی فضا کی جانب بھاگا۔ اَپنی ڈائری کے آخری سے پہلے صفحے پر سارا وقوعہ لکھنے کے بعد اس نے اپنا یہ فیصلہ بھی لکھا:

''اب مزید خُون نہیں پیوؤں گا۔''

مگر وہ دو' جو قتل ہونے سے بچ گئے تھے' خون مانگتے تھے۔

اور جتنے دن انہیں خون نہ ملا' اتنے دن وہ اس پر برستے رہے اور اپنے شکموں کو دباتے رہے۔

تب اس نے وہ سارا خون تھوکنا شروع کیا' جو اس نے پیا تھا

اور جب خُون تھوکتے تھوکتے تھک گیا' تو ایک سوچ اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی' یہی کہ ان دونوں کو قتل کرے' جو تین میں سے زندہ بچ گئے تھے یا پھر ان دو کے لیے مزید خون کرتا جائے کہ لہو مانگتے تھے۔

اور جس رات اس کے دروازے پر اس سوچ نے دستک دی تھی' اسی رات کی صبح' وہ پنکھے کے ساتھ رسی باندھ کر لٹک گیا تھا اور یہ سارا وقوعہ نامعلوم ہاتھوں نے ڈائری کے آخری صفحہ پر عدم کے لفظوں سے لکھ دیا۔

کفن کہانی

ہاں میری معصوم بچی! میں اَپنے دَل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں کہ کہانی اس کا کفن نہ بن سکی، تو تمہارا کفن ضرور بنے۔ اوراب جب کہ تم زِندگی کی سانسیں ہار چکی ہو تو میں تمہاری نعش کے سرہانے کاغذ تھامے اس کہانی کو لفظ دینے کا دُکھ سہہ رہا ہوں۔

جب وہ آخری سانسیں لے رہی تھی تو کہانی لکھنے کی یہی خواہش میرے اندر یوں سر پٹخ رہی تھی جیسے چودھویں کی رات، سمندر کی بپھرتی لہریں، ساحل پر سر پٹختی ہیں۔ مگراس کی ٹھہر ٹھہر کر آتی سانسوں کے سنگ، ہونٹوں پر سرسراتے نرم گرم لفظوں کی مہک نے میرے قلم کو ایک لفظ تک تخلیق نہ کرنے دیا۔ اور جب اس کے ہونٹوں پر سارے لفظ غروب ہو گئے،اور وہاں چپ اَندھیرے نے جالا بُن دِیا، تو یوں لگا، میں نے یہ کہانی نہ لکھ ڈالی، تو میرا سینہ پھٹ جائے گا۔

مگر قلم چپ تھا اور لفظ اُس سے پرے کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

اور آج جب کہ اس اَن کہی کہانی میں تمہاری کہانی بھی شامل ہو چکی ہے، وہی خواہش میرے اندر پھر انگڑائیاں لے رہی ہے۔

اور تم ہو کہ جو ابھی ابھی میٹھی باتوں کا امرت رس میری سماعتوں میں گھول کر ابد کی نیند سو گئی ہو،

مجھے یقین ہے، آنکھیں کھول دوگی اور مجھ سے ایک بار پھر پوچھوگی:

''بابا! کہانی مکمل ہوگئی؟''

میں جواب نفی میں دوں گا' توتم وہ کہانی مجھے تھما دوگی جو دو روز قبل مکمل کر کے تم نے میرے لیے تکیے کے نیچے رکھ چھوڑی تھی۔

یوں وہ کہانی' جو میرے سینے کے محبس میں پھڑ پھڑا رہی ہے' اَن کہی رہ جائے گی۔

میری بچی' میں جو ایسا اِتنے وثوق سے کہہ رہا ہوں تو اِس لیے کہ چودہ برس قبل انہی دنوں اور انہی لمحوں میں جب اس نے سانس کی بازی ہاری تھی اور گھر میں مفلسی ننگا ناچ رہی تھی' تو میں نے چاہا تھا؛ اس کی اَپنی کہانی سے اس کا کفن بناؤں گا۔

تم نے میرے بانجھ قلم کو دیکھا اور پھر اس کاغذ کو دیکھا تھا جس پر ایک لفظ کا بھی احسان نہ تھا۔ میرے بھنچے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا اور میری آنکھوں میں جھانکا تھا' جن سے سارے بدن کا کرب قطرہ قطرہ بہہ رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی تم نے سہمے لفظوں سے کہا تھا:

''بابا! کہانی مکمل ہوگئی؟''

میں ایک لفظ بھی منھ سے نہ کہہ سکا تھا۔ ایک درد سینے سے اٹھا اور حلق میں آ پھنسا تھا۔ مگر تم پر تو جیسے میرا جواب کہیں جا چکے لمحوں میں اتر چکا تھا۔ تم نے یقین کی فضا سے نفی والے جواب کی سرگوشی سن لی تھی۔ تب ہی تو تم لمحۂ موجود کی حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے اپنے قدموں سے چل کر میرے قدموں میں آ بیٹھی اور بھیگے لفظوں میں التجا کی تھی:

''بابا! میرے پاس بھی ایک کہانی ہے۔ اسے دِے دیجیے مگر اپنے نام سے کہ یہ اس طرح یہ ماں کا کفن بن سکتی ہے''

مجھے معلوم تھا' بیٹی کہ وہ تمہاری پہلی کہانی تھی۔

میں نے اُسے پڑھا اور اُس کی چوٹ دِل پر محسوس کی۔ بے شک وہ فن کا شاہکار تھی۔

مگر دنیا فن کو نہیں' نام کو تولتی ہے۔ اور نام کو منڈی میں لانے کے لیے طویل مسافت کی گرد

پھانکنا پڑتی ہے۔ اس طویل مسافت پر جانے کے لیے تمہارے پاس وقت نہ تھا۔ سامنے اس کی نعش پڑی تھی اور گھر میں مفلسی ننگا ناچ رہی تھی۔ لفظ قلم سے پرے کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے اور کاغذ کورے کا کورا تھا۔ آنکھوں سے بدن کا کرب بہہ رہا تھا اور تم بھیگے لفظوں سے کہہ رہی تھیں۔

''بابا! یہ کہانی ماں کا کفن بن سکتی ہے۔''

میں چاہتا تھا' جو کہانی تخلیق کرنے کا دُکھ تم نے سہا ہے' تم ہی سے منسوب ہو مگر یہ بھی جانتا تھا کہ جب اسے تمہارے نام سے اِشاعت کے لیے دوں گا تو شاید شکریہ کے بے ثمر لفظوں کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ اور شکریہ کا لفظ کفن نہیں بن سکتا تھا۔

پھر میری بیٹی' میں نے مجبوراً تمہاری کہانی پر اَپنا نام لکھا اور اُس کا کفن بنا ڈالا۔

اور آج جب کہ تم چپ کے لامحدود گہرے پانیوں میں اُتر گئی ہو اور لفظ میرے قلم سے پرے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے' تم کہو گی:

''بابا' میرے کفن کے لیے کہانی سرہانے پڑی ہے۔''

مگر میری بچی' میں نے آج فیصلہ کر لیا ہے کہ لفظ چاہے قلم کی گرفت میں آئیں' نہ آئیں' میں چپ مفہوم کے سہارے' ساری کہانی تمہارے ٹھنڈے وجود پر اُتا دوں گا۔ اور تمہارے سرہانے بیٹھا جا چکے لمحوں کی ایک ایک اکائی سے گزروں گا' جن کے تانے بانے سے یہ کہانی تشکیل پا کر میرے سینے میں پھڑ پھڑا رہی ہے۔

سنو میری بچی! غور سے سنو!

جب میں نے اس کہانی کے پہلے مرحلے میں اُسے آخری بار دِیکھا تھا' اس وقت عورتیں اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں انڈیلنے لگتی تھیں۔ حیرت کی اُنگلیاں دانتوں تلے جا دبتیں اور آنکھوں کی پتلیاں یوں کُھل جاتیں' جیسے آنکھوں میں ادھر ادھر تیزی سے پھدکنے والا کالا سا موتی ابھی باہر آ گرے گا۔

پنگھٹ پر مٹیاریں اُس کا ذکر کرتی تھیں، تو کبھی کھنکتے قہقہوں، کبھی بھیگے لفظوں، اور کبھی تعجب سے۔ کوئی سن رہا ہو یا نہیں، بس آواز مدہم ہو جاتی اور لفظ دِھیرے دِھیرے پھسل پھسل کر دوسری کے کانوں میں گرتے۔ جن کی سماعت کی جھولیوں میں لفظ گرتے، ان کے سینے کے اندر مقید پرندہ کبھی گہری فضا میں غوطہ لگاتا اور کبھی اوپر کو اُٹھتا۔ جب وہ گہری فضا میں غوطہ لگاتا، تو سکوت کا چولا پہنے ہوتا اور جب اُوپر اٹھتا، تو اس کے پروں سے کھنک دار پھڑ پھڑاہٹ اٹھتی، جو حلق سے نکلتی تو فضا مترنم ہو جاتی۔

سرادارں کا تنور تو جیسے اُس کی باتوں کے لیے گرم ہوتا تھا۔ جتنی روٹیاں پکتیں اُن میں اُس کے لذت اور کرب بھرے ذِکر کے پھول ضرور ڈالے جاتے۔ تنور پر اس کے ذکر سے ہونے والی گھسر پُھسر اور پنگھٹ پر اُس کے نام سے اُٹھنے والی سرگوشیوں کی عمر ایک سی تھی۔ اس کے سرو جیسے قد، نیلی جھیل آنکھوں، چھوٹی مگر ستواں ناک، لمبے بالوں یا پھر شفق سے سرخی چرائی شفاف رنگت کا تذکرہ ہوتا تو چند دنوں بعد خود بخود دم توڑ دیتا کہ جب نوعمر لڑکیوں میں اس کے حسن کا ذکر چھڑتا، تو دو چار لفظوں سے بات آگے نہ بڑھتی اور ہر ایک اپنے سراپے میں حسن تلاش کرنے لگتی۔ کوئی بوڑھی جو اُس کی من موہنی صورت کا مصرعہ اٹھاتی، تو دوسری گزرے وقتوں کی کتاب سے اپنے حسن کی غزل نکال لاتی۔

مگر جس روز سے مہر اللہ بخش گم حو اس کے ساتھ گھر پلٹا تھا تو پنگھٹ اور تنور پر اس کا ذکر تواتر سے ہونے لگا۔

مہر اللہ بخش اس کا باپ تھا اور یوں چلتا تھا جیسے زمین کے ایک ذرّے کو کھنگال رہا ہو۔ اُس کے جھریوں بھرے ہاتھوں پر کہیں کہیں سفید بال تھے۔ ایک ہاتھ کمر پر ہوتا، دوسرا لاٹھی پر۔ وہ لاٹھی کو مضبوطی سے زمین پر جماتا تھا، تب قدم آگے بڑھا پاتا۔ وقت نے اس کی پشت پر اونٹ کی طرح کا کوہان بنا ڈالا تھا۔ وہ گردن سدھائے ہوئے بیل کی طرح جھکائے رَکھتا تھا۔ دھیرے دھیرے نپے تلے قدم اُٹھاتا، یوں جیسے وہ نہیں چل رہا ہوتا، زمین آہستہ آہستہ پیچھے سرک رہی

ہوتی۔

جس روز وہ واقعی اپنے قدموں سے چلا تھا' اس روز زمین ساکت ہو گئی تھی اور وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک ہاتھ لاٹھی پر تھا جو تھر تھر کانپ رہا تھا اور دوسرا جو کمر پر ہوتا تھا' تیز ہوا کی زد میں آئے ہوئے خشک پتے کی صورت فضا میں ڈول رہا تھا۔ وہ لاٹھی جو کانپتے ہاتھ میں تھی' زمین پر پڑنے کی بہ جائے گھسٹ کر ایک نشان چھوڑ رہی تھی۔ یوں' جیسے کوئی سانپ چھوڑ دیا کرتا ہے۔

اِسی لکیر سے سرگوشیوں نے اپنا پھن اُٹھایا تھا۔

پنگھٹ پر اس کا ذکر ہوتا تو سینے زور زور سے دَھڑک اٹھتے۔ یوں لگتا' اندر ایک ایسا پرندہ تھا جو اَپنی پھڑ پھڑاہٹ سے سینے کا قفس توڑ دے گا اور فضا میں تیرنے لگے گا۔ حیرت سے کھلی آنکھیں اک ادا سے شرم وحیا کا بوجھ اُٹھا کر جھک جاتیں یا تعجب سے چہرے لٹکتے یا پھر عجب معنی خیز مسکراہٹ چہروں پر ناچنے لگتی۔ سرداراں کے تنور پر تو جیسے ایسے چہروں کا داخلہ بند تھا' جن پر اس کے ذکر سے حیا کی چمک دوڑ جایا کرتی تھی۔

گاؤں کے عین وسط میں سرداراں کا تنور تھا۔ بس یوں کہ لیجیے گاؤں ہر گلی سرداراں کے تنور پر ضرور پہنچتی تھی۔ گویا وہ مرکز تھا جہاں سے سارے راستے پھوٹتے تھے۔ جتنی باتیں گاؤں کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچتی تھیں ان پر سرداراں کے تنور پر بیٹھنے والیوں کی مہریں ضرور لگتی تھیں۔

سرداراں کیا تھی' بس ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ سر پر میل سے اَٹے ہوئے سفید بال' یوں جیسے پہلے آٹا گوندھا گیا ہو' پھر اُس سے موٹی موٹی سویاں بنائی گئی ہوں اور پھر انہیں گرد آلود کر کے سرداراں کے سر پر چپکا دیا گیا ہو۔ اس کے ہاتھ بڑے بڑے تھے' ایسے کہ اگر اس کے سارے وجود کو چھپا دیا جاتا اور صرف ہاتھ سامنے رہنے دیے جاتے تو یوں لگتا' جیسے وہ اس کسان کے ہاتھ تھے' جو سارا دن جنگل میں بڑے کلہاڑے کے ساتھ لکڑیاں کاٹتا ہے' ٹوکتا گیڑتا ہے یا پھر بیلوں

کی جوڑی پیچھے پیچھے چیختا چلاتا اہل تھامے رہتا ہے۔ خیر' سچ پوچھو تو سرداراں کے ہاتھ اتنے بڑے بھی نہ تھے' جتنی اُس کی زبان۔ اس کی آنکھیں باہر کو یوں نکلی ہوئی تھیں جیسے قمیض کے بٹن کا دھاگہ ڈھیلا ہو جائے تو وہ آگے کو جھک آتا ہے۔ مگر اس کے گال اندر کو دھنسے ہوے تھے۔ ہونٹ خوب سیاہ تھے' جیسے سارے تنور کی راکھ بس انہی پر جمی ہو۔ جب وہ تنور کے پاس بیٹھ جاتی تو سر پر آٹے اور مٹی سے لتھڑا کپڑا باندھ لیتی اور ایسا ہی ایک کپڑا ایک ہاتھ پر لپیٹ لیتی۔ جب شعلے خوب مچل چکتے اور واپس اپنے منبع میں پلٹ جاتے تو وہ تنور پر جھکتی اور ہاتھ پر لپٹے کپڑے سے تنور کی اندرونی سطح کو صاف کرتی۔ کپڑا ایک طرف دھر کے' ہاتھ کو پہلی کے چاند کی صورت خم دیتی اور سب سے پہلے آنے والی ہم مجلس کی پرات میں موجود گندھے آٹے کو اس چاند میں بھر لیتی تو بھدے ہاتھ چمکنے لگتے تھے۔ وہ آٹے کے پیڑے کو دوسرے ہاتھ کی مدد سے ہتھیلی میں یوں گھماتی جیسے زمین اپنے محور پر گھوم رہی ہو۔ پھر اُسے زور زور سے کبھی ایک ہاتھ پر پٹختی اور کبھی دوسرے ہاتھ پر مگر اس ہوشیاری کے ساتھ کہ وہ چودھویں کے چاند کی صورت گول ہو جاتی۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ اس میں مزید پھیلنے کی صلاحیت نہیں ہے تو پھر اسے دائیں ہاتھ پر دھرتی اور تنور میں جھک کر مہارت سے ایک جانب تھپک دیتی۔ اس سارے عرصے میں ایک لمحہ بھی ایسا نہ آتا جب اُس کی زبان رک گئی ہو۔ ہاتھ اپنے محور پر حرکت کرتے' مینڈک کی طرح باہر کو امنڈتی آنکھیں اپنے زاویے پر پھدکتی رہتیں اور زبان لفظوں کے پیڑے بنا بنا کر اِدھر اُدھر تھپکتی رہتی۔

عین چوراہے کے وسط میں' پھونس کے چھپر تلے' جتنی بھی عورتیں بیٹھتیں وہ سرداراں کی ہم عمر ہوتیں۔ فرق ہوتا بھی تو اُنیس بیس کا۔ کنواری لڑکیوں کا داخلہ بند تھا۔ گاؤں کا چوراہا تھا' مرد آتے جاتے تھے۔ کنواریوں کا اس جگہ بیٹھنا صحیح بھی نہ تھا۔ اور یہ معقول بہانہ تھا جس کے ذریعے بوڑھیوں نے لڑکیوں کو اَپنی محفل سے نکال رکھا تھا۔ یوں' جیسے اُن کے ذِکر ہی سے سرداراں کے تنور سے شعلے اُٹھتے تھے' وہ آنے لگیں تو ان کی باتیں نہ ہوں گی' آگ نہ بھڑکے گی' روٹی نہ پکیں گی۔ بوڑھیاں چاہتی تھیں' آگ جلتی رہے' روٹیاں پکتی رہیں۔

معاملہ اگر بڑی بوڑھیوں تک محدود رہتا تو لڑکیاں کب کا جیت چکی ہوتیں مگر مقابل سرداراں تھی جس کی زبان لفظوں کے شعلے اگلتی تھی۔اور جب وہ پوری طرح ڈٹی ہوئی تھی تو کس لڑکی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بے رحم طوفانی لفظوں سامنے ایک لمحے کے لیے بھی ٹھہر سکتی۔

”کیا بن سنور کر نکلی ہوری۔کیا غضب ڈھا رہی ہو۔کیا ٹھمک ٹھمک چلتی ہو۔کسی نے گزرنا ہے یہاں سے؟خیال کرنا کوئی اور قتل نہ ہو جائے“

اس پر بوڑھیوں کے قہقہوں کا کورس۔ بات یہیں تک رہتی تو کوئی مضبوط اعصاب والی‘ لڑکیوں کے بیٹھنے کی رسم ڈال ہی دیتی مگر جو کچھ آگے کہا جاتا‘ خدا پناہ۔

اور یوں بوڑھیاں اس محفل میں اور لڑکیاں پنگھٹ پر خوب کھل کر گفتگو کرتیں۔

اس کا ذکر دونوں جگہ عجب انداز سے چلتا رہا۔

ایک طرف بے تاب سینوں میں چنگاریاں سلگاتے ہوئے تو دوسری طرف پپڑی جمے ہونٹوں پر ہُوں ہُوں اور ہونہہ کے ساتھ۔

کم عمر بچوں کا داخلہ نہ تو پنگھٹ پر بند تھا‘ نہ سرداراں کے تنور پر کہ دونوں جانب یہی خیال تھا یہ عمر ایسی باتوں کے سمجھنے کی نہیں ہوتی۔ کھل کر بات ہوتی بھی کب تھی؟مخصوص اشارے‘ مخصوص علامتیں‘ مخصوص استعارے۔ان کی دانست میں ان نادانوں کی فہم کے نازک قدم اتنی گہری کھائیوں میں اُترنے کے قابل نہ تھے۔

میں نے جب اُسے اِس کہانی کے پہلے مرحلے میں آخری بار دیکھا تھا تو میں پنگھٹ پر بھی جایا کرتا تھا اور تنور پر بھی۔ شاید میں کچھ بڑا ہو گیا تھا تب ہی تو لڑکیوں کے کھنکتے قہقہوں میں مفہوم تلاش کرنے لگتا اور بوڑھیوں کے اِشاروں سے تصویریں بنانے لگتا تھا۔ جب میں یوں کرتا تو میرے چہرے پر سنجیدگی لکھی جاتی تھی جسے کنواریاں پڑھتیں تو قہقہوں کی کھنک ایکا ایکی رُک جاتی۔جیسے چلتے ریکارڈ سے سوئی اچانک اُتر گئی ہو۔اور بوڑھیاں میرے چہرے کی اس کیفیت کو دیکھتیں تو تنور کے شعلے آنکھوں میں بھر کر میری جانب برسا دیتیں۔ میں ٹھہرا رہتا تو آگ کے

انگارے منہ میں بھر کر میری جانب اُچھال جاتے اور مجھے وہاں سے کھسکتے ہی بنتی۔

پھر وہ لمحہ بھی آیا کہ جب میں لڑکیوں کے قہقہوں اور بوڑھیوں کی حیرت گزیدہ پیشانیوں کا مفہوم سمجھنے لگا اور اس کے ذکر سے عجب سی اُلجھن محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کا ذکر ہو رہا ہوتا تو جی چاہتا اُٹھ کر چل دوں۔ مگر جیسے زمین قدم جکڑ لیتی' سینے کے اندر ہی اندر کچھ ہونے لگتا' سماعتیں لپک کر سرگوشیوں کو پکڑنے کو پکڑنے کی سعی کرتیں۔ سرگوشیاں اور بیچ بیچ میں اٹھتے قہقہے' میرے جسم پر چیونٹیوں کی صورت تیرنے لگتے اور میں ان چیونٹیوں کی گدگداہٹ میں یوں کھو جاتا' جیسے میں ہوں بھی اور نہیں بھی۔ ہوا چلتے چلتے رک سی جاتی' پانی بہتے بہتے ٹھہر جاتا اور بادل فلک سے اتر کر میرے قدموں میں بچھ جاتے۔ مگر جونہی اس کا ذِکر ختم ہوتا' ہوا پہلے کی طرح چل رہی ہوتی۔ شاخیں سب ٹھیک کا اشارہ کرتے ہوئے ہِل رہی ہوتیں۔ پانی اپنے مخصوص نغمے گاتے بہہ رہا ہوتا اور بادل اسی طرح چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوتے۔

میں نے جب پانچ جماعتیں گوٹھ کے سکول میں پڑھ لیں تو میرے ابا نے کہا تھا:

''تمہیں ساتھ والے گوٹھ کے سکول میں داخل ہونا ہوگا''

جب میں نے ابا کی یہ بات سنی تھی تو میں نے اس کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا' اُس کا چہرہ اُس کھیت کی طرح تھا جس پر ابھی ہل چلا دیا گیا ہو۔ اور جس میں نمی محفوظ ہو چکی ہو۔ اور بیج اس میں دفن ہو چکا ہو۔ اور اَپنی جھریوں سے آسمان کی جانب دُعا کے لیے اُٹھتی ہتھیلیوں کی صورت اوک بنائے' سازگار موسموں کی آس لگائے بیٹھا ہو۔ اس یقین کے ساتھ کہ رُتیں ساتھ دیں گی تو بیج سے کونپل تنا بنے گی' تنوں سے شاخیں اُگیں گی اور اُن پر پھول کھلیں گے' جن سے مہک اُٹھے گی اور پھل لگے گا اور اس پھل کا بیج دُکھ کی کوکھ سے سکھ کا سورج اُگائے گا۔ اُس لمحے میں' مَیں نے تشویش کی لمبی اُنگلیوں سے اَپنے ماتھے کی لکیروں کو ٹٹولا تھا اور اُس خوبصورت لکیر کو محسوس کرنے کی کوشش کی تھی جو میرے باپ نے اَپنی بوڑھی آنکھوں سے میرے ماتھے پر دِیکھ لی تھی۔

جس روز میں ساتھ والے گوٹھ کے مڈل سکول میں جانے لگا تھا' پنگھٹ اور تنور پر اُس کے ذِکر کی عمر ایک سال سے بھی بڑھ چکی تھی۔ مہر اللہ بخش کبھی کبھار گھر سے نکلا کرتا۔ اُس نے تو جیسے باہر نہ نکلنے کی قسم کھالی تھی۔

جب میں آٹھ جماعتیں پاس کر چکا تو اُس کے تذکرے اِسی طرح جواں تھے۔ میرا داخلہ پنگھٹ اور تنور پر گرچہ بند ہو چکا تھا مگر اس سارے عرصے میں' میں نے اُس کا ذِکر سننے کے لیے سرداراں کے تنور کے پیچھے چھاتی تک اٹھی کچی دِیوار کے عقب میں خود کو کئی گھنٹے چھپایا تھا۔ اور پنگھٹ کے مشرق میں درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ سے نوخیز لڑکیوں کے قہقہوں میں پروئی باتوں کے ایک ایک لفظ سے مفہوم نچوڑا تھا۔ اس روز کہ جب میرے ابا نے مجھے شہر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا کہ وہاں میں چچا کی ورکشاپ میں کام بھی کروں گا اور اپنا نصیب بھی چمکاؤں گا۔ اس روز مجھ پر عجب افسوس کا بادل جھک آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا' مجھ سے محض گوٹھ کے در و دیوار نہیں چھوٹ رہے' اُس کا ذکر بھی چھوٹ رہا ہے۔ میں نے جب یہ سوچا تو خلوص دل سے دُکھ کی جھیل میں اُتر گیا تھا۔

وہ گوٹھ جو اُس کے ذِکر سے لبالب بھرا ہوا تھا' مجھ سے چھوٹ گیا۔ ابھی میں نے پانچ ماہ ہی شہر میں گزارے تھے کہ میرے ماتھے پر خُوش قسمتی کی لکیر تلاش کرنے والی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مُند گئیں۔ ابا کے سرہانے میں خوب رویا' میرے اعصاب شل تھے۔ مجھے یوں لگتا تھا؛ بادل جو مجھ پر ٹھنڈی چھاؤں کرتا تھا' چھوٹ گیا۔ وہ ہاتھ جو میرے لیے دُعا کو اُٹھتے تھے' نہ رہے۔ بس میں تھا اور دُکھ تھا۔ جب کوئی ہم دردی کے دو کلمات کہتا' مجھے یوں لگتا' جیسے میرے مَن کی دَھرتی پر کرب کے دو اور بیج بو دیے گئے ہوں۔ جو بھی آتا تھا' میرے سینے پر کرب کی یہی فصل اُگاتا تھا۔ بس ایک مہر اللہ بخش تھا جو چپ کا چولا پہنے آیا' خاموش نگاہوں سے میرے چہرے کو دیکھا اور زمین کی قبر میں اُپنی نظریں دفن کر دیں۔ وہ جتنی دیر رہا' چپ چاپ زمین کو تکتا رہا۔ میں جتنے روز رہا' وہ اتنے دن آیا مگر ایک لفظ بھی نہ کہا۔ مجھے یوں لگا تھا کہ بس یہی ایک شخص

تھا‘ جس نے دکھ کے مفہوم کو سمجھا تھا۔ میں اس سانحے سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ مجھے کسی اور کا ہوش نہ رہا۔ ہاں‘ جب کبھی محض ایک ساعت کے لیے‘ مہر اللہ بخش آتے ہوے یا پھر جاتے وقت‘ میری جانب دیکھتا تھا تو مجھے یوں لگتا تھا‘ اس کی آنکھوں میں سمندر جتنا پانی ہے اور اس پانی میں اس کی بیٹی ڈوب رہی ہے۔

میں شہر لوٹ آیا تو وقت پرندے کی طرح پر لگا کر اڑتا رہا۔ یوں دس سال بیت گئے۔

میری بچی! دس سال کیسے بیتے؟ یہ ایک الگ کہانی ہے جسے لفظوں کا پیرہن پہنانا چاہوں تو شاید اتنا وقت درکار ہوگا کہ تمہارے بے روح اور بے کفن وجود سے میری کہانی کے اس حصے کی طرح تعفن اٹھنے لگے گا۔ اِس لیے اے میرے بچی‘ اِس حصے سے یوں گزر جاؤ‘ جیسے کوئی اجنبی ایسے انجانے شہر سے گزرتا ہے جس میں اُسے روکنے والی کوئی زنجیر نہیں ہوتی۔ ہاں بس اِتنا یاد رکھو کہ میں اس کے بعد گوٹھ واپس کبھی نہ پلٹا کہ وہ بادل نہ رہا تھا جو مجھ پر برستا تھا اور تشنگی میں‘ مَیں جس کی جانب پیاس بجھانے کو لپکتا تھا۔

شہر میں میرا ٹھکانا چچا کے پاس تھا۔ صبح اگر میں سکول اور بعد ازاں کالج جایا کرتا تو شام کو چچا کی ورکشاپ میں کبھی پیچ کس‘ کبھی پھانا‘ پلاس بنا کسی گاڑی کے اِنجن پر جھکا ہوتا تو کبھی سٹپنی بنا گاڑی کے نیچے گھسا ہوتا۔ وقت اور ماحول نے میرے چہرے پر کالک مَل دِی تھی جو رفتہ رفتہ موٹی اور تہ دار ہو رہی تھی۔ وہ لکیر جو میرے ابا نے بڑی محنت‘ صبر اور اُمید سے میرے ماتھے پر کھودی تھی وہ اِسی کالک میں کہیں گم ہو گئی تھی۔

جب میں نے محسوس کیا کہ ورکشاپ کا کام میرے لیے بوجھ بن رہا ہے تو میں نے ورکشاپ اور چچا‘ دونوں کو چھوڑ دیا اور ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھانے لگا۔ شام ہوتی تو کبھی احباب کے ساتھ لفظوں کی بازی گری کرتا اور کبھی کسی لائبریری میں اوراق کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا۔ یہ کیفیت سال بھر رہی۔ اس عرصے میں میرا نام لکھنے والوں کی صف میں کچھ اوراوپر جا پہنچا۔ تاہم میرے اندر ایک طوفان تھا جس نے مجھے یہاں بھی تھمنے نہ دیا تھا۔ مجھ سے کہانیاں

مانگنے والے یاد دہانی کراتے کراتے تھک گئے جب کہ میں چپکے سے تاریک راہوں پر چل دیا۔ میرے نزدیک زِندگی کا مفہوم کچھ بھی نہ تھا۔ زِندگی کیا تھی، محض ایک دھوکہ‘ ایک جھوٹا ڈرامہ جو سٹیج ہو رہا تھا۔ ڈرامہ بھی ایسا‘ جس میں کوئی تماشائی نہ تھا۔ وہ جو ہنس رہا تھا‘ وہ اپنا رول ادا کر رہا تھا۔ جو رو رہا تھا‘ اس کے سکرپٹ میں رونا لکھا تھا۔ میں جو تاریک راہوں پر چل پڑا تھا‘ سمجھ رہا تھا کہ مجھے یہی کردار ادا کرنا تھا۔

مگر اے میری بچی‘ اب جب کہ تھاری مقدس نعش میرے سامنے پڑی ہے۔ تمہارا کفن ابھی تیار ہونا ہے۔ اور لفظ میرے قلم سے پرے کھڑے ہیں۔ اس لمحے میں‘ مجھے یوں لگ رہا ہے‘ میری سوچ باطل تھی۔ زِندگی کا مقصد تو بہت عظیم ہے۔ ہمیں روحوں میں تعفن اُٹھنے سے پہلے بے داغ اور بے عیب سفید کفن بنانا ہوگا۔

ہاں تو میری بچی‘ میرے دل کے ٹکڑے‘ میں سوچتا ہوں‘ کتنا وقت جا چکا۔ میرے پاس اِختیار کی وہ زنجیر بھی نہیں‘ جو جا چکے لمحوں کے ساتھ بندھی ہوتی اور میں اس زنجیر کو کھینچتا کہ لمحے پلٹ آتے۔ اب جب کہ تم اور وہ‘ دونوں اپنے سینے کی سانس چنگیر میں پڑی روٹیوں کا ایک ایک ٹکڑا عدم کے پرندوں کو کھلا چکی ہو‘ تو مجھے یوں لگا ہے‘ جیسے میرے اندھے قدموں نے جتنی بھی مسافت طے کی تھی‘ وہ عموداً تھی۔ اوپر سے نیچے۔ ایسے ہی‘ جیسے میں نے دلدل میں قدم رکھے تھے اور دلدل میرے سینے چڑھ دوڑی تھی۔

اس سب کو چھوڑ‘ میری معصوم بچی‘ کہ یہ سب کچھ میری زِندگی کا اثاثہ نہیں ہے۔ یہ تو وہ کالک ہے‘ جو میں اَپنے ماتھے سے دھونا چاہتا ہوں۔ مگر میری بچی‘ کیا کروں! کہ یہ کہانی انہی کالی گلیوں سے گزرتی ہے۔ ان سے کترا کا نکلنا چاہوں تو بھی نہ نکل پاؤں گا۔

انہی دنوں میں سے وہ ایک دن تھا کہ جب میں تاریک گلیوں میں گھوما کرتا تھا۔ میں اس روز گلی کے وسط میں کھڑا تھا۔ اوپر گھنگرو بول رہے تھے اور چلمنوں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ باہر گلی میں تاریکی اتر آئی تھی۔ ایسی گاڑھی تاریکی کہ میرے چاروں طرف کمبل کی طرح لپٹی ہوئی

تھی۔ پھر بھی ادھر سے گزرنے والے اندھرے کی اوٹ میں کافی تعداد میں موجود تھے۔ دائیں جانب بجلی کا کھمبا تھا۔ زرد روشنی بلب سے پھوٹ کر نیچے اترنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ عین اُس کھمبے کے نیچے ایک ریڑھی والا تھا‘ جس کی ریڑھی میں چند آموں کے سوا کچھ نہ تھا۔ بوڑھے ریڑھی والے کے سر پر گنتی کے چند بال تھے۔ ہونٹ موٹے بھدے‘ ٹھوڑی نیچے تک لٹکی ہوئی اور مونچھیں داڑھی میں گم ہو رہی تھیں۔ وہ جھولتے بیل کی طرح آگے بڑھ رہا تھا اور ریڑھی بھی اس کے جسم کے ساتھ کبھی دائیں جانب کھسکتی‘ کبھی بائیں جانب۔ وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی۔ میں نے اندازہ لگایا وہ اُپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ جونہی وہ مجھ سے چند قدم آگے بڑھا‘ اوپر سے ایک جسم نعش کی صورت آیا اور دھپ سے اُس کی ریڑھی پر جا پڑا۔ اس سے پہلے کہ جسم ریڑھی تک پہنچتا‘ ایک چیخ فلک کو پرواز کر گئی تھی۔ اس چیخ کی بازگشت میرے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ میں ڈرا بھی اور جھجکا بھی مگر یہ کیفیت چند لمحوں میں میرے ذہن سے یوں پھسل گئی‘ جیسے بہتے پانی میں ریت مٹھی سے نکل جاتی ہے۔ لوگوں کا جم غفیر پل بھر میں جمع ہو گیا۔ میں راستہ بناتا‘ اس نازل ہوتے وجود تک پہنچا۔ وہ کوئی عورت تھی اور ریڑھی پر الٹی پڑی تھی۔ بازو دائیں بائیں جھول رہے تھے اور ماتھا اس جگہ پر تھا‘ جہاں ریڑھی والے نے ابھی ابھی اپنے بوڑھے ہاتھوں کو رکھا ہوا تھا۔ ریڑھی والے کے ہاتھ اس کے اپنے چہرے پر جمے تھے اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھنچا ہوا تھا۔ جب کہ آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔ اُن کھلی آنکھوں سے تشویش جھانک کر ریڑھی پر پڑے جسم پر پھسل رہی تھی۔ جسم ریڑھی پر نعش کی صورت اوندھا پڑا تھا۔ بال بوڑھے برگد کی طرح پھیلے ہوئے اور جٹائیں زمین تک دفن ہونے کو لپک رہی تھیں۔ جہاں بال زمین کو چھو رہے تھے وہاں خُون کی ایک جھیل بنتی جا رہی تھی۔ وہ لوگ جو اوپر معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے‘ ان میں سے چند ایک قدموں کی اس چاپ کے پیچھے بھاگے جو سیڑھیوں سے اتر کر بغلی گلی میں گم ہو رہی تھی۔

میرا دِل ڈوب رہا تھا۔ آگے بڑھا اور کانپتے ہاتھوں سے اس کا بدن سیدھا کر دیا۔ اب

اُس کی ٹانگیں ریڑھی کے دائیں بائیں جھولنے لگیں۔ پاؤں جوتوں سے بے نیاز تھے۔ اس کے بدن پر سبز پھولدار کپڑے تھے اور عین پیٹ پر پچکے آم اپنا نشان چھوڑ گئے تھے۔ اُس کا سر اَب ریڑھی کی ہتھی سے پھسل کر نیچے جھول رہا تھا۔ ماتھے سے پھوٹتا لہو بالوں کی سیڑھی بنا کر زمین پر پڑ رہا تھا۔ ادھر میرے چہرے پر حیرت نے قدم جما لیے تھے۔ ہوا ساکت تھی اور بجلی کے کھمبے سے اُترتی زَرد روشنی وہیں ٹھٹھر گئی تھی۔

وہ جو اُس کے گرد تھے‘ وہ بھی شاید نہ تھے۔

جب میں حیرت کے قدموں تلے سے نکلا تو سینے سے ایک چیخ اُچھل کر نکلی اور لبوں کا حصار توڑ کر فضا میں تیر گئی۔ زبان نے ’نہیں‘ کا لفظ تین بار اگلا۔ جب میرے ہی کانوں میں میرے لفظ پلٹ کر گونجے تو دِل سے درد کا ایک اور بادل اٹھا اور آنکھوں میں جا برسا۔ تب میں بے اختیار اس پر جھک گیا۔ اور جب دوبارہ اُٹھا تو میرے بازوؤں میں اس کا جسم نعش کی صورت جھول رہا تھا۔ سارا مجمع دَم بخود تھا اور سب کے چہرے کھڈی پر چڑھے کھدر کی مانند تنے ہوئے تھے۔ اُس کھدر پر سوالیہ نشان تھر تھرا رہا تھا۔ ان کے قدم زمین پر یوں جم گئے تھے‘ جیسے وہ اسی جگہ سے اُگے تھے۔

میری پیاری بچی‘ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب میرے قدم دَلدل سے نکلے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ زمین کی سختی کو محسوس کیا۔ اس لمحے میرے سینے سے جو درد کی لہر اٹھی‘ اس کی لذت ہی انوکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس درد نے صدا بن کر فضا کو چیرا تھا۔ میرے سر میں ایک جنون تھا۔ میرے قدم ہسپتال کی جانب تیزی سے بھاگ رہے تھے۔

جب اس کے سینے سے زِندگی کی سانسیں ہونٹوں تک آئیں‘ پتلیاں تھر تھرا کر اوپر اٹھیں اور نیل گوں آنکھیں حیرت سے مجھے تکنے لگیں تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔

اور پھر میری بچی‘ میں ہسپتال سے سیدھا اُسے اپنے گھر لایا۔ وہ عمر میں مجھ سے دس سال بڑی تھی اور اس وقت سے بہت مختلف ہو چکی تھی جب میں نے شہر آنے سے قبل‘ سائیں اللہ رکھا کی

منڈیر سے' اُسے آخری بار دیکھا تھا۔ اس روز گرچہ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں' مگر ان میں دکھ کی عجب کشش تھی۔

اس کے سر پر موٹا کپڑا جھول رہا تھا۔ پاؤں میں کھلے سلیپر تھے اور وہ اس دیوار سے ٹیک لگائے سامنے آسمان کو گھور رہی تھی' جس سے کچھ دیر پہلے سایہ اتر کر اس کے قدموں سے جا لپٹا تھا۔ ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی اور اس کی قمیض کا پلو ہوا کے سنگ اڑ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ساکت تھیں اور اس کے چہرے پر خُون کی پھوار پڑ رہی تھی۔

اب وہ یوں میرے مقابل آئی کہ وقت کے تیشے نے اس پر بہت طبع آزمائی کی تھی۔ تاہم نہ جانے کیوں' میرے من میں آیا' اس کا ہاتھ تھام لوں۔ اس نے مجھے دلدل سے نکالا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے پاؤں سخت زمین پر تھے۔ میرے سینے سے دلدل کا بوجھ اتر گیا تھا اور سچے جذبوں نے وہاں پھول کھلائے تھے۔ جب میں اس کا ہاتھ تھاما' تو اس نے مجھے اپنا سائبان بنا لیا اور ہم نے اپنی زندگی کو ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا۔

اور پھر میری بچی' تم ہمارے آنگن میں اتریں۔ میرے من میں پیار کی ایک نئی جوت جاگ اٹھی۔ ایک عجب برکھا برسی کہ میں نہال ہوتا چلا گیا۔ پہلے پہل تم نے زِندگی کا رس اس کے بدن سے چوسا۔ تمہارے ننھے زِندگی کی ہمک سے پھڑ پھڑانے لگے' تو مجھے پتہ چلا' زِندگی تو یہی ہے۔ میں نے اس خدا کو پہلی مرتبہ جانا' جو تخلیق بھی کرتا اور رزق بھی دیتا اور جس کے کرم کی پھوار مجھ پر مسلسل پڑ رہی تھی۔ جب تم کلکاری مارتی' تو میں عجب احساس سے مخمور ہو جاتا۔ یوں' جیسے ہوا تھم گئی ہو اور بادل میرے قدموں تلے ہوں' آنکھوں میں سمندر اتر آیا ہو اور دل میں کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہوں۔

میں آج تک اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکا۔

بہت پہلے جب میں نے اپنے گوٹھ سے پانچ جماعتیں پاس کر لی تھیں اور ساتھ والے مڈل سکول میں پڑھ رہا تھا۔ پنگھٹ کے اُدھر' جھاڑیوں میں چھپ کر' نوعمر لڑکیوں کی باتیں سنا کرتا تھا یا

سرداراں کے تنور کے عقب میں، سینے تک اٹھی، کچی دیوار کے پیچھے چھپ جایا کرتا اور اس کا ذکر چھڑتا تو میرے بدن پر ایسے ہی لمحے گزرتے تھے۔ میں اسے کس جذبے کا نام دوں؟ آج تک نہ جان سکا۔ کیا وہ محبت تھی؟ اور تمھارے ننھے منے کلکاریاں بھرتے وجود کو دیکھتا اور کچھ اس سے ملی جلی کیفیت سے گزرتا۔ کیا یہ بھی محبت ہے؟ میرا دل میری یہ بات مانتا ہے، نہ ذہن تسلیم کرتا ہے۔ سچ پوچھو تو بیٹی، محبت کا لفظ فرسودہ ہو چکا۔ لکھنے والوں نے اسے اتنا بدنام کیا ہے کہ میں لفظ محبت ادا کرنے سے قبل اردگرد دیکھتا ہوں کہ کہیں کوئی سن تو نہیں رہا۔ میرا ایمان ہے، ہر لفظ باعصمت ہوتا ہے مگر شاید محبت ایسا لفظ ہے، جسے لکھنے والوں نے سب سے زیادہ بے آبرُو کیا ہے۔

میرے دِل میں اُس کے لیے یا پھر تمہارے لیے، جو بھی جذبات ہیں اُن کی تعبیر میں محبت جیسے لفظ پامال سے نہیں کر سکتا۔ ان جذبات کے لیے تو ایسا اچھوتا لفظ ہونا چاہیے جو ادائیگی میں ملائم ہو۔ ایسے کہ ادا کرتے وقت ہونٹ باہم یوں ملیں جیسے پھول پر شبنم کا قطرہ پڑتا ہے۔ اور وہ اپنے اندر کائنات کی وسعت جتنی اپنائیت اور خلوص کا مفہوم رَکھتا ہو۔ سچ جانو تو میرا تعلق تم سے یا اس سے ایسا تھا، جیسا میرے بدن کا آنکھ سے ہے۔ میرے بدن کو آنکھ سب سے زیادہ عزیز ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آنکھ نہ رہی تو اندھے وجود کو خود سے متنفر ہونا پڑے گا۔ یا پھر تم دونوں کا تعلق کہیں میرے اندر ہے، وہیں جہاں دَھک دَھک ہوتی ہے تو جسم کا ایک ایک خلیہ حیات کی خُوشبو سے مخمور رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میری آنکھوں کے کینوس پر روز بروز بڑھتے تمہارے وجود کا پورٹریٹ بنتا، تو میرے اندر ایک روحانی کیفیت کے لچھے میں خُوشی کے پر پھڑ پھڑانے لگتے اور اس کے دن بدن زرد ہوتے وجود کو دیکھتا، تو دُکھ میرے اندر کلبلاتا۔ ان دونوں کیفیتوں پر میری آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبالب بھر جایا کرتے۔

پھر اے میری بچی، جب تم اٹھارہ برس کی ہوگئیں تو اس کے ہاتھوں پر رعشہ اتر آیا۔ میں تمہاری جانب دیکھتا، تم فطرت کا ایک مسحور کن اور روح پرور نقش لگتیں اور اسے دیکھتا تو محسوس ہوتا، وہ اس قمیض کی مانند تھی جسے نچوڑ دیا گیا ہو۔

میری پیاری بچی، یہ انہی دنوں میں سے ایک دن تھا، جب اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی تھی اور مجھ پر منکشف ہوا تھا کہ دُکھ کے تپتے صحرا سے گزرنے کے بعد سکھ کی ٹھنڈی چھاؤں ملے، تب بھی سانسیں برابر نہیں ہوتیں۔ بہ ظاہر پرسکون نظر آنے والے سمندر میں ان گنت طوفان تھے۔ اُس کے قدموں کے سارے آبلے اس کے باطن میں جا چھپے تھے۔ اور وہ آبلوں کو پھوڑ رہی تھی۔ اور بپھرتی لہروں کو گن رہی تھی۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے۔ جب میں بھی چھوٹا تھا۔ اور اس کا ذکر پنگھٹ اور سرداراں کے تنور پر نہیں چھڑا تھا اور اس نے تمہاری طرح اٹھارویں سال میں قدم رکھا تھا۔ کچھ لمحے پہلے اس کا باپ مہر اللہ بخش اپنے قدموں سے چلتا ہوا گھر واپس پلٹا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود لاٹھی زمین پر گھسٹ رہی تھی اور پیچھے ایسا نشان چھوڑ رہی تھی جیسے سانپ چھوڑتا ہے۔ اسی لمحے مہر اللہ بخش نے ایک ایک لفظ اپنی بیٹی کو بتایا تھا کہ کیسے سانول نظامانی نے اس کا راستہ روکا اور کیسے وہ اسے اپنے ڈیرے پر لے گیا اور کیوں کر وہ اس پر جھکا اور کس طرح اس نے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا۔ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے مہر اللہ بخش کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔ کمر کچھ اور خمیدہ ہو گئی اور آنکھوں سے پانی پھوٹ بہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھا اور شاید پھر کچھ سوچا تھا۔ باپ کو تھاما اور پیار سے بٹھایا تھا۔ اور ایک ایک لفظ سن کر اپنی سماعتوں پر محسوس کیا تھا۔ تاہم اسے تسلی ہوئی کہ باپ کہہ رہا تھا:

''میری زِندگی میں سانول کو اس گھر سے کچھ نہ ملے گا''

اُسے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ سانول نظامانی کون تھا؟

وہ جو اِردگرد کے ساتھ گوٹھوں میں سے لڑکیاں اغوا ہو جایا کرتی تھیں۔ اونٹوں پر لدا سامان سرحد پار اُتر جاتا اور مہینے میں ایک آدھ بار کوئی نہ کوئی لہو کا چولا پہنتا تھا، اس سب کے ساتھ اس کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ جیسے یہ واقعات اگر پتنگ تھے تو ڈور اس کی انگلی پر ناچ رہی تھی۔ ادھر ایک پتنگ کٹتی ادھر دوسری ڈور سے بندھی فضا میں ہلکورے کھا رہی ہوتی کہ سانول دُھن کا پکا تھا۔

وہ تھا بھی پکی عمر کا' جب کہ وہ' وہ تو بس کچی کلی تھی۔

وہ انسان نہ تھا' وحشی تھا۔ جدھر سے گزرتا ادھر گلیاں ویران ہو جاتیں۔ پنگھٹ خامشی کا کفن پہن لیتا۔ تنور چپ کی پرات سے ڈھک جاتا اور بچے سہم کر کونوں کھدروں میں جا چھپتے۔

وہ کہ جس نے ابھی کچے قدموں سے بچپنے کی منزل کو چھوڑا تھا' غم زدہ باپ کے سامنے بیٹھی' اس کا دکھ اپنی آنکھوں میں چبھتا ہوا محسوس کر رہی تھی' اُسے بھی سانپ نے سونگھ لیا تھا۔

جب مہر اللہ بخش کی بات فضا کے سنگ سنگ گلیوں میں سرسرائی' تنور کے شعلوں پر ناچی اور پنگھٹ کے پانیوں کے ساتھ بہی تو خوف اور تجسس نے جالا بن دیا۔

آگے کیا ہو گا؟

یہ سوال پنگھٹ پر تھا اور تنور پر بھی۔ لوگ حیران تھے۔ وقت گزر رہا تھا اور گزرتے وقت کی چاپ سبھی سن رہے تھے۔ بہ ظاہر سانول خاموش تھا مگر سماعتوں نے سنا تھا' جب کبھی مہر اللہ بخش کو ملتا تھا' تو اپنا فیصلہ ضرور سناتا تھا کہ ایک دن وہی ہونا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

چار سال پل پل ہو کے گزرے اور کسی نے ان کا دروازہ نہ کھٹکھٹایا۔ کس میں ہمت تھی کہ سانول سے دشمنی مول لیتا؟ مہر اللہ بخش نے سوچا تھا یا یہ سوچ خود بخود اس کے وجود میں سرایت کر گئی کہ وہ اب کے اور زندہ نہ رہ سکے گا۔ وہ زندہ نہ رہا' تو اس کی بیٹی ننگے آسمان تلے ہو گی۔ اس کی بیٹی کو چھت چاہیے تھی۔ کوئی نہ تھا' جس نے دروازے پر دستک دیتا۔ کس میں ہمت تھی۔

عین اسی لمحے' کہ جب اس کے دِل میں یہ دھڑکا رینگنے لگا تھا' اُسے سانول اچھا لگنے لگا۔ اس کا نکلتا قد' بھرا ابھرا جسم' گھنی مونچھیں اور نام جیسا سانولا رنگ' اسے کچھ بھی برا نہ لگا تھا۔ اور جب میں نے اس کہانی کے دوسرے مرحلے میں' پہلی بار' ریڑھی پر نعش کی صورت اسے گرتے دیکھا تھا' تو اس درمیانی وقت کی ایک ایک ساعت نے اُس سے حساب لیا تھا۔

میری بچی' اس نے مجھے بتایا تھا' کہ اس نے ملائمت کا چولا پہن لیا تھا اور سانول کا ہر جبر اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔ اس کے قدموں کو اپنے جسم پر سہا مگر اس کے پاؤں کی گرد صاف کی

تھی۔ پھر لوگوں نے دیکھا' سانول کے قدم بخود گرد آلود راہوں سے کترانے لگے تھے۔ اس کی نظر رفتہ رفتہ جھکتی گئی۔ لہجے کی سخت شاخ پر ملائم اور کومل پھول کھلنے لگے۔ اردگرد کے گوٹھوں سے لڑکیوں کا اغوا بند ہو گیا۔ قتل کی وارداتیں ہوتیں نہ لدے ہوے اونٹ سرحد پار اترتے۔

گلیوں' پنگھٹ اور تنور سے خوف نے چادر سمیٹ لی اور زِندگی کی چہکار تو جیسے اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ سرداراں کے تنور پر اب اس کے ذکر کے پھول ہر روٹی پر ڈالے جاتے۔ ان پھولوں کو کنواریوں نے بہتے پانیوں میں تیرتے دیکھا' رنگوں کو اپنی نگاہوں میں بھرا اور خُوشبو سے مشامِ جاں کو معطر کیا۔

پھر میری بچی' ایک روز غضب کی آندھی چلی۔ وہ تمام دیئے بجھ گئے جو گھروں میں جل رہے تھے۔ لوگوں نے کواڑ سختی سے بھینچ کر بند کر لیے۔ بجلی اس زور سے کڑکی کہ بچے سہم کر ماؤں کی گودوں میں جا سمٹے اور مائیں سمٹ کر اپنے مردوں کے گھٹنوں سے جا لگیں۔ جب سب لوگ آندھی کی پھنکار اور بجلی کی کڑک سے خوب دہل چکے تو بارش کی ایسی باڑھ چلی کہ مکانوں کی چھتیں تک رونے لگی تھیں۔ ایسے میں وہ آواز لوگوں تک کیسے پہنچتی جو شعلے اگلتی بندوقوں کے دہانوں سے نکلی اور سانول کے وجود کو چیر گئی تھی۔ لوگ تو وہ دلدوز چیخیں بھی نہ سن سکے تھے' جو اس کے حلق سے نکلی تھیں' جس کا شوہر اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہوا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی اور آسمان رو رہا تھا مگر آنے والے بے رحم ہاتھ اس آگ کو ٹھنڈا کرتے رہے جو سانول نے اُن کی راہ سے جدا ہو کر بھڑکائی تھی۔

جب بارش رُکی اور لوگوں کے اوسان بحال ہوے تو لوگ گھروں سے باہر نکلے۔ سائیں اللہ رکھا کی بہو مٹھن نے یوں ہی احوال لینے کو اس کے آنگن میں جھانکا تو ایسی دہشت کی چیخ ماری' جس نے سارے گوٹھ کو باندھ کر اس کے آنگن میں لا کھڑا کیا تھا۔ سب چپ تھے اور سانول کی بھیگی ہوئی نعش ان کے درمیان پڑی تھی اور خُون کب کا گدلے پانی کے ساتھ بہہ کر اپنا رنگ کھو چکا تھا اور وہ وہاں نہیں تھی۔

لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو حزن کی چادر اوڑھ لی۔ زبانوں نے حیرت کے لفظ جنے اور کنواریوں نے چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ جوانوں نے غصے سے لہو کے جام لنڈھائے اور بوڑھوں نے کہنہ سال فلک کو دیکھا۔ پھر میری بچی' وہ جو اسے لے گئے تھے' انہوں نے اسے اُن تاریک گلیوں میں بیچ ڈالا' جن سے کبھی گزرتا تھا۔

اور پھر ایک دن جب اس کالی گلی سے گزر رہا تھا اور پرے کھڑے کھمبے سے زرد روشنی ٹھٹھرتے ہوئے نیچے اس ریڑھی والے کے چہرے پر پڑ رہی تھی جس کے سر پر محض چند بال تھے اور......اور......

اور جب وہ میرے گھر آ گئی تو اس نے میرے ساتھ فاقے کاٹے۔ جب تم اٹھارہ برس کی ہو گئیں' تو اس نے اپنی کہانی سنائی۔ جب کہانی سنا چکی تو اس نے ہوش کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی۔ جب اُس کے حواس بحال ہوئے تو میرے ہوش گم ہو گئے تھے۔ جب میری سماعت بحال ہوئی تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا:

''یہ بہت خطرناک آپریشن ہے۔ دماغ میں ایک پھوڑا ہے۔ جو روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اور جوں جوں وہ بڑھ رہا ہے مریض کی سانسیں گھٹ رہی ہیں''

ڈاکٹر کہہ رہا تھا:

''آپریشن بہت ضروری ہے۔''

میرے پاس کیا تھا؟ جب سے وہ ہسپتال آئی تھی' نوکری چھوٹ چکی تھی اور گھر کا اثاثہ بک چکا تھا۔ قلم بانجھ تھا اور وہ سارے دوست جو مجھ سے ملا کرتے تھے' میری پھیلی ہتھیلی پر ان سب نے کچھ نہ کچھ دھرا تھا مگر اب راہیں بدلنے لگے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا۔ سامنا ہو گا تو ہاتھ پھیلے گا۔ وہ بھی سچے تھے' بھلا کب تک کسی کی پھیلی ہتھیلی کو بھرا جا سکتا تھا۔

میری ہتھیلی خالی تھی۔

لفظ قلم سے پرے کھڑے تھے

وہ آخری سانسیں گن رہی تھی۔

اس نے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور کچھ کہا' جسے میں سن سکا' نہ سمجھ سکا۔ پھر اس نے بجھتی آنکھوں سے تمہاری جانب دیکھا تو نہ سمجھ آنے والے لفظوں کا مفہوم خود بخود میرے باطن میں جا اترا۔ اور جب میں نے اس کا بے روح بدن اپنے آنگن میں اتارا اور قلم تھاما تو ایک لفظ بھی قلم پر نازل نہ ہوا تھا۔

تم نے' ہاں میری بچی تم نے کہا تھا:

''بابا میں نے ایک کہانی لکھی ہے۔''

اور پھر جب ایک لمبے دُکھ نے تمہیں چاٹ لیا۔ زندگی کی بتیس خزاں زدہ بہاریں اس گھر میں گزار کر تم عدم کی راہ پر جا چکی ہو اور میرے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ جس گھر میں قرض خواہ دستک دیتے ہوں اور ہر بار انہیں مفلسی اپنا چہرہ دکھاتی ہو تو ایسے گھر کے دروازے پر تمہیں سکھ کا سندیسہ دینے کون آتا؟ دسمبر کی ٹھٹھرتی چاندی دیکھنے کا حوصلہ کس میں تھا؟ مگر تم نے یہ سب کچھ دیکھا اور اپنے اندر محسوس کیا تھا۔ پھر چپکے سے ایک کہانی لکھ کر میرے سرہانے رکھ دی۔

تم' جو چپ کی کشتی پر پہلے ہی سوار تھیں' اب موت کے گہرے پانیوں میں جا اتریں۔

اور اب جب کہ میری پیاری بچی' تاریکی زینہ زینہ اُتر رہی ہے۔ مجھے تمہارا کفن لانا ہے۔ میرا قلم بانجھ ہے اور کاغذ پر ایک لفظ کا بھی احسان نہیں۔ دیکھو میں اپنا بانجھ قلم رکھ رہا ہوں۔ اور اپنے سرہانے تلے رکھی کہانی نکال رہا ہوں۔ اور دیکھو سرناویں پر میں نے اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔ میں کہانی بیچنے جا رہا ہوں۔ تم گھبرانا مت' گھبرانا مت۔ میں جب واپس پلٹوں گا' تو تمہارے لیے سفید بے داغ کفن میرے ہاتھوں میں ہوگا۔ اسے میں اپنے سینے سے بھینچوں گا تو تمہاری ماں کی کہانی خُوشبو بن کر کفن میں سما جائے گی۔ تُو کفن پہنے گی تو میرے سینے سے بوجھ کے قدم اتر جائیں گے۔ لیکن اسی لمحے ایک اور بوجھ قدم بہ قدم میرے سینے پر بڑھ رہا ہے کہ جب میں اس مرحلہ میں داخل ہوں گا' جس میں اب تم ہو' یا کبھی تمہاری ماں تھی تو میرے لیے کفن

ماخوذ تاثر کی کہانی

وہ کہانیاں لکھتا رہتا ہے‘ نئی نئی کہانیاں۔

مگر میں اُس کی کہانیاں نہیں پڑھتی۔

اُسے گلہ ہے‘ سب لوگ اس کی کہانیوں کو نیا تجربہ قرار دیتے ہیں‘ اُس کی بہت تعریف کرتے ہیں مگر میں‘ اُس کی بیوی ہوتے ہوئے بھی اس کی کہانیاں نہیں پڑھتی۔

یہ درست نہیں کہ میں نے اس کی کوئی کہانی نہیں پڑھی۔

شروع شروع میں وہ جو بھی کہانی لکھتا‘ میں پڑھتی تھی۔

مگر جب اُس نے یہ بتایا کہ اُس نے جانوروں کی کہانیاں لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے تو میں خوفزدہ ہو گئی۔

میں نے فیصلہ کیا‘ میں اس کی کہانیاں نہیں پڑھوں گی۔

دراصل بچپن میں‘ میں نے ایک شکاری کی ڈائری پڑھی تھی جس میں ایک پرندہ ہر شب ایک

انسان کو نگل جاتا تھا۔

اگرچہ شکاری نے آخر میں اس درندے کو مار دیا تھا مگر تب جو خوف میرے اندر اترا تھا اب تک میرے اندر ہی اندر دندناتا پھرتا ہے۔

اور میں جانوروں کی کہانیاں نہیں پڑھ سکتی۔

وہ مجھے قائل کرنے کوشش کرتا ہے۔ جب بھی نئی کہانی لکھتا ہے' میرے سامنے لا رکھتا ہے۔

میں خوفزدہ ہو کر اُسے پرے دھکیل دِیتی ہوں اور وہ مشتعل ہو جاتا ہے۔

جب میں اُس کی بات نہیں مانتی یا پھر اُس کی بات کاٹ دِیتی ہوں تو وہ مشتعل ہو جایا کرتا ہے۔

میں مزید خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔

ایسے میں جھوٹ بول دیتی ہوں کہ میں نے اس کی کہانی پڑھ لی ہے۔

وہ خُوش ہو کے پوچھتا ہے۔

''بتاؤ کیسی لگی؟''

میں جھوٹ موٹ تعریف کرتی ہوں اور روایتی جملے بول دیتی ہوں۔

وہ اور زیادہ خُوش ہوتا ہے اور اَپنی کہانی کے ایک ایک نکتے کو کھول کھول کر بیان کرنے لگتا ہے۔

جب وہ ایسا کر رہا ہوتا ہے تو اُس کے نتھنے گرم سانسوں سے بھر جاتے ہیں اور جبڑے اس قدر سرعت سے اوپر نیچے حرکت کرتے ہیں کہ میں خوفزدہ ہو جاتی ہوں اور وہاں سے اُٹھ جاتی ہوں۔

جب وہ اَپنی بات نامکمل چھوٹتا دیکھتا ہے' تو طیش میں آجاتا ہے۔

میں ایک مرتبہ پھر دروغ گوئی کا سہارا لیتی ہوں اور کہتی ہوں:

''میں وہ ساری باتیں سمجھ گئی ہوں جو تم نے کہانی میں بیان کی ہیں۔''

’’ساری باتیں، جو علامت اور استعارے کی زبان میں ہوئی ہیں وہ بھی ؟‘‘

وہ سوال کرتا ہے۔

’’ہاں، وہ سب بھی۔ اور وہ بھی جو تم نے بیان نہیں کیں مگر کہانی میں موجود ہیں۔‘‘

میرا یہ جواب سن کر وہ تحسین بھری نظروں سے مجھے دیکھتا ہے۔

اس خوف سے کہ مبادا وہ میرا جھوٹ پکڑ نہ لے میں اسے مزید کہتی ہوں:

’’دیکھو کہانی اپنے قاری پر ایک الگ مفہوم کھولتی ہے۔ کہانی لکھتے وقت جو خیال محرک بنا، اُسے بیان کر کے تم کہانی محدود کیوں کرتے ہو؟‘‘

یہ ویسے ہی جملے ہیں جیسے کبھی میں نے اُس سے سنے تھے۔

وہ اِن جملوں کو سن کر مطمئن ہو جاتا ہے۔

حالاں کہ جب سے اُس نے جانوروں کی کہانیاں لکھنا شروع کی ہیں میں نے اس کی کوئی کہانی نہیں پڑھی۔

پھر یوں ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے دَھری چنگیر روٹیوں سے خالی رہنے لگتی ہے۔

اور منے کی بوتل میں دودھ کی بہ جائے پانی کی مِقدار بڑھ جاتی ہے۔

حتیٰ کہ اُس کی ماں کی پرانی کھانسی دوا نہ ملنے سے تازہ ہو جاتی ہے۔

میں اُس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہوں جب کہ اس طرح دیکھنے کی مجھے بالکل اجازت نہیں ہے۔

وہ مشتعل ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔

’’میں ساری عمر تمہارے شکموں کا ایندھن بنتا رہا ہوں۔ میری ساری صلاحیتیں، قوتیں، سارا وقت، سارا سرمایہ لقمہ لقمہ تمہارے بدنوں کا حصہ بنتا رہا مگر اب مجھے اپنے وجود کا یقین بھی چاہیے۔ ہاں اپنے وجود کا یقین۔ سمجھیں!‘‘

مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آتا۔ ڈر جاتی ہوں اور چپ ہو جاتی ہوں۔

وہ چپ ماحول میں آخری جملہ پھینکتا ہے۔

''میں نے اُپنی ہستی کو اُپنی کہانیوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں اب کتابی صورت میں لا رہا ہوں۔''

میں اسے ایک مرتبہ پھر حیرت سے دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ وہ تو جانوروں کی کہانیاں لکھ رہا تھا۔

پھر میں اُس کی بات بھول جاتی ہوں۔

دراصل اب کہیں جا کر میں اس قابل ہوئی ہوں کہ کچھ بھول سکوں حالاں کہ وہ بہت پہلے سے یہ چاہتا تھا۔ خصوصاً جب وہ میری تحقیر کر چکتا اور اِشتعال کی کیفیت سے نکل آتا تو یہی چاہتا کہ میں وہ سب بھول جاؤں جو اُس نے کہا ہوتا تھا۔

مجھے اُس کی ہر بات پر عمل کرنا ہوتا ہے کہ میری تربیت اِسی نہج پر ہوئی ہے۔

شروع شروع میں مجھے اُس کی بات گوارا تک نہیں ہوتی تھی۔

اور جب بھی گوارا ہی نہ ہو تو بھولتی کب ہے؟

مگر رفتہ رفتہ میں نے کوشش سے خود کو اس کا عادی بنا لیا ہے۔

اب تو وہ باتیں بھی بھولنے لگی ہوں جنہیں بھولنے کی وہ ہدایت نہیں کرتا۔

اور غالباً میرا اُنہیں یاد رکھنا ہی اُس کا منشا ہوتا ہوگا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں وہ باتیں بھول جاتی ہوں جنہیں بھول جانے کی وہ ہدایت کرتا ہے۔

مگر اچانک یوں ہوتا ہے کہ مجھے اُس کی سارِی باتیں شدّت سے یاد آنے لگتی ہیں۔

اور یہ تب ہونے لگا ہے جب سے اُس کی نئی کتاب آنے کی خبر اخبار میں چھپی ہے۔

اور اس کا یہ جملہ بھی کہ اُس نے اُپنی ذات اور اُپنے عہد کو ان کہانیوں کے ذریعے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں اخبار ایک طرف رکھ کر کتاب اُٹھا لیتی ہوں۔

وہی کتاب جو گزشتہ ہفتے اس نے لا کر میری گود میں ڈالی تھی تو وہ خُوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

اُس کا خیال تھا کہ اب اسے صحیح طور پر جانا جانے لگے گا۔

مگر اُس نے جو کہا تھا وہ میں بھول جاتی ہوں۔

اور اُس کی کتاب بھی پڑھنا بھول جاتی ہوں حالاں کہ اُس نے اَپنی کتاب، گھر میں ہر کہیں بکھیر دی ہے۔ یہاں، وہاں۔ ڈرائنگ، ڈائنگ، بیڈ۔ شیلفوں میں، سرہانے تلے، سائیڈ ٹیبل پر۔ کتاب ہر کہیں ہے مگر میں پڑھنا بھولے رہنا چاہتی ہوں۔

میں نے کہا ہے نا! جانوروں کی کہانیاں میں نہیں پڑھ سکتی۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں، جو ہر بات بھول جاتی ہوں، یہ کیوں نہ بھول پائی کہ اس میں جانوروں کی کہانیاں ہیں۔

وہ کہا کرتا تھا:

''کہانیاں تو کہانیاں، ہوتی ہیں، چاہے انسان کی ہوں یا جانوروں کی یا پھر دونوں کی۔''

مجھے اُس کی تیسری صورت مضحکہ خیز لگتی ہے۔

کیوں کہ میرا خیال ہے کہانی یا تو اِنسانوں سے متعلق ہوتی ہے یا پھر جانوروں سے۔ مگر اس کا دعویٰ ہے کہ دونوں کے بارے میں کہانیاں لکھنا ہی دراصل وہ منطقہ ہے جو اُس نے دریافت کیا ہے۔

اُس کی یہ دلیل بھی مجھے اُس کی کہانیاں پڑھنے پر آمادہ نہیں کر پاتی۔

پھر یوں ہوتا ہے کہ میں اخبار میں خبر پڑھتی ہوں۔

بل کہ یوں کہوں تو مناسب ہوگا کہ خبر میں اُس سے منسوب جملہ پڑھا تو بے اختیار کتاب

پڑھنے بیٹھ گئی۔

دراصل مجھے اس خواہش نے کتاب پڑھنے پر مجبور کیا کہ میں بھی اسے دریافت کرسکوں۔

میں اُسے شروع سے جاننا چاہتی تھی۔ پہلے پہل کوشش بھی کی مگر جان نہ پائی۔ میں اُسے جان بھی کیسے پاتی کہ وہ اَپنی ذات کے گنبد بے در میں محصور تھا۔

کسی کو جانے بغیر صدیوں پر محیط زِندگی کا ایک ایک لمحہ گزارنے سے بہتر ہے کہ محض معرفت کی ایک ساعت میسر ہو جائے۔

زِندگی کے بارے میں میرا یہی نقطہ نظر ہے۔

مگر وہ مجھ پر نہ کھل سکا۔

اس نے میرے اندر جھانکنے کی کوشش بھی نہ کی اور وقت گزرتا رہا۔

حتیٰ کہ وقت گزرنے کا اِحساس میرے اندر سے معدوم ہوتا چلا گیا۔

معدوم ہوتے اِحساس نے میرا اندر سے انہدام شروع کر دیا۔

ممکن تھا میں مکمل طور پر منہدم ہو جاتی کہ میں اخبار میں اس سے منسوب جملہ پڑھتی ہوں۔

یہ جملہ پڑھتے ہی فوراً کتاب اٹھاتی ہوں اور خود کو کوستی ہوں کہ میں نے پہلے یہ کہانیاں کیوں نہ پڑھ ڈالیں۔ ناحق وقت برباد کیا۔

میں جم کر بیٹھ جاتی ہوں اور ایک ایک لفظ پڑھ ڈالتی ہوں۔

کتاب پڑھ کر بند کرتی ہوں تو نظر اُس کی تصویر پر ٹھہر جاتی ہے۔

اُس کے ہونٹ تھوتھنی بننے لگتے ہیں اور......اور......

میرے اندر خوف کی آندھیاں چلنے لگتی ہیں۔

میں کتاب کو پَرے اُچھال دیتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ جو پڑھا ہے وہ سب بھول جاؤں یا پھر تصویر کی بابت جو محسوس ہوا ہے وہ احساس جاتا رہے۔

مگر مجھے دُکھ ہوتا کہ میں بھول جانا بھول چکی ہوں۔

میں اُس لمحے کو کوستی ہوں جب میں نے اخبار میں اُس سے منسوب جملہ پڑھا تھا اور خود کو اس کی کتاب پڑھنے پر مجبور پایا تھا۔

میری نظر بے اِختیار اُس کی دوسری تصویر پر پڑتی ہے جو سائیڈ ٹیبل پر دَھری ہے۔

یہ تصویر' جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں' یہیں ہے۔

اس تصویر کو میں نے جتنا دیکھا ہے' جتنی نزدیک سے اور جتنی بار' اتنا تو میں خود اسے بھی نہیں دیکھ پائی ہوں۔

مگر اب جو دیکھتی ہوں تو کتاب کی کہانیاں تصویر کے چہرے میں اُترنا شروع ہو جاتی ہیں۔

میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔

مگر تصویر' تصور میں جا اُترتی ہے۔

اور وہ کہانیاں بھی' جو جانوروں سے متعلق نہیں ہیں۔

نہیں' جو محض جانوروں سے متعلق نہیں ہیں۔

یا پھر آدمیوں سے متعلق ہیں۔ نہیں' وہ کہانیاں محض آدمیوں سے متعلق بھی نہیں ہیں۔

میرے چہرے کا رُخ تصویر کی سمت ہی رہتا ہے۔

اور لحہ لحہ اُس کے بدلتے خال وخد دیکھتی ہوں تو مزید خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔

میں اَپنے سارے وسوسے (اگر یہ سوسے ہیں تو) جھٹک دینا چاہتی ہوں اور خود کو یقین دِلاتی ہوں کہ یہ اس کی ہی تصویر ہے۔

نہیں' یہ اُس کی تصویر نہیں ہے۔

تو پھر یہ اُس کے اَندر کی تصویر ہے۔

نہیں' یہ محض اُس کے باطن کی تصویر بھی نہیں ہے۔

میں ایک مرتبہ پھر آنکھیں میچ لیتی ہوں۔

مگر اُس کے پل پل بگڑتے خال وخد میرے اندر اُترنے لگتے ہیں۔

میں آنکھیں پوری طرح کھولتی ہوں کہ یہ تو اس سے بھی زیادہ بھیانک صورتحال ہے۔اب تصویر پر نظریں گاڑے اس کی صورت کو ویسا ہی دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں جیسی وہ کتاب پڑھنے سے پہلے نظر آتی تھی۔

میں چاہتی ہوں کتاب کا ایک لفظ بھی مجھے یاد نہ رہے۔

مگر شاید میں بھول جانا بھول چکی ہوں۔

اُف خدایا' یہ ہونٹ' یہ تھوتھنی

اوپر سے عجیب طرح کی مونچھیں

اور بالوں کا فرسودہ سٹائل

کندھے گرا کر چلنا

آنکھوں کی سرخی

اور دیکھنے کا بے ہودہ انداز

اِدھر اُدھر سے خوف اُمڈ پڑتا ہے۔ میں خوف میں ڈوب جاتی ہوں اور تیرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہوں۔ ہاتھ اس کی تصویر پر جا پڑتا ہے۔

میں اُسے اٹھا کر پرے پھینک دیتی ہوں۔

فریم کا شیشہ کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔

مگر تصویر سے اُبلتے ہوے خال وخد سے اسی طرح خوف اُبلتا رہتا ہے۔

میں تصویر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہوں۔

نظر کتاب پر پڑتی ہے' اُلٹ دیتی ہوں؛ تصویر وہاں بھی ہے۔

سرہانے سے کتاب اُٹھا کر پرے پھینکتی ہوں۔

کتاب پائینتی پر یوں جا پڑتی ہے کہ تصویر کا رُخ اُوپر کی جانب ہوتا ہے۔

وہی سرخ سرخ آنکھیں، وہی تھوتھنی، وہی مونچھیں کھردری اور بے ڈھنگی، وہی......

میں پاؤں سے چھو کر اُسے فرش طرف کھسکانا چاہتی ہوں۔

یکا یک خیال گزرتا ہے۔

اگر اس نے مجھے ڈس لیا تو؟

عجب مضحکہ خیز خدشہ ہے۔

مجھے اَپنے خیال پر حیرت ہوتی ہے اور خیال کی تہہ تک پہنچنے کے لیے سوچتی ہوں۔

ایسا کیوں ہوا؟

ایسا خیال کیوں آیا؟؟

آخر کیوں؟؟؟

مجھے اس کتاب میں کتوں اور کتیوں، سانپوں اور سپنیوں حتیٰ کہ مچھروں کے بارے میں ایک سے زائد کہانیاں یاد آتی ہیں۔

مگر یہ تو کتاب ہے، کیسے کاٹ ڈس سکتی ہے؟

کیسے، کیسے؟؟

تو کیا میں اسے وہیں پڑا رہنے دوں۔

کتاب میں موجود کہانی کی اُس کتیا کی طرح، جو اپنے پلوں کے ساتھ گھر کی دہلیز پر پڑی رہتی ہے اور جب بھی گھر کا مالک باہر نکلتا ہے اسے دریدہ نظروں سے دیکھتی ہے۔

مالک اُسے دھتکارتا ہے، گالیاں بکتا ہے، ٹھوکریں مارتا ہے، اور کہتا ہے:

''تم اسی لائق ہو۔ تم اور تم جیسی سب لائق ہیں، بچے جنیں، دروازوں پر پڑی رہیں اور دھتکاری جاتی رہیں۔''

کہانی آگے چلتی ہے اور آخر میں اپنا بھید کھولتی ہے۔

گھر کے مالک کی بابت انکشاف کرتی ہے کہ وہ خود بھی اسی قبیل سے تھا۔

اور چوں کہ اسی بستی میں سب ہی ایک قبیل کے تھے لہٰذا خدا کا کرنا یوں ہوا کہ ایک مجذوب کا گزر اس بستی سے ہوا۔

اس بستی کا کوئی فرد مجذوب کے مقابل نہ آیا' سوائے اُس کے جو بعد میں اپنے پلوں کے ساتھ دہلیز پر جا بیٹھی تھی۔

مجذوب بھوکا تھا۔ اس نے کھانا دیا۔

مجذوب نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہاں منڈلاتی گدھوں کو کھلا دیا۔ کہا:

''جانتی ہو گدھ کہاں زیادہ منڈلاتے ہیں؟''

اُس نے ادب سے جواب دیا:

''آپ بہتر جانتے ہیں سرکار۔''

مجذوب کا جواب تھا:

''جہاں مردار ہو۔''

''مردار؟''

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب اسے کوئی نظر نہ آیا تو وہ مجذوب کے کہے کی تہہ تک پہنچ گئی۔

''سرکار' مجھے اِن گدھوں سے بچائیے۔ مجھے اِن سے مختلف کیجیے۔''

مجذوب نے نگاہ اوپر کی اور جب نگاہ پلٹ کر نیچے آئی تو وہ آئینہ بن چکی تھی۔

لہٰذا اُس کا مقام اُسی کی دہلیز قرار پائی۔

وہ دہلیز پر بیٹھی اُسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتی ہے اور تاسف سے اُن لمحوں کی بابت سوچتی ہے کہ جب پھر مجذوب آئے گا اور سب کا ظاہر باطن کی جون پر بدل دیا جائے گا۔

کہانی کا یہ حصہ یاد کر کے' میں خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔

پھر کتاب کی پشت والی تصویر کو دیکھتی ہوں تو یوں لگتا ہے مجذوب آ کے گزر گیا ہے کہ تصویر

والے کا چہرہ بدلتا جا رہا ہے۔ ہونٹ' ہونٹوں سے تھوتھنی' اور......

میں خوف سے کانپنے لگتی ہوں اور باہر نکل کھڑی ہوتی ہوں۔

دالان عبور کرتی ہوں۔

دالان سے گزرتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے صدیوں کی مسافت پر محیط صحرا عبور کیا ہے۔

جب چوکھٹ آجاتی ہے تو خود بخود میں دوزانو بیٹھ جاتی ہوں۔

دہلیز آنسوؤں سے سیلن زدہ ہے۔

میں دہلیز چھوتی ہوں اور آنسوؤں کے ساتھ ساتھ سسکیاں اور آہیں بھی میری پوروں میں سما جاتی ہیں۔ میں ہمت کر کے اپنے قدموں پر کھڑی ہوتی ہوں۔ خُوشی سے سوچتی ہوں کہ میں بھی اپنے قدموں پر کھڑی ہوں۔ تب میں گلیوں میں بھاگتی ہوئی اس روشنی تک جانا چاہتی ہوں جو گلی کی نکڑ پر ایک کھمبے کے نیچے سمٹی ہوئی ہے۔

مجھے یوں لگتا ہے کہانی والی ''وہ'' میرے ساتھ بھاگ رہی ہے جس کا تعاقب بھونکار اور غراہٹیں کرتی ہیں۔

میں اُسے دیکھتی ہوں۔ وہ میری طرح خوفزدہ ہے۔

میں نہیں چاہتی کہانی کا اگلا حصہ مجھے یاد آئے۔

مگر یاد تو وہ چیز آتی ہے جو بھولی ہوئی ہو۔

جب کہ میں بھولنا بھول چکی ہوں۔

اور ''وہ'' میرے ساتھ ساتھ ہے مگر خوف سے تھر تھر کانپے جا رہی ہے۔

میں جھک کر پتھر اٹھانا چاہتی ہوں......مگر پتھر زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔

میں خالی ہاتھ ہی اُن کی طرف اُچھال دِیتی ہوں۔

بھونکار اور غراہٹیں بند ہو جاتی ہیں۔ میں نکڑ تک جا پہنچتی ہوں۔

کیا دیکھتی ہوں کہ وہاں ایک چوہیا ہے۔

کہانی مجھے ایک مرتبہ پھر یاد آتی ہے؛ وہی جس میں چوہیا سدھائی جاتی ہے۔

میں خود کو سوچتی ہوں اور مری ہوئی چوہیا کو دیکھتی ہوں۔ ایک بار پھر خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔

اس سے پہلے کہ مٹھی بھر روشنی تلے ایک اور چوہیا مری پڑی ہو میں واپس گھر کی جانب بھاگ کھڑی ہوتی ہوں۔

جونہی دہلیز پار کرتی ہوں، وہ سامنے آجاتا ہے؛ اور مجھے دیکھتا ہے۔

میں اُسے نہیں دیکھنا چاہتی؛ مگر نظر پڑ جاتی ہے۔

عین اُس لمحے کہ جب اُس کی نظر پڑتی ہے مجھے گمان گزرتا ہے کہ میں نے چوہیا نہیں ایک چوہا دیکھا تھا۔

لمبی تھوتھنی اور......

میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے، چوہا میرے اندر اتر گیا ہے اور اس نے مجھے اندر سے کترنا شروع کر دیا ہے۔

آنکھیں کھولتی ہوں، تو وہ گھورتا ہے۔

آنکھیں بند کرتی ہوں، تو وہ اندر سے کترتا ہے۔

تب یکا یک میرے اندر سے کراہت کا غبار اٹھتا ہے۔ مرا ہوا چوہا۔

سامنے چھت سے لیمپ لٹک رہا ہے اور عین اس کے نیچے وہ بیٹھا ہوا ہے۔

نکڑ پر عین روشنی تلے؛ مرا ہوا چوہا۔

مجھے اُبکائی آتی ہے۔ میں بھاگ کر واش بیسن تک پہنچتی ہوں اور اِستفراغ کے عمل سے گزر جاتی ہوں۔

ساس مجھے دیکھتی ہے اور خُوشی خُوشی اُسے کہتی ہے:

''مبارک ہو۔''

وہ جو پہلے مجھے گھور رہا تھا' اب اُوپر نہیں دیکھتا۔
میں اِنتظار کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ وہ مجھے دیکھے' مگر نہیں دیکھتا اور رات بیت جاتی ہے۔
تب میں پاؤں پٹختی ہوں۔
میرے پاؤں پٹخنے کی صدا فقط میری ہی سماعتوں سے ٹکراتی ہے۔
جب اس کی خامشی اور بے اعتنائی میرا بدن نوچنے لگتی ہے تو میں دوسری بار دہلیز پار کر جاتی ہوں اور بھاگنے لگتی ہوں۔ مسلسل بھاگتی رہتی ہوں۔
حتیٰ کہ وہ پارک آجاتا ہے جہاں رنگ ہی رنگ ہیں۔ قہقہے ہی قہقہے ہیں۔
میں مُسرت بھری آوازوں کو سنتی ہوں' تتلیوں کو دیکھتی ہوں' خُوشبوؤں سے مشامِ جاں معطر کرتی ہوں اور ان ساری کہانیوں کو بھولنا چاہتی ہوں جو میں نے پڑھی ہیں۔
مگر رفتہ رفتہ جب شام کے سائے اُترنے لگتے ہیں تو کہانیوں کے دُھندلکے بھی میرے اندر اُتر جاتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے وہ پارک نہیں ایک جنگل ہے' گھنا جنگل۔ دور ادھر آسمان سے سایا اُترتا ہے اور بدنوں کی کھال بنتا جاتا ہے۔
اُس کی ایک کہانی میں بھی یہی ہوتا ہے۔
کہ اندر کی تاریکی باہر کی کھال بن جاتی ہے۔
یا پھر باہر کی سیاہ کھال اندر کی تاریکی بن کر گھس بیٹھتی ہے۔
پھر لمبی تھوتھنیوں والے اَپنی جون بدل کر انسانی بستیوں میں جا پہنچے ہیں۔
روز کسی نہ کسی پر شب خُون مارتے ہیں حتیٰ کہ وہاں فقط وہی رہ جاتے ہیں جو اَپنی جون میں نہیں ہیں۔
بس یہیں تک کہانی یاد کر پاتی ہوں کہ خوف میرے چاروں جانب دھمال ڈالنے لگتا ہے۔
مجھے یوں محسوس ہوتا ہے میرے اردگرد سب وہ ہیں جو اَپنی جون میں نہیں ہیں۔

میں اُلٹے قدموں بھاگ کھڑی ہوتی ہوں۔
مگر ٹھوکر کھا کر گھر کی دہلیز سے اندر جا پڑتی ہوں۔
وہ چیختا ہے اور پوچھتا ہے کہ میں کہاں رہی؟
میں چپ کے دھاگے سے ہونٹ سیئے رکھتی ہوں۔
میں چاہے چپ رہوں یا بولوں؛ اُسے ہر صورت میں طیش آتا ہے۔
لیکن جب میں چپ رہنے پر بولنے کو ترجیح دوں تو وہ آپے میں نہیں رہتا۔
اگرچہ اب کے میں چپ رہنے کو مناسب خیال کرتی ہوں مگر میری چپ اُسے اس سے زیادہ طیش دِلا دِیتی ہے جتنا اُسے میرے بولنے پر آیا کرتا ہے۔
میں اُسے دیکھتی ہوں۔
اُس کی ساری کہانیاں اُس کے چہرے پر اُگ آئی ہیں۔
تھوتھنی، دانت، کھردری مونچھیں، آنکھوں کی سرخی......
وہ آگے بڑھتا ہے اور مجھے بھنبھوڑ ڈالتا ہے۔
اس قدر کہ میرا جسم زخموں سے چور ہو جاتا ہے۔
جب سارے جسم کے زخم رِسنے لگتے ہیں تو وہ میری روح پر چرکے لگاتا ہے۔
اور جب اُسے یقین ہو چکتا ہے کہ مجھ میں سنبھلنے کی ذرا بھی سکت نہیں رہی تو وہ مجھے یوں ہی کھلے صحن میں چھوڑ کر اندر چلا جاتا ہے۔
اور جب سب کچھ بھول جاتا ہے تو وہ باہر آتا ہے۔
مجھے بہلا پھسلا کر ہمیشہ کی طرح سب کچھ بھول جانے کا مشورہ دیتا ہے۔
مگر میں اب بھول جانا' بھول چکی ہوں۔
میں اُٹھتی ہوں اور پہلی مرتبہ اُسے نظر انداز کرتی ہوں جو دوزانو بیٹھا ہوتا ہے۔ میں اُسے یوں ہی بیٹھا چھوڑ کر اندر چل دیتی ہوں۔

اُس کی ساری کتابیں اُپنے بازوؤں میں سمیٹ کر باہر نکلتی ہوں اور عین اس کے سامنے ڈھیر لگا دیتی ہوں۔

پھر بھری ہوئی تیل کی بوتل ڈھیر پر اُنڈیل دیتی ہوں۔

وہ اُٹھتا ہے اور مجھے دھکا دے کر پرے گرا دِیتا ہے مگر میں حوصلہ نہیں ہارتی اور ماچس کی تیلی کتابوں کے ڈھیر کو دِکھا دِیتی ہوں۔

شعلے بھڑکنے لگتے ہیں اور وہ آگ کی تپش سے موم کی طرح پگھلتا چلا جاتا ہے۔

جب وہ سارے کا سارا پگل چکتا ہے' تو میں اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتی ہوں اور وہاں بوسہ دیتی ہوں جہاں سے توتھنی برآمد ہوا کرتی تھی۔

وہ میرے بھیگے بوسے سے کھل اٹھتا ہے۔

اس کی نظر شعلوں پر پڑتی ہے تو وہ بڑبڑاتا ہے:

''یہ تم نے کیا کیا؟''

میں اُسے دیکھتی ہوں اور موم کی طرح پگھلتے اُس کے وجود کو محبت کی پوروں سے اصلی خال وخد میں لاتی ہوں اور کہتی ہوں:

''اب تم صرف انسانوں کی کہانیاں لکھو گے۔''

وہ میری طرف دیکھتا ہے۔

اس کی آنکھوں کی ساری سرخی غائب ہو چکی ہے۔

وہ دہراتا ہے:

''انسانوں کی کہانیاں؟......م......م......مگر کیسے؟''

میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے ایک مرتبہ پھر باہنوں میں سمیٹتی ہوں۔

''ہاں انسانوں میں رہ کر انسانوں کی کہانیاں اور محبتوں میں بس کر محبت کی کہانیاں''

اپنے ہونٹ دوبارہ وہاں جا رکھتی ہوں جہاں کچھ دیر پہلے پھول کھل اُٹے تھے۔

عین اسی لمحے سارے میں مہک بھر جاتی ہے۔

گرفت

ہم دو ہیں اور تیسرا کوئی نہیں۔

اگر ہے بھی تو ہم نے اُسے ذِہن کی سلیٹ سے رَگڑ رَگڑ کر مٹاڈالا ہے۔

وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے میرا بدن اُس موم کی طرح ہے جو شعلے کی آنچ سے اس قدر نرم ہو جائے کہ جدھر چاہو موڑ لو۔

یہ شعلہ اُس کے اندر بھی ہے اور میرے اندر بھی۔

مگر حیرت ہے یہ شعلہ اس کے بدن کو تپا کر مزید سختی عطا کرتا ہے اور مجھے پگھلاتا چلا جاتا ہے۔

یہی سختی اور نرماہٹ پھسلن کی شروعات ہو سکتی ہیں۔

مجھے یقین ہے، ہمیں پھسلنے سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

ویسے ہم دو کے علاوہ ہے بھی کون، جو ہمیں بچا سکے۔

اور اگر ہے بھی تو ہم نے اُسے اپنے ذہن کی سلیٹ سے یوں رگڑ رگڑ کر مٹا ڈالا ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا ایک جیسا ہے۔

مجھے خدشہ ہے یوں پھسل کر گرنے سے مجھے گومڑ نکل آئے گا۔

ایسا گومڑ جو میری ساری رعنائی نچوڑ کے مجھے بدوضع کر دے گا۔

یہ گومڑ پک کر پھٹ جائے گا تو مجھے بدبودار خُون اور پیپ میں بھگو دے گا۔

اور شاید اس قدر بھگو دے کہ دیکھنے والوں کو ابکائیاں آنے لگیں۔

وہ کہتا ہے کہ چوٹ تو اسے بھی آ سکتی ہے۔

مگر، میں جانتی ہوں وہ جھوٹ کہتا ہے۔

اُسے جھوٹا سمجھنے کی میرے پاس ٹھوس دلیل ہے۔

وہ یہ کہ ہم جب بھی پھسلنے کو ہوتے ہیں میرا رخ زمین کی طرف اور اُس کا رخ آسمان کی بہ جائے میری جانب ہوتا ہے مگر ہر بار وہ پشت کے بل اوپر ہی کو اُٹھتا ہے۔

عجب واقعہ ہے کہ وہ آسمان کو آنکھ بھر کر دیکھنے سے گریز کرتا ہے اور نظر مجھ پر ہی جمائے رَکھتا ہے۔

جس روز بھولے سے بھی اُس کی نظر آسمان پر پڑ جائے اس کے ہونٹوں پر لفظ پیڑی کی صورت جم جاتے ہیں۔

مجھے حیرت ہوتی ہے؛ کیا یہ وہی الفاظ ہیں جو اُس کے ہونٹوں سے پھسل پھسل کر پھسلن بناتے رہے ہیں؟ ایسی پھسلن کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اُس پر لڑھکتی رہی ہوں۔

ہاں، پھسلن کی وجہ اُس کے ہونٹوں سے پھسلنے والے لجلجے الفاظ بھی ہو سکتے ہیں۔

کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ گفتگو کو میں ہی اِبتدا دیتی ہوں۔

مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

اتنا کم کہ انگلیوں پر گن سکتی ہوں۔

اُنگلیوں پر گننا مجھے اچھا لگتا ہے۔

مگر بار بار دو تک گننے سے مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگتی ہے۔

میں اُسے کہتی ہوں:

''آؤ' پھسلتے پھسلتے وہاں اُن ٹھنڈے میٹھے چشموں تک جا پہنچیں جن کا متبرک پانی ہمارے بدنوں سے بانجھ مشقتوں کو دھو کر انہیں زرخیز کر دے گا پھر نئے پھول اُگیں گے۔ ایسے پھول' جن کی مہک خدشوں کی دلدل کو ڈھانپ لے گی۔''

وہ یہ سن کر بپھر جاتا ہے۔

اور میری ان انگلیوں کو جنہیں دو تک گنتی ازبر ہو چکی ہے' ان انگلیوں سمیت جو گنتی کے عمل سے ہی نا آشنا ہیں' سختی سے اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

عجب سختی ہے جو اُنگلیوں سے ہتھیلی اور ہتھیلی سے بدن میں نرماہٹ اُتارتی چلی جاتی ہے۔

میری ماں کہتی تھی۔

''عورت پیدا ہوتے ہی آدھی زمین میں دفن ہو جاتی ہے اور زمین میں دفن ہونے والی' باہر رہ جانے والی کو ساری عمر اَپنی گرفت میں لینے کے جتن کرتی ہے۔''

ماں کی بات مجھے یوں یاد آئی کہ پھسل کر گرتے وقت وہ کشش ثقل سے آزاد ہو جاتا ہے اور مجھے کوئی نیچے بہت نیچے کھینچتا چلا جاتا۔

شاید یہ وہی میرے بدن کا حصہ' آدھی عورت ہے جس کی بابت ماں نے بتایا تھا۔

مجھے اُس وقت ماں کی باتوں پر ہنسی آتی تھی' جب کہ اب میں اُلجھن پڑ جاتی ہوں۔

میری ہنسی کی سنہری مچھلی نے اُلجھن کا کانٹا اُس روز نگلا تھا جب مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ میں اُس علاقے میں داخل ہو چکی ہوں جہاں پھسلن ہی پھسلن ہے۔

دراصل میں پہلے پہل خلوصِ دِل سے سمجھتی تھی کہ میری ماں نا سمجھ ہے۔

مگر جب سے وہ یہ کہنے لگا ہے کہ ساری ہی لڑکیاں نا سمجھ ہوتی ہیں' مجھے اَپنی ماں کی

باتیں یاد کر کے ہنسی نہیں آتی۔

اب مجھے پہلے پہل کی اپنی بے جا ہنسی پر دُکھ ہوتا ہے۔

ہمارے گھر کے صحن میں ایک برگد اُگا ہوا ہے۔

مجھے یاد ہے یہ اس وقت بھی تھا جب بان کی کھری چارپائی پر لیٹے ایک شخص کو سفید میلی چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

میں نے ماں کو پہلی مرتبہ دوہتڑ سینے پر مارتے' بال نوچتے اور دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ تو چپکے چپکے رونے کی عادی تھی' یوں کہ سینے کے اندر کچھ ہوتا رہتا جس کی دھمک بہ مشکل مجھ تک پہنچ پاتی تھی۔ ہونٹ دانتوں تلے دبے ہوتے اور آنکھیں بھیگ بھیگ جاتیں۔ مگر یوں منھ کھول کر روتے اور ہاتھ لہرا لہرا کر بین کرتے میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔

میں نے بے اختیاری میں اُس کے چہرے سے چادر اُلٹ دِی تھی۔

اجنبی' بالکل اجنبی چہرہ؛ سخت یوں جیسے پتھر سے تراشا گیا ہو۔

اُس اجنبی شخص کو' کہ جسے میں نہ جانتی تھی اور جس کے لیے میری ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی' صبح ہی صبح' صحن میں بچھی کھری چارپائی پر ڈال دیا گیا تھا۔

میری آنکھ اُس وقت کھلی جب میری ماں بوکھلا کر میرے پہلو سے اُٹھی تھی اور اُس کے سینے کی دَھمک دانتوں تلے دَبے ہونٹوں سے شرائے بھرتی نکلی تھی۔

پھر میری ماں نے میرے نیچے بچھی چادر کو اس قدر تیزی سے کھینچا تھا کہ میں لڑھکتی پرے جا پڑی تھی۔

ماں نے مجھے نہیں سنبھالا تھا حالاں کہ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔

جب وہ بھاگ کر صحن میں بچھی چارپائی تک پہنچی تھی تو اُس نے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر چادر کو

پھیلا کر اُس شخص کے بدن پر ڈال دیا تھا۔

ایسا کر کے ماں نے اپنے ہاتھوں کی ساری چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں۔ بال کھول لیے تھے اور ماتھا چار پائی کے پائے سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی کر لیا تھا۔

مجھے ماں کے رویے پر حیرت ہوئی تھی۔

میں بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر جلد ہی اس کی لمبی چیخیں، لمبی چپ نے نگل لیں۔

اور لمبی چپ اُسے تب لگی جب اُس نے یوں ہی روتے دھوتے لمحہ بھر کو نظر بھر کو مجھے دیکھا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ خود بھی چُپ کی چادر اوڑھ کر بے سُدھ برگد تلے بچھی کھری چار پائی پر لیٹ گئی۔

مجھ پر حیرت در حیرت کی جمتی تہیں سِل کی طرح ہو گئیں۔

حیرت کی سِل اس روز تڑخ کر ٹوٹ گئی جب اُس شخص نے میرے لیے لجلجے لفظ اُگلے تھے جن کی وجہ سے چاروں طرف پھسلن ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اُس کا چہرہ غور سے دیکھا تھا۔ بالکل وہی چہرہ تھا۔ پتھر سے تراشا ہوا۔

وہی جو بہت پہلے اپنے گھر کے صحن میں برگد تلے دیکھا تھا۔

اور جس کے سرہانے میری ماں نے بین کیے تھے' چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور سینے میں دفن دُکھوں کو سسکیوں سے چیخوں میں ڈھلنے دیا تھا۔

گھر کے صحن میں اَب بس وہی برگد کا درخت ہے اور میں ہوں۔

وہ چہرہ' جو پتھر سے تراشا گیا ہے فقط میری سوچوں میں ہے۔

محض اُس کا چہرہ ہی پتھریلا نہیں اُس کا سارا بدن پہاڑوں جیسا ہے۔

ایسا پہاڑ جس کے اندر آتش فشاں کھول رہا ہے اور جس نے اپنا دہانہ کھول دیا ہے جہاں سے لفظوں کا لاوا نکلتا ہے۔ یہی لجلجا اور گرم گرم لاوا مجھے آن کی آن میں پگھلا دیتا ہے۔

اوپر کو اچھلتا کودتا۔

اس کا پہاڑوں جیسا بدن اپنے ہی لاوے کا جزو بن کر اوپر ہی اوپر اچھلتا رہا اور میں روز بہ روز زمین کی طرف گرتی چلی گئی۔

مجھے وہی گومڑ بھی نکل آیا ہے جس کا مجھے خدشہ تھا۔

وہ قہقہے لگاتا رہا اور کہتا رہا کہ اُسے بھی تو چوٹ لگ سکتی ہے۔

مگر میں شروع ہی سے جانتی ہوں' وہ جھوٹ بولتا ہے۔

اب جب کہ میں عین برگد تلے کھڑی ہوں مجھے اپنی ماں خُوش نصیب لگنے لگی ہے۔

اُس نے پتھر جیسا چہرہ اپنے سامنے بے بس پڑے دیکھا تھا۔

اس پر آنسو بہائے تھے اور بین کئے تھے۔

کاش میں بھی اتنی خُوش بخت ہوتی۔

مجھے تو وہ ساری آوازیں سننی پڑ رہی ہیں جو گھر کے دروازے پر بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

مجھے خبر ہے وہاں ایک نہیں پتھر جیسے چہروں والے کئی ہیں۔

وہ بھی ان ہی میں ایک ہے۔ ان سب کے بیچ اپنی پہچان کھونے والا۔

اُن سب کو میرے گومڑ نے مشتعل کر رکھا ہے۔

ابھی میرا گومڑ نہیں پھٹا۔

مگر انہیں خدشہ ہے کہ اگر وہ پھٹ گیا تو ان سب کے گھر اور گلیاں خُون اور پیپ سے لت پت ہو جائیں گے۔

دروازہ ٹوٹ چکا ہے۔

اب وہ مجھے دھکیلتے ہوئے شہر سے باہر لے جا رہے ہیں۔

میں گرتے پڑتے اُن کے آگے آگے بھاگ رہی ہوں اور وہاں پہنچ جاتی ہوں جہاں پھسلن ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے۔ پتھر چہروں والے سارے مرد' کہ جن کے ہاتھوں میں بھی پتھر ہیں'

پھسلنا شروع ہو گئے ہیں۔

ان میں سے کسی ایک کو بھی چوٹ نہیں لگ رہی اور مجھے اس پر تعجب نہیں ہو رہا۔

میں اپنے گومڑ کو دیکھتی ہوں اور اُن کے پھسلتے اور اُچھلتے بدنوں کو دیکھتی ہوں۔

پھر اس تضاد پر زور زور سے قہقہے لگاتی ہوں اور اس کے لیے بانہیں کھول دیتی ہوں جو میرے پیدا ہوتے ہی مجھے اَپنی گرفت میں لینے کے جتن کر رہی تھی۔

دوسرا آدمی

کم آمیزی میرے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔

سفر کے دوران تو میں اور بھی اپنے آپ میں سمٹ جاتا ہوں۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ میلوں سفر کر جاتا ہوں مگر ساتھ بیٹھے مسافر سے رسمی علیک سلیک بھی نہیں ہو پاتی۔

مگر وہ عجب باتونی شخص تھا کہ اس نے زورازوری مجھے بھی شریک گفتگو کر لیا تھا۔

ماڈل ٹاؤن منتقل ہونے کے بعد مجھے ذاتی گاڑی پر روزانہ دفتر آنا جانا ترک کرنا پڑا کہ دفتر اور گھر کے بیچ لگ بھگ بیس بائیس کلومیٹر کا فاصلہ پڑتا ہے اور جو تنخواہ کٹ کٹا کر بچتی ہے اس میں پٹرول اور گاڑی کے توڑ پھوڑ کے اضافی خرچ کی کوئی گنجائش نہیں۔

مجھے کئی سالوں کے بعد ذاتی گاڑی کی بہ جائے ویگن میں آنے جانے سے اُلجھن سی ہوتی ہے۔کبھی کبھی تو ویگن کا اِنتظار اُلجھن سے کوفت میں بدل جاتا ہے۔

اور وہ ایسا ہی روز تھا۔

دفتر سے نکلا تو شدید ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ویگن سٹاپ تک پہنچتے پہنچتے بوندا باندی ہونے لگی۔ مجھے یوں زیادہ بھیگنا نہ پڑا کہ جلد ہی ویگن آ گئی۔

میں کوششیں کرتا ہوں کہ سب سے پچھلی نشست کے ایک طرف ہو بیٹھوں۔ یوں میں باہر کا نظارہ بھی کرتا رہتا ہوں اور باہر سے اندر آتی روشنی میں اخبار یا رسالہ بھی پڑھ سکتا ہوں جو عموماً سفر کے لیے ساتھ لے کر چلتا ہوں۔

مگر اُس روز دائیں ہاتھ ایک میلا کچیلا آدمی بیٹھا ہوا تھا اور دوسری طرف لحیم شحیم شخص۔ مجھے مجبوراً بائیں جانب اسی شخص کے ساتھ بیٹھ جانا پڑا۔

میں عومی اور اجنبی چہروں کو غور سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوں۔ سرسری نظر ڈالتا ہوں اور گزر جاتا ہوں۔ ہاں کوئی بہت دِل کش چہرہ ہو تو نظر ٹھہر جاتی ہے۔

اُس کا بھی عام سا چہرہ تھا' کرخت اور بے ہودہ۔ مگر مجھے دیکھنا پڑا کہ یہ وہ شخص تھا جو میری پسندیدہ نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے عادتاً اخبار اپنے دامنے پھیلا لیا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ میری بے سود کوشش تھی۔ اس شخص کا بے طرح پھیلا بدن شیشے سے چھن چھن کر آتی روشنی کو پوری طرح روکے ہوے تھا۔ میں نے جھنجھلا کر قمیض کے دامن سے عینک کے شیشوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا مگر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود الفاظ بصارت کی گرفت میں نہ آ رہے تھے۔ میں نے اخبار تہہ کر دیا اور نہ چاہتے ہوے بھی اس شخص کو دیکھا۔

وہ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر بے ہنگم مسکرا دیا۔

مجھے اس کی مسکراہٹ زہر لگی' منھ پھیر لیا۔ میرے چہرے پر پھیلتی ناگواری کو محسوس کیے بغیر وہ کہنے لگا:

''یہ آپ نے اچھا کیا بھائی صاحب' آخر اخبار میں ہوتا کیا ہے۔ حکمرانوں کے جھوٹے وعدے' سیاستدانوں کے لمبے چوڑے بیانات' قتل' چوری' ڈکیتی اور اغوا کی خبریں۔ اللہ قسم میں اخبار دیکھتا ہوں تو خوف سے ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔''

باہر زور کی بارش ہونے لگی اور ویگن میں جو بھی مسافر داخل ہوتا' پانی میں تر بتر ہوتا۔ میری دوسری جانب اب جو مسافر آیا' اس سے بھی پانی نچڑ رہا تھا۔ میرے ساتھ بیٹھنے لگا تو میں کھسک کر اس لحیم شحیم شخص کے ساتھ لگ گیا' جو میرے مطالعے کا شغل منقطع ہونے پر خُوشی کا اِظہار کر چکا تھا۔

اُس کے چربی چڑھے بدن سے گرمی کے ہلے اُٹھ رہے تھے۔ مجھے اُس کے بدن سے جا لگنا خُوشگوار لگا۔

اب وہ کنڈیکٹر سے اُلجھ رہا تھا۔

''ارے او چھوٹے اب بس بھی کر۔ سواریاں تو پوری ہو چکی ہیں۔ اب کیوں گھسیڑے جا رہے ہو ہر ایک کو اندر۔ اب اور نہ بٹھانا کسی کو۔''

کنڈیکٹر جان بوجھ کر اُس کی جانب متوجہ نہ ہو رہا تھا۔

وہ جھنجھلا کر بولا۔

''دیکھیں نا بھائی صاحب! یہاں تو ہر طرف بگاڑ ہی بگاڑ ہے لوگوں میں بے حسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں۔ سواریاں ٹھسی بیٹھی ہیں مگر ان کی ہوس ختم نہیں ہوتی۔ دیکھیں نا......!''

اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔ میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگا۔

''کیا نام بتایا تھا آپ نے؟''

حالاں کہ نہ اُس نے پہلے مجھ سے نام پوچھا تھا' نہ ہی میں نے بتایا تھا۔ بہ ہر حال میں نے اپنا نام بتایا تو وہ کہنے لگا:

''جی عاطف صاحب! آپ ان کی نظر میں عاطف نہیں' نہ ہی میں ان کی نظر میں ہاشم ہوں۔ ہم محض کرنسی نوٹ ہیں۔ اور یہ جو میرے اور آپ کے منھ پر کان' ناک اور ہونٹ ہیں نا! یہ فقط نوٹ پر چھپے نقش و نگار ہیں۔''

میرے اندر سے بے اختیار ہنسی چھوٹی اور ہونٹوں پر پھیل گئی۔

اب وہ مجھے میرے نام سے پکار پکار کر گفتگو کر رہا تھا۔ میرے ہونٹ جو ابھی مسکراہٹ کے لیے کھلے تھے اب ''ہاں ہوں'' بھی کرنے لگے تھے۔

''دیکھیں نا جی عاطف صاحب! ایسا نفسانفسی کا دور چلا ہے کہ کسی کو کسی کی پروا نہیں۔ آپ ماڈل ٹاؤن میں ہی رہتے ہیں نا؟''

یہ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ اس طرح کے سوالات وہ وقفے وقفے سے ُبغیر کسی تمہید کے میری جانب پھینک کر' مجھ سے میرے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ ان سوالات نے مجھے چوکنا ہو کر اُس کی گفتگو سننے پر مجبور کر دیا۔

اُسے جب یہ معلوم ہو گیا کہ میں ماڈل ٹاؤن میں ہی رہتا ہوں تو وہ کہنے لگا:

''یہ عجب شہر ہے عاطف صاحب! ادھر والے ادھر والے کی خبر نہیں۔ ادھر والا ادھر والے کو نہیں جانتا۔ آتے جاتے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں مگر نام تک نہیں پوچھتے۔ ابھی کل ہی کی لیں' میری بیوی درد کی شدّت سے تڑپ رہی تھی۔ میں پڑوسیوں میں سے کسی کو نہ جانتا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے ماڈل ٹاؤن میں منتقل ہوا تھا۔ ایک ہفتے میں بھلا میں کیسے جان پاتا؟ پریشانی سے تو میرے پسینے چھوٹ گئے۔ پہلے بھی آپریشن سے صبیح پیدا ہوا تھا۔ اب اللہ جانے کیا ہو؟ ادھر قریب کوئی نرسنگ ہوم یا ہسپتال بھی نہیں ہے۔ جو ہے بھی تو میں نہیں جانتا کہاں ہے؟ اس پریشانی میں کئی دفعہ دروازے تک گیا اور واپس پلٹ آیا۔ ہر بار بیوی مجھے کچھ نہ کچھ کرنے کو کہتی مگر میں کیا کرتا؟ آخر کہنے لگی' یہ ہمارے پیچھے جو سمیرا رہتی ہے نا' اُس کا میاں ڈاکٹر ہے اُسے بلا لاؤ۔

''یہ سننا تھا کہ میری جان میں جان آئی' عاطف صاحب! یہ جو عورتیں ہوتی ہیں نا! یہ

ہم مردوں سے زیادہ سوشل ہوتی ہیں' جلد تعلقات بنا لیتی ہیں ایک دوسرے سے۔ ایک ہی ہفتے میں سمیرا سے اس کی دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور اِن ملاقاتوں میں جو

تعلقات بنے تھے' ان کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کو میں گھر لے آیا۔ اُنہوں نے انجکشن لگایا۔ رات چین سے کٹی۔ ورنہ اللہ جانے آج صبح میں اُسے ہسپتال لے بھی جا سکتا یا۔ اللہ معاف کرے۔ یہ جو تعلقات اور میل جول ہے نا عاطف صاحب! یہ بہت ضروری ہے۔ مگر عجب زمانہ آ گیا ہے جی کہ میلوں سفر کر جاتے ہیں مگر ساتھ بیٹھے مسافر سے ایک لفظ تک نہیں کہتے۔ گھر کی دیوار سے دیوار ملی ہوتی ہے مگر نہیں جانتے کہ ساتھ والا کرتا کیا ہے؟ عجب بے گانگی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔''

مجھے یوں لگا۔ اب وہ براہ راست مجھ پر چوٹ کر رہا تھا۔ میں جھینپ کی مسکرانے لگا۔ اسی لمحے ویگن والے نے ماڈل ٹاؤن کا نعرہ مارا۔ ویگن رُکی۔ میں چند سواریوں کے بعد نیچے اُترا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا کہ وہ بھی اُترے تو اس سے ہاتھ ملاؤں اور خدا حافظ کہوں۔

وہ بھاری بھرکم جثے کی وجہ سے سواریوں کو اِدھر اُدھر دھکیلتا باہر اترا۔ سانس درست کیا۔ اِسی اثنا میں' میں نے اپنا ہاتھ اُس کی جانب بڑھایا اور خدا حافظ کا لفظ ابھی ہونٹوں سے نہ پھسلا تھا کہ وہ بائیں جانب مڑا' سرسری سی نگاہ میری جانب پھینکی اور جھولتا ہوا' میرے ہاتھ کو دیکھے بنا چل دیا۔

مرگ زار

وہ دھند میں ڈوبی ہوئی ایک صبح تھی۔

مری میں میری پوسٹنگ کو چند ہی روز گزرے تھے اور جتنی صبحیں میں نے اس وقت تک دیکھی تھیں سب ہی دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔

کلڈنہ روڈ پر ہمارا دفتر تھا۔ابھی مجھے گھر نہیں ملا تھا لہذا میں روزانہ پنڈی سے یہاں آیا کرتا تھا گزشتہ ہفتے کے آخری تین روز تو مناظر اپنی طرف کھینچتے اور جی لبھاتے رہے مگر اگلے ہفتے کے پڑتے ہی دل پر عجب بے کلی کی دھند چھانے لگی تھی' بالکل ویسی دھند جو گزشتہ ہفتے مری کی صبحوں کو آغوش میں لے کر سہلاتی رہی تھی اور اب تیور بدل کر اس کی چھاتی بھینچے جاتی تھی۔

وہ صبح میری چھاتی بھی بھینچ رہی تھی۔

میں ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔دوسری جانب سے ایک مانوس آواز لرز رہی تھی جو یک بہ یک سسکیوں میں ڈھل گئی۔نواز کہہ رہا تھا تمہارا بھائی مصعب شہید ہو گیا۔مزید ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ادا نہ ہو سکا کہ اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی تھی۔

شدید دُکھ میرے پورے وجود میں تیر گیا اور لفظ شہادت کی تکرار میرے اندر گونجنے لگی۔

''دعا کرنا امی اللہ مجھے شہادت نصیب کرے''

''دعا کرنا بھائی میں خدا کی راہ میں شہید ہو جاؤں''

''باجی دعا کرنا اللہ مجھے شہدا کے قافلے میں شریک کرے''

امی کے نام' بھائیوں کے نام اور بہن کے نام اس نے جتنے خطوط لکھے وہ بس اسی تکرار پر تمام ہوتے تھے۔ لفظ شہادت کے ساتھ جو تقدس وابستہ تھا اس کے باعث میں بغیر سوچے سمجھے آمین کہتا رہا مگر ہر بار یوں ہوتا تھا کہ یہ لفظ میرے ہونٹوں سے پھسلتے ہی مجھے بوکھلا دیتا پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی اور میں بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگ جاتا۔ حتیٰ کہ پچھتاوا مجھے جکڑ لیتا اور میں خلوص دل اور گہرے تاسف سے سوچتا کہ جسے میرے ہونٹوں سے لڑھکتی آمین کو سننا تھا وہ تو سن کر کوئی فیصلہ دے بھی چکا ہو گا۔

نواز میرا قریبی عزیز تھا اس تک جو خبر پہنچ چکی تھی وہ اسے مجھ تک منتقل کرنے میں دِقت محسوس کر رہا تھا کہ سسکیاں لفظوں کو راہ ہی نہ دے رہی تھیں۔ کسی اور نے اس سے ٹیلی فون لے لیا اور پشاور کا ایک نمبر دیتے ہوئے کہا آپ مزید تفصیلات اس پر معلوم کر سکتے ہیں۔ میں نے پشاور والے نمبر پر فون کیا اور جوں ہی اپنا نام بتایا' دوسری طرف سے کہا گیا

''آپ سے رابطہ کرتے کرتے بہت دیر ہو چکی ہے آپ کو مبارک ہو آپ کا اور ہمارا بھائی مصعب شہادت کی منزل پا گیا۔''

مبارک......مبارک......مبارک' ایک گونج تھی جو سیدھی چھاتی پر پڑتی تھی اور ایک بوچھاڑ تھی کہ آنکھوں سے برس پڑی تھی۔

اطلاع دینے والی آواز جیسے چابی سے چل رہی تھی' بغیر کسی وقفے کے آتی چلی گئی۔

''زِندگی میں مصعب نے جس سعادت کی موت کی تمنا کی تھی وہ اسے نصیب ہوئی۔''

میں تو پہلے ہی چپ تھا اب اُدھر کی چابی بھی ختم ہو گئی تھی' دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ بس ایک میرے سینے کی دھمک تھی جو سارے میں دندناتی پھرتی تھی۔

میں نے چھاتی کو دبایا اور خود کو کچھ کہنے کے لیے مجتمع کیا' بہ مشکل کہا:

''بھائی کی لاش......''

ترت جواب آیا:

''جی لاش ہمارے پاس ہے، مگر......''

میں بے حوصلہ ہو گیا اور لگ بھگ چیخ کر کہا:

''جو کچھ کہنا ہے ایک ہی دفعہ بک کیوں نہیں دیتے''

چابی والی آواز رک رک کر آنے لگی جیسے جس گل سے آواز آ ہی تھی اسے چلانے والی گراریاں پھنسنے لگی تھیں۔

وہ جو کچھ کہ رہا تھا مجھے پوری طرح سمجھ نہیں آ رہا تھا تاہم جب اس نے یہ کہا کہ تابوت ہمارے پاس پڑا ہے تو اس کی آواز پھر سے صاف اور واضح ہو گئی تھی۔ وہ کہ رہا تھا:

''کوئی ساڑھے پانچ بجے جلال آباد کے اگلے مورچوں پر شہادت کا واقعہ ہوا۔ ہمیں دو تین گھنٹے لاش اکٹھا کرنے میں لگ گئے اور......''

میں ایک دفعہ پھر چیخ رہا تھا:

''کیا کہ رہے ہو...... یہ لاش اکٹھا کرنے سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

وہ چپ ہو گیا' اتنا چپ جیسے ادھر دوسری جانب کوئی تھا ہی نہیں۔ حتی کہ مجھے ''ہیلو' ہیلو' چلا کر اسے بولنے پر مجبور کرنا پڑا۔

''دیکھیں ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے۔''

''تعاون؟''

''جی اور اجازت بھی''

''کس بات کی اجازت؟''

''ہمیں شہید بھائی کی وصیت پر عمل کرنا ہے' آپ تعاون کریں گے اور اجازت دیں گے تو ایسا ممکن ہو پائے گا۔ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے۔''

''کیا وصیت کی تھی بھائی نے......اور......کب؟''

''دیکھیں جی ظاہر ہے وصیت اس نے شہادت سے پہلے کی تھی اور وصیت کے مطابق اسے دوبارہ جلال آباد لے جانا ہے۔''

''دوبارہ جلال آباد......مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ اس کی وصیت یہ تھی کہ شہید ہونے کی صورت میں اسے جلال آباد کے شہداء کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔''

''پھر لاش......''

''خدارا زیادہ بحث مباحثہ نہ کریں۔ ہمیں اجازت دیں کہ شہید کی وصیت پر عمل کر سکیں۔''

میں بے بس ہوتا جا رہا تھا کہا:

''میں کیسے اجازت دے سکتا ہوں......وہ......امی جان سے......''

''جی ان سے رابطہ کی کوشش کی گئی مگر ان سے بات نہ ہو سکی' بس پیغام دیا جا سکا ہے۔''

''میں بڑبڑایا' میں کیسے اجازت......؟''

شاید میری بڑبڑاہٹ اس تک پہنچ گئی تھی تبھی تو اس نے فوراً کہا تھا:

''جی مجبوری ہے؟''

''گویا میں اجازت دوں نہ دوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا''

میں روہانسا ہو کر چیخا۔ میری آواز پھٹ گئی تھی اور پھٹی آواز کے دندانے میرے حلقوم کو بھی پھاڑ گئے تھے۔

(نوٹ: اب مجھے کہانی روک کر یہاں وضاحت کر ہی دینی چاہیے کہ یہ کہانی میں انور کی اصرار پر لکھ رہا ہوں۔ انور آج کل موت کے کنول پر منڈلاتی کہانیوں کا

اسیر ہے خود بھی زندگی کی بہ جائے موت کی کہانیاں لکھتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ مجھے بھی اپنے پاس موجود کسی بھی ایسی کہانی کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اس کا

خیال ہے کہ آج کل کی زِندگی کی کہانیوں سے کہیں زیادہ جَوہر موت کی اِن کہانیوں میں ہوتا ہے۔ میں اس کی بات سے متفق نہیں تھا لہذا اس کہانی کو اسے سنانے کے باوصف لکھنے سے احتراز کرتا رہا اور جس قدر کتراتا رہا اتنا ہی اس کا اصرار بڑھتا گیا یہاں تک کہ اوپر کی سطور قلم زد ہو گئیں۔ یہاں پہنچ کر مجھے بہت سی وضاحتوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب کہانی اپنے زور سے بہہ رہی ہو تو وضاحتوں کو موخر کر دینا چاہیے۔ لہذا کہانی کا سرا وہیں سے جوڑتے ہیں جہاں سے یہ ٹوٹی تھی۔ اس کے لیے مجھے کہانی کے راوی کی کھال میں گھسنا ہے' وضاحتوں کے لیے مناسب مَقام تلاش کرتے ہی پھر حاضر ہو جاؤں گا۔)

میں منت سماجت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا گھگھیا گھگھیا کر کہنے لگا:

''مجھے بھائی کا چہرہ دیکھنا ہے''

ادھر سے بالکل سپاٹ آواز میں کہا گیا:

''آپ کے آتے آتے تو بہت دیر ہو جائے گی۔''

میں ہتھے سے اُکھڑ گیا' پھٹی ہوئی آواز کو اور لیر لیر کرتے ہوئے چلایا:

''تم جھوٹ بولتے ہو تمہارے پاس لاش ہے ہی نہیں ورنہ تم......''

میں نے اَپنی بات قصداً نامکمل چھوڑ دی۔ سارے میں سناٹا چھا گیا۔ پورا دفتر میرے کمرے میں جمع ہو گیا تھا اور کوئی بھی کچھ نہ کہ رہا تھا۔ ٹیلی فون کے دوسری طرف بھی کچھ دیر کا سکوت اتنا دبیز تھا کہ چھاتی پر بھاری سل کی طرح اپنا دباؤ بڑھاتا چلا گیا' حتیٰ کہ مجھے گماں گزرنے لگا کہ میری پسلیاں چیخ جائیں گی۔ دفعتاً ریسیور میں سے چابی بھری آواز نے آ کر بھاری سل سرکا دی:

''آپ آجائیں'..........ابھی''

میں نے لمبا سانس لیا اور فوراً کہا:

''جی میں آتا ہوں' میرا انتظار کیجئے......اور امی کو بھی ساتھ لیتا آؤں گا''

''نہیں اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی''

اس نے رٹا رٹایا جملہ دہرا دیا اور ساتھ ہی تاکید بھی کر دی:

''بس آپ خود ہی آجایئے مگر دیر نہ کیجئے گا''

اس خدشے کے پیش نظر کہ میں پھر سے نہ بول پڑوں اس نے حیات آباد کے ایک مکان کا نمبر مجھے دیا اور کہا:

''ہم اس پتے پر آپ کا دو اڑھائی گھنٹے ہی انتظار کر پائیں گے''

فون بند ہو گیا۔ ساتھ ہی میرا دل بھی جیسے دھڑکنا بند ہو گیا تھا۔ میں جہاں تھا' وہیں کھڑا رہا اور دوسری طرف سے کچھ سننے کے لیے سماعت کو پوری طرح حاضر رکھا' یہاں تک کہ لائن کٹ گئی ۔ میں دونوں ہاتھوں کو میز پر رکھ کر کرسی پر یوں ڈھے گیا تھا جیسے بدن عین وسط سے کٹ گیا تھا۔ میں رو دینا چاہتا تھا' دھاڑیں مار مار کر' اپنی چھاتی پیٹ ڈالنا چاہتا تھا......عین وہاں سے جہاں دل پسلیوں میں گھونسے مار رہا تھا مگر میرے اردگرد سارا دفتر جمع ہو گیا تھا۔

(وضاحت نمبر ۱:

کہانی کے راوی نے اپنی ماں کو ساتھ لانے کی بات کی اور باپ کا تذکرہ نہیں کیا۔ ممکن ہے یہ بات کسی قاری کو الجھائے لہذا یہاں وضاحت ضروری ہو گئی ہے کہ راوی کا باپ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔

وضاحت نمبر ۲:

راوی کے بھائی کی شہادت کا واقعہ ہمسایہ ملک افغانستان میں ہوا جب کہ حیات آباد اس کے اپنے ملک کے ایک شہر پشاور میں واقع ہے۔

وضاحت نمبر ۳:

اس خدشے کے پیشِ نظر کہ اسے ایک دہشت پسند کی کہانی نہ سمجھ لیا جائے یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہو گیا ہے کہ یہ واقعہ قدرے پرانا ہے' اتنا پرانا کہ ابھی آزادی اور خود مختیاری کی جدوجہد کرنے والے دہشت گرد قرار نہیں پائے تھے انہیں فلسطین میں فدائی' کشمیر' چیچنیا میں حریت پسند اور افغانستان میں مجاہدین کہا جاتا تھا اور ان کی حمایت اور باقاعدہ سرپرستی ہماری قومی ترجیحات کا لازمی جزو تھا۔

وضاحت نمبر ۴:

ابھی دو میں سے ایک بڑی قوت یعنی روس کو ٹوٹنا تھا تاہم وہ آخری دموں پر تھا جب کہ ہمیں امداد دے کر اَپنی جنگ کو ہمارے لیے جہاد بنانے والے امریکہ نے ہمیں یقین دلایا ہوا تھا کہ پڑوسی ملک میں ہونے والی جدوجہد دراصل ہمارے اپنے ملک کی بقا کے لیے جہاد کا درجہ رَکھتی ہے۔

وضاحت نمبر ۵:

راوی کا خاندان ایمان اور زمین دونوں سے جڑا ہوا تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد جب یہ خاندان ایک قافلے کے ساتھ یہاں آ رہا تھا تو راوی کا تایا بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا جبکہ اس کی ایک جوان پھوپھی اٹھالی گئی تھی۔ اس خاندان نے اس قربانی کو اللہ کی منشا جان کر قبول کر لیا تھا۔

وضاحت نمبر ۶:

راوی خود تقسیم کے معاملے کو ایمان سے زیادہ معاشی آزادی کی جدوجہد قرار دیتا تھا۔ راوی کا باپ اَپنی زِندگی میں اپنے اس بڑے بیٹے کی ان باتوں سے بہت نالاں رہتا تھا۔ وہ اس پر بہت برہم ہوتا اور کہتا کہ اس طرح تو تقسیم میں جان قربان کرنے والے شہید کہلائے جاسکیں گے نہ اٹھالی جانے والی عورتیں اپنے وجود کے گرد تقدس کا ہالہ بنا کرنے

ملک میں آ کر بسنے والوں کے لیے محترم ہو پائیں گی ۔مگر باپ کے مرنے کے بعد راوی کو یوں محسوس ہوا جیسے ایمان اور زمین سے جڑنے والی ساری نسل مر مرا چکی تھی۔

وضاحت نمبر ۷:

چوں کہ وہ شروع ہی سے اپنے خاندان سے الگ سوچتا تھا اور اپنے پورے خاندان کو سادہ فہم اور جذباتی سمجھتا تھا لہذا اس شہادت پر بھی اس کا ردعمل ایک ایسے آدمی کا تھا جو اس ساری جنگ کو ایمان اور زمین سے نہیں جوڑتا۔ وہ صرف اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ مارا جانے والا اس کا اپنا بھائی تھا' وہ بھائی' جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔

وضاحت نمبر ۸:

راوی ماں کے ساتھ بھی بہت محبت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ بیٹے کی لاش ماں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اگر چہ وہ اس کو ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ اس وصیت پر عمل بھی کیا جائے جو اپنی ہی دھن میں مگن اس کا بھائی کر گیا تھا اور اگر اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہے تب بھی ماں اس کی لاش کو خود جلال آباد کے لیے رخصت کرے مگر اس کے لیے اسے اپنے قصبے جانا پڑتا جو ایک سو پچھتر کلومیٹر دوسری سمت واقع تھا۔ یوں دیا گیا وقت وہاں پہنچنے میں ہی صرف ہو جانے کا احتمال تھا اور اسے خدشہ تھا کہ وہ انتظار کیے بغیر بھائی کی لاش واپس جلال آباد لے جائیں گے۔)

میں گاڑی جتنی تیزی سے مری کے پہاڑوں سے اتار سکتا' اُتار لی۔ اسلام آباد' ترنول' ٹیکسلا' حسن ابدال' اٹک کا پل' نوشہرہ غرض سب کو روندتا آگے بڑھتا رہا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میرے پہنچنے سے پہلے کہیں وہ بھائی کی لاش واپس جلال آباد نہ لے جائیں۔ دو تین مقامات پر گاڑی بے قابو ہو کر ٹکراتے ٹکراتے بچی تاہم میں کسی بھی صورت دیئے گئے وقت کے اندر اندر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

اور میں واقعی اتنے کم وقت میں وہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ میرا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے یوں جیسے میں نے بہت دیر کر دی تھی۔

وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے ان سب کا عجب طرح کا سفاک استقلال میرے احساسات کی شدت کو پچھاڑ رہا تھا۔

وہ باری باری مجھ سے بغل گیر ہو رہے تھے اور مجھے بھائی کی شہادت کی مبارک باد دے رہے تھے

میں بھائی کو دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی لاش سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا۔ زور زور سے منہ پھاڑ کر اور سینہ پیٹ پیٹ کر۔ میرا اندر دکھ سے ابل رہا تھا مگر وہ سب بھیگی داڑھیوں والے مجھے مبارکباد دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میں خُوش نصیب تھا کہ میں ایک شہید کا بھائی تھا۔

وہ ختم ہونے میں ہی نہ آتے تھے مجھے لگا میری چھاتی پھٹ گئی تھی اور آنکھیں پھوٹ گئی تھیں، سماعتیں بند ہوگئی تھیں اور میں ان میں سے کسی کی بانہوں میں جھول گیا تھا۔

میں فوری طور پر اندازہ نہیں کر پایا کہ مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا تھا تاہم جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک نیم تاریک کمرے میں قالین پر پڑا پایا۔ مجھے یہ جان لینے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ میں کہاں تھا۔ وہ کمرا گلاب کی خوشبو سے کناروں تک بھرا ہوا تھا۔ بہت جلد مجھے یہ باور ہوگیا کہ لاش کہیں پاس ہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھتے ہی ان میں سے کئی ایک مجھ پر جھک گئے تھے اور یوں میں آزادی سے گردن گھما کر کمرے کا جائزہ نہ لے سکتا تھا۔ ان میں سے ایک، جو کچھ زیادہ ہی گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا، دوسروں کو پیچھے دھکیلتا میرے چہرے پر جھک گیا اور کہا کہ مجھے اٹھ کر وضو کر لینا چاہیے کہ پہلے نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرا خالی تھا...... بالکل خالی بھی نہ تھا...... اس میں بچھے اس ایرانی قالین پر وہ سب ننگے قدموں سے کھڑے تھے، جس پر کچھ دیر پہلے میں لیٹا پڑا تھا۔ سارے میں ایک بوجھل خُوشبو پھیلی ہوئی تھی جو نتھنوں میں گھسے آتی تھی۔ میں نے اپنے پاس کھڑے ہونے والوں کی ٹانگوں کے بیچ سے دائیں دیوار کے پاس پڑا ایک تابوت بھی دیکھ لیا جو گلاب کی پتیوں سے لدا ہوا تھا۔

دل میری چھاتی کے شکنجے سے نکلا اور حلق کی سمت اچھلا۔ میں تابوت کے پاس جانا چاہتا تھا اور اس کا تختہ اکھیڑ کر اندر پڑی لاش کی چھاتی سے لگ جانا چاہتا تھا مگر ان......

(نوٹ: یہاں پہنچ کر راوی نفرت یا پھر غصے کے سبب خاموش ہو جاتا ہے لہذا کچھ اندازے لگانا پڑتے ہیں:

اندازہ نمبر ۱:

کہانی کے اس مرحلے پر راوی کی عقل ماری گئی ہوگی تب ہی تو اس نے بے قابو ہو کر گالی بک دینا چاہی تاہم وہ تہذیب یافتہ شخص تھا لہذا کسی اور احساس یا پھر اپنی آپ کو ناحق برہم پاتے پا کر ندامت سے دو چار ہوا اور گالی کو ہونٹوں میں دبا لیا ہوگا۔

اندازہ نمبر ۲:

راوی نے یہ نہیں بتایا کہ ان سب کی داڑھیاں کیوں گیلی تھیں لیکن اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا سبب ان کی آنسو نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ سب یقیناً وضو کر کے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں بارڈر پار جانا تھا وہ روشنی میں سرحد پار کرنا چاہتے تھے اس کے پہنچنے اور جنازے میں شامل ہونے کے بعد ہی لاش کو واپس لے جایا جا سکتا تھا مگر راوی اتنے کمزور ایمان اور بودے دل والا نکلا کہ اس عظیم وقوعے کو صبر واستقامت سے برداشت کرنے اور وقار سے اپنے شہید بھائی کو رخصت کرنے کی بہ جائے بے ہوش ہو گیا تھا۔

اندازہ نمبر ۳:

وہ غالباً روشنی میں اس لیے سرحد تک پہنچ جانا چاہتے تھے کہ ادھر سے انہیں پوری محافظت دینے والوں کا یہی حکم ہوگا۔ جب کہ رات کو کچھ اور خطروں کے جاگ اٹھنے کا احتمال بھی ہوگا۔

اندازہ نمبر ۴:

ہوش میں آنے کے بعد بھی انہیں اسے وضو کرنے اور جنازہ پڑھنے تک شہید کی لاش سے

قدرے فاصلے پر رکھنے میں بہت دِقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔
ان اندازوں کے بعد کہانی راوی کے بیان سے جڑ جاتی ہے۔)

خدا خدا کر کے نماز جنازہ ہو چکی تو میں بھاگ کر تابوت تک پہنچا میں اتنی تیزی سے تابوت کی طرف لپکا تھا کہ اوپر کا تختہ الٹنے تک وہ مجھ تک نہ پہنچ پائے تھے۔

تختہ الٹ دینے کے بعد وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ سب جو مجھے قدم قدم پر روک رہے تھے' وہ بھی نہیں۔

میں جو تابوت پر جھکا ہوا تھا' میں بھی نہیں۔

وہ لاش جسے تابوت میں ہونا چاہیے تھا حتی کہ وہ بھی نہیں۔

میں نے کفن کی اس جانب کو ٹٹولا جہاں سر ہونا چاہیے تھا...... وہاں سر نہیں تھا۔ میں نے کفن الٹ دیا وہاں سرخ سرخ بوٹیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ میں نے وہاں ہاتھ سرکایا جہاں کندھے ہوتے ہیں وہاں کندھے بھی نہ تھے چھاتی بھی گوشت کا ڈھیر تھی خُون کی پھٹکیوں اور مہک میں بسا ہوا گوشت کا ڈھیر۔

مجھے گمان گزرا ایک لمحے کے لیے کہ وہ میرے بھائی لاشہ نہیں تھا اس سے پہلے کہ میں انہیں جھوٹا کہ کر ان پر چڑھ دوڑتا میری انگلیاں ایک جگہ سلامت جلد کا لمس پا کر رک گئیں۔ میں نے وہاں سے کفن الٹ ڈالا لہو میں ڈوبا بازو میرے سامنے تھا۔ میں نے پہچان لیا وہ سب جھوٹے نہیں تھے' یہ بازو میرے بھائی ہی کا تھا۔ اس کی دو انگلیاں اندر کو مڑی ہوئی انگوٹھے کو چھو رہی تھیں جبکہ دوسری دو اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں' جیسے کوئی تتلی اڑان بھر رہی ہو۔ میں نے بازو کو وارفتگی میں اٹھا کر بوسہ دینا چاہا تو وہ کہنی سے کٹا بازو میرے ہاتھوں میں جھولنے لگا یوں کہ میں بوسہ دینا بھول گیا اور ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ مجھے سنبھال رہے تھے اور میں روتے روتے ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔

(نوٹ: راوی یہاں پہنچ کر چپ ہو جاتا ہے اور کچھ وقفے کے بعد کہانی سے برگشتہ باتیں کرنے لگتا ہے یوں، جیسے وہ سننے والوں کو نظر انداز کر کے خود سے کلام کر رہا ہو۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں کہانی سے جوڑنے میں مجھے دِقت ہو رہی ہے لہذا قوسین کے بعد اس نوٹ کی ذیل میں ان کو صرف اشاروں کی صورت دے رہا ہوں تا کہ راوی کی ذہنی کیفیت کا دُرست دُرست اندازہ لگایا جا سکے۔

پہلی برگشتہ بات کا اشارہ:

راوی نے مٹھیاں بھینچیں اور کہا اب سارے بھیگی داڑھیوں والے اور خود کو ملت واحد کہنے والے بھیگی بلیاں بنے ہوئے ہیں۔

دوسری برگشتہ بات کا اشارہ:

اب کون ہے جو اس زمین پر ٹکنا چاہتا ہے۔ ایسی زمین پر جہاں قربانی حماقت ہو گئی ہے، نیکی بے وقوفی اور ایمان سے وابستگی تنگ نظری۔ ایسا کہتے ہوئے راوی کے ہونٹوں سے سسکی نکلی تھی (جب راوی کی سسکی نکلی تو میرا گمان ہے کہ راوی نے اپنے اس تایا کو یاد کیا ہو گا جو ہجرت کرتے ہوئے مارا گیا تھا اور اس پھوپھی کی بابت بھی سوچا ہو گا جو اٹھالی گئی تھی۔)

تیسری برگشتہ بات کا اشارہ:

راوی نے ایک پرانا اخبار جیب سے نکالا تھا جس میں اس ہیرو کی تصویر چھپی ہوئی تھی جو اب ہیرو نہیں رہا تھا اور قہقہہ لگاتے ہوئے الفاظ چبا چبا کر کہا تھا وہ جس کی ہم جوتیاں چاٹتے ہیں وہ جب چاہتا ہے ہمارے ہاتھوں سے ہمارے ہیرو کو زیرو بناتا ہے جب چاہتا زیرو کو ہیرو بنوا لیتا ہے۔ ہم اپنے پیاروں کو خود رسوا کرتے ہیں اور اپنے غداروں کو خود کندھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد راوی کئی روز کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کی خاموشی بھی کہانی سے برگشتہ باتوں پر عین محرم کی دسویں کو ٹوٹی تھی۔

چوتھی برگشتہ بات کا اشارہ:

راوی یہ بات بتاتے ہوئے خود رونے لگا تھا کہ ماں اب مصعب کو یاد کر کر کے روتی تھی اور زور زور سے بین کرتے ہوئے انہیں بھی یاد کرتی تھی جن سے کوفے والوں نے غداری کی تھی اور جنہیں کربلا میں شہید ہونا پڑا تھا۔ وہ ان مقدس ہستیوں کو روتے روتے تقسیم کے دوران اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کو یاد کرنے لگتی تھی اور وہ سارے آنسو بہا دینا چاہتی تھی جو بیٹے کی شہادت کی خبر سن کر اس نے روک لیے تھے)

(پیارے انور ایک نوٹ تمہارے لیے: یہاں موت کی کہانی ختم ہونے کے قریب ہے۔ وہ کہانی جو تم لکھوانا چاہتے تھے اس کہانی کے اندر ہی کہیں تحلیل ہوگئی ہے اب چاہے کوئی ماں کی کوکھ سے جنم لیتے لیتے سانسیں توڑ بیٹھے' اپنے بستر پر طویل عمر پا کر بے بسی کی موت مرے' سڑک پر چلتے چلتے کسی ٹرک تلے کچلا جائے یا کسی اعلا آدرش کے لیے جان دے دے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ بعد میں سب موتوں کے معنی بدل جانے ہوتے ہیں۔ اب تو کہانیوں کا وہ متن بھی بے وفا ہو گیا ہے' جسے تم نے یا میں نے لکھا ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس پر زیادہ استحاق رکھنے لگا ہے۔ بالکل اسی طرح' جس طرح ہم جس کے تصرف میں ہیں' اکیلے اکیلے یا ایک گلے کی صورت میں' وہ جس طرف چاہتا ہے ہماری زِندگیوں کو ہانک لے جاتا ہے اور جب چاہتا ہے ہماری شہادتوں کو تہمت بنا دیتا ہے۔ لو میں بھی بہک گیا ہوں راوی اِدھر ہی کو آرہا ہے لہذا میں اَپنی بات موقوف کرتا ہوں راوی کے آخری جملے سن لو کہ کہانی تکمیل کو پہنچے)

ماں اس وقت بالکل نہ روئی تھی جب میں گھر پہنچا تھا' ہاں ماسی جو پاس ہی بیٹھی تھی ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر بین کرنے لگی تھی۔ ماں نے ماسی کے اٹھے ہوئے ہاتھ جھٹک کر گرا دیئے اور اسے رونے سے منع کرتے ہوئے کہا تھا کہ شہیدوں پر رویا نہیں کرتے۔ میں ماں کے حوصلے پر دنگ اور اس کی سادگی پر برہم تھا...... لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ تب ایمان کے معاملے میں وہ اندر سے اتنی مضبوط تھی کہ میں اندر سے کافر ہوتے ہوئے بھی اسے ٹوک نہ پاتا تھا...... مگر یہ تو تب کی بات ہے جب ایمان اور زمین کی کوئی وقعت تھی اب تو ماں روتی ہے اور رلاتی بھی ہے۔ اتنا زیادہ' اور اتنے تسلسل سے' کہ میں بھی رونے لگتا ہوں اور بچھڑے ہوؤں کو یاد کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔ میں بچھڑے ہوؤں کو اتنا یاد کرتا ہوں کہ اندر کا کافر دل پسیج کر ایمان اور زمین سے وابستہ ان جذبوں کو اپنے ہی اندر سے ڈھونڈ نکالتا ہے' جو وہاں کبھی تھے ہی نہیں۔

پارہ دوز

(تین پارچے: ایک کہانی)

پہلا پارچہ

اُس روز تو میری آنکھیں باہر کو اُبل رہی تھیں۔

بے خوابی کا عارضہ میرے لیے نیا نہ تھا تاہم پہلے میں مُسکّن ادویات سے اس پر قابو پالیا کرتا تھا' یوں نہیں ہوتا تھا کہ ادل بدل کر دوائیں لینے سے بھی افاقہ نہ ہو۔ مگر اس بار ایسا نہ ہوا تھا۔ دونوں کنپٹیوں کے نواح سے درد برامد ہو کر پورے بدن پر شب خُون مارتا تھا اور میرے عصبی ریشے بری طرح ٹوٹنے لگتے تھے۔ جب سارے ٹسٹ ہو چکے اور کہیں بھی کوئی خرابی نہ نکلی تو مجھے تشویش کے دورے پڑنے لگے میں اس ٹوٹ پھوٹ سے نڈھال تھا مگر یہ درد کیوں تھا' اس کی تشخیص ہی نہ ہو پا رہی تھی۔ اور یہی بات مجھے دہلائے دیتی تھی ۔ بے پناہ تشویش کے ایسے ہی

دورانیے میں میرا دھیان آنکھوں کی دُکھن کی جانب ہو گیا۔ بل کہ مجھے یوں کہنا چاہیے کہ جب سارا درد آنکھوں میں برچھی کی طرح کُھب گیا تو دھیان کے وہاں ارتکاز کے علاوہ میرے پاس کوئی اور صورت تھی ہی نہیں۔

بدن کا درد تو کسی کو نظر نہ آیا تھا مگر میری ان آنکھوں کو تو دیکھا جا سکتا تھا جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

نافی کا خیال تھا: اس میں تشویش کا کوئی پہلو نہیں تھا۔

یہ بات اس نے میری آنکھوں میں دیکھے بغیر ہی کہہ دی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی مصنوعی پلکیں چپکا رہی تھی۔ مجھے اس کے روّیے پر طیش آرہا تھا تاہم میں نہیں جانتا تھا کہ میں اس پر اپنے غصے کا اظہار کیسے کروں۔ ہم دونوں کے درمیان رشتہ کچھ ایسی نہج پر پہنچ چکا تھا کہ ہم ایک دوسرے پر غصہ کرنا لگ بھگ ہی بھول گئے تھے۔

میں نے ہمت جمع کی اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا' کچھ یوں کہ اس کی نظر آئینے کی بہ جائے میری سرخ بیرا بہٹی اُبلتی ہوئی آنکھوں پر پڑ جائے۔

نافی نے کندھے سکیڑ کر پہلو بدلتے ہوئے اپنی داہنی کہنی کو قدرے باہر کو نکلی ہوئی میری توند کے بائیں جانب ٹکا دیا' یوں کہ آئینہ دیکھتی اس کی نیلی آنکھیں میری گردن کے ایک طرف سے بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھتی رہیں۔ میں نے بائیں کو مزید کھسک کر درمیان میں حائل ہونا چاہا تو وہ میرے ارادے کو بھانپ گئی اور ''اوں ہونہہ'' کہتے ہوئے میرے پیٹ پر ٹکی کہنی پر دائیں جانب دباؤ بڑھا دیا۔

میں مجبوراً ایک طرف کھسک گیا تاہم ہمت نہ ہاری اور لگ بھگ گھگھیا کر کہا ''نافی دیکھو نا ڈارلنگ میری آنکھیں درد سے پھٹ رہی ہیں۔''

~~مجھے اپنی آواز اجنبی لگی تھی' اتنی کہ میں اُدبدا کر آئینے میں خود کو دیکھنے لگا تھا۔ ایک ثانیے کے~~ لیے' جی محض ایک ثانیے کے لیے۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میری آنکھیں سرخ نہیں تھیں' مگر

دوسرے ہی لمحے سارے آئینے میں سرخ لوتھڑا بنی آنکھیں اُگ آئی تھیں ۔ میں نے ادھر سے دھیان ہٹا کر ساری توجہ نافی پر مرتکز کر دی کہ شاید یوں وہ آئینے کے واسطے سے میری آنکھوں پر نظر ڈال لے۔ میں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا مگر وہ اپنے آپ میں بری طرح مگن تھی کچھ اس محویت سے کہ اس سلسلے کو روک کر میری طرف دیکھنے کی گنجائش نکلتی ہی نہ تھی۔ تاہم ہمارے حسی نظام کی تربیت اس نہج پر ہو چکی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھے بغیر سہولت سے ضروری فیصلے کر سکتے تھے ......اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ مجھے وہاں کھڑا رہنے کی بہ جائے اپنے لیے کوئی اور مصروفیت ڈھونڈنی چاہیے:

''اوہ موظی ڈیئر' میں نے دیکھ لی ہیں نا تمہاری آنکھیں''۔

وہ جھوٹ بول رہی تھی یا ممکن ہے اس نے میرا چہرہ دیکھے بغیر ہی میری آنکھیں دیکھ لی تھیں تاہم میں دیکھ رہا تھا ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نگاہ اس کے اپنے چہرے سے جدا نہیں ہوئی تھی ۔ مجھے اس کے جملے پر ایک بار پھر غور کرنا پڑا' اور جب میں اسے خوب جانچ چکا تو اس کا مطلب بھی سمجھ آ گیا تھا۔

وہ ہمیشہ سے نچلے ہونٹ کو قدرے ڈھلا چھوڑ کر مجھے معظم کی بہ جائے موظی کہتی چلی آ رہی تھی' حتیٰ کہ ایسے کہنا اس کی عادت ہو گئی۔ تاہم ایک زمانہ تھا کہ موظی کہتے ہوے اس کا نچلا ہونٹ رسیلا ہو جایا کرتا تھا۔ جب پہلی بار اس نے مجھے موظی کہا تھا تو میں بہت ہنسا تھا۔ میں نے سیلاب جیسی ہنسی تھمتے ہی اس کے رسیلے ہونٹوں کے صدقے اس کا موظی کہنا قبول کر لیا تھا۔ اور جب اس نے پوچھا تھا کہ میں اسے نفیسہ کی بہ جائے محبت سے کیا کہا کروں گا تو مجھے کچھ نہ سوجھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے نام کو بدلنے کی مجھے طلب ہی نہ ہو رہی تھی ۔ میں اسے نفیسہ کہتا تھا تو اس کا پورا وجود انتہائی نفاست سے میرے سامنے ایستادہ ہو جاتا تھا لہٰذا میں نے کہہ دیا کہ محبت مجھے نفیسہ کہنے سے باز نہیں رکھے گی۔ مگر اس نے ضد کر کے اپنے لیے نافی سے پکارا جانا تجویز کر لیا تھا۔

نافی جہاں تھی وہاں اب میرا ٹکنا مشکل ہو رہا تھا مگر یوں تھا کہ میں اس کی توجہ کے لیے

مرے جاتا تھا۔اس طرح کا مرنا تو میں ایک مدت سے بھول چکا تھا......مگر آہ میری سرخ بوٹی کی سی آنکھیں......میں وہاں سے کیسے ٹل سکتا تھا کہ ابھی تک اس نے ان میں جھانکا ہی نہیں تھا۔

جب وہ آئینے کے اوپر جھک کر نفاست سے بنی اپنی بھنووں کو دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے باری باری سہلا کر جائزہ لے رہی تھی تو میری دُکھتی ہوئی آنکھیں آئینے ہی سے اس کے چکنے شانے سے پھسلتی ڈیپ وی میں گر گئی تھیں۔روئی کے گالے جیسی نرمی ان کے لیے مرہم ہو گئی تھی۔ میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے وہاں' اُس گداز میں بھول سکتا تھا مگر عین اسی لمحے نرم اور ملائم جلد کٹتی چلی گئی' تیز نشتر کی نوک سے' بالکل ایک سیدھ میں۔اور جب وہ پوری طرح کٹ گئی تو لہو شرائے بھر کر بہنے لگا' اتنا کہ میری آنکھیں اس لہو میں ڈوب گئی تھیں۔

دوسرا پارچہ

میرے لیے وہ پہلا آپریشن نہیں تھا۔اس عورت کی باری آنے سے پہلے اس جیسے لگ بھگ سات سو بائیس مریضوں کو چھ سال میں آپریٹ کر چکا تھا۔ایک ایک پیشنٹ کا ریکارڈ میرے پاس تھا۔اگر میں اس عرصے میں کام یاب نہ ہونے والے آپریشنز کی شرح نکالنا چاہوں تو وہ محض ایک اشاریہ ایک صفر آٹھ فی صد بنتی ہے۔اس عرصے میں آپریشن کے تختے پر یا پوسٹ آپریشن ٹریٹمنٹ کے دوران مرنے والوں میں سے پانچ کی عمر اٹھاون سے اوپر تھی دو لڑکے نو اور گیارہ برس کے تھے جبکہ ایک عورت عین اس عمر میں آپریٹ ہوئی تھی جس میں اب نافی تھی۔

جس کے لہو سے میری آنکھیں بھیگی تھیں وہ مرنے والی یہ عورت نہیں تھی۔نہ یہ نہ باقی مرنے والی عورتیں۔وہ عورت تو زندگی کے ایسے دورانیے میں آپریشن تھیٹر میں لائی گئی تھی جو طویل تر ہو گیا تھا' اتنا کہ کاٹتے رہنے سے بھی کٹنے میں نہ آتا تھا۔

سات سو بائیس مریضوں کے آپریشن کے چھ برس کتنی جلدی بیت گئے تھے۔میرا اپنا دل اُس سارے عرصے میں عین پسلیوں کے بیچ نشتر چلاتے ہوئے ایک بار بھی نہیں کانپا تھا۔ جنہیں زندگی ملنا تھی' انہیں میرے نشتر کی دھار سے ملی اور جن کی سانسوں کا کوٹہ ختم ہو گیا تھا انہیں

میرا خلوص اور انتھک محنت بھی زِندگی نہ دلا سکا تھا۔ تاہم جب میری مہارت اور قابلیت کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تو ڈاکٹر میر باز سے ملاقات ہو گئی۔

ڈاکٹر میر باز سے میں پہلے بھی مل چکا تھا غالباً پہلی بار ان دنوں جب وہ وفاقی علاقے میں اپنا ہسپتال بنانے کا منصوبہ بنا رہا تھا ان دنوں وہ اس سرکاری ہسپتال کے سربراہ سے ملنے آیا تھا جس میں' میں پریکٹس کرتا تھا۔ اسے بہت سے امور میں میرے باس کی مدد چاہیے تھی' یہ مدد اسے ملتی رہی ایک شاندار ہسپتال اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بن گیا۔ جتنے سرکاری ادارے اس کے پینل پر آسکتے تھے وہ لائے گئے اور اس میں بھی میرے باس کی مدد شامل تھی۔ تاہم میں اسے دیکھتا تھا تو مجھے ابکائی آنے لگتی اور جب اس کے ہسپتال کے پاس سے گزرنے کا موقع نکلتا تو مرعوبیت مجھ پر چڑھ دوڑتی تھی۔ شاید یہی وہ اسباب تھے کہ میں اس کے قریب نہ ہو پا رہا تھا لہذا اپنے کام میں مگن ہو گیا حتی کہ وہ دن آ گیا کہ جس کی شام کو ہمیں کرائے کا مکان بدلنا تھا اور نفیسہ نے' جو ابھی نافی نہیں بنی تھی' ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا کہ ہم کب تک کرائے کے مکان بدلتے رہے گے۔ یہ بات نفیسہ نے عین اس وقت کہی تھی جب اس نے سامان گھسیٹتے ہوئے میری پشت سے اَپنی پشت کو ٹکرا لیا تھا۔ اس ٹکرانے میں کچھ ایسا لطف تھا کہ وہ یونہی سی ایک بات سمجھ کر اپنے اس جملے کو بھول گئی تھی جس کی تلخی میرے اندر اتر گئی تھی۔ جب وہ مزے سے اور اپنے آپ سے بے پروا ہو کر ہنس رہی تھی تو اس کی آواز کے ہلکوروں میں ایک میٹھا سا بھید چھلکنے لگا تھا۔ اس بھید میں اس کا بدن ڈوب اُبھر رہا تھا۔ میں نے اُسے نظر بھر کر دیکھا تھا اور ساری تلخی بھول کر ان ہلکوروں میں خود بھی بہہ گیا تھا۔

آخری پارچہ

اسے سننا' اس کی آواز کے ہلکوروں میں بہہ جانا یا پھر اُس کے بدن کو یوں دیکھنا کہ لطف اور لذت ساری دُکھن سمیٹ لے ایک مدت کے بعد ہوا تھا۔ اتنی مدت کے بعد کہ اب یہ اندازہ کرنے کے لیے' کہ آخری بار ایسا کب ہوا تھا' مجھے ذہن پر بہت زور دینا پڑے گا۔

ذہن پر غیر معمولی زور دیئے بغیر یہ بات میں یقین سے کہ سکتا تھا کہ یہ واقعہ سرکاری ہسپتال سے الگ ہونے اور ڈاکٹر میر باز کے نئے ہسپتال میں میرے پہلے آپریشن سے بھی پہلے کا تھا۔ جی 'اس پہلے آپریشن کا جس نے ابھی ابھی میری آنکھیں خُون میں نہلا دی تھی۔ بعد کے برسوں کی تعداد اور یادیں میں نے قصداً سینت سینت کر نہیں رکھی تھیں کہ انہیں سوچوں تو مجھے خود پر ویسی ہی اُبکائی آنے لگتی جیسی کبھی ڈاکٹر میر باز خان کو دیکھ کر آتی تھی۔

تاہم اس وقت میرا مسئلہ ابکائی نہیں آنکھیں تھیں جو درد سے پھٹی جا رہی تھیں۔

''دیکھو موظی ڈیئر بہتر یہ ہے کہ کچھ دیر کے لیے سو جاؤ' خود ہی آرام آجائے گا''

اس نے اس بار بھی میری آنکھوں میں دیکھے بغیر یہ کہا تھا۔ جملے کی ساخت میں بہ ظاہر محبت اور تشویش تھی مگر آواز جس مخرج سے برامد ہوئی تھی اس نے اسے سپاٹ اور سارے ممکنہ جذبوں سے عاری بنا دیا تھا۔

اس طرح بولنا اور اسی طرح کی آوازوں کو سننا اور ان کے مطابق اپنے آپ کو حرکت دینا اب ہماری زِندگی کا معمول تھا۔ لہذا میرے لیے وہاں کھڑے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔

میں گزشتہ طویل عرصے سے مختلف دوائیں پھانک رہا تھا اور کچھ ہی دیر پہلے اَپنی ابلتی آنکھوں میں قطرے بھی ڈال لیے تھے۔مگر وہ درد جس نے میری آنکھوں کو گروی رکھا ہوا تھا۔ٹلتا ہی نہ تھا۔اور نافی کا کہنا تھا کہ مجھے آرام کرنا چاہیے۔

بیڈ پر بیٹھتے ہی میں نے زور سے خود کو پیچھے گرا دیا۔خود کو یوں گرانے سے میں ایسی آواز پیدا کرنا چاہتا تھا جو نافی کو متوجہ کر لے مگر فومی گدے کی نرماہٹ پر میرا بدن جھول کر رہ گیا۔ اَپنی اس کوشش کے بعد اس کو دیکھا۔وہ پہلے کی طرح آئینے میں مگن تھی تاہم میں نے محسوس کیا تھا کہ جب تک میں وہاں کھڑا رہا' وہ بھی کھڑی رہی تھی' یوں جیسے آئینہ اس کے وجود سے کھڑا تھا۔مگر اب وہ بیٹھ چکی تھی اور آئینہ اسے جُھک جُھک کر جھانک رہا تھا۔

دودھ جیسی گوری گردن تک سلیقے سے ترشے ہوے بالوں کو چھونے کے لیے جب نافی

دونوں کہنیاں باہر کو اُٹھا کر ہاتھ پیچھے کو لے آئی تو ایک بار پھر میں اُپنی اُبلتی آنکھوں کو بھول گیا۔
اس نے ہتھیلیوں کا رخ اپنے گالوں کی طرف کیا دونوں ہاتھوں کی چھوٹی انگلیوں کو اوپر اٹھایا اور پھر انہیں لچکا کر بالوں کے نیچے گردن پر رگڑتے ہوئے باہم ملالیا۔ اس کے سارے بال ان ننھّی مُنّی انگلیوں کے اوپر جمع ہوے گئے تھے۔ پھراس نے یک دم ہاتھوں کو کچھ یوں جنبش دی کہ بالوں کے نیچے سے نکل آنے والی انگلیوں سمیت دونوں ہاتھوں کی آخری تین تین انگلیاں تتلی کے پروں کی طرح ہوا میں لہرا گئیں' کچھ اس ادا سے کہ باقی کی انگلیاں پہلے سے سمٹے سمٹائے بالوں کو دھیرے دھیرے اُپنی پوروں سے بوسے دینے لگی تھیں۔

عین اس لمحے میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں ہلکی ہوگئی تھی۔ قمیض کی سلوٹیں اُس کے بدن کے گداز میں دھنس رہی تھیں۔گلا آگے پیچھے دونوں طرف سے ڈیپ تھا جو اندر کی ساری نرمی باہر پھینک رہا تھا۔ بازو اوپر اٹھانے سے اس کے کولہے دائیں بائیں اور پیچھے کو کچھ اور پھول گئے تھے۔اتنے کہ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں اٹھ کر انہیں پیار سے تھپتھپادوں۔ میں نے اٹھنا چاہا بھی مگر آنکھوں کی شدید چبھن نے مجھے اٹھنے ہی نہ دیا اور وہ خواہش قضا ہوگئی۔اتنی شدید اور اتنی خالص خواہش کے اس قدر مختصر دورانیے پر مجھے بہت دکھ ہوا۔تاہم عین اسی لمحے پر حیران بھی تھا۔اور حیرت اس بات پر تھی کہ یہ خواہش میرے اندر ابھی تک موجود تھی۔اب میں اسے دیکھتے رہنا چاہتا تھا مگر اسے یوں دیکھنا میرے لیے ممکن نہ رہا تھا کہ میرا سر گھومنے لگا۔اور میں قبر جیسے اندھرے میں ڈوبتا چلا گیا۔شان دار روشن قبر کے گہرے اندھیرے میں۔

جونہی میں قبر کے پیندے سے جالگا ٹیلی فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ میں گن نہیں پایا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی کتنی بار بجی تھی تاہم آخری بار ابھی اس کی گونج پوری طرح معدوم نہیں ہوئی تھی کہ نافی کے ہیلو کہنے کی آواز سنائی دی۔دوسری طرف جو بھی تھا اسے نافی نے یہ نہ بتایا تھا کہ میں اس کے کہنے پر آرام کر رہا تھا۔اُس نے اگلے آدھے گھنٹے کے اندر میرے پہنچنے کا خود ہی تخمینہ بھی لگا لیا

تھا۔ بات مکمل کرتے ہی اس نے مجھے جھنجھوڑ ہی ڈالا تھا اتنی زور سے کہ اتنا جھنجھوڑنے پر مُردے بھی زندہ ہو سکتے تھے۔

وہ آپریشن ڈے تھا اور مجھے اُوپر تلے تین آپریشن کرنا تھے۔

جب میں تیار ہو کر اپنے خوب صورت گھر کے پورچ سے اپنی نئی گاڑی نکال رہا تھا تو نہیں جانتا تھا کہ ایک مرا ہوا شخص زِندگی کے بخیے کیسے لگا پائے گا۔

اشاریہ

(افسانہ/افسانوں کے مجموعے کا نام/صفحہ نمبر)